رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ
ماہنامہ
نئے اُفق
کراچی
naeyufaq.com
عیدالاضحیٰ
مبارک
Pakistanipoint
Learning Point

10 دستک — مشتاق احمد قریشی

11 گفتگو — عمران احمد

18 اقرأ — طاہر قریشی

20 دختر وطن — زرین قمر

50 خونی کتاب — شہزاد خان

56 سنہری دھوپ — دستگیر شہزاد

66 وجود حیات — عرفان رامے

10 جیت کی نشانی — ببرک کارمل جمالی

10 چال — سجاول خان

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

دفتر کا پتا: 81 نیپئر بیرکس، ہاکی کلب آف پاکستان، اسٹیڈیم نزد آنچل پریس کراچی 75510

100
چھوٹا چور
محمد سلیم کرد

108
بساط گر
وحید سلطان

134
صراط مستقیم
ریاض بٹ

146
آپریشن نومبر
مونا شہزاد

152
سایہ
عبداللہ احمد حسن

164
راز سربستہ
ثناء اللہ خان احسن

168
ذوق آگہی
عثمان عبداللہ

172
خوش بوئے سخن
نوشین اقبال نوشی

176
عشق پیچاں
قرۃ العین سکندر

Waqar Azeem
PakistaniPoint.com

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ آنچل پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی، 74200 فون نمبرز 021-35680771/2
فیکس 0300826424 2 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل: Info@naeyufaq.com

دستک

مشتاق احمد قریشی

حکومت وقت نے کابینہ کی منظوری سے ایک بل اخباری تنظیموں کو بھیجا ہے تا کہ اُن کی رائے کو پیش نظر رکھا جائے اور اس بل میں شامل کیا جا سکے، حکومت پاکستان کی کابینہ میں ایک سے بڑھ کر ایک دانشور اور قابل کھلاڑی موجود ہیں انہوں نے اس اہم بل کو قابلیت کی کھچڑی بنا دیا ہے گذشتہ دنوں اسلام آباد میں اخباری مالکان کی تنظیم آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی اے پی این ایس نے اہل صحافت اور اشتہارا تی کمپنیوں (ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں) کے لیے سالانہ تقسیم انعامات کی تقریب منعقد کی اس تقریب میں جناب صدر مملکت عارف علوی صاحب مہمان خصوصی تھے۔ اس موقع پر وزیر اعظم کی مشیر خصوصی وزارت اطلاعات ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان نے صدر اے پی این ایس کو یاد دلایا کہ حکومت کی طرف سے جو مسودہ قانون تحافظ صحافت اور کارکنان صحافت کا بھیجا گیا ہے اس کا جواب ابھی تک نہیں ملا حالانکہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں جس پر سوچ بچار میں اتنا وقت لگایا جائے۔ کابینہ نے اسے منظور کر دیا ہے۔

حکومت کی جانب سے پیش کردہ مسودہ قانون اتنا سادہ نہیں ہے جتنا کہا گیا اس میں دو طرح کے قانونی مسائل کو گڈمڈ کر دیا گیا ہے کیونکہ صحافت کے تنظیمی شعبہ اور کارکنان صحافت کا شعبہ دو الگ الگ شعبے ہیں ان کے مسائل مختلف ہیں جن کی قانون سازی الگ الگ کرنے کی ضرورت ہے بظاہر جو بہت سادھا بات نظر آ رہی ہے وہ اتنی آسان نہیں، تمام متعلق ادارے جن کے مفادات متاثر ہو سکتے ہیں چاہے وہ کارکنان صحافت ہوں یا صحافتی ادارے ہو یا صحافتی تنظیمیں ہو جب تک تمام اسٹیک ہولڈرز کی ایک رائے نا ہو اس وقت تک کسی قسم کی قانون سازی کرنا اُسے نافذ کرنا مناسب نہیں ہوگی۔ امید ہے کہ حکومت وزارت اطلات اس اہم اور سنجیدہ ترین مناملے پر تمام متعلقین کو جب تک مکمل یک رائے نا کر لے اسے اس وقت نافذ نا کیا جائے۔

صحافت اور کارکنان صحافت کی قوت اور اثر پذیری کو موجودہ حکومت اور تمام اہل سیاست اور اہل قانون و تجارت خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں صحافتی ادارہ اور صحافی حضرات کا مطمئن ہونا کتنا اہم اور ضروری ہوتا ہے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

بھارت میں جو ننگے فسادات ہو رہے ہیں خصوصاً بھارتی دارالحکومت نئی دلی میں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں جو کچھ کشمیر میں مظالم ہو رہے ہیں وہ کسی سی چھپے نہیں ادھر کوئی واقعہ دنیا کے کسی بھی کونے میں کیوں نا ہو اس کی تمام تفصیل منٹوں میں دنیا کے سامنے آجاتی ہے یہی اہل قلم صحافتی کارکنان کا اور نشریاتی اداروں کا کارنامہ اور کمال ہوتا ہے دنیا سمٹ کر رہ گئی ہے اب لاکھ کوشش کے باوجود بھی کوئی خبر چھپائی نہیں جا سکتی جیسے بھارت تمام کوشش کے باوجود اپنے کالے کرتوت دنیا سے چھپا نہیں سکا موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا یہ ذرائع ابلاغ کا ہی کرشمہ و کارنامہ ہے کہ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کشمیریوں پر توڑے جانیوالے ظلم پر اپنی رائے کا اظہار کیے بنا رہ نہیں سکے یہ بلاشبہ صحافت کی قوت ہی ہے جس نے امریکی صدر کی مسلم مخالفت اور مودی دوستی کے باوجود ہندوستان کے دورے کے موقع پر اپنی زبان روک نہیں سکے انہوں نے کھل کر پاکستان کی حمایت میں بیان دیکر نا صرف مودی کو اور اُن کے تمام چھوٹے بڑے حمایتیوں چیلے چانٹوں کو ناراض کر دیا جس کے ردعمل کے طور پر امریکی صدر پر تو اُن کا بس نہیں چلا لیکن اپنے ہی وطن کے مسلمانوں پر اپنا غصہ لکالنے ھڑ ے ہو گئے ویسے بھی دلی کی آبادی پر انہیں دوہرا غصہ تھا الیکشن میں شکست کا اور امریکی صدر کا پاکستان کے لیے بہت اچھے جذبات کے اظہار نے اُن کے سینوں میں انتقام کی آگ بڑھکا دی پاکستان مسلمان ملک ہے اس لیے انہوں نے اپنا غصہ مسلمانوں پر نکالا یوں اپنے گھر کے اپنے ہی ہم وطن لوگوں کو قتل کیا اور اُن کی املاک کو نذر آتش کیا کھسیانی بلی کھمبا نوچے یہ اہل قلم اہل صحافت ہی ہیں جو دنیا بھر کی اطلاعات کو ہر قسم کی خبروں کو عوام تک پہنچانے کے لیے شب و روز اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں اپنا خون پسینہ بہاتے ہیں تا کہ لوگ ہر طرح کی خبر سے باخبر رہیں، اس کا ایک منفی پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی خبر کسی سرکار دربار کے مزاج کیخلاف چل جائے تو نا صرف اس اشاعتی اور نشریاتی ذریعے کی بلکہ اس صحافی کی بھی شامت آجاتی ہے اسی ناپسندیدگی کے باعث اب تک سیکڑوں صحافی موت کے گھاٹ چڑھائے جا چکے ہیں اب حکومت وقت اگر کسی بھی وجہ سے صحافت کی حفاظت کی طرف متوجہ ہوئی ہے تو یہ بہت اچھی علامت ہے اللہ کرے کہ حکومت تمام متعلقین (اسٹیک ہولڈرز) کو ساتھ لے کر چلے اس مجوزہ قانون میں تجویز کردہ ترامیم کو شامل کر کے اسے کار آمد قانون بنا دے تا کہ کسی حد تک ہی سہی صحافتی اداروں کو اُن کے کارکنان کو تحفظ کا احساس ہو سکے جو خوف کے سائے صحافت پر منڈلا رہے ہیں ان کا کچھ تو تدارک ہو سکے اس سلسلے میں اے پی این ایس ہو یا سی پی این ای اجتماعی مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے مشترکہ طور پر جلد از جلد ترمیم کا مسودہ حکومت کو پیش کر دے تا کے اسے قانون کی شکل مل سکے صحافت کو تحفظ کا احساس ہو سکے اور صحافت کے لیے اطمینان کا باعث ہو۔

گفتگو

عمران احمد

"حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس جوان نے کسی بوڑھے شخص کی اس کے بڑھاپے کی وجہ سے تعظیم و تکریم کی تو اللہ تعالیٰ اس کے بڑھاپے کے وقت ایسے شخص کو مقرر کرے گا جو اس کی تعظیم کرے گا" (الترمذی)

عزیزان گرامی!

اگست کا شمارہ حاضر ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ کرونا کے بعد حالات بتدریج معمول پر آنا شروع ہو گئے ہیں۔ ان تین ماہ ڈائجسٹ انڈسٹری کو شدید نقصانات سے دوچار ہونا پڑا جس کی تلافی کب تک ہوگی کچھ خبر نہیں۔ پاکستان کے تمام ڈائجسٹ کی اشاعت بری طرح متاثر ہوئی ہیں۔ پہلے ہی ڈائجسٹ مشکلات کا شکار تھے اب ان کی اشاعت میں مزید کمی آ گئی ہے۔ ہم سب مل کر بارگاہِ الٰہی میں دعا کریں کہ اللہ سبحان و تعالیٰ ڈائجسٹ انڈسٹری اور ان سے منسلک افراد پر اور اس ملک پر اپنا خصوصی کرم و فضل فرمائے۔ آمین اگست کا شمارہ تیار کرتے وقت کافی مشکلات کا شکار رہا ہوں۔ سب سے اہم کردار کے الیکٹرک کا رہا جس نے بجلی کی آنکھ مچولی ایسی کھیلی کہ الامان والحفیظ۔ جس کی وجہ سے مجھے کمپیوٹر کی ونڈوز کی خرابی کی شکل میں کافی پریشانی اٹھانی پڑی۔ بہرحال کام تاخیر سے صحیح مگر مکمل ہو ہی گیا۔

اس ماہ آخری صفحات پر قرۃ العین سکندر کا ناول خاص ہے جسے پڑھ کر یقیناً آپ مصنفہ کو داد دیے بغیر نہیں رہیں گے۔ پہلی سطر سے آخری سطر تک قاری کو اپنی مضبوط گرفت میں رکھا آپ پڑھ کر ان کی صلاحیتوں کے معترف ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ دیگر کہانیاں بھی یقیناً آپ کی دل بستگی کا سامان کریں گی۔

اگست کے شمارے میں آپ تبصرے پڑھیں اور ان میں سے دو ایسے تبصروں کا چناؤ کریں جو انعام یافتہ ہوں۔ دو منتخب تبصروں کو نئے افق کا نیا شمارہ انعام میں دیا جائے گا۔

ایک خاص بات آپ نئے افق کے فیس بک پر موجود پیج اور گروپ کو جوائن کریں اور اپنے احباب کو بھی اس میں شامل کریں ساتھ ہی نئے افق میں اپنی اور دیگر افراد کی سرگرمیوں سے مطلع بھی کرتے رہیں تا کہ ادارے سمیت آپ اور دیگر افراد نئے افق کی فیملی کا حصہ بن کر اس میں ہونے والی سرگرمیوں میں شامل رہیں۔ جن لوگوں نے نئے افق میں اپنی کہانیاں ارسال کی ہیں وہ تھوڑا سا انتظار کریں ان شاء اللہ جلد سب کو مطلع کر دیا جائے گا۔

بشرط زندگی اگلے ماہ تک کے لیے اجازت۔ اب آیئے اپنے تلخ و شیریں تبصروں کی جانب:۔

محسن علی طابش ساھیوال:۔ السلام علیکم بھائی عمران احمد صاحب اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور ایمان والی لمبی عطا فرمائے آمین کرونا نے لوگوں کے ساتھ ڈائجسٹوں کی دنیا کو بھی ہلا کر رکھ دیا شکر ہے نئے افق کی شکل دیکھی شمارہ مشترکہ جولائی کا سرورق کہانیوں کے عین مطابق تھا دستک میں سر نے درست کہا اللہ پاک صحت عطا فرمائے آمین خطوط کے رنگ دیکھ کر دل خوش ہو مطلب یہ کے مکھیو خوش ہوا خیر پہلی پوزیشن پر شہزاد خان بھائی بہترین خط کے ساتھ براجمان تھے عالی امان عانی شکریہ آپکی محبت ہے یسین صدیق بھائی کبھی یاد کر لیا کریں خاکسار کو بھی۔ تسلیم شیخ بہنا دستگیر شہزاد اور رباب فاطمہ بہنا کے خط بھی اچھے تھے اچھے بچوں کی طرح ہر دفعہ حاضری لگایا کریں خطوط میں یاد رکھنے والوں کا دلی شکریہ دعائیں۔ مجھے جن کی کہانیاں پسند آئیں انکے اسماء گرامی کھرا کھوٹا نزہت جبین ضیاء۔ ابن طالب آزار مرض۔ زرین آپا بھی ہمیشہ کی طرح منفرد تحریر لائیں زبردست دختر وطن۔ شہید وفا تسلیم شیخ بہنا نے بھی کمال لکھا ساہیوال کا نام روشن کیا۔ بنجر رحیں عمیر علی گڈ۔ موت کی وادی نفیسہ سعید زبردست۔ دوراہا نسیم سکینہ صدف اچھی تحریر تھی سلسلے وار ناولز بساط گرد وجود حیات اچھے جا رہے ہیں باقی سلسلے بھی اپنی مثال آپ تھے اللہ پاک رونق لگائی رکھے آمین دلی دعائیں اجازت باشرط زندگی اگلے ماہ خاکسار حاضر ہوگا خدا حافظ۔

عروشمہ خان بہاول پور:۔ نئے افق رائٹرز ریڈرز کو عروشمہ خان کی طرف سے اسلام علیکم۔ ویسے تو میں بہت پرانی قاری ہوں نئے افق کی مگر خط پہلی بار لکھ رہی ہوں آج کے دور میں نئے افق معیاری ڈائجسٹ ہے سب سے پہلے سیگمنٹ دستک پڑھا سر مشتاق احمد قریشی صاحب ٹھیک کہا آپ نے اللہ پاک ہمارے حکمرانوں کو عقل دے اور پاکستان پر اپنا کرم کرے آمین اسکے بعد کہانیوں کی طرف آتے ہیں پیاری نفیسہ سعید آپی کی کہانی موت کی وادی پڑھی اپنوں کا اس طرح دکھ کے وقت آنکھیں پھیر لینا بھی بڑے دکھ اور اذیت کی بات ہے سچ کہتے اپنے بس وہی جو مصیبت میں کام آئیں۔ عمیر علی کی بنجر رحیں بھی اچھی کہانی تھی۔ ابن طالب کی آزار مرض اور آپا نزہت جبیں ضیا کی کہانی کھرا کھوٹا زبردست تھیں وحید سلطان کی سلسلے وار کہانی بساط گرنا قابل فراموش کہانی ہے امید ہے آگے چل کے مزید بہتر ہو جائے گی وجود حیات سر عرفان راے کی سلسلے وار کہانی بھی بہترین جا رہی دختر وطن زرین قمر اور شہید وطن تسلیم شیخ کی کہانیاں عمدہ تھیں باقی سلسلے بھی بہت اچھے ہیں بہت کچھ سیکھنے اور پڑھنے کو ملتا خطوں میں رباب فاطمہ ابن طالب تسلیم شیخ کے خط اچھے تھے اب اجازت چاہتی ہوں خدا حافظ۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

شہزاد خان ۔۔۔ صادق آباد:۔ مکرمی ومحترمی عمران احمد صاحب، السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ گلہائے عقیدت۔ مئی، جون، جولائی 2020 کا مشترکہ شمارہ ملا۔ ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ اس بات کی بہت خوشی ہوئی کہ اللہ پاک کے فضل وکرم سے لاک ڈاؤن کی وجہ سے رسالہ کی اشاعت دوبارہ شروع ہو چکی ہے۔ اس بات کا بہت اچھی طرح اندازہ ہے کہ گزشتہ مہینوں میں رسالہ کی بندش کی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہو چکے جن سے ادارہ سے وابستہ تمام سٹاف اور انتظامیہ یقیناً بہت متاثر ہوئی ہوگی۔ دعا ہے اللہ پاک آئندہ کے لئے آسانیاں پیدا فرمائے۔ آمین۔ اب چلتے ہیں موجودہ مشترکہ رسالے کی جانب۔ اس میں ایک درجن خوبصورت کہانیوں کے جھرمٹ میں اپنی کہانی شیطان مکڑی کو پا کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کے لئے آپ سمیت ادارہ نئے افق کا شکریہ۔ ہمیشہ کی طرح ہمارے دلوں پر دی جانے والی دستک محترم مشتاق احمد قریشی صاحب کی چھائی رہی۔ ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتے ہیں جب خوبصورت نفاظ ہمیں اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔ حکومت وقت اور اس کو چلانے والے سرکاری کارندے اور ان کے سیاہ کارناموں کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔ دستک میں لکھی گئی تمام گہری باتوں کو سمندر کے پانی کو ایک کوزے میں سمیٹ دینے والی بات ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موصوف ایک انتہائی جہاندیدہ شخصیت کے مالک ہیں۔ محترم عمران احمد صاحب کی گفتگو کے بارے میں کچھ نہ کہنا ناانصافی ہوگی۔ محترم پر ایک بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ملک بھر سے موصول ہونے والے خطوط کو پڑھ کر ان کا انتخاب کرنا ایک بہت بڑا دردِ سر ہے۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب وہ علم کے سمندر میں ڈبکی لگا کر سطح پر ابھرتے ہیں تو ان کے ہاتھوں میں بہت قیمتی موتی ہوتے ہیں جن کی رونمائی وہ اپنی گفتگو میں کر کے قارئین کو انہیں دیکھنے کا شرف بخشتے ہیں۔ اللہ پاک انہیں اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ آمین۔ تمام خطوط لکھنے والے میرے لئے انتہائی قابلِ احترام ہیں۔ ان کے لکھے گئے قیمتی الفاظوں کے موتی رسالے کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ محترمہ رباب فاطمہ صاحبہ، عالی مان آفاقی صاحب، یٰسین صدیق صاحب، اللہ رکھا چوہدری صاحب، ظہیر ملک صاحب، محسن علی طاب صاحب، تسلیم شیخ صاحبہ ساہیوال، ابن طالب اور دستگیر شہزاد صاحبان ان سب کے تبصرے بہترین اور خوبصورتی سے لکھے گئے تھے۔ میری طرف سے انہیں ڈھیروں مبارکباد قبول ہو اقراء کے متعلق کیا کہیں؟ اس میں لکھی گئی تمام باتیں قرآن وسنت کی روشنی میں تحریر ہوتی ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہو کر انسان اپنی آخرت سنوار سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن تمام مسلمانوں کے لئے ایک ایسا پیپر ہے جو امتحان سے پہلے آؤٹ ہو گیا ہے۔ اب اس سے صرف سمجھدار لوگ ہی فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انسان خسارے میں ہے اور یہ ہماری بدقسمتی ہی کہلائے گی۔ اللہ معاف فرمائے۔ پہلی کہانی دخترِ وطن زرین قمر کی لکھی گئی ایک بہترین کاوش ہے۔ جو ایک فلمی یونٹ کے گرد گھومتی ہے۔ جس کی کہانی ایک کینیڈین آرمڈ فورسز کے ایک فوجی کے متعلق تھی۔ جو افغانستان میں ایک مشن کے لئے جاتا ہے اور وہاں اسے کن حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا تفصیل سے احاطہ کیا گیا۔ پہلا حصہ شاندار ہے امید ہے دوسرا حصہ بھی اسی کی طرح بہترین ثابت ہوگا۔ دوسری کہانی شیطان مکڑی کے متعلق دوستوں کی آراء کا انتظار رہے گا۔ عثمان عبداللہ کی قاتل حسینہ لالچ کے پس منظر میں لکھی جانے والی ایک اچھی تحریر تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پیسہ انسان سے بہت سے کام کراتا ہے کسی کا قتل بھی اور کسی کی غلامی بھی۔ عرفان راما کی وجودِ حیات کی تیسری قسط بھی اچھی رہی ان کے قلم میں جادو ہے۔ معاشرتی برائیوں کے متعلق اور خوبصورت چہروں اور رشتوں کے پیچھے چھپے بھیڑیوں کی عکاسی کرتی لگی۔ موضوع کے اعتبار سے بہت اچھی کاوش تھی۔ میری طرف سے انہیں مبارکباد قبول ہو۔ نفیسہ سعید کی موت کی وادی کرونا وائرس کے پس منظر میں لکھی گئی ایک فکر انگیز تحریر تھی۔ موضوع کے لحاظ سے فٹ تھی۔ کرونا نے سب رشتوں کے پول کھول دیئے جو ہم سب کی آنکھیں کھولنے کے لئے ایک سبق ہے۔ نزہت جبیں ضیاء کی کھرا کھوٹا ایک لالچی انسان کی زندگی کے گرد گھومتی تحریر جس نے اپنی خصلت اور لالچ کی اندھی آگ میں دو دلوں کو جھونک دیا۔ ایک اچھی تحریر تھی۔ پیسے کی لالچ نے ہر رشتہ بھلا دیا ہے۔ یہ رشتے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے پیاروں کو پیسوں کی لالچ میں موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔ بہت لمحہ فکریہ والی بات ہے۔ وحید سلطان کی بساط گھر کی چوتھی قسط بھی اچھی رہی۔ ماشاء اللہ بہت اچھا لکھتے ہیں اللہ پاک مزید زورِ قلم عطا کرے۔ آمین۔ حنا حور عین شاہد کیا کہیں۔ جاوید یوسف کی خوبصورت باتیں۔ ثانیہ خان کی الفاظ بہت اچھے تھے۔ نسیم سکینہ صدف کی دوراہا معاشرے میں رہتے ہوئے اس میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات سے چشم پوشی کرنے والوں کی کہانی ہے۔ اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ کبوتر بلی کو دیکھ کر پروں میں اپنا سر چھپا لیتا ہے کہ وہ بلی سے محفوظ ہو گیا لیکن حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ بحرحال سمجھدار لوگوں کے لئے ایک تازیانۂ عبرت ہے۔ عمیر علی کی بنجر رحمیں کچھ نا قابلِ یقین واقعات کے متعلق بیان کی گئی تحریر تھی۔ زمین پر پھیلے ان گنت اسرار سے نظریں چرانا ہمارے بس سے باہر ہے۔ زینی خان کی غزل بہت اچھی تھی۔ تسلیم شیخ کی شہیدِ وطن مختصر مگر ایک لازوال کہانی جو ہمارے فوجی بھائیوں کی خدمات کے اعزاز میں لکھی گئی اور ملک کے لئے دی ان کی قربانیوں اور خدمات کا ساحرہ رنی بہترین موضوع پر لکھی گئی تحریر تھی۔ انہی فوجی بھائیوں کی وجہ سے ہم اپنے گھروں میں چین کی نیند سوتے ہیں۔ اتنے اچھے ٹاپک پر لکھنے کے لئے رائٹر مبارکباد کی مستحق ہیں۔ ثناء اللہ خان احسن کی رازِ سربستہ جو ہمیشہ ایک منفرد موضوع پر ایک جامعہ تحقیق لے کر آتے ہیں اس بار بھی ان کا چنا گیا موضوع اچھا رہا۔ ظاہر ہے نیکی اور بدی کا ہمیشہ سے ہی ساتھ رہا اور شر اور خیر بھی لازم وملزوم ہیں جن سے نظریں نہیں چرائی جا سکتیں۔ اچھی تحریر لکھنے پر رائٹر مبارکباد کا مستحق ہے۔ عثمان عبداللہ کی ذوقِ آگہی میں تمام انتخابات بہترین تھے۔ جن میں وسیم اختر، واجد علی، شجاع جعفری، حمیرا خان، محمد نعیم، عرفان شبیر راجہ، حنا ناز، زینب فرحان، احمد عبدالی، رضوانہ خان، فاروق احمد، محمد یعقوب حماس، الیس اکبر خان، افضل راحیل۔

تسلیم شیخ ۔۔۔ ساہیوال:۔ السلام علیکم نئے افق کے پیارے پیارے دوستو! اُمید ہے آپ سب ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔ تین ماہ کے طویل انتظار کے بعد آخر نئے افق چھپ ہی گیا۔ جو لوگ ڈائجسٹ پڑھتے ہیں۔ اُن کے لیے ایک ماہ انتظار کرنا مشکل ہوتا۔ کجا کے تین ماہ انتظار کیا جائے۔ خیر شکر الحمدللہ کے ڈائجسٹ چھپ گیا۔ اللہ تعالیٰ یہ سلسلہ جاری وساری رکھے۔ آمین ثم آمین۔ سرورق بہت اچھا۔ ''دستک'' میں ''مشتاق احمد قریشی'' صاحب نے پاکستان کے حالات وواقعات پر جو نظرِ ثانی کی۔ بہت اچھا لکھا سر آپ نے۔ خان صاحب کے انڈر میں جو لوگ کام کر رہے ہیں۔ سب بہتی گنگا میں ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔ جس کے ہاتھ میں جو آتا۔ جیسے آتا۔ وہ ویسے ہی وصول کر رہا۔ ''گفتگو'' میں ''عمران احمد سر'' نے صحیح بخاری کی حدیث بیان کی۔ بے شک انسان کی اچھی نیت اور اچھے اعمال گناہ کو بخش دیتے ہیں۔ سبھی کے خطوط ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔ شہزاد خان جن کو میرا تبصرہ

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

پسند آیا۔ بہت شکریہ آپ کا۔ اس بار صدارت کی کرسی آپ نے سنبھالی ہوئی ہے۔ بہت خوب۔ رباب فاطمہ کا بہت شکریہ کہ اُن کو میرا تبصرہ پسند آیا۔ اور میری بہن کے لیے دعا کرنے کے لیے شکریہ۔ اُس کے بعد عالی مان آفاقی بھائی کا تبصرہ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ پہلی بار اُنہیں نئے اُفق کے تبصروں میں دیکھا۔ اس محفل میں خوش آمدید آپ کو۔ اور شکریہ آپ کا، میری بہن کو دعا دی۔ اللہ بیٹیوں کے بہترین نصیب کرے۔ آمین ثم آمین۔ یٰسین صدیقی صاحب کو بھی خوش آمدید۔ اللہ رکھا چوہدری کا شکریہ کہ میرا تبصرہ پسند کیا۔ ظہیر ملک، ابن طالب، دستگیر شہزاد تینوں کے تبصرے اچھے تھے۔ محسن علی طاب بھائی آپ کا بہت شکریہ تبصرہ پسند کرنے کا۔ ''اقرا'' میں ''طاہر قریشی سر'' نے القریب کی تفصیل بہترین بیان کی۔ ''زرین قمر'' کے ناول ''دخترِ وطن'' بہت دلچسپ اور ہمت والا۔ مبارکباد۔ ''عرفان رامے'' کا ناول ''وجود حیات'' اور ''وحید سلطان'' کے سلسلہ وار ناول ''بساط گر'' دلچسپ مراحل پر۔ بہت اچھے جا رہے ہے۔ کیپ اِٹ اپ۔ ''عثمان عبداللہ کا افسانہ ''قاتل حسینہ'' پڑھ کر تو میں خود قاتل ڈھونڈنے لگ گئی۔ اس کہانی کا نام چالاک حسینہ ہونا چاہیے تھا۔ ناک کے نیچے سب کر دیا۔ حق ہا۔ شہزاد خان کا افسانہ شیطان مکڑی اچھا تھا۔ لالچ کا انجام ہمیشہ برا ہی ہوتا ہے۔ پتا نہیں لوگ تھوڑے سے ہی راضی کیوں نہیں ہو جاتے۔ نفیسہ سعید کی کہانی موت کی وادی پڑھی۔۔ اچھا لکھا۔ اب تو کرونا کا نام سن سن کر ہم لوگ اُکتاہٹ کا شکار ہو گئے ہیں۔ اللہ خیر کرے ہم سب پر۔ آمین ثم آمین۔ نزہت جبیں ضیاء آپا ہمیشہ کی طرح منفرد لکھا اور بہت اچھا لکھا۔ بے شک ہمیں کھرے اور کھوٹے سکوں کی پہچان نہیں ہے۔ عورت ذات کو تو بالکل بھی نہیں ہے۔ بس عورتیں اپنا پیچھا بڑھنے پر لگی رہتی۔ اور یہ معاشرے کی تلخ حقیقت ہے۔ ثناء اللہ خان کے قلم سے راز بستہ کا سلسلہ اچھا جا رہا۔ نسیم سکینہ صدف کے قلم سے دوراہا کہانی اچھی رہی۔ مگر آخر میں آ کر عجیب دوراہے پر لا کر کھڑا کر دیا۔ اب انجام کیا ہوا یہ تو بتا دیتی بھئی۔ عمیر علی کی کہانی بنجر رحمیں نے تو ڈرا دیا۔ اچھا لکھا۔ میری کہانی شہید وطن سچ پر مبنی کہانی تھی۔ اب آپ سب کو کیسی لگی۔ یہ تو آپ لوگ ہی بتا سکتے ہیں۔ آخر میں ''آزار مرض'' مزاح میں ٹاپ بہترین تحریر۔ ذوق آگہی بہترین انتخاب۔ خوش بوئے سخن بہت اچھا۔

عالی، مان آفاقی ۔۔۔ احمد پور شرقیہ:۔ السلام علیکم، امید ہے بخیریت ہوں گے۔ نئے افق کا مشترکہ شمارہ لاک ڈاؤن کی کوفت زندگی کو تحلیل کر بیزار ہوئی پڑی طبیعت کو بشاش کرنے پہنچا تاخیر سے۔ آیا لیکن مطالعے کے لیے نئے افق کا ہی میسر آنا دل باغ و بہار کر گیا۔ نئے افق سے والہانہ عشق ہے کہ سب سے پہلے میں جس ڈائجسٹ سے متعارف ہوا، یہی میرا البیلا ماہی تھا۔ سرورق میں دلکشی واضح ہے۔ رباب فاطمہ دادا تحقیق ہے۔ گفتگو کی محفل اپنی ہے، سبھی نے خلوص سے شرکت کی۔ شہزاد خان، رباب فاطمہ، یسین صدیق، رکھا چوہدری، ظہیر ملک، محسن طاب بھائی، نعیم شیخ ان سب کے نامے نئے افق سے محبت کا ثبوت ہیں۔ میری کہانی ''ستم تقدیر'' پسند کرنے پر سب کا شکر گزار ہوں۔ خاص طور پر یسین صدیق بھائی نے کھلے لفظوں میں مجھے سراہا ہے۔۔ ان کے لیے پیغام ہے میرا کہ بھائی ہم نے ساتھ چلنا ہے اور ایک ساتھ یاد کیے جانا ہے۔ جزاک اللہ خیرا کثیرا۔ ابن طالب اور دستگیر شہزاد جیسے سینئر رائٹرز کی گفتگو میں شرکت ان کے بڑے پن کا ثبوت ہے۔ ناچیز کی تحریر کو سراہنے کے لیے میں دونوں کا بے حد متشکر ہوں۔ دختر وطن۔ زرین قمر کی کہانی کا انتظار رہا تھا۔ بے شک وہ شاہکار لاتی ہیں۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ان کی کہانی کا موضوع حب الوطنی ہے اور مرکزی کردار عورت۔ زرین قمر کا خاصہ رہے کہ وہ صنف کی حیثیت سے پرے صرف جذبہ لکھتی ہیں۔ ان کی کہانی کا کردار مرد ہو چاہے عورت، ہمیشہ بہادر اور محب وطن ہی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو لکھنے کے اس خاص مقصد میں تا آخرش کامیاب رکھے آمین۔ شیطان مکڑی۔ شہزاد خان متاثر کن ہے۔ بے شک لالچ کا انجام برا ہے۔ دولت کے حصول کے لیے اچھا بھلا انسان بھی انتہا کا ظالم بن جاتا ہے۔ تارا مسیح نے ظلم کا بازار گرم کیا لیکن انجام کار ظلم جب حد سے بڑھا تو مٹ گیا۔ تارا مسیح بھی مٹ گیا۔ بے شک ظلم ہمیشہ نہیں رہتا۔ دولت کا حصول انسان کو جہاں قاتل بناتا ہے وہاں رشتوں کی مہک اپنا اثر کھو دیتی ہے۔ اسی بات کو موضوع بنا کر عثمان عبد اللہ نے ''قاتل حسینہ'' بھی کمال لکھی۔ ویلڈن۔ وجود حیات وہ تحریر ہے جس کی وجہ سے نئے افق کا انتظار کیا جاتا ہے۔ عرفان رامے کو پہلی بار پڑھ رہا ہوں۔ ان کے سحر کی قید سے رہائی دل چاہتا ہی نہیں۔ وجود حیات اور بساط گر دونوں بہترین جا رہی ہیں۔ وحید سلطان تیز رفتاری کے ریکارڈ قائم کرتے ہوئے کہانی کو اچھی مناسبت سے بڑھا رہے ہیں۔ بہت خوب۔ خوب۔ اس ماہ کی سب سے خاص کہانی ''موت کی وادی'' ہے۔ سطر سطر ایک مزین اسلوب سے نکھرتی ہوئی سی ہے۔ نفیسہ سعید کو ادبی حلقوں میں کافی پسند کیا جاتا ہے۔ نئے افق کو ان کا رونق بخشنا دل خوش کن ہے۔ کرونا وائرس جیسے اہم موضوع پر حقائق لکھنا یقیناً ہم جیسے بچہ لوگ رائٹرز کا کام نہیں۔ ان جیسوں کو پڑھ کر ہم لکھنا سیکھ رہے ہیں۔ کہانی بہت پسند آئی۔ با زور قلم مزید۔ ''دکھرا کھونا'' نزہت جبیں ضیاء کے قلم سے نئے افق کی زینت ہے۔ موضوع پرانا اور کہانی کہنے کی روش بھی برتی ہوئی سی ہے۔ مجموعی طور پر کہانی اچھی ہے اور یقیناً پسند کی گئی ہوگی۔ ''دوراہا'' نسیم سکینہ صدف۔ شادی کی عمر کو پہنچ جانے پر اولاد کے بارے والدین جتنا سوچتے ہیں شاید کسی اور معاملے پر اتنا سوچا جاتا ہو۔ دوراہا اولاد کی شادی کے سلسلے میں آنے والی پہلی سوچ کی کہانی ہے۔ سب سے پہلے خاندان ہی دیکھا بھالا جاتا ہے۔ باقی آسائشات بعد کی باتیں ہیں۔ رضی کے خاندان کو لے کر راوی کی فکر بجا ہے۔ اتنی اچھی کہانی لکھنے پر نسیم سکینہ صدف مبارکباد کی مستحق ہیں۔ ''بنجر روحیں'' عمیر علی کو پہلی بار پڑھا۔ بے شک ان کا لکھا پڑھے جانے کے لائق ہے۔ کہانی نے خود کو محسوس کروایا ہے۔ اپنے کرداروں کے ساتھ بہا کر لے جانے والی کہانی لکھنے پر عمیر علی کو سلام۔ بے شک محبت کے کتنے رنگ ہیں، شمار ممکن نہیں۔ محبت میں ناکامی کی خلش بسا اوقات دنیا سے ناتا کٹ جانے پر بھی سکون سے رہنے نہیں دیتی۔ ''شہید وطن''، تسلیم شیخ! کیپ اٹ اپ۔ آہستہ آہستہ آپ بہتری کی طرف آ رہی ہیں۔ ماشاء اللہ، کیپٹن عثمان جیسے کردار قابل عزت ہیں۔ اس لحاظ سے ان کو احاطہ تحریر میں لانے والوں کا بھی دل میں مقام ہے۔ سلامتی ہو سدا ابن طالب خاص رائٹر ہیں۔ ہیں ان کا طویل ناول ''آزار مرض'' فرصت کے لمحات میں طبیعت محظوظ کرنے کے لیے بچا رکھا ہے۔ والسلام۔ بشرط زندگی ملاقات باقی۔

آصف اکرم بھٹی ۔۔۔ بہاولپور:۔ السلام علیکم اردو ادب سے ناتا پرانا ہے۔ نئے افق عہد ماضی میں ہمیشہ ساتھ رہا ہے۔ تاہم کچھ سالوں سے قسمت اور جدوجہد کی آویزش نے زندگی کے اس راستے پر لا کھڑا کیا ہے کہ سکون نام کو بھی نہیں۔ ڈائجسٹ پڑھنے جیسی سرگرمیاں سب خواب و خیال ہو گئیں۔ ایک اچھے دوست کے توسط سے، اس بار کا نئے افق مجھے ملا تو اپنے محبوب رسالے پر سے نظریں ہٹانا دشوار ہو گیا۔ لوح کا وہی انداز مجھے سکول کے زمانے میں لے گیا جب سکول کے بستے میں دیگر کتب کے ساتھ نئے افق بھی ہوتا تھا۔ اوپری درشن میں سب کچھ ویسے کا ویسا ہی ہے تاہم سرورق میں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

تبدیلی ہے جوکہ اچھی ہے۔ منفرد سرورق دینا نئے افق کا ہمیشہ سے مزاج رہا ہے۔ سرورق اٹریکٹو ہے ماشاءاللہ۔ گفتگو کی محفل میں سبھی نام نئے ہیں۔ یسین صدیق جانے پہچانے ہیں۔ عالی مان آفاقی تو پیارا بھائی ہے۔ جان سے پیارا دوست ہے۔ نئے افق میں شمولیت پر بے حد مبارک باد۔ شہزاد خان، رباب فاطمہ، اللہ رکھا چوہدری، ظہیر ملک، محسن علی طاب، طاب تسلیم شیخ، ابن طالب، دستگیر شہزاد سب نے بہت عمدہ تبصرے کیے۔ ''دختر وطن'' کا مطالعہ کیا، جیسے معروف مصنفہ زریں قمر احاطہ تحریر میں لا رہی ہیں۔ ایک نڈر قوم کے حالات ایمانداری سے رقم کرنا بے شک ایک بڑا کام ہے، جوکہ زریں قمر جیسے رائٹر ہی سرانجام دے سکتے ہیں۔ جذبہ جہاد کو اجاگر کرتی اس تحریر نے آخر تک دلچسپی قائم کیے رکھی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ شیطان مکڑی شہزاد خان نے بہت اچھی کہانی لکھی۔ خوف و دہشت سے لبریز متوقع انجام لیے ایک ناقابل فراموش کہانی۔ بہت خوب۔ قاتل حسینہ عثمان عبداللہ۔ ان کی پہلے بھی کچھ کہانیاں پڑھی ہیں۔ بہت اچھا اور منبت لکھتے ہیں۔ دولت کے آزار کے گرد گھومتی ایک تلخ کہانی ''قاتل حسینہ'' بہت پسند آئی۔ ''موت کی وادی'' شاہکار ہے۔ نفیسہ سعید مختلف ادوار میں میری پسندیدہ رائٹر رہی ہیں۔ موجودہ حالات کے پس منظر میں صفحہ قرطاس پر اتری ان کی لازوال تحریر ہمیشہ کی طرح کمال ہے۔ ماشاءاللہ۔ کھرا کھوٹا نزہت جبین ضیاء معذرت کے ساتھ پسند نہیں آئی۔ دوراہا نسیم سکینہ صدف نے لکھی۔ ایسی کہانیاں بھی وقتاً فوقتاً لکھی جاتی رہی ہیں۔ تاہم کہانی کہنے کا انداز دلچسپ ہے جس کی وجہ سے یہ کہانی مزین و کمال بنی ہوئی ہے۔ دلنشین بنت لیے فن اسلوب کی حامل ''بنجر روحیں'' عمیر علی کی نئے انداز کی کہانی ہے۔ پڑھ کر بہت زیادہ احتظاظ حاصل ہوا۔ بازور قلم مزید۔ شہید وطن بہت اچھی کہانی ہے۔ جس کے مطالعے سے وطن کے محافظوں کی عظمت دل میں سوا ہوگئی ہے۔ کیپٹن عثمان جیسے جوانوں کو میرا سلام۔ تسلیم شیخ مستقل اگر لکھنا چاہیں تو ان کے پاس صلاحیت ہے۔ شہید وطن کے مطالعہ سے ظاہر ہوا کہ ان کا سفر نیا نیا ہے۔ رب سوہنا کامیاب کرے۔ ادارے کی مزید ترقی کے لیے دعاگو۔ والسلام

اللہ رکھا چوہدری ہارون آباد: لیجیے جناب آپ کا غلام رکھا چوہدری، بوتل کے جن کی طرح آپ سب کی خدمت میں حاضر ہے اپنے تبصرے کے ساتھ۔ مجھے کام بتائیں میں کیا کروں؟ میں کس کو اچھا کہوں کس کو برا کہوں۔ یہاں تو سارے ہی نئے افق کے جگمگاتے ستارے ہیں جن کی چکا چوند روشنی دیکھ ہم ڈوب جاتے ہیں۔ چلیے جی ہم بھی اپنی ادنیٰ سی کوشش پیش کیے دیتے ہیں اس تبصرے کے ساتھ جس کا حصہ بننے پہ میں ماہنامہ نئے افق کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔ کہاں نئے افق پہ نیا جہاں اور کہاں میں نامعلوم سا گم نام۔ جناب عالی بہت شکریہ۔ بندہ تبصرے کی اجازت چاہتا ہے۔ ناسمجھ، نادان سمجھتے ہوئے کہا سنا معاف کیجیے گا اور مزید بہتری کے لیے اصلاح کا طلب گار ہوں۔ جی جناب تو سب سے پہلے تمام نئے افق اسٹاف اور قارئین کو دل کی گہرائیوں سے پرخلوص السلام علیکم تین ماہ انتظار کر کر کے آخر 26 جون کو مئی، جون اور جولائی کا مشترکہ شمارا ملا۔ اتنی خوشی ہوئی کے بیان سے باہر ہے۔ ویسے لاک ڈاون میں بہت سے رسالے اور کتابیں پڑھی لیکن، جو مزا نئے افق، آنچل اور حجاب میں ہے، کسی میں نہیں۔ پورے دو ماہ نئے افق کے پرانے شمارے پڑھتا رہا، کیوں کے کافی جمع تھے۔ اس بار فہرست دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کیوں کے جس ناول کا چار ماہ سے انتظار تھا اس کی پہلی قسط ماشااللہ زریں قمر بہنا کی ہر سٹوری بہت ہی عمدہ ہوتی ہے بہت سے ناول اور افسانے پڑھے ہیں۔ دستک میں اس دفعہ کام کافی گرم تھا لیکن مجھے یہ لائنیں بہت زیادہ پسند آئیں۔ کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اسے مرنا نہیں ہے۔ اسے اپنے اعمال و اقوال کا حساب کسی کو دینا ہی نہیں ہے مرنے کے بعد مٹی میں دفن ہونا ہے اور مٹی ہو جانا ہے۔ اس میں بہت ہی گہرائی ہے اور جب وہاں جا کے سوچا تو رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ بے شک سر جی آپ کی ہر بات سے متفق ہوں زبردست۔ جی تو اب بات کروں ٹائٹل کی تو رباب فاطمہ آپی بہت ہی جاندار ٹائٹل دیکھنے کو ملتا ہے ہر ماہ مگر اس بار تو بہت ہی زیادہ عمدہ ٹائٹل تھا بہت سی داد۔ گفتگو میں عمران احمد صاحب نے خوب رونق لگائی، سلسلہ کا آغاز حدیث شریف سے کیا گیا سبحان اللہ۔ ماشاءاللہ جزاک اللہ۔ خطوط میں سب سے پہلے جناب شہزاد خان صاحب کرسی صدارت پر براجمان ہوئے۔ بہت بہت مبارک ہو پیارے۔ دوسرا خط رباب فاطمہ بہنا کا تھا کیا خوب لکھا۔ پیاری بہنا، امی کی بات مانیں اور ساتھ ساتھ کام بھی کرتی رہیں، بے شک محنت میں عظمت ہے۔ عالی مان آفاقی بھائی پہلے تو سٹوری شائع ہونے پر بہت بہت مبارک آپ نے بہت عمدہ تبصرہ کیا ہر ماہ کیا کریں۔ ماشاءاللہ میرے استاد محترم یاسین صدیق صاحب کا تبصرہ دیکھ کر دلی خوشی ہوئی اور پھر جو تبصرے کے شروع میں لکھا بہت ہی بہترین لکھا، جزاک اللہ۔ ظہیر ملک بھائی خوش آمدید ہمیشہ خوش رہو۔ اب ہر ماہ تبصرہ کرتے رہنا آپ کا تفصیلی تبصرہ بہت پسند آیا۔ اللہ آپ کو صحت دے۔ محسن علی طالب باکمال تبصرہ۔ تسلیم شیخ آپی آپ نے تو کمال ہی کر دیا زبردست تبصرہ۔ ابن طالب اور دستگیر شہزاد دونوں نے بہت خوب تبصرے کیے۔ اقراء میں، طاہر قریشی صاحب نے قریب کا مفہوم بیان کیا جزاک اللہ۔ دختر وطن زریں قمر بہنا جی تو میری پسندیدہ رائٹر ہیں، ہر تحریر ایسی لکھتی ہیں جیسے موتی پروئے ہوں، دیکھتے ہیں آگے آگے ہوتا ہے کیا۔ شیطان مکڑی شہزاد خان جناب کمال کر دیا کہانی نے شروع سے آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا اور تارا مسیح اف اللہ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو خود کے لیے سکون تلاش کرتے ہوئے دوسرے لوگوں کو تنگ کرتے ہیں۔ ویسے جو شخص اپنی ماں کو ذبح کرسکتا ہے وہ کچھ بھی کرسکتا ہے اختتام قابل ستائش کیا، ایسے لوگوں کو ایسی سزا ہی ملتی ہے لیکن یہ تارا مسیح کے لیے کم تھی۔ قاتل حسینہ عثمان عبداللہ نے دولت کے دلدل میں پھنسے لوگوں کی عکاسی کی ہے زبردست ویل ڈن پیارے۔ وجود حیات عرفان رامے کے لیے دونوں ہاتھوں سے تالیاں دوسری قسط کی طرح یہ قسط بھی کمال تھی۔ ویسے ایک مشورہ ہے کے پلیز گزشتہ قسط کا خلاصہ لکھا کریں وہ پڑھنے سے جو بھولا ہوا ہوتا ہے یاد آ جاتا ہے شاد رہیے آباد رہیں۔ کھرا کھوٹا نزہت جبیں ضیاء ایک ایسی کہانی لکھی جس نے آنکھیں کھول کر رکھ دی کہیں بار ایسا ہوتا ہے کے ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کے ہمارے لیئے کون فائدہ مند ہے اور کون نقصان دہ۔ اس دنیا میں کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے بھائی بہن کا دشمن صرف دولت کے لیے اللہ ایسے بھائی کسی کو نہ دے۔ اس کہانی کے اصل ہیرو عبدل تھے جس نے آخر میں وہ کر دیکھایا جو آج تک کسی نے کسی کے لیے نہیں کیا ہوگا۔ بساط گر وحید سلطان پچھلی قسط کی طرح یہ قسط بھی زبردست رہی کہانی بہت ہی عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ دوراہا نسیم سکینہ صدف بہت بہت مبارک ہو۔ کہانی شروع سے بہت شاندار رہی اور پھر آخر پر سوال، نے مجھے پریشان کر دیا لیکن یہ بھی سچ ہے کے ہر ایک کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا یہ ضروری نہیں کے جو رضی کے شوہر نے اس کے ساتھ کیا وہی اس کی بیٹی کے، ساتھ ہو، میں یہ ہی کہوں گا کے رشتہ کر لیں، کیوں کے بیٹیاں تو اپنے نصیب اللہ سے لکھوا کر لاتی ہیں۔ اللہ پاک سب کی بہنوں، بیٹیوں اور ماؤں کے نیک نصیب کرے آمین۔ بنجر روحیں عمیر علی بہت بہت مبارک ہو کہانی کی اشاعت پر مجھے یہ جملہ بہت اچھا لگا یہ دنیا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ایک ایسا راز ہے جسے آج تک کوئی بھی جان نہیں سکا باقی کہانی بہت ہی عمدہ آپ کی تحریر نے ایک سبق دیا ہے اور وہ ہے نماز اللہ پاک کا راستہ ہے ہم جب مشکل میں ہوتے ہیں تو پکارتے ہیں اور وہ ہماری ہر پکار سنتا ہے اور ہر بار ہماری غلطی معاف کر دیتا ہے لیکن پھر سے ہم دوبارہ شروع ہو جاتے ہیں اور گناہوں کے دلدل میں دھنس جاتے ہیں۔ اللہ پاک آپ کو اس کا اجر دے اور ایسی اصلاحی تحریریں لکھتے رہو۔ شہید وطن تسلیم شیخ بہنا جی سب سے پہلے تو کہانی کی اشاعت پر بہت بہت مبارک ہو۔ شروع سے بہت ہی عمدہ میں تو سمجھا کے عثمان اب فوج میں نہیں جائے گا لیکن کیا کرے ہائے یہ محبت بھی نہ کیا کیا کرا دیتی ہے طیبہ جب عثمان کے کمرے میں آئی تو میں سمجھ گیا کے طیبہ کو دادا جان نے سمجھانے بھیجا ہو گا اور پھر ایسا ہی ہوا وہ عثمان کے کمرے سے ہو کر جب دادا جان کے پاس جا کر رو رہی تھی تو صاف سمجھ آ گئی کے وہ دادا کے مجبور کرنے پر عثمان کو کہنے گئی تھی۔ آخری پہرے کا یہ جملہ بہت زبردست تھا۔ یادیں کانچ کی طرح ہوتی ہیں جنہیں جب یاد کیا جائے تو دل زخمی ہو جاتا ہے۔ آپ نے کمال کر دیا اس زبردست تحریر پر میری طرف سے بہت سی داد قبول کیجیے اور لکھتی رہیں۔ خوش رہیں۔ راز سربستہ ثناء اللہ خان احسن یار کمال کر دیا بہت ہی معلوماتی تحریر پچھلے ماہ بھی زبردست لیکن اس ماہ تو جناب نے کمال ہی کر دیا میں پڑھتا گیا اور ساتھ حیران بھی ہو رہا تھا۔ اچھا ویسے آم کے چھلکوں والا کام میں ضرور کروں گا مجھے بابا جی بننے کا بہت شوق ہے۔ میں ضرور کروں گا یہ نیک کام۔ لیموں کے فائدے پڑھ کر حیران ہو گیا۔ آپ کی تحریر پڑھ کر دل خوشی سے گارڈن گارڈن ہو گیا ہر ماہ لکھا کریں۔ جزاک اللہ۔ میرا پسندیدہ سلسلہ ذوق آگہی سب نے بہت عمدہ اور زبردست لکھا کسی ایک کا نام لیا تو باقی سب کے منہ لٹک جائیں گے (ہاہاہاہاہاہا) ہر ایک اپنی جگہ ٹھیک تھا۔ خوشبوئے سخن میں نوشین اقبال نوشی بہنا نے بھی بہت عمدگی سے سب کے انتخاب سجائے ہوئے تھے دس غزلیں اور نظمیں سب بہت عمدہ تھی سب کے لیے بہت بہت داد۔ آخری صفحات پر ابن طالب کا پورا ناول آزاد مرض شامل اشاعت تھا۔ ابھی تک آدھا پڑھا ہے کیوں کے تبصرہ بھی تو کرنا تھا اس لیے جتنا پڑھا ہے بہت عمدہ ہے کہیں بھی جھول نظر نہیں آ رہی پیارے بہت بہت مبارک ہو مکمل ناول ایک ساتھ شائع ہونے پر۔ میری دعا ہے کے اللہ تعالیٰ سب لکھاریوں کے زور قلم اور زیادہ میں جلا بخش دیے آمین ثم آمین اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتا ہوں اللہ حافظ۔ اللہ تمام لکھنے والوں کے قلم کو مزید جلا بخشے پڑھنے والوں کو صبر و استقامت و استقلال بخشے اور ہم سب کا حامی و نگہبان رہے آمین ثم آمین یارب العالمین آپ سب کا مہمان نواز اللہ رکھا چوہدری آج کی نشست سے اجازت چاہتا ہے فی امان اللہ۔

محمد یاسین صدیق ... ماہنامہ نئے افق نے ہمیشہ سے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ آج جو بڑے لکھاری ہیں ان کی ابتدا بھی ماہنامہ نئے افق سے ہوئی تھی۔ ماہنامہ نئے افق نے اردو ادب کو درجنوں ادیب دیے ہیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ماہنامہ نئے افق کا انداز سادہ ہے اپنے اندر سچائی و سادگی کو سموئے ہوئے ہے۔ اس میں لکھنے والے ہمارے معاشرے کے ایسے فرد ہیں جن کا مطالعہ وسیع ہے اور لکھنے کا فن جانتے ہیں۔ دختر وطن محترمہ زرین قمر صاحبہ کا شہکار ناول کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے اس کی طوالت دیکھنے کے جب ورق پلٹے تو علم ہوا کہ یہ قسط وار کہانی ہے سوچا اس کا مطالعہ اگلے شمارے آنے کے بعد کریں گے۔ تاکہ دو اقساط کا لطف ایک ساتھ اٹھا سکیں۔ اس فیصلے کے باوجود کہیں کہیں سے کہانی کا مطالعہ کیا تاکہ موضوع کا علم ہو سکے۔ اپنے وطن سے دور وطن کی محبت میں سرشار ایک دوشیزہ کی کہانی۔ جس میں عالمی سازشوں کے جال اور چند سر پھرے سرفروشوں کا سچا احوال ہے۔ شیطان مکڑی محترم جناب شہزاد خان کی لکھی کہانی ہے جو ایک تارا اسیح نامی فرد کے گرد گھومتی ہے جو دولت کے حصول کے لیے انسانیت کی حد پار کر گیا تھا۔ حتیٰ کہ اپنی ماں کو قتل کر دیا۔ لیکن اس کہانی نے متاثر نہیں کیا۔ خاص کر انجام نے تو کہانی کا سارا حسن غرق کر دیا۔ ایسے ظالم کو اتنی آسان موت نہیں ملنا چاہیے تھی۔ لکھاری کو چاہیے قاری کا بھی خیال رکھے۔ ایسے شقی القلب انسان کا انجام ذرا بے دردی سے لکھا کریں۔ ایسی ہی کہانی یعنی دولت کے حصول کے لیے اندھے ہو جانے والے کرداروں پر مشتمل جناب عثمان عبداللہ نے قاتل حسینہ کے نام سے لکھی۔ اس کہانی میں چند واقعات کا کوئی سر پیر ہی نہیں ہے۔ ایک اخباری رپورٹر کی آپ بیتی ہے لیکن ضرورت سے زیادہ اسے باخبر، بہادر، خوامخواہ کا عاشق دکھایا گیا ہے۔ انجام اس کا بھی توقع کے عین مطابق ہوا۔ بہرحال انہوں نے اپنی طرف سے کوشش کی میرا مشورہ ہے کہ ہر واقعہ کی وجہ ہوتی ہے جسے لازمی لکھنا چاہیے۔ کھرا کھوٹا محترمہ نزہت نسبیں ضیا صاحبہ کی ہے۔ نئے انداز میں لکھی کہانی کا مرکزی خیال بھی دولت کے حصول کے لیے رشتوں کا خون کرنے والے معاشرے کے بھیانک کردار ہی ہیں۔ بھائی کا اپنی ہی بہن کا دشمن بن جانا دولت کے لیے۔ کہانیوں میں ہر ظالم کو سزا لازمی ملتی ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا کم ہوتا ہے۔ اس بار ماہنامہ نئے افق میں سب سے زیادہ کہانیاں دولت کے حصول کے گرد گھومتی نظر آتی ہیں۔ ان کہانیوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ مجرم کو سزا ملتی ہے۔ مکافات کا پہیہ گھومتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ شاید اس کی نفسیاتی وجہ یہ ہی ہو کہ ہم ظالم کا انجام دیکھنا چاہتے ہیں۔ جو ہمیں کہانیوں میں دکھایا جاتا ہے۔ نسیم سکینہ صدف صاحبہ نے دوراہا نام کی منفرد کہانی لکھی ہے۔ ہمارے معاشرے کے زندہ کرداروں پر مشتمل کہانی۔ معاشرے میں زندہ انسانوں کے ساتھ گزرنے والے المیوں اور ان المیوں کے نتیجے میں بدلتے احساسات و جذبات کی کہانی بہت اچھی لگی۔ موت کی وادی محترمہ نفیسہ سعید صاحبہ کی موجودہ حالات کی عکاس کہانی ہے۔ کورونا نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ مجھے اس کہانی نے بہت متاثر کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کہانی حقیقت کے قریب ترین ہے مثبت اور سبق آموز ہے۔ ذوق آگہی میں شامل اقتباسات و اقوال کو ماہنامہ کے صفحات پر شائع ہونا چاہیے جیسے کتر نیں شائع ہو رہی ہیں اور اس جگہ ہر ماہ کوئی موضوع دے کر مختصر کہانیاں لکھوانی چاہیے۔ اسے یک صفی کہانی کہا جانا چاہیے۔ ہر ماہ دس یا پانچ کہانیاں یعنی دس یا پانچ صفحات۔ جیسے پہلے فن پارے شروع کیا گیا تھا۔ یہ کہانیاں پہلے کہیں شائع نہ ہوئی ہوں۔ ایک مخصوص موضوع پر مشتمل ہوں۔ موضوع ادارے کی طرف سے دیا جائے۔ خوشبوئے سخن نوشین اقبال نوشی صاحبہ کا ترتیب دیا ہوا سلسلہ اس بارے عرض ہے کہ اگر صرف ذاتی شاعری ہی بعد از اصلاح شائع کی جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ اس سے زیادہ دلچسپ اور بامعنی سلسلہ ہو جائے گا۔ تمام انتخاب بہت مناسب تھے۔ اس پر محترمہ نوشین اقبال داد کی مستحق ہیں کہ انتخاب خوب سے خوب تر تھے۔ مجموعی طور پر اس ماہ کا شمارہ بہترین تھا۔ کوئی کہانی دولت کے گرد گھومتی ہے، کوئی ناانصافی کے کوئی ظلم کے ہر کہانی ہماری اپنی کہانی ہے۔ ہمارے دکھوں کی تصویر ہے۔ ہمارے زخموں کا آئینہ ہے۔ کوئی کہانی رشتوں کے بننے کی ہے کچھ رشتوں کے بکھرنے کی ہیں۔ کچھ وفا کی چند جفا کی کہانیاں ہیں۔ تکلیف دہ کہانیاں زندگی کے فلسفے کو اس کی حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔ ان کہانیوں میں اکثر ہمارے معاشرے کی عکاس کہانیاں

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

ہیں۔ باقی کہانیوں کا ابھی مطالعہ نہیں کیا اس بار خاصے کی چیز ہے محترم جناب ابن طالب کا مکمل ناول آزار طلب لیکن اس کا مطالعہ نہیں کیا۔ وجود حیات اور بساط گر کا بھی مطالعہ بقایا ہے۔ ان شا اللہ قسط وار تینوں کہانیوں پر بھرپور تبصرہ آئیندہ ماہ کرنے کی کوشش کروں گا۔

ظہیر ملک ۔۔۔ ہارون آباد:۔ شروع کرتا ہوں اللہ تعالی پاک نام سے جو بڑا مہربان نہایت فرمانے والا ہے۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ پیارے نئے افق کے قارئین کرام اور لکھاری امید واثق ہے آپ رب کریم کے فضل سے بخیر و عافیت ہونگے۔ دعا ہے کہ آپ سب کو اللہ تعالی صحت وتندرستی عطا فرمائے اور خوش باش رہیں۔ اس دفعہ تو نئے افق میں میرا ایک خواب پورا ہوا جس میں میرا تبصرہ لگا جس کے لیئے میں اس پیارے سے ڈائجسٹ کے مدیر اور تمام ٹیم کا بہت شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس قابل سمجھا دستک میں سر مشتاق احمد قریشی صاحب کو پڑھا جو ہمارے ملک کی سیاسی خستہ حالی پر اچھے سے نظر ڈال رہے ہیں ہر کوئی اپنے مفاد کے لیئے ہی بھاگ رہا ہے کسی کے لیئے ملک کی سلامتی ضروری نہیں ہے سچ کہا سر جی اس ملک کی بھاگ دوڑ اگر ہمارے اپنے کسی حکمران کے پاس ہوتی تو ایسا کبھی نہ ہوتا جو آج ملک کی صورت حال ہے یہ غیر ملکی غاصبوں کے اشاروں پہ ناچنے والے حکمران ہیں انہوں نے کیا تبدیلی لانی تبدیلی وہی لائے گا جس کے سینے میں عوام کا درد اور ملک کیلیئے محبت ہوگی بقایا اللہ تعالی ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے آمین گفتگو میں پیارے سر عمران احمد نے شروعات کی ایک پیاری سی حدیث مبارکہ سے ماشاءاللہ بہت خوبصورت حدیث مبارکہ اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ وعلیکم السلام سر بلکل بجا فرمایا آپ نے یہ ہمارے ہی گناہ ہیں جو ہم پر اللہ تعالی کی ناراضگی کی صورت میں ہم پر کرونا وباء مسلط ہوگی ہے ہمیں اللہ تعالی سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں تاکہ ہم سے یہ عذاب ٹل سکے اللہ تعالی ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے۔ گفتگو میں تمام پیارے معزز ین جن میں شہزاد خان صاحب بہت ہی عمدہ تبصرہ ماشاءاللہ پیاری بہن رباب فاطمہ بہت ہی پیاری باتیں لکھتی ہیں ماشاء اللہ اللہ تعالی ہماری بہن کو سلامت رکھے۔ محترم عادل مان آفاقی کا تبصرہ تو نہ پوچھیں دریا کو کوزے میں بند کردیا سر بہت ہی کمال تبصرہ سلامت رہیں۔ محترم سر یسین صدیق صاحب کا تبصرہ بہت ہی عمدہ اور لاجواب تھا خوشی ہوئی پڑھ کہ سلامت رہیں۔ اللہ رکھا چوہدری پیارے بھیا نئے افق کے لیئے آپ کی محبت قابل ستائش ہے یونہی کرتے رہیں تبصرے ان شاءاللہ ضرور کامیابی ہوگی بہت ہی عمدہ تبصرہ سلامت رہیں۔ محسن علی طاب صاحب بہت ہی عمدہ تبصرہ خوشی ہوئی پڑھ کہ سلامت رہیں۔ محترمہ تسلیم شیخ کیا بات ہے مزہ آگیا آپ کا تبصرہ پڑھ کہ عمدہ تبصرہ سلامتی کی دعائیں جزاک اللہ۔ ابن طالب صاحب بہت ہی عمدہ تبصرہ سلامت رہیں۔ دستگیر شہزاد سر بہت ہی خوبصورت مفصل اور جامع تبصرہ اللہ زور قلم کرے زیادہ سلامت رہیں کے خطوط پڑھ کہ انتہائی خوش ہوئی آپ کی روداد سے محبت قابل ستائش ہے جو بہت ہی پیارے خطوط کے ذریعے ہم تک پہنچتی ہے اللہ تعالی آپ کو مزید ترقیاں عطا فرمائیں اور بزم رونق دیونہی سجاتے رہیں۔ اب اگر اقراء کی بات نہ کی تو تبصرہ کرنے کا کیا فائدہ طاہر قریشی صاحب کمال کردیا کیا خوبصورت باتیں پڑھنے کو ملی تھیں اور جو قرآن پاک کی آیت مبارکہ شامل کی گئی سبحان اللہ اللہ ہم سب کو قرآن پاک پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ لفظ قریب کی بہت عمدہ تشریح کی ماشاء اللہ بہت ہی اچھا انداز بیاں بہت سی داد سلامت رہیں۔ زریں قمر صاحبہ کو نئے افق کی پیاری سی دنیا میں قلب صمیم کے ساتھ دل کی انتہا گہرائیوں سے خوش آمدید کہتے ہیں زریں قمر صاحبہ کی کہانی دختر وطن کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اتنی اچھی اور کمال کہانی ماشاءاللہ وطن کی محبت میں سرشار میں ایک بہت ہی پیاری بہن کی کہانی جسے بہت ہی خوبصورت انداز سے بیان کیا۔ اللہ تعالی آپ کو سلامت رکھیں اور اللہ زور قلم زیادہ عطا کرے۔ شیطان لڑکی کہانی نے تو میرے رونگٹے کھڑے کردیئے اتنی خطرناک کہانی ایک جادوگر کی کہانی جو لوگوں کو اپنے جادو سے ہراساں کرکے پیسے کمانا چاہتا تھا کچھ حد تک وہ کامیاب بھی ہوگیا تھا لیکن وہ کہتے ہیں نہ کہ ظلم کی رات جتنی بھی لمبی ہو اس کی صبح ضرور ہوتی اور اس جادوگر کا انجام کتے سے بھی برا ہوا ایسے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے بہت ہی خطرناک کہانی بہت سی داد سلامت رہیں۔ قاتل حسینہ محترم عثمان عبداللہ صاحب کی کہانی بہت ہی خوبصورت رہی لیکن روایتی کہانی ایسا پہلے بہت بار سن چکے ہیں کہ دولت اور عورت انسان کو ہمیشہ تباہ کردیتی ہے آپ کا انداز بیاں پسند آیا ڈھیروں داد سلامت رہیں۔ وجود حیات عرفان راۓ صاحب کی قسط وار کہانی تو ماشاءاللہ ہٹ جارہی ہے۔ پچھلی دو قسطیں کمال تھیں یہ بھی ان سے کم نہ تھی بہت ہی خوبصورتی کے راۓ صاحب اپنی کہانی آگے بڑھا رہے ہیں اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا بہت سی داد اس قسط کیلیئے اللہ زور قلم زیادہ کرے۔ موت کی وادی محترمہ نفیسہ سعید ایک حقیقت پہ مبنی کہانی لے کہ آئی ہیں جن کو ڈھیروں مبارکباد دیں ماشاءاللہ بہت عمدہ کہانی کرونا وائرس واقعی دنیا میں ایک وحشت کا نام بن چکا ہے اللہ تعالی ہمیں اس سے محفوظ رکھے ہمیں اپنے گناہوں کی اللہ تعالی کے حضور سجدہ ریز ہو کہ معافی مانگنی چاہیئے یقیناً یہ ہمارے ہی گناہ ہیں جن کی ہمیں سزا مل رہی اے میرے اللہ تو تو رحیم ہے تو کریم ہے ہم اپنے کیئے ہوئے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اے میرے رب اپنے حبیب کے صدقے معاف فرما آمین۔ کھرا کھوٹا محترمہ نزہت جبین ضیاء کی کہانی سبق آموز اور بہت ہی خوبصورت لکھا ہے آپ ڈھیروں داد واقعی کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جو دولت کو اپنے پیاروں پر زیادہ ترجیح دیتے ہیں لیکن انہیں یہ نہیں پتہ ہوتا کہ رشتے دلوں کے ہوتے ہیں جن میں زرا برابر بھی لالچ نہیں ہوسکتا۔ بساط گر محترم وحید سلطان صاحب بہت ہی عمدہ اور ہر دل عزیز لکھاری ہیں ماشاءاللہ ان سے ملاقات تو نہیں ہوئی لیکن ان کا انٹرویو پڑھا اور ان کے ناولز بہت ہی کمال اور خوبصورت ہیں یقیناً یہ سلسلہ وار کہانی بساط گر بہت ہی لاجواب ہے دو دوستوں کے درمیان ایک لڑکی مہرہ بنی ہوئی جو کہ ان دو دوستوں کی سازشی لڑائی کروانے کا سبب بنتی ہے۔ بہت ہی عمدگی سے کہانی اپنی منزل کی جانب رواں دواں نیک تمنائیں اور اگلی قسط کا انتظار۔ دوراہا نسیم سکینہ صدف کی کہانی میں اتنا سسپینس ذرا بھی مشکل نہیں ہوئی کہانی کو سمجھنے میں لیکن جس طرح اولاد کے لیئے ماں باپ فکرمند ہوتے ہیں وہ یقیناً بہت اہم پہلو ہے کہ جہاں ہمارے اولاد کی شادی ہو وہ جہاں رہیں خوش رہیں بلکہ حد سے زیادہ اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن ہوں۔ بنجر روحیں عمیر علی صاحب بہت ہی کمال کہانی جس میں ایک روح کی محبت دکھائی گئی جسے دنیا میں رہتے ہوئے تو سب کچھ نصیب نہ ہوا لیکن شاید مرنے کے بعد حاصل کرنا چاہتی تھی جو نہ کرسکی محبت اگر ہوجائے تو پھر اگر وہ نہ ملے تو جو دکھ اور غم انسان کو گھیر لیتا ہے وہ کبھی بھی ختم نہیں ہوتا چاہے جتنا مرضی اسے بھولنے کی کوشش کرلیں کہانی کے لیئے بہت سی داد نیک تمناؤں کا اظہار سلامت رہیں۔ ساتھ ایک غزل بھی شامل کی گئی تھی جناب نمار بارہ بنکوی صاحب کی جو بہت عمدہ اور لاجواب تھی ڈھیروں داد سر جی۔ شہید وطن محترمہ تسلیم اختر کی وطن کے جذبے میں سرشار کہانی جس کے لیئے بہت سی داد۔ پاک فوج کو سلام پیش کرتے ہیں کہ وہ خود کو خطرے میں رکھ کر ہماری دل و جان سے حفاظت کرتے ہیں ہم جتنا بھی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ان کا شکریہ ادا کریں اور شہید کا رتبہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت اعلیٰ و افضل ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ شہید کو کبھی مردہ نہ کہو کیونکہ وہ زندہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق دینے کا وعدہ ہے۔ رازِ سربستہ ثناء اللہ خان احسن سر نے تو کمال کر دیا اتنی منفرد معلومات وہ بھی طب کے حوالے سے سر بہت عمدہ کام کر رہے ہیں آپ اللہ آپ کو سلامت رکھیں خوش رہیں اور یونہی ہم جیسے ننھے منے بچوں کے لیئے لکھتے رہیں اللہ آپ کی قلم کو مزید وسعتیں عطا فرمائے جزاک اللہ۔ ذوق آگہی بہت ہی عمدہ اسباق شامل کیئے ہیں جن کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے سب اسباقوں کے عنوان ہی بہت عمدہ تھے تمام مصنفین اور جنہوں نے منتخب کیئے ہیں ڈھیروں داد سب کے لیئے سلامتی کی دعائیں موتی بکھیرتے اسباق اور یہ موتی بہت ہی خوبصورت اور دلکش تھے اللہ آپ سب کی قلم میں وسعتیں عطا فرمائے آمین۔ خوشبوئے سخن، میں تمام شاعروں کی شاعری کمال اور لاجواب تھی اور جو منتخب کردہ شاعری تھی وہ تو ان سے بھی لاجواب اور کمال تھی جن میں شاعر شرافت ضیاء صاحب جن کی غزل کو بطور انتخاب پیش کیا ہے بہت ہی عمدہ اور لاجواب غزل ڈھیروں داد۔ غزل: انتخاب پرنس افضل شاہین بہت عمدہ انتخاب ماشاء اللہ ڈھیروں داد آپ کا انتخاب بہت عمدہ ماشاء اللہ اس کے علاوہ تمام شعراء کرام کا کلام قابل ستائش اور بہت عمدہ تھا سب کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے آمین۔ آزادمرض ابن طالبؒ اس کہانی نے تو جھنجوڑ کے رکھ دیا ماشاء اللہ بہت ہی عمدہ کہانی اور وطن کے جذبے سے سرشار عمدہ کہانی ابن طالب صاحب کی قلم کو اللہ تعالیٰ مزید وسعتیں عطا فرمائے اور آپ کا حب الوطنی کا جذبہ یقیناً قابل ستائش ہے اور جس کے لیئے بہت سی داد ماشاء اللہ اتنی لمبی کہانی پر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اس کہانی میں جس طرح کی روانگی اور الفاظ کا استعمال کیا ہے لگتا ہے وسیع و عریض علم موجود ہے آپ کے پاس خیر اللہ تعالیٰ آپ کے علم میں مزید اضافہ فرمائے اور یونہی لکھتے رہیں جزاک اللہ خوش رہیں۔ لو جی ہمارا تبصرہ ہوا مکمل ملتے ہیں اگلے شمارے کے تبصرے کے ساتھ دعا ہے رب کریم ہمیں اس وباء سے چھٹکارا عطا فرمائے اور جو بھی ہمارے بہن بھائی علیل ان کو صحت کاملہ و آجلہ عطا فرمائے۔ اپنا اپنے پیاروں کا خیال رکھیں اللہ حافظ اللہ نگہبان اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو آمین جزاک اللہ۔

شہزادی حفصہ ــــ کراچی :۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

سب ہی کو محبت بھرا اسلام۔ کیسے ہیں عمران بھائی؟ جانتی نہیں ہوں کہ محفل میں جگہ ملے گی یا نہیں؟ لیکن تبصرہ دل کھول کر کرنا چاہتی ہوں۔ اس کی وجہ زریں قمر کی تحریر ''دخترِ وطن'' ہے۔ جب اس کے ایڈورٹائز لگنا شروع ہوئے تھے تب ہی سے مجھے اس کا شدت سے انتظار تھا۔ اور یہ میری امیدوں پر پورا اترا ہے۔ آزادے کے اگلے سفر کے لیے نئے افق کے اگلے شمارے کے انتظار میں ہوں۔ اب ذرا تبصرے کو ٹائٹل سے شروع کرتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے رباب نے دخترِ وطن کی وجہ سے ہی ایک حسینہ کی تصویر کو مرکز بنا کر ٹائٹل بنایا ہے لیکن جو بھی ہے ٹائٹل ہے کمال! دستک میں مشتاق احمد قریشی نے جو عمران خان کے بارے میں کہا اس سے مجھے اپنے فزکس کے ٹیچر یاد آ گئے انہوں نے کہا تھا کہ کسی بھی لاء کو اپلائی کرنے کے لیے آپ کو پیرامیٹرز پتا ہونے چاہیے تب انہوں نے مثال دی تھی کہ جیسے عمران خان صاحب حکومت کرنے بیٹھ گئے ہیں لیکن پیرامیٹرز کا انہیں علم ہی نہیں اللہ ہمارے سیاستدانوں کو ہدایت دے۔ گفتگو میں کافی اچھے تبصرے پڑھنے کو ملے سب نے نئے افق پر دل کی گہرائیوں سے محبت نچھاور کی۔ اقراء میں الرقیب اللہ کی صفت کو پڑھ کر، جان کر بہت ہی اچھا لگا۔ طاہر قریشی اللہ تعالیٰ آپ کو اس سلسلے کو آگے بڑھانے کی مزید ہمت عطا کرے آمین دخترِ وطن کی بات تو ہو گئی۔ آگے چلتے ہیں۔ شیطان مکڑی از شہزاد خان اچھی تحریر تھی۔ قاتل حسینہ از عثمان عبداللہ میں نے آپ کو دوسری دفعہ پڑھا ہے اور آپ کی فین ہو گئی ہوں وجہ یہ ہے کہ کہانی کو آگے بڑھانے کا انداز جو آپ کا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ آہاں! وجودِ حیات از عرفان رانے کے بارے میں کیا کہوں۔ جب بھی نئے افق آتا ہے سب سے پہلے اسی کی قسط کا مطالعہ کرتی ہوں۔ آپ میری پسندیدگی کا اندازہ لگا لیں۔ موت کی وادی از نفیسہ سعید رلا دیا بھئی۔ اتنے جذبات ڈھال دیے کہ میرا معصوم اور حساس دل دھڑکنیں ہی نہیں سنبھال پا رہا تھا۔ یہ سچ ہے کہ ہم مسلمان یہ سوچے بیٹھے ہیں کہ یہ وبا ہمیں چھو بھی نہ سکے گی۔ کیا یہ ہم سے پوچھے گی آپ مسلمان ہو نا او کے میں چلتی ہوں۔ کیا مطلب ہے اس بات کا؟ ہوش کے ناخن لیں۔ یہ بھی بہت بڑی حقیقت ہے اور تلخ ہے کہ ہمارا میڈیا صرف ریٹنگ کے لیے کام کر رہا ہے۔ گہرا کھوٹا از نزہت جبیں ضیاء مختلف اندازِ تحریر کے ساتھ ایک لاجواب کہانی۔ بہت ہی خوب بساط گر از وحید سلطان کہانی بہت جاندار چل رہی ہے اللہ آپ کو مزید کامیابی دے آمین دوراہا از نسیم سکینہ صدف زندگی نے تو واقعی عجیب دوراہے پر لا کھڑا کیا۔ آپ نے ایلیٹ کلاس کی لڑکی کے کردار کے ساتھ بھرپور انصاف کیا ہے۔ بنجر رحیں از عمیر علی منظر نگاری بہت خوب تھی۔ اللہ کے ساتھ تعلق کو اچھے انداز میں کہانی سے جوڑا ماشاء اللہ شہیدِ وطن از تسنیم شیخ مختصر تحریر بناء جھول کے تھی۔ اختتام بہت عمدہ تھا۔ ہم کبھی نہیں بھلا سکتے انہیں جو اپنے وطن کے لیے شہید ہو جاتے ہیں۔ رازِ سربستہ میں ثناء اللہ خان احسن نے سنیاس کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید استقامت دے ایسے معلوماتی سلسلے کو آگے بڑھانے کی۔ ذوق آگہی ہمیشہ کی طرح آگہی کا خزانہ لیے ہوا تھا۔ خوشبوئے سخن میں سبھی غزلیں نظمیں بہت عمدہ تھیں مگر پرنس افضل شاہین کی غزل اور ارسلان اللہ خان کی نظم کرونا وائرس زیادہ پسند آئی اور اب آتی ہے میرے پسندیدہ ہیرو ساحر کے کردار کو لکھنے والے ابنِ طالب کی تحریر آزارمرض ویسے کبیر اور جبران بھی مجھے بہت پسند ہیں۔ نئے افق کے یہ آخری صفحات ہمیشہ سے مجھے پسند آتے رہے ہیں اور میں مصنف سے امید کرتی ہوں کہ آتے رہیں گے۔ ان شاء اللہ پھر ملاقات ہو گی پیارے لوگوں تب تک کے لیے خوش رہیں خوشیاں بانٹیں اللہ حافظ۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اقراء

ترتیب: طاہر قریشی

المجیب
(دعاؤں کا قبول کرنے والا)

مجیب: اس کا مادہ جوب ہے اور صفتِ مشبہ ہے' اسم فاعل واحد مذکر ہے' معنی دعا قبول کرنے والا' دینے والا' (دنیا میں یا آخرت میں) حاجت پوری کرنا اور مانگ کے مطابق دینا' مجیب وہ ہے جو سائل کے سوال کو پورا کرے' دعا کرنے والے کی دعا کو قبول کرے' لاچاروں کی ضروریات پوری کرے' التجا سے پہلے انعام دے' دعا سے پیشتر بخشش کرے' وہ ذاتِ الٰہی جو حاجت مندوں کی حاجت کو ان کے سوال کرنے سے قبل ہی جانتا ہے بلکہ ازل سے سب اس کے علم میں ہے۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک جمالی صفت ہے' اللہ تعالیٰ سوال کرنے والے کے سوال کو رد نہیں فرماتا تا وہ اپنے تمام بندوں کی تمام دعائیں قبول فرماتا ہے۔ یہی اللہ کے مجیب ہونے کی صفت ہے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ترجمہ: پس ان کے رب نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ (آل عمران۔ ۱۹۵)

اللہ تعالیٰ کی صفت المجیب ہے یعنی دعاؤں کا قبول کرنے والا' وہ کون سی دعائیں ہیں کن لوگوں کی دعائیں ہیں یا سب لوگوں کی سب دعائیں اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی تربیت وہدایت کے لئے کچھ قوانین وضوابط نافذ فرمادیئے ہیں' اسلامی نظام کا مزاج اور اس کے اجزائے ترکیبی متعین کردیئے گئے ہیں یہ بھی کہ انسان کس راہ پر چلے۔ انسان کے لئے صرف تدبر وتفکر ہی کافی نہیں ہے اور نہ پرسوز خشوع وخضوع دعا کے لئے کافی ہے اور نہ ہی اللہ کی طرف متوجہ ہوکر اپنے گناہوں کی معافی مانگنا کافی ہے اور نہ ہی نجات اخروی کی طلب کافی ہے' بلکہ سب سے اہم تو اس کا پرخلوص عمل ضروری ہے وہ بھی ایسا عمل جو مثبت ہو احکامِ الٰہی اور قوانینِ الٰہی کے عین مطابق ہو اور پھر جب ایسا انسان اللہ کی طرف پوری دیانت واخلاص اور دھیان سے متوجہ ہو تو ایسی توبہ جس میں پوری آمادگی کے احساس شامل ہوں اور دعائیں سوچ ہو اور وہ مثبت عمل پر آمادہ ہو' اسلام جس طرح عبادات کا تفکر وتدبر کا ذکر وفکر' خوف واستغفار کا ذکر کرتا ہے وہی عمل اللہ کے یہاں مقبول ہے اور ایسی تمام دعائیں جو ان تمام اعمال وافکار کو لئے ہوئے ہوں گی' ضرور قبول ہوگی۔ اسلام ایسی تمام عبادات کو ثمرہ قرار دیتا ہے' یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ اپنے تمام بندوں کی دعائیں قبول فرماتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ جو خالق ومالک ہی نہیں ہر طرح سے ہر چیز پر قادر بلکہ قادرِ مطلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دعا کے لئے جو طریقہ قرآن کریم میں

بتا دیا ہے وہ ایک انوکھا اور نیا انداز ہے اسلام سے پہلے یہ طریقہ یہ انداز اختیار نہیں کیا گیا یا اس کی تعلیم یوں نہیں دی گئی۔ دعا میں تمام تر عاجزی کے ساتھ اپنا مدعا دربارِ الٰہی میں پیش کرنے کے لئے نرم اور پرسوز لہجہ اختیار کیا جائے' الفاظ میں مٹھاس وانکساری نمایاں محسوس ہو' ایسی دعا جس میں خشوع وخضوع خوش آوازی کے ساتھ ہو' آواز کے زیر بم نہایت ہی گہرے ہوں اللہ کے یہاں فوراً قبول ہوتی ہے۔

ترجمہ:۔ ہم کیسے اچھے دعا قبول کرنے والے ہیں۔ (الصفت۔ ۷۵)

اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ صفتِ عالی ہے کہ وہ اپنے بندوں کی دعاؤں کو نہ صرف سنتا ہے بلکہ انہیں قبول بھی فرماتا ہے یعنی دعا مانگنے والے کی طلب بھی وہی مالک پوری کرتا ہے' اللہ المجیب ہمہ وقت اپنے بندوں پر بے حد و بے حساب مہربان ہے' وہی تمام التجاؤں کو سنتا ہے اور حسبِ ضرورت پوری بھی کرتا ہے۔ وہی ہے جو سب کچھ سنتا ہے اور سب سے اچھا سننے والا ہے' وہ اپنے بندوں کی فریادیں' التجائیں سنتا اور قبول فرماتا ہے اور بندوں کو ان کے مسائل سے آزادی دیتا ہے۔

دعا تو اہلِ ایمان کا ایک موثر ہتھیار ہے بلکہ قلبِ انسانی کے لئے تیر بہدف نسخہِ کیمیا بھی ہے۔ کیونکہ تمام تر حاجت روائی مشکل کشائی کے تمام اختیارات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ اسی لئے صرف اسی سے دعا مانگنا برحق ہے۔ انسان کا اپنی طلب اور خواہش کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف رجوع کرنا اس سے مدد طلب کرنا' قرآنِ کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ ''اور اے نبی! میرے بندے اگر تم سے پوچھیں تو انہیں بتا دو کہ میں ان کے قریب ہی ہوں پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا انہیں چاہئے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔ (البقرۃ۔ ۱۸۶)

دنیا کی تدبیر وانتظام میں کسی بھی طرح کسی دوسرے کا نہ کوئی دخل ہے نہ اختیار ہے' انسان کو صرف اتنا اختیار ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرے' یہ اللہ کا اختیار ہے کہ وہ اسے قبول کرے یا رد کرے۔ آیتِ کریمہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''ہم کیسے اچھے دعا قبول کرنے والے ہیں' یقیناً اللہ ہی دعا قبول کرنے یا رد کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور سب سے اچھا دعا قبول کرنے والا کیسے دعا قبول کرتا ہے' اس کی تفصیل سے قرآنِ حکیم بھرا ہوا ہے' احکام الٰہی کو تسلیم کرنے والے' راہِ حق پر چلنے والے' اتباع رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کرنے والے' اعمالِ صالحہ کرنے والوں' کی دعا اللہ قبول کرتا ہے۔

جس طرح انسان کو اپنی ضرورت حاصل کرنے کے لئے' کھانا کھانے اور حاصل کرنے کے لئے' محنت کرنا پڑتی ہے' روٹی پکانی یا خریدنی پڑے گی تو ہی اس عمل سے گزرنے سے اسے روٹی کا حصول ہوگا اسی طرح پانی اگر سامنے موجود ہو چاہے دریا ہی قریب سے کیوں نہ بہہ رہا ہو اور کوئی شخص دریا کے کنارے لیٹا رہے تو وہ اپنے اس عمل سے پیاسا ہی رہ جائے گا جب تک وہ پانی کے حصول کے لئے عمل اختیار نہیں کرتا' بالکل ایسے ہی دعا کی مقبولیت کے لئے بھی ایسے عمل کی ضرورت اور اہمیت ہے جس کی تاکید اور ترکیب طریقہ وسلیقہ اللہ نے سکھایا' بتایا ہے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

دخترِ وطن

زرین قمر

اس نے ایک ایسی سرزمین پر جنم لیا تھا جہاں سامرا جوں کی بھوکی نظریں اس کے وطن کی عزت سے کھیل رہی تھیں ، جینے کا حق چھینا جارہا تھا ،رہنا ،خاموش تھا۔ انصاف کے دروازے ان پر بند تھے اور دشمن چالاک اور عیار تھا وہ کھلی فضاؤں اور زمین کی تاریک گہرائیوں سے ان پر حملہ آور ہوتا تھا جس کا مقابلہ میدان جنگ میں ممکن نہیں تھا۔ تب نازک دوشیزہ نے خود کو خطروں میں ڈال کر ہونٹوں پر مسکراہٹیں سجالیں ، مستقبل داؤ پر لگا دیا اور وہ نہتے ہاتھوں میدان میں اتر گئی، اس نے موسیقی کی جھنکار کو رزمیہ گیتوں میں بدل دیا ، رقص زنجیر شروع کردیا۔ اس نے کئی ملکوں میں یہ جنگ لڑنے کے لئے اسٹیج سجالئے افتاد زمانہ سے پل پل پردہ اٹھاتی ایک ایسی سچی کہانی جسے پڑھتے ہوئے آپ کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں گے۔“

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ایسی قوم کا المیہ جسے ہر دور میں دردناک حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا مگر ثابت قدمی ان کا شعار رہی تھی

”میرا خیال ہے اگر میں تمہارے ساتھ ناشتہ کروں تو تم برا تو نہیں مانو گی؟“ اسٹیو نے کہا۔

”ویلکم ٹو افغانستان۔“ آزادے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمہیں چاہیے تھا کہ مجھے تھوڑی سی وارننگ ہی دے دیتیں۔“ سٹیو نے شکایتی انداز میں کہا۔

”میں چاہتی تھی کہ اپنی کیمرہ کریو ٹیم کو ایکشن میں دیکھوں ان کی کارکردگی بہت اچھی ہے۔“ آزادے نے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور اس نے خوف کو قابو کرلیا تھا۔

”انہوں نے مقامی کی خبروں کے لیے بڑی تیزی سے تصویریں بنائی تھیں۔“ اسٹیو نے کہا۔ ”میرا خیال ہے ایسے حملے یہاں عام نہیں ہوں گے؟“

”ایسے حملے یہاں عام ہی ہیں۔“ آزادے نے تصحیح کی۔

”ہوں..... اچھا کسی ہلکے پھلکے موضوع پر بات کرتے ہیں..... تمہارے شو کی تیاری کہاں تک پہنچی؟“

میں جانتا ہوں ہم اس پالیسی کو کس طرح پروموٹ کرسکتے ہیں اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں اس کو شہرت دلاسکتے ہیں ہم تمہیں اُوپرا آف افغانستان کے نام سے مارکیٹ کریں گے۔“

”تم مجھے دنیا کی مشہور ترین اور مقبول ترین اسٹیج شو میزبان سے ملا رہے ہو جب کہ میں نے تو ابھی شو شروع بھی نہیں کیا اگر وہ مقبول نہیں ہوا تو کیا ہوگا؟“ آزادے نے کہا۔

”ناممکن..... یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ شو غیر مقبول ہو، میں نے تمہاری آواز سنی ہے تمہاری ریکارڈنگ کے ٹیپ دیکھے ہیں، تم نے اپنے ابتدائی ریہرسل کتنی کامیاب کی ہے سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ ٹی وی کی دنیا کا وسیع تجربہ ہے میں جانتا ہوں کون سی چیز کامیاب رہے گی اور کون سی ناکام، تم نا صرف ٹی وی کی بلکہ افغانستان کی بھی مقبول ترین شخصیت بنو گی۔“

Wasqurahe.com
Pakistanpoint.com

"میں تمہاری توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گی۔" آزادے نے انھیں ان سے جواب دیا۔

"میں کل بم دھماکے کی وجہ سے میٹنگ نہیں کر سکا تھا لیکن آج میں اپنے پروڈکشن کرو کے ساتھ میٹنگ کرنے والا ہوں میں چاہتا ہوں تم بھی وہاں موجود ہو۔"

پھر دن اسی مصروفیت میں تیزی سے گزرتے گئے اور مارچ آ گیا، جب آزادے کو واشنگٹن ڈی سی جانا تھا نسرین بھی کابل آ گئی اس کے ساتھ کئی سوٹ کیس تھے جن میں وہ آزادے کے نئے لباس لے کر آئی تھی جو اسے واشنگٹن میں پہننے کے لیے منتخب کرنا تھے۔ اس تقریب کے لیے وائٹ ہاؤس کا مشرقی کمرہ منتخب کیا گیا تھا جہاں زیادہ تر تقریبات رکھی جاتی ہیں۔ اس کمرے میں دو بڑی تصاویر لگی ہیں، ایک تو امریکہ کے پہلے صدر جارج واشنگٹن کی اور دوسری ان کی وائف مارتھا واشنگٹن کی۔

اس تقریب میں صدر اوباما اور مشعل اوباما نے طالب علموں، مقامی شہری، اسکول ٹیچرز اور کچھ رضا کاروں کو بھی بلایا تھا، اس موقع پر دنیا سے آئی ہوئی ایسی بیس خواتین کو ایوارڈ دیئے گئے جنہوں نے کھیل، سائنس، بزنس، وغیرہ میں خاص خدمات انجام دی تھیں۔

آزادے اور نسرین ایک ہفتے پہلے ہی واشنگٹن پہنچ گئی تھیں اور انہوں نے اپنا زیادہ وقت سیاحوں کی طرح گھومنے پھرنے اور شاپنگ کرنے میں گزارا تھا۔ ڈیوڈ نے آزادے کو اپنی بیٹی کی طرح چاہا تھا اس کا بہت خیال رکھتا تھا وہ بغیر ہتھیار لیس گارڈ کے اسے باہر جانے سے منع کر دیتا تھا اور اس کے لیے ایک بلٹ پروف گاڑی وقف کی ہوئی تھی۔

جیسے جیسے خواتین کا بین الاقوامی دن قریب آ رہا تھا آزادے کا خوف بڑھتا جا رہا تھا، اپنی پرفارمنس سے ایک دن پہلے وہ اپنے کمرے میں تنہا لیٹی تھی۔ رات تین بجے اس کی آنکھ لگی تھی اور دو گھنٹے بعد وہ پھر اٹھ گئی تھی۔ اس نے تقریب میں جانے کی تیاری کی اور اپنے لیے ایک سبز لباس پسند کیا تھا جو اس کی ماں نے اس کے لیے ڈیزائن کیا تھا، پھر اپنی والدہ نسرین کے مشورے سے جیولری پہنی اور ہلکا سا میک اپ کیا تھا۔

"تمہیں وہاں جو بولنا ہے، تم نے وہ یاد کر لیا ہے؟" نسرین نے پوچھا۔

"میں اپنے ذہن میں اسے بار بار دہرا رہی ہوں یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم کسی کا شکریہ ادا کریں، اور مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ میں صدر اوباما سے ملنے جا رہی ہوں۔"

تقریب میں اس کی دوست ٹم نے اسے صدر اوباما اور مشعال اوباما کے نزدیک بٹھایا تھا۔ تقریب میں شرکت کرنے صدر اوباما آئے۔ مشعال اوباما نے اپنی اس تقریب سے افتتاحی خطاب کیا تھا۔

"ہم ان خواتین کی عزت کرتے ہیں جوان لوگوں کی پروا نہیں کرتیں جو انہیں ان کے خواب پورے نہیں کرنے دیتے اور رکاوٹیں ڈالتے ہیں ان کی ہمت افزائی نہیں کرتے، ہم انہیں مواقع دیتے ہیں جنہیں اپنی زندگی میں اچھے مواقع میسر نہیں آتے ہم انہیں پسند کرتے ہیں جنہیں اپنی کامیابی کا یقین ہوتا ہے۔"

ان الفاظ کو سن کر آزادے کو یوں لگ رہا تھا جیسے یہ الفاظ اس کے لیے ہی کہے جا رہے ہوں اور اسے بھی اپنے شو میں بھی روح پھونکنے کی ضرورت ہو گی اور اب اس کا فرض ہے کہ وہ یہ پیغام اپنے ساتھ افغانستان کی خواتین کے لیے لے جائے، صدر اوباما نے بھی ایک مختصر سی تقریر کی اور تقریب کے لیے چند مزید لوگوں کے ناموں کا اعلان کیا۔

"آزادے خان زادہ۔" اس کے نام کا اعلان ہوا تو آزادے کو اپنا دل سینے میں دھڑکتا محسوس ہوا وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کیسے پرفارم کرے گی، کیونکہ صدر اوباما نے اور دوسری خواتین کا جو تعارف کروایا تھا وہ اس سے بہت زیادہ خدمات انجام دے چکی تھیں اور ابھی ان کی امیدیں خواتین سے بہت زیادہ تھیں۔ آزادے اپنے دھڑکتے دل کے ساتھ سب سن رہی تھی صدر اوباما نے اس کی مثال دی تھی۔

"میں آزادے جیسی خواتین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو افغانستان سے تشریف لائی ہیں اور اپنے خوابوں کو تعبیر دینا چاہتی ہیں۔ خواتین کو پروموٹ کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہم معیشت کی ترقی کے لیے کام کریں، خواتین ہمارے خیالات آگے بڑھانے میں ہماری مدد کر سکتی ہیں۔"

آزادے کو لگا جیسے اوباما اس کی طرف داری کر رہا ہو اسے سپورٹ دے رہا ہو۔ اسے اچانک ہی اپنے اندر سے ابھرتی طاقت اور انرجی کا احساس ہونے لگا اور وہ خود کو بہت مضبوط محسوس کرنے لگی، یہ پروگرام بیس منٹ پر مشتمل تھا،

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

جس میں ایک لڑکی نے ایک گیت ''شکست خوردہ'' گایا اور پھر آزادے کی باری آئی اور اس نے ''دختر افغان'' پیش کیا اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ اسٹیج پر قدم رکھا، نیچی نظروں سے اپنی والدہ نسرین کی طرف دیکھا جو اوباما کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھیں وہ بہت خوش اور پرسکون نظر آرہی تھیں یوں لگ رہا تھا کہ صدراتی جوڑے کے قریب بیٹھنا ان کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہو آزادے نے صدر اوباما اور مشعال اوباما کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ''دختر افغان'' شروع کرنے سے پہلے اس نے مشعال اوباما اور صدر اوباما کی ان کاوشوں کو سراہا جو وہ دکھی انسانیت اور خواتین کے لیے کر رہے تھے اور بتایا کہ وہ مشعال اوباما کو اپنے لیے رول ماڈل سمجھتی ہے۔

''میں کابل (افغانستان) سے یہاں آئی ہوں اور افغان خواتین کی بھلائی کے لیے جو کچھ کرسکتی ہوں وہ کر رہی ہوں، یہ نغمہ میرے والد اور میں نے لکھا ہے جو قندھار شہر کی ان بچیوں کے لیے ہے۔ جن پر تیزاب پھینکا گیا، جب وہ اسکول سے گھر جا رہی تھیں چنانچہ میرے دل میں خیال آیا کہ میں ان کے لیے کچھ کروں۔''

آزادے نے جب دختر افغان پیش کیا تو اس نے دیکھا کہ مشعال اوباما نے اس کی والدہ نسرین کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔

''میں ایک لڑکی ہوں، میں ایک افغانی لڑکی ہوں۔
میں بہادروں کی سرزمیں کی بیٹی ہوں
میرے پر مت توڑو، مجھے اڑنے دو
میرا تاج نہ توڑو مجھے سوچنے دو
میں کسی ہرن کی طرح آزادی چاہتی ہوں
اور اپنے وطن سے محبت کرتی ہوں
میرا گیت گاؤ جیسے پرندے باغوں میں گاتے ہیں
میں اپنے نغموں میں زینب، نازو اور مہرو کا ذکر کرتی ہوں
میرے پر مت توڑو مجھے اڑنے دو
میرا تاج مت توڑو مجھے سوچنے دو
میرے سبزہ زاروں میں زندہ رہو
میرے دل میں میرے وطن کا پیار ہے
میں اپنے وطن کے نغمے گاتی رہوں گی۔''

آزادے نے نغمہ ختم کیا تو سارا ہال تالیوں سے گونجنے لگا

چند ہفتے بعد کابل میں آزادے کا شو شروع ہو گیا تھا آزادے کی ساری توجہ شو کی تیاری پر تھی۔ وہ اسے ہر نقص سے پاک رکھنا چاہتی تھی، اسٹیج کی سجاوٹ میں افغان کلچر کو نمایاں کرنے کے لیے افغان فرنیچر، قالین، سجاوٹی اشیاء اور زیورات استعمال کیے گئے تھے یہ شو فارسی میں تھا، اسٹیج کے سامنے کی دیوار پر بڑے بڑے حروف میں ''آزادے'' لکھا ہوتا تھا۔

''آزادی نے پہلا شو آن ایئر کرنے سے پہلے اپنے والد بشیر خان زادہ سے بھی کئی موضوعات پر مشورے کیے تھے۔ وہ اکثر ان کو فون کر کے بات کرتی تھی کچھ اہم موضوعات تھے جنہیں وہ پروگرام میں شامل کرنا چاہتی تھی، لیکن انتظامیہ اسے ابھی اجازت نہیں دے رہی تھی۔

''نہیں آزادے یہ مناسب نہیں ہوگا ہم چاہتے ہیں کہ شروع میں تم بہت ہلکے پھلکے موضوعات پر گفتگو کرو ابھی شروع کے پروگراموں پر لوگوں کی رائے آنے دو پھر آہستہ آہستہ مزید تبدیلیاں لائیں گے شو کو دلچسپ رکھو تاکہ لوگ شوق سے دیکھیں اور ملک میں جو موجودہ تناؤ والی صورتحال ہے اس سے کچھ دیر کے لیے نجات پائیں، اس کے پروڈیوسر نے سمجھایا اور جب اس نے بشیر سے اس سلسلے میں بات کی تو اس کا جواب بھی وہی تھا۔

''دیکھو اگر تم پہلے ہی پروگراموں میں افغان بچوں کے تعلیمی مسائل، عورتوں پر گھریلو ظلم، عورتوں کی آزادی ان کے حقوق پر بات کروگی تو یاد رکھو گھروں کے سربراہ افغانستان مرد ہی ہیں وہ کبھی اپنی فیملی کو ایسا پروگرام دیکھنے کی اجازت نہیں دیں گے جو ان کے خود ساختہ قوانین کی منافی کرے، صبر سے کام لو تمہیں آہستہ آہستہ بہتری کی طرف لانا ہے۔'' بشیر نے سمجھایا۔

پہلا شو شروع ہونے سے پہلے آزادے کو اس کی ایک پروڈیوسر نیلوفر نہ ڈھونڈ رہی تھی۔

''آزادے کہاں ہے؟'' نیلوفر نے ایک کیمرہ مین سے پوچھا۔

''پتا نہیں۔''

''جاؤ اسے ڈھونڈو اور لے کر آؤ۔'' نیلوفر نے کہا۔

آزادے اس وقت ٹی وی کے ڈریسنگ روم میں تھی اور میک اپ آرٹسٹ سے میک اپ کروا رہی تھی جو میک اپ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کرنے کے بعد اسے حجاب پہنانے کی کوشش کر رہی تھی۔
"رہنے دو خورشید اس طرح تو میرا چہرہ اور بال چھپ جائیں گے۔" آزادے نے کہا۔
"ہمیں چند منٹ بعد ہی اسٹیج پر پہنچنا ہے آزادے مجھے میرا کام کرنے دو ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" خورشید ہمدانی نے کہا۔
"تم میرے بال سامنے کی طرف کر دو اور سر کے پچھلے حصے میں حجاب لگا دو۔" آزادے نے کہا۔
"ٹھیک ہے آزادے تم تیار ہو؟" ڈریسنگ روم کے دروازے سے جھانکتے ہوئے نیلوفر نے پوچھا۔
"ہاں میں تیار ہوں بس ذرا پروگرام کا اسکرپٹ ایک نظر دیکھ لوں مجھے مائیک دو...... میرا مائیک کہاں ہے؟"
"فوراً اسٹوڈیو میں آجاؤ آزادے...... ابھی۔" اس کے پروڈیوسر نے غصے سے اسے آواز دی۔
"میں اپنے مائیک کا انتظار کر رہی ہوں...... میں بغیر مائیک کے کچھ نہیں کر سکتی...... اور تم مجھ پر غصہ مت نکالو۔" آزادے نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔
"میں مہمانوں کو اندر بلا رہا ہوں۔" پروڈیوسر نے کہا اور پھر آزادے کو اس کی آواز سنائی دی۔
"تمام لوگ تیار ہو جائیں آزادے۔ شو شروع ہو رہا ہے۔" پروڈیوسر نے یہ جملہ فارسی میں کہا تھا، "میں دیکھنا چاہتا ہوں آپ میں کتنا جوش ہے۔" پروڈیوسر نے کہا اور لوگ زور زور سے تالیاں بجانے لگے اس عرصے میں آزادے اسٹوڈیو میں چلی گئی تھی۔
"تھری...... ٹو...... ون...... گو۔" نیلوفر نے آزادے کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا اور اسٹوڈیو کا دروازہ کھول دیا لوگوں کی بڑی تعداد اندر آ گئی تھی، تقریباً ڈھائی سو لوگ تھے جنہیں دعوت نامے بھیجے گئے تھے۔
"مبارک ہو۔" نیلوفر نے آہستہ سے آزادے کو مخاطب کیا اور اس نے اثبات میں گردن ہلائی پھر وہ آہستہ آہستہ چلتی اسٹیج پر آ گئی تھی۔
"ہیلو؟" اس نے مسکراتے ہوئے فارسی میں کہا۔ "آپ سب کیسے ہیں؟" اس نے پوچھا تو خواتین اور لڑکیوں نے خوشی سے ہاتھ ہلا کر اس کا جواب دیا آزادے نے دیکھا اگلی نشستوں میں سے ایک پر ڈیوڈ بیٹھا تھا۔ ہال میں پیچھے ٹی وی کیمرے موجود تھے جو مختلف سمتوں سے آزادے کو فلما رہے تھے یہ موقع اس کی زندگی میں پہلی بار آیا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ یہاں آنے والی اور لڑکیاں بھی شاید اسی اسٹوڈیو کے اندر کا سکون، ٹھنڈک اور ہلکا سا اندھیرا پہلی بار دیکھ کر اطمینان محسوس کر رہی ہوں یہ سب کچھ اس اسٹوڈیو سے باہر افغانستان کی گلیوں میں پائے جانے والے خوف و ہراس سے بہت مختلف تھا۔ یہ سوچ کر اسے خوشی کا احساس ہوا۔
"ہم نے آپ کے لیے آج ایک ونڈر فل شو ترتیب دیا ہے۔" آزادے نے مسکراتے ہوئے کہا۔
آزادے نے برٹش کولمبیا انسٹیٹیوٹ سے براڈکاسٹنگ جرنلزم پروگرام کی دو سال کی ٹریننگ کی ہوئی تھی اس کے بعد اس نے مختلف جگہوں پر لائیو پروگرام کیے تھے جہاں وہ لوگوں سے مختلف موضوعات پر سوالات کرتی تھی اور ان کے جواب حاصل کرنے کے بعد کسی بھی مسئلے کا حل بھی پیش کرتی تھی وہ کچھ وقت کنٹرول روم میں بھی گزارتی تھی اور کیمروں کے فنکشن سیکھنے کی کوشش کرتی تھی اس نے اپنی ٹریننگ کے زمانے میں بڑے بڑے سیاستدانوں کے انٹرویوز لیے تھے وہ اُوپرا کو فالو کرتی تھی اور خود کو پرسکون رکھتے ہوئے اپنے ذہن میں آنے والے نئے نئے سوالات کو آسان بنا کر لوگوں سے پوچھتی تھی، چنانچہ اس میں ہمت آ چکی تھی اور اب اپنے پہلے لائیو پروگرام میں وہ بہت پر اعتماد تھی۔
اسٹیج پر مختلف رنگ برنگی روشنیوں کے جھماکے ہو رہے تھے آزادے نے چند لمحے اپنے سامنے موجود مہمانوں کو دیکھا، اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ یہ کابل تھا جہاں سے کافی سال پہلے حالات خراب ہونے کی وجہ سے اس نے اپنے والدین کے ساتھ چھپ کر ہجرت کی تھی اور اب تک ملکوں ملکوں ماری ماری پھری تھی، لیکن اس کے دل میں امید تھی کہ وہ ایک روز واپس ضرور آئے گی اور اپنے ملک کی ڈری سہمی عوام کو انصاف ضرور دلوائے گی یا ان میں ایسا احساس جگائے گی کہ وہ خود اپنے اوپر ہونے والے ظلم کو روک سکیں، آج اس کے خواب کا ایک حصہ مکمل ہو گیا تھا وہ واپس کابل میں قدم رکھ چکی تھی اور پھر سے اپنے لوگوں کے درمیان موجود تھی۔
"خوش آمدید میرے دوستو اور مہربانو۔" اس نے دھیمے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ’’آج آپ سب کے درمیان میں جس طرح خود کو دیکھ رہی ہوں یہ میرے بچپن کی خواہش تھی، میں بہت خوش قسمت ہوں کہ یہاں تک پہنچ سکی ہوں۔ آپ میرے پروگراموں میں بہت کچھ پائیں گے یہاں آپ کے لیے خوشیاں، تفریح اور مزا تو ہوگا ہی جو آپ کی سارے ہفتے کی تھکن اور کوفت، دور کر دیا کرے گا، لیکن یہاں آپ کو آپ کی بہت سی ایسی پریشانیوں کا حل بھی ملے گا جنہیں شاید عام حالات میں کسی کے سامنے کہنے کی جرأت بھی نہ کریں۔‘‘ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی اور ہال اس کے نام کے نعروں سے گونج گیا۔

’’آزادے، آزادے۔ آزدے۔‘‘ لوگ زور زور سے تالیاں بجا کر چیخ رہی تھے اور اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

’’آپ سب کی خدمت میں آپ ہی کے لیے لکھا گیا میرا ایک چھوٹا سا گیت جسے ساری دنیا میں پذیرائی حاصل ہوئی ہے...... پیش کرتی ہوں۔‘‘ آزادے نے ہاتھ میں پکڑا ہوا مائیک منہ کے قریب کرتے ہوئے کہا۔

’’میں لڑکی ہوں‘

’’میں اک لڑکی ہوں افغانی‘‘

اس نے اپنا مشہور گیت شروع کیا اور حال میں خاموشی چھا گئی، چند ہی لمحوں میں ہال میں بیٹھے لوگ اس کی اور موسیقی کی آواز پر وجد کے عالم میں جھوم رہے تھے۔

’’گیت ختم ہونے کے ساتھ ہی قاسم ابراہیم بھی اسٹیج پر آ گیا تھا یہ ایک افغانی نوجوان تھا جو فارسی روانی سے بولتا تھا اور اسے آزادے کی مدد کے لیے پروگرام میں رکھا گیا تھا۔ بعد میں وہ باقاعدہ اس پروگرام کا حصہ بن گیا تھا۔

’’آزادے کے گیت کے بعد مہمانوں سے آزادے کا مختصر سا تعارف تھا اور اس کے بعد پروگرام کی تفصیل بتائی گئی تھی جو قاسم ابراہیم نے بتائی تھی۔

آزادے شو ہفتے میں دو بار ہوا کرے گا ہر جمعرات اور جمعہ کو، اور ان دونوں شوز کی ریکارڈنگ جمعے کو ہی ہوا کرے گی، پہلا شو صبح دس بجے اور دوسرا شو دوپہر دو بجے ہوا کرے گا۔‘‘ قاسم نے بات مکمل کی تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

’’ہماری کوشش ہوگی کہ ہر ہفتے اپنے سامعین کے کسی اہم مسئلے کا حل پیش کریں آپ اس سلسلے میں اپنے ذاتی مسائل بھی پیش کر سکتے ہیں۔‘‘ آزادے نے آگے بڑھ کر کہا۔ ’’جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ پروگرام خاص طور سے تفریحی ہے اور خواتین اور بچوں سے متعلق ہے، لیکن ہماری کوشش ہوگی کہ مرد حضرات کو بھی اس پروگرام میں پذیرائی ملے۔‘‘ آزادے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’میں آپ سب کا اس پروگرام میں آنے پر شکریہ ادا کرتی ہوں۔‘‘ آزادے نے ایک بار پھر سب کو مخاطب کیا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس موقع پر خواتین کے کچھ بنیادی مسائل پر بات کرے، لیکن اسے اپنے والد بشیر خان زادہ کی بات یاد تھی کہ پروگرام کے شروع میں زیادہ حساس مسائل کو بحث کے لیے پیش نہ کیا جائے یہ پروگرام کے حق میں بہتر ہوگا۔

’’اگلے پروگرام میں ہمارے شو کے مہمان خصوصی جناب ڈاکٹر زمان رجبی ہی ہوں گے۔‘‘ آزادی نے بتایا۔ ’’ڈاکٹر زمان ہمارے ہر پروگرام میں شرکت کریں گے۔ وہ ایک ماہر نفسیات کنسلٹنٹ بھی ہیں اور کابل کے مینٹل ہیلتھ ہاسپٹل میں اپنی ذمہ داریاں بھی نبھا رہے ہیں وہ خاص طور سے بچوں کی نفسیات کے ماہر بھی ہیں اور جو بچے ہمارے ملک کے جنگی حالات کا شکار ہو کر نفسیاتی مریض بن گئے ہیں وہ ان کے علاج کے لیے مستند سمجھے جاتے ہیں۔‘‘

اس روز پروگرام کی ریکارڈنگ کے بعد جب وہ گیسٹ ہاؤس پہنچی تو ڈاکٹر زمان رجبی اور ڈیوڈ کے ساتھ ایک اور شخصیت اس کی منتظر تھی۔

’’اوہ کامی تم؟‘‘ وہ کامی زرگی کو وہاں دیکھ کر حیران رہ گئی تھی کامی کا تعلق عراق سے تھا اور وہ اس کے ساتھ عراق میں کئی میوزیکل شو میں حصہ لے چکی تھی اور اس کی بڑے مداح تھی۔

’’تمہیں پتا بھی نہیں چلا میں تمہارے آج کے پہلے شو میں موجود تھا۔‘‘ کامی نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟‘‘ ہال میں موجود ایک ایک چہرے پر میری نظر تھی۔ آخر یہ میرا پہلا شو تھا، جس کے لیے میں اتنے عرصے سے تیاری کر رہی تھی۔‘‘ آزادے نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’میں ہال میں نہیں اسٹیج کے پچھلی طرف کمرے میں تھا، میں تمہارا پہلا شو مس نہیں کرنا چاہتا تھا۔‘‘

’’بہت خوب۔‘‘

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"آزادے، کامی کو میں نے یہاں بلایا ہے میں چاہتا ہوں یہ تمہارے شو میں تمہارے ساتھ پرفارم کرے کیونکہ اس کے اور تمہارے نغمے مڈل ایسٹ میں بہت پسند کیے گئے تھے۔ ڈیوڈ نے کہا، جو بڑی دلچسپی سے آزادے اور کامی کی گفتگو سن رہا تھا۔

"ہاں کیوں نہیں ضرور...... میری خوش قسمتی ہوگی اگر کامی میرے ساتھ یہ اسٹیج شو کرے۔"

"ٹھیک ہے، تمہارے اسٹیج شو کی ترتیب میں تھوڑی سی تبدیلی ہوئی ہے اب تم شو کا آغاز کرو گی اس کے فوراً بعد کسی افغان خاتون یا بچے کا کوئی ایسا مسئلہ پیش کیا جائے گا جس میں اس کے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی ہو، اسے ایک چھوٹے سے خاکے کی صورت میں بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔" ڈیوڈ نے کہا۔ "اور کسی نغمے کی صورت میں بھی۔ قاسم ابراہیم تمہارے ساتھ مل کر اناؤنسمنٹ کرے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" آزادے نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر کامی کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"تم نے کوئی چائے، یا ٹھنڈا کچھ لیا؟"

"نہیں ابھی خواہش نہیں۔" کامی نے جواب دیا۔

"کیا خیال ہے...... آزادے کیا تم اپنا فارسی کا سبق ابھی لوگی یا پہلے اپنے مہمان کی خاطر کرو گی؟" ڈاکٹر رجبی نے پوچھا۔

"اگر فارسی کا سبق شام میں کرلیں تو کیا رہے؟" آزادے نے پوچھا۔

"بالکل...... یہ بھی ہوسکتا ہے۔"

"تمہارے کمرے کے برابر والا کمرہ کامی زرگی کو دے دیا ہے، چونکہ وہ تمہارے پروگرام میں تمہارا ساتھی ہے تو تمہیں آپس میں معاملات ڈسکس کرنے میں آسانی ہوگی۔" ڈیوڈ نے کہا۔

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔" آزادے نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "آؤ کامی میں تمہیں اپنے شو سے متعلق کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔" آزادے نے کامی سے کہا اور ڈیوڈ کی طرف بڑھی۔ "اجازت ہے ڈیوڈ؟" اس نے پوچھا تو ڈیوڈ نے اثبات میں سر ہلایا اور آزادے کامی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

وہ گیسٹ ہاؤس کی دوسری منزل پر آئی تھی اور وہاں بائیں جانب بنے دو کمروں کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"ان کمروں میں ہمارا بہت قیمتی سامان موجود ہے۔" اس نے کامی سے کہا۔

"قیمتی سامان؟" کامی نے حیرت سے پوچھا تو وہ ہنسنے لگی۔

"ہاں، ہم جو کچھ اپنے شو میں استعمال کرتے ہیں وہ سب ہی ہمارے لیے قیمتی ہوتا ہے دراصل ہماری ساری توجہ اپنے شو میں افغانستان کا ماحول، یہاں کا کلچر اور یہاں کے مسائل پیش کرنے پر ہوتی ہے، اس لئے ایک ایک چیز کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ یہاں کے لوگو کا لباس، زیورات، فرنیچر ہر چیز ہمارے لیے اہم ہے اور میں اکثر ان چیزوں میں کچھ مناسب تبدیلیاں کرواتی رہتی ہوں جو کہ نئے دور کا تقاضا بھی ہے۔" آزادے نے کہا اور ایک کمرہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

کمرے میں دیوار کے ساتھ میزیں لگی تھیں، جن پر مختلف پردے، قالین، ملبوسات پڑے تھے اور ایک الماری کے شیشے کے دروازوں سے افغان جیولری بھی جھانک رہی تھی۔

"بہت خوب آزادے تم نے تو بہت انتظام کیا ہوا ہے۔" کامی نے تعریفی انداز میں کہا۔

"کامی! میں تم سے ایک فیور چاہتی ہوں۔" آزادے نے کہا تو کامی اسے چونک کر دیکھنے لگا۔

"کیسا فیور؟"

"کامی! میں چاہتی ہوں کہ تم میری ساتھ کابل کی گلیوں، محلوں میں چلو...... میں اپنی آنکھ سے وہ مناظر دیکھنا چاہتی ہوں جن کا ذکر لوگ مجھ سے کرتے ہیں۔"

"کیسے مناظر؟"

"انتہا پسند لوگو کے مظالم جو وہ بچوں اور عورتوں پر کرتے ہیں...... ایسے مظالم جس کی وجہ سے مائیں اپنی بیٹیوں کو بیٹا ظاہر کرنے پر مجبور ہیں یا اپنے بیٹوں کو بیٹیاں بنا کر چھپاتی ہیں۔" آزادے نے کہا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"کیا یہاں ایسا بھی ہوتا ہے؟" کامی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں بالکل ہوتا ہے۔" آزادے نے ایک نیلے رنگ کی لمبی سی فراک اٹھاتے ہوئے کہا۔ فراک پر بہترین کشیدہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کاری کی گئی تھی۔

''یہ دیکھو...... یہ ایک پرانے فیشن کی فراک ہے، لیکن اب میں اس کو کاٹ کر اس کی شکل بدلوانے والی ہوں، میں اسے ایک ٹراوزر کے ساتھ پہنوں گی اور بھاری جیولری بھی اس کی مطابقت سے منتخب کی گئی ہے، میں اس فراک کو کاٹ کر سامنے سے کھلی ہوئی لمبی شرٹ بنوا رہی ہوں، اس کام میں یہاں کی مقامی خواتین کی مدد کی جاتی ہے، بعض اوقات یہ خواتین بھی بہت اچھے مشورے دیتی ہیں جن سے ہمارے پروگرام میں چار چاند لگ سکتے ہیں۔''

''تم نے تو اپنے پروگرام میں بہت سے رسم و رواج کا خیال رکھا ہوا ہے یہی شاید تمہاری مقبولیت کی وجہ بھی ہے۔''

''ہاں، کسی حد تک یہ بات کہی جاسکتی ہے لیکن میرا خیال ہے میری مقبولیت کی اصل وجہ افغانستان میں اور افغانستان سے باہر پوری دنیا میں اپنے ملک کا کلچر، کردار، ثقافت کی تشہیر کرنا ہے۔ میں لوگوں کو بتانا چاہتی ہوں کہ افغانستان ایسا نہیں ہے جیسا ظاہر کیا جاتا ہے۔ بلکہ افغانستان کی تاریخ سینکڑوں سال پر محیط ہے۔ ہماری پہچان ایک مسلم ملک و قوم ہونے سے ہے ہماری اپنے ملک سے وفاداری سے ہے۔'' آزادے کہہ رہی تھی اس کی سانسیں تیز چلنے لگی تھیں اور وہ خاصی جذباتی ہوگئی تھی۔ کافی حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا کیونکہ کچھ عرصہ پہلے عراق میں وہ جس آزادے سے ملا تھا وہ اس سے بہت مختلف تھی لا ابالی، الھڑ اور چنچل سی دوشیزہ تب ہی وہ اسے اپنے دل میں بسا بیٹھا تھا اور اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن اسے اپنا جیون ساتھی ضرور بنائے گا لیکن کبھی بھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کرسکا تھا۔

''اب سے پہلے میں نے تمہیں کبھی اتنا جذباتی نہیں دیکھا تھا۔'' کامی زرگی نے کہا۔ ''کیا تم بتا سکتی ہو کہ ایسا کیا ہوا کہ تم نے اپنی زندگی کا رخ موڑ دیا۔''

''زندگی کا رخ موڑ دیا؟ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی؟''

''میرا مطلب ہے کہ پہلے، تمہاری باتوں میں صرف تمہاری اپنی ذات کا ذکر ہوتا تھا۔ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں گی۔ میں بہت زیادہ پڑھ کر اور محنت سے بیرون ملک کوئی اچھا عہدہ حاصل کروں گی اور ایک اعلیٰ شخصیت بن کر اپنے وطن واپس جاؤں گی وغیرہ وغیرہ؟'' کامی نے اس کے کہے ہوئے الفاظ ایسے یاد دلائے تب وہ گہرا سانس لے کر کمرے میں موجود ایک صوفے پر بیٹھ گئی اور اس نے کامی کو ابھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''کامی، جب ہم دونوں کو مل کر شو کرنا ہے اور اگر ہم اس شو کو کامیاب کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ میں تمہیں اس شو کی اصل روح سے آگاہ کردوں تاکہ ہماری اداکاری یا پرفارمنس میں حقیقت کا رنگ ہو سکے۔''

''یہ تو بہت ضروری ہے۔'' کامی نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''یہ بات ہر ذی شعور جانتا ہے کہ جب کسی فرد، گروہ یا قوم کے مفادات اس سے چھینے جائیں تو وہ مزاحمت ضرور کرتے ہیں، دنیا میں جہاں کہیں ایسے حالات پیدا ہوئے جہاں رہنے والوں پر ظالموں نے زندگی تنگ کرنا چاہی چاہے ان کے مفادات کچھ بھی رہے ہوں لیکن ان کے خلاف مزاحمت کی گئی۔'' آزادے آہستہ آہستہ بول رہی تھی اور کافی حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا، اس کے چہرے پر موجود سنجیدگی اور بہادری بھی اسے خوف میں مبتلا کررہی تھی، اس کی باتیں کسی بہت سنجیدہ موضوع کی طرف لے جارہی تھیں جہاں دور دور تک لاابالی آزادے کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

''خیر تو ہے آزادے تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''تمہیں افغانستان کے حالات کا علم تو ہے۔'' آزادے نے کامی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... میں جانتا ہوں۔''

''یہاں چند انتہا پسند گروہ اپنی مرضی سے عوام کو چلانا چاہتے ہیں اگر تم باہر نکلو تو کھلی سڑک پر دو میل کا فاصلہ بھی سکون سے طے نہیں کرسکتے کیونکہ راستے میں جگہ جگہ تمہیں ایسے مناظر نظر آئیں گے جب چند جیپوں میں بیٹھے ہوئے ہتھیار لیس قبائلی عام لوگوں کے پیچھے گاڑیاں دوڑا رہے ہوں گے ان پر فائر کررہے ہوں گے انہیں پکڑ پکڑ کر گاڑیوں میں بٹھا رہے ہوں گے اور ایک نامعلوم منزل کی طرف لے جا رہے ہوں گے۔''

''اس سب سے ہمارا کیا واسطہ؟'' کامی نے حیرت سے کہا۔

''تمہارا شاید نہ ہو لیکن میرا واسطہ ہے، میں بہت چھوٹی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

تھی میری عمر پانچ سال تھی تب، میرے والد انہی حالات سے پریشان ہو کر اپنا ملک چھوڑ گئے تھے۔ میری والدہ نے راستے میں مجھے ظالموں کی بھوکی نظروں سے بچانے کے لیے کئی بار اپنے نیلے ٹوپی دار برقعے کے اندر چھپایا تھا، تب میں نہیں جانتی تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہیں، لیکن اتنا جانتی تھی کہ لڑکی ہونے کی وجہ سے مجھے اسکول جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میرے اسکول کو بم سے اڑا دیا گیا تھا اس روز میں اتفاق سے گھر پر ہی تھی۔"

"ان نا مساعد حالات سے، تنگ آ کر ہم یہاں سے ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے راستے میں کئی بار موت کے منہ سے بال بال بچے، اس وقت بہت سے افغان خاندان ہجرت کر رہے تھے ہم صرف اپنی اور اپنے بچوں کی زندگیاں بچانا چاہتے تھے۔"

"پھر...... پھر کیا ہوا؟" تم لوگ پاکستان میں محفوظ تھے؟" کامی نے پوچھا۔

"ہاں محفوظ تھے لیکن میرے، والد مجھے اور میرے دونوں بھائیوں سیفی اور مسیح کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتے تھے جو ہمارے حالات کی وجہ سے ممکن نہیں تھا، پھر انہیں اسلام آباد میں کینیڈا کے سفارت خانے میں ملازمت مل گئی، وہ پی ایچ ڈی ہیں اور انہیں کئی زبانوں پر عبور حاصل ہے۔"

"اچھا...... پھر......؟"

"پھر انہوں نے کوشش کی اور ہمیں کینیڈا کا ویزا مل گیا ہماری فیملی کینیڈا میں کئی شہروں میں ٹھہری، لیکن ہم وہاں مستقل رہائش اختیار نہ کر سکے۔"

"کیوں......؟"

"ہم ان کے لیے اجنبی تھے اور وہ ہمارے لئے، میرے اسکول کے بہت سے ساتھیوں کو تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ افغانستان بھی کوئی ملک ہے، وہ میرے نام کا...... میری زبان کا...... میری حرکتوں کا مذاق اڑاتے تھے اور میں سارا دن روتی رہتی تھی۔" آزادے نے کہا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں کہ اپنے وطن اور لوگو سے دور تمہیں کیا محسوس ہوتا ہوگا۔"

"پھر میرے والد نے میری مدد کی میری والدہ نے ہم بہن بھائیوں کی تربیت کی اور ہمیں سمجھایا کہ اپنے حالات سے مایوس نہ ہوں خود کو یہاں کے کلچر میں ڈھالیں کیونکہ اب ہمیں یہاں ہی رہنا ہے ہمارے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔"

"ظاہر ہے ایسے حالات میں اور ہو بھی کیا سکتا تھا؟"

"میری والدہ نے بھی میرے والد کے ساتھ ساتھ کام کیے انہوں نے لوگو کے گھروں میں، بیکریوں میں، بیوٹی پارلرز میں ملازمت کی تا کہ اپنے حالات کا مقابلہ کر سکیں اور ہم لوگو کے تعلیمی اخراجات پورے کر سکیں اپنے آپ کو کامیاب بنانے کا ہمارے پاس صرف ایک ہی راستہ تھا، ہم زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کریں۔"

"تم پڑھتے پڑھتے میوزک کی طرف کیسے آ گئیں؟" کامی نے پوچھا۔

"افغانستان میں ایک دلدوز حادثہ ہوا اسکول جانے والی کچھ طالبات پر انتہا پسندوں نے تیزاب پھینک دیا، دو طالبات موقع پر ہی ہلاک ہو گئیں اور کچھ کو زخمی حالت میں اسپتال میں داخل کر دیا گیا یہ خبر اور اس کی فوٹیج ٹی وی پر دکھائی گئی جو میں نے بھی دیکھی اور مجھے بے حد افسوس ہوا کیونکہ ان طالبات کا کوئی قصور نہیں تھا اس روز میں نے اپنی نظم "دختر افغان" کے چند اشعار لکھے جو میرے والد کو بہت پسند آئے میں پہلے سے ہی شاعری کرتی تھی لیکن وہ عام سی شاعری ہوتی تھی جس میں مناظر کا ذکر دوستوں سے بچھڑنے کا ذکر، آگے بڑھنے کا ذکر ہوتا تھا، لیکن اس واقعے کے بعد میری شاعری کا رنگ ہی بدل گیا اور "دختر افغان" کو اتنی پذیرائی ملی کہ میں نے بعد میں اس میں کئی بندوں کا اضافہ کیا۔"

"بہت خوب۔" کامی نے تعریفی انداز میں کہا۔

"میری والدہ نے ایک اچھے موسیقار سے بات کی اور کہا کہ وہ اس نظم کی دھن بنائیں اور مجھے یاد کروائیں، مجھے خود پر یقین نہیں تھا کہ میں اس نظم کو کامیابی سے پرفارم کر سکوں گی، لیکن جب یہ بن کر تیار ہوئی اور مختلف جگہوں سے نشر ہوئی تو بہت پسند کی گئی اور مجھے اس نظم کو پرفارم کرنے کے لیے "ویمنز ڈے" پر امریکہ بلایا گیا، جہاں صدر اوباما اور خاتون اول مشعال نے میری بہت پذیرائی کی تب سے میرے حوصلے بڑھ گئے۔"

"گویا تم نے مستقبل کے بارے میں طے کر لیا کہ تمہیں آگے کیا کرنا ہے؟" کامی نے پوچھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"ہاں..... کیونکہ مجھے ایک پلیٹ فارم مل گیا تھا میں باہر رہتے ہوئے اپنے ملک اور یہاں کے عوام کے لیے کچھ کر سکتی تھی دنیا کو یہاں کی اصل صورتحال دکھا سکتی تھی اور یہاں کے لوگو میں زندہ رہنے کی خواہش پیدا کر سکتی تھی۔" آزادے آہستہ آہستہ بول رہی تھی اور کامی اس نازک سی لڑکی کے حوصلے کی داد دے رہا تھا۔

"پر تم واپس یہاں کیوں آ گئیں؟"

"یہاں مجھے ٹی وی والوں نے بلایا جیسے تمہیں بلایا ہے وہی ہمیں سیکورٹی دے رہے ہیں اور ہمارے شو کو بھی پرموٹ کر رہے ہیں۔"

"تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"جیسا کہ تم جانتے ہو بنیادی طور پر یہ پروگرام تفریحی پروگرام ہے اس میں شروع میں میں کچھ معمولی نوعیت کے سوالات کروں گی جو کسی خاص مسئلے کی نشاندہی کریں گے پھر اس کا حل بتایا جائے گا مختلف مثالیں دے کر شروع اور درمیان میں دو گیت بھی پیش کیے جائیں گے اور ڈاکٹر رجبی پیش کیے جانے والے مسائل کا ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے تجزیہ کر کے ان کا حل پیش کریں گے بس ہمیں یہ کرنا ہے کہ اس تفریحی پروگرام کو تفریح کی ساتھ ساتھ اپنا ٹارگٹ حاصل کرنے کا ذریعہ بنانا۔"

"ٹارگٹ.....؟"

"ہاں، لوگو میں زندگی کی روح پھونکنا اور اس زندگی کو جینے کا مقصد دینا اپنے فیصلے خود کرنا اور ظالموں سے نجات حاصل کرنا۔"

"ظالموں سے نجات.....؟ آزادے! تم ایک ہلکے پھلکے پروگرام کو کدھر لے جا رہی ہو؟ تم جانتی ہو کہ اگر انتہا پسندوں کو ہمارے مقصد کا ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو ہماری جان خطرے میں پڑ جائے گی ویسے بھی میں نے سنا ہے کہ آئے دن یہاں ٹی وی چینل کی عمارت کے قریب بمباری ہوتی رہتی ہے۔"

"ہاں ہوتی رہتی ہے، لیکن اب مجھے ڈر نہیں لگتا، پہلے لگتا تھا، اب میرا ماننا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگر مجھے زندہ رکھا ہے تو میری زندگی کا کچھ نہ کچھ مقصد ضرور ہوگا اور میں اس مقصد کو پورا کروں گی۔"

"لیکن یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ تمہاری زندگی کا مقصد کیا ہے؟"

"مجھے میرے حالات بتا رہے ہیں کہ وہ مجھے کدھر لے جا رہے ہیں میں خود بہ خود ایک ایسے راستے پر چل پڑی ہوں جس کے بارے میں میں نے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا اس کا مطلب ہے کہ میرے رب کی مرضی یہی ہے۔" آزادے نے کہا اور کامی حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا وہ اس کی امید سے زیادہ ہی سمجھداری کی باتیں کر رہی تھی۔

"بولو، تم کیا کہتے ہو، میرا ساتھ دو گے؟"

"ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

"اس پروگرام کو زیادہ سے زیادہ حب الوطنی کا رنگ دینا، فی الحال میں بس اتنا ہی کہوں گی۔"

"ٹھیک ہے..... میں تیار ہوں۔" کامی نے اس کی طرف مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"ہمارا اگلا پروگرام آنے والی جمعرات کو ریکارڈ ہوگا اس کا ٹاپک بچوں کو نظر انداز کرنا یا ان پر بے جا تشدد ہوگا۔ میں اس سے متعلق ایک نظم پیش کروں گی اور ایک گیت تمہارا بھی ہوگا اس کے علاوہ ہمیں پروگرام سے متعلق کچھ میٹر بھی تیار کرنا ہوگا، جس میں سے میں کچھ سوالات ترتیب دوں گی جو پروگرام کے شروع میں میں ڈاکٹر رجبی سے پوچھوں گی، پروگرام کے درمیان میں ایک وقفہ ہوگا جس میں مہمانوں کو کھانا پیش کیا جائے گا، کیونکہ پروگرام کی ریکارڈنگ کے دوران کسی کو بھی باہر جانے کی اجازت نہیں ہوگی، اس سے سیکورٹی کے مسائل پیدا ہونے کا خطرہ ہے وقفے کے بعد پروگرام کا دوسرا حصہ ریکارڈ کیا جائے گا، تمہیں یہ سب بتانے کا مقصد یہ ہے کہ تم بھی میری مدد کرو اور اس ٹاپک پر جتنا بھی میٹر جمع کر سکتے ہو وہ کر لو۔"

"ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔" کامی نے آزادے کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم اس کی وجہ نہیں پوچھوگی کہ میں اس کام کے لیے کیوں تیار ہو گیا ہوں؟"

"کیوں تیار ہو گئے ہو؟" آزادے نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور اب تمہارے دل میں موجود تمہارے وطن کی محبت نے مجھے اور بھی متاثر کیا ہے تمہاری قدر اور تمہاری محبت میری نظروں میں بڑھ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

گئی ہے۔"

"شکریہ کامی۔" آزادے نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں سوچ رہی ہوں آج رات کابل کے ایک رہائشی کے گھر جاؤں وہاں سے مجھے خاصا مواد مل سکے گا۔"

"رات کو...... تمہیں وہاں کیا مواد ملے گا؟" کامی نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے اس سلسلے میں اپنے ڈیڈی سے بات کی تھی انہوں نے بتایا کابل میں ہمارا آبائی گھر ہے اس کے پڑوس میں گل خان کی فیملی رہتی ہے، گل خان بہت سخت گیر طبیعت کا مالک ہے وہ اکثر اپنے بچوں اور بیوی پر تشدد کرتا تھا وہ لوگ ڈیڈی کو جانتے ہیں ڈیڈی نے انہیں بتایا ہے کہ میں ان سے ملنے ان کے گھر جانا چاہتی ہوں وہ مجھ سے ملنے کے لیے تیار ہیں ڈیڈی نے مجھے ان کا ایڈریس بھی دے دیا ہے۔"

"کیا تم یہاں کے راستوں سے واقف ہو؟" کامی نے فوراً پوچھا۔

"نہیں۔" آزادے نے جواب دیا۔ "میں جب یہاں سے گئی تو پانچ سال کی تھی اور اب واپس آئی ہوں یہاں کے گلی کوچوں اور راستوں سے واقف نہیں ہوں۔"

"تو پھر ہمیں کسی ایسے شخص کی ضرورت ہوگی جو یہاں کا رہائشی ہو اور راستوں سے واقف ہو۔"

"قاسم ابراہیم ہے وہ یہاں کا رہائشی بھی ہے اور باتیں کرنے میں بھی اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

"تو پھر تمہیں قاسم کو اپنے ساتھ ملانا ہوگا، اور اگر یہ بات ہمارے درمیان سے نکل گئی تو اس پر عمل کرنا ممکن نہیں ہوگا کیونکہ کوئی بھی اتنے خراب حالات میں ہمیں باہر نہیں نکلنے دے گا، یہاں چپے چپے پر انتہا پسندوں کا راج ہے۔ تم بھی جب سے آئی ہو ایسی کئی مثالیں دیکھ چکی ہو۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن یہ کام مجھے آج ہی کرنا ہے کیونکہ اگلی ریکارڈنگ کے لیے زیادہ وقت نہیں ہے اور مجھے اپنا اسکرپٹ تیار کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں تم مجھے انفارم کر دینا۔" کامی نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔

آزادے نے آدھے گھنٹے میں قاسم سے بات کر کے اسے تیار کر لیا تھا اور طے پایا تھا کہ وہ تینوں قاسم ہی کی گاڑی میں گل خان کے گھر جائیں گے اور اس کے لیے رات کے کھانے کے بعد کا وقت مقرر کیا گیا تھا۔

اس رات قاسم کی گاڑی جب گل خان کے گھر کے دروازے پر رکی تو دروازہ گل خان کی بیوی یاسمین نے کھولا تھا۔

"گل خان گھر پر موجود نہیں ہے اور اپنے کاروبار کے سلسلے میں دوسرے شہر گیا ہوا ہے۔ وہ کل تک واپس آئے گا اسی لیے میں نے آپ کو آج بلا لیا، اس کے سامنے تو میں بالکل کوئی بات نہیں کر سکتی تھی۔" یاسمین نے کہا اور انہیں ایک کمرے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

"ڈیڈی نے بتایا تھا کہ گل خان کا رویہ آپ کے اور بچوں کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔" آزادے نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا قاسم اور کامی بھی سامنے والی کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔

"تمہارا شوہر کس بات پر غصہ کرتا ہے؟" آزادے نے پوچھا۔

"اس کے غصہ کرنے کے لیے کسی بات کا ہونا ضروری نہیں ہے وہ کسی بھی بات پر غصہ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ مثلاً اگر کسی بچے کو باہر سے گھر آنے میں کچھ دیر ہو جائے تو وہ اس کو ڈانٹنا شروع کر دیتا ہے اور پھر نوبت مار پٹائی تک آ جاتی ہے یا اگر بچے گھر میں کھیل رہے ہوں تو شور مچانے کی شکایت کر کے بلاتا ہے بس اس کی عادت ہے وہ برداشت نہیں کرتا۔" یاسمین نے کہا۔

"آپ نے اسے کبھی سمجھایا نہیں کہ بچوں کے ساتھ محبت سے پیش آنا چاہیے۔" کامی نے کہا۔

"بہت سمجھایا...... وہ کہتا ہے کہ میں نے ہی بچوں کو بگاڑا ہے۔"

"اگر ہم تمہاری فیملی کے بارے میں ٹی وی پر بتائیں گے تو اسے اعتراض تو ہوگا؟" قاسم نے کہا۔

"نہیں وہ ٹی وی نہیں دیکھتا اور ویسے بھی میں چاہتی ہوں تم بچوں کے نام بدل دینا۔" یاسمین نے کہا۔

"ٹھیک ہے یاسمین، میں تم سے ایک اور درخواست بھی کروں گی کہ اگر ممکن ہو تو ایسے بچوں اور عورتوں کی کہانیاں مجھے بتاسکو جو کم تعلیم کی وجہ سے، غربت کی وجہ سے کسی جسمانی کمزوری کی وجہ سے لوگوں کے ظلم کا شکار ہو رہے ہوں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اور انہیں یہ پتا نہ ہو کہ وہ اس مصیبت سے خود کو کیسے بچا سکتے ہیں، میں ایسے افغانی بہن بھائیوں اور بچوں کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں ضرور بتاؤں گی۔" یاسمین نے وعدہ کیا۔

"تم اس نمبر پر مجھ سے بات کر سکتی ہو۔" آزادے نے اپنا فون نمبر اسے دے، آزادے سے کارڈ لینے کے بعد یاسمین کمرے سے نکل گئی تھی اور کچھ دیر بعد جب واپس آئی تھی تو اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں گرما گرم چائے اور افغانی کلچے رکھے تھے۔

"ارے اس کی کیا ضرورت تھی؟" قاسم نے جلدی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارے گھر سے کوئی مہمان تواضع کے بغیر چلا جائے افغان کتنے مہمان نواز ہوتے ہیں آپ کو تو پتا ہی ہوگا۔" یاسمین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کامی، جلدی کرو، میرا خیال ہے ہمیں زیادہ دیر نہیں لگانا چاہیے۔" آزادے نے صرف چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

آزادے نے بچوں کے ساتھ زیادتیوں کے عنوان سے جو پروگرام کیا تھا وہ بہت پسند کیا گیا تھا ہال میں موجود لوگ تعریفی انداز میں تالیاں بجا رہے تھے اور پروگرام کے بعد آزادے کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ کچھ اس سے آٹوگراف لے رہے تھے اور کچھ مزید اصلاحی پروگراموں کے لیے مشورے دے رہے تھے جنہیں آزادے کے کہنے پر اس کا اسٹنٹ وکی نوٹ کر رہا تھا، اس پروگرام کے بعد آزادے کا اگلا پروگرام شادی کے عنوان پر تھا جس میں لڑکیوں کے حقوق کا بہت کم خیال رکھا جاتا ہے ان کی مرضی، ان کا مہر، ان کا جہیز ہر معاملے میں ان کی حق تلفی ہوتی ہے اس کے لیے بھی وہ بہت سے لوگوں سے ملی تھی اور بہت سے اہم پوائنٹ اس نے نوٹ کیے تھے کھانے کے وقفے کے دوران مہمانوں کی مووی بنائی جا رہی تھی، تب ہی ایک ادھیڑ عمر عورت ہرے کلر کا حجاب پہنے آزادے سے بغل گیر ہوئی، آزادے نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں بھوری تھیں جن میں آزادے کے لیے ستائش چھپی

ایک فقیر کی سچی بات

مغرب کا رہنے والا ایک فقیر حلب کے کپڑا فروشوں کی لائن میں کہہ رہا تھا: اے مال والو! اگر تم لوگ انصاف کرتے یعنی غریبوں کو ان کا حق دیتے اور فقراء کی جماعت کو قناعت ہوتی تو دنیا سے بھیک مانگنے کی رسم اور طریقہ ختم ہو جاتا۔ (گلستان ص ۱۰۵)

فائدہ: مال دار کے لیے بخل کرنا اور غریب کے لیے بلا ضرورت سوال کرنا بدترین عیب ہے۔

ایم اے فاروق...... حیدرآباد

تھی اس نے آزادے کا ہاتھ تھام لیا۔

"میری فیملی اور میں مزار شریف سے آئے ہیں، مجھے عاطفہ کہتے ہیں۔" اس عورت نے کہا اور آزادے نے اندازہ لگایا کہ اس سفر میں اس کے کم از کم چھ گھنٹے لگے ہوں گے۔

"آپ کی آمد کا شکریہ۔" آزادے نے مسکراتے ہوئے کہا اور عورت کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اس نے پھر آزادے کو گلے سے لگا لیا تھا اور آزادے سوچ رہی تھی کہ وہ عورت آخر اتنی جذباتی کیوں ہو رہی ہے۔

"میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ جب سے میرے شوہر نے آپ کا پچھلا پروگرام دیکھا ہے اب وہ میرے بچوں کو نہیں مارتا اور یہ صرف آپ کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔"

آزادے نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا، اسے لگ رہا تھا کہ کہیں وہ بھی سارے مہمانوں کے سامنے اس عورت کی طرح جذباتی ہو کر رونے نہ لگے، اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ لوگوں کی بھلائی کے لیے سوچنا اور کام کرنا کتنا اعلیٰ عمل ہے ایسا کر کے کتنی خوشی ہوتی ہے۔

"مجھے آپ کا آج کا پروگرام بھی بہت پسند آیا جو آپ نے شادی کے بارے میں کیا ہم سب کو اپنی سوچ بدلنے کی ضرورت ہے تو آسانیاں خود ہی پیدا ہو جائیں گی۔" عاطفہ نے کہا۔

"ہاں بالکل...... میں نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہم شادی کے اخراجات کو کم بھی کر سکتے ہیں، بھلا بہت

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

دور کے رشتے دار جن سے برسوں ملنا ہی نہیں ہوتا انہیں بلانے کی کیا ضرورت ہے انہیں کم کرنے سے خرچا بہت کم کیا جا سکتا ہے۔'' آزادے نے کہا۔

''ہاں...... ہم بھی اس بات سے متفق ہیں۔'' قریب کھڑی کچھ خواتین نے کہا۔

اس رات ڈیوڈ نے آزادے کو بتایا تھا کہ صبح نو بجے وہ اس کے شو کے پروڈیوسر کے ساتھ ایک میٹنگ کرنا چاہتا ہے اور آزادے نے اسسٹنٹ وکی کو متعلقہ لوگوں کو اطلاع دینے کے لیے کہہ دیا تھا پھر واپسی پر گیسٹ ہاؤس میں آزادے کو اس کے کمرے کے باہر چھوڑتے ہوئے کامی ٹھٹک گیا تھا۔

''آؤ، ایک کپ کافی پیتے ہیں سکون سے۔'' آزادے نے اسے آفر کی۔

''ہاں... ٹھیک ہے۔'' کامی نے فوراً حامی بھری جیسے اسے اس موقع کا انتظار ہی تھا۔

''تم یہاں بیٹھو۔'' آزادے نے پچھلی بالکنی میں رکھے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کامی سے کہا

بالکنی سے باہر کا منظر صاف نظر آرہا تھا، جس سمت دور دور تک پھیلی آبادی کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ جو اندھیرے میں عجیب سماں پیدا کررہی تھیں، وقفے وقفے سے انتہا پسندوں کی جیپیں گزر جاتی تھیں، جن میں بڑی بڑی شلوار قمیصوں میں ملبوس طالبان ہاتھوں میں ہتھیار لیے نعرے مارتے گزر جاتے تھے۔ شہر بھر پر خوف طاری تھا۔

''میں ابھی کافی لے کر آتی ہوں۔'' آزادے نے کہا اور اندر چلی گئی پھر کچھ دیر بعد جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی ٹرے میں کافی کے دو کپ رکھے تھے اور ایک پلیٹ میں کچھ بسکٹ بھی تھے، اس نے لباس تبدیل کرلیا تھا، اب اس نے سلیپنگ گاؤن پہنا ہوا تھا، بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔

''میرا خیال ہے تمہاری کافی کی دعوت قبول کرکے میں نے غلطی کردی۔'' کامی نے کہا۔

''کیوں، تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟'' آزادے نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیونکہ تمہیں دیکھ کر احساس ہورہا ہے کہ تم اب آرام کرنا چاہتی ہو۔''

''ہاں، یہ تو سچ ہے لیکن اتنی مصروف زندگی ہوگئی ہے کہ اپنے لیے تو وقت ہی نہیں ملتا۔'' آزادے نے اداسی سے کہا۔

''اچھا... تم بھی اس طرح سوچتی ہو؟'' کامی نے کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے کہا ''میں تو سمجھتا تھا کہ تم نے اپنے کام کی مصروفیت میں اپنے آپ کو بھلا دیا ہے۔''

''ایسا نہیں ہے۔'' آزادے نے آہستہ سے کہا۔

''دراصل میں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اپنے شو کی بہترین تیاری پر لگانا چاہتی ہوں تاکہ اس میں کوئی نقص نہ رہ جائے اور میں لوگوں کی جو مدد کرنا چاہتی ہوں وہ کرسکوں...... آج تم نے دیکھا؟ ابھی تو شروعات اور خواتین کس طرح پروگرام کی تعریف کررہی تھیں۔ وہ کتنی دور دور سے یہ شو دیکھنے آرہی ہیں۔''

''ہاں، وہ بہت خوش ہیں ایک تو انہیں تفریح کا ذریعہ میسر آگیا ہے اور دوسرے اس پروگرام میں اس ان کے مسائل کے بارے میں بھی بات ہوتی ہے اور انہیں اچھے مشورے دیئے جاتے ہیں جو بہترین ماہرین انہیں دیتے ہیں۔'' کامی نے کہا۔

''ایک بات پوچھوں آزادے؟'' کچھ دیر بعد کامی نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے اس سے کہا۔

''ہاں، پوچھو۔''

''تم نے آئندہ کے لیے کیا سوچا ہے؟'' کامی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''آئندہ......؟ وہ دراصل وکی کے پاس تفصیل لکھی ہے میری تمام مصروفیات کی تفصیل وہی نوٹ کرتا ہے اور موقع آنے پر مجھے ریمائنڈ کرادیتا ہے شاید مجھے کئی دوسرے ملکوں میں بھی شو......'' آزادے بولتے بولتے رک گئی کیونکہ کامی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا تھا وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

''میں شو کے بارے میں نہیں تمہارے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔'' کامی نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ''تم کیا سمجھتی ہو میں عراق سے یہاں کیوں آگیا ہوں یہاں کیا کررہا ہوں میرا یہاں آنے کا مقصد صرف تمہارے شوز میں شرکت کرنا ہی نہیں تھا میں تمہاری قربت چاہتا ہوں اور تمہیں پسند کرتا ہوں۔''

کامی نے بہت آسانی سے وہ سب کچھ کہہ دیا جو وہ کافی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

عرصے سے خود اس سے کہنا چاہتی تھی لیکن اپنے اندر ہمت نہیں رکھتی تھی وہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''جب میں نے عراق میں تمہارے ساتھ کئی شو کیے تب ہی تم میرے دل میں سما گئی تھیں اور میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بناؤں گا، لیکن میں مناسب موقع کی تلاش میں تھا تا کہ تم سے اپنی خواہش کا اظہار کرسکوں۔''

''لل...... لیکن کامی......''

''اگر تمہیں اعتراض ہے تو بتادو۔'' کامی نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''ابھی میں نے اس بارے میں کچھ سوچا نہیں...... شاید یہ فیصلہ میرے والدین کریں یا پھر کچھ وقت کے بعد میں ہی کروں۔'' آزادے نے آہستہ سے کہا۔

''اور میرے بارے میں خیال کیا ہے؟'' کامی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''برا نہیں۔'' آزادے نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کچھ اپنے بارے میں اور اپنی فیملی کے بارے میں بتاؤ کامی۔'' اس نے کہا تو کامی کا اندازہ ہوا کہ اگر وہ اس کے بارے میں جاننا چاہتی ہے تو یقیناً کسی حد تک اس میں دلچسپی رکھتی ہوگی۔

''میرا تعلق ایک متوسط فیملی سے ہے میرے والد ایک اسکول میں ٹیچر تھے پھر انقلاب عراق کے وقت جب امریکہ نے عراق پر شدید گولہ باری کی تو ایک حادثے میں شہید ہوگئے، میں اس وقت بہت چھوٹا تھا میری دو بہنیں ہیں جن کی اب شادی ہوچکی ہے اور میں ہی اپنی والدہ کے ساتھ رہتا ہوں، میں نے سوفٹ ویئر انجینئرنگ میں ماسٹرز کیا ہے اور شوقیہ طور پر میوزیکل شوز میں حصہ لیتا رہتا ہوں۔'' کامی نے اپنا مختصر سا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''تمہاری پروفائل تو بری نہیں...... مجھ سے خاصی ملتی ہوئی ہے۔'' آزادے نے ہنستے ہوئے کہا۔

''صرف تم سے ہی نہیں بلکہ تیسری دنیا کے سارے ترقی پذیر ممالک کے عوام کی پروفائل ایسی ہی ہے۔'' کامی نے ہنستے ہوئے مزاحیہ انداز میں کہا، اسی وقت کہیں دور ایک زور دار دھما کا سنائی دیا۔

''یا اللہ رحم۔'' بے ساختہ آزادے کی زبان سے نکلا۔

''ڈر گئیں؟'' کامی نے سنجیدگی سے آزادے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں...... ڈرتی تو یہاں واپس نہ آتی...... واپس بھی آ گئی ہوں اور اکیلے یہاں رہ کر حالات کا مقابلہ بھی کر رہی ہوں...... یہ میرا وطن ہے۔ اگر یہاں کچھ مشکلات تھیں یا ہیں تو انہیں ہم ہی دور کریں گے اور اس جگہ کو رہنے کے قابل بنائیں گے میرے والدین نے شاید غلطی کی تھی جو یہاں سے چلے گئے۔'' آزادے نے کہا۔

''ممکن ہے کہ وقت کے لحاظ سے ان کا فیصلہ درست رہا ہو اللہ تعالیٰ کو تم لوگوں کی زندگیاں بچانا تھیں۔'' کامی نے جواب دیا اور کھڑا ہوگیا۔ ''اچھا، میں چلتا ہوں رات زیادہ ہوگئی ہے صبح نو بجے ڈیوڈ کے ساتھ میٹنگ بھی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' آزادے نے آہستہ سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''اپنا خیال رکھنا۔'' کامی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا اور آزادے نے مسکرا کر سر جھکا دیا۔

''دوسری صبح مقررہ وقت پر آزادے شو کے پروڈیوسرز گیسٹ ہاؤس کے ہال میں جمع ہوگئے تھے، لیکن چند کچھ تاخیر سے پہنچے تھے جس کی وجہ کابل کی سڑکوں پر ٹریفک کی زیادتی تھی۔ کیونکہ رات جس علاقے میں بم دھما کا ہوا تھا وہاں خاصی تباہی ہوئی تھی اور ٹریفک کا راستہ تبدیل کردیا گیا تھا۔

''آج اس میٹنگ میں شرکت کرنے کے لیے میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔'' ڈیوڈ نے بولنا شروع کیا۔ ''میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آئی ٹی وی اور آزادے شو اشتہارات کے سلسلے میں کیا کر رہے ہیں۔'' اس مقصد کو بیان کرنے کے لیے اس نے پروڈیوسر اسٹیو کو اشارہ کیا تھا۔

''جو کمپنیز اس شو کے لیے اشتہارات دے رہی ہیں انہیں ابھی تک اس پروگرام کی مقبولیت کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔'' اسٹیو نے کہنا شروع کیا۔ ''ہمارے اشتہارات کے تمام slots فروخت ہوگئے ہیں۔ نہ صرف آزادے پروگرام کے بلکہ اور دوسرے پروگراموں کے بھی۔''

''اوہ مجھے بہت خوشی ہوئی میری طرف سے آپ سب لوگوں کو بہت بہت مبارک ہو۔'' آزادے نے وہاں موجود سب لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔

''ہماری ایڈورٹائزنگ ٹیم اب بھی دوسری کمپنیوں کے

ساتھ باقی تفصیلات طے کر رہی ہے ان میں بینک العزیز بھی ہے جو اپنے اشتہارات میں آزادے کی تصویریں استعمال کرتے ہیں اس کے علاوہ رحیم گردیزی کمپنی جو افغانستان کی سب سے بڑی اسٹیل کمپنی ہے اور کوکا کولا کی طرح ہماری بڑی اشتہاری کمپنی کے طور پر سامنے آئی ہے اور مستقبل میں افغانستان میں اہم کردار ادا کرنا چاہتی ہے۔ اس کے علاوہ Etisalot ایک سیلولر کمپنی ہے اور اس ٹیلی کمیونی کیشن نے سارے افغانستان میں جگہ جگہ نیٹ ورک کے لیے ٹاورز لگا دیے ہیں اور میری اور ڈیوڈ کی کئی میٹنگز ان کے ساتھ ہو چکی ہیں۔'' اسٹیو نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اور ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آخر دو امریکی اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر یہاں کیوں رہ رہے ہیں۔'' ڈیوڈ نے اپنی اور اسٹیو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے انہیں بتایا کہ جو جوان افغانی اپنی اور اپنی فیملی کی نئی زندگی یہاں بسر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ان کی مدد کر سکیں اور ان کے ملک کے استحکام میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔''

''ہم افغانستان میں ٹیلی ویژن کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔'' اسٹیو نے کہا۔ ''آزادے، کا شو اس وقت امریکہ میں افغانستان سے براڈ کاسٹ ہونے والا واحد خواتین کا شو ہے جس کی پروڈیوسر خاتون بھی ہے۔'' اسٹیو نے نیلوفر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ افغانستان کی فیملیز، خواتین، بچوں اور مردوں کے لیے ہے یہ افغانستان کی ایک تازہ آواز ہے اور آئی ٹی وی کی روزانہ آٹھ گھنٹے کی نشریات سے ہمیں 2.5 ملین ڈالرز کی آمدنی ہو گی۔''

''اوہ زبردست۔'' آزادے نے کہا۔

''لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم شدت پسندوں کے سائے میں کام کر رہے ہیں جنہیں کبھی بھی ہمارا پروگرام پسند نہیں آئے گا خاص طور سے آزادے اس میں لوگوں کے جو گھریلو یا معاشرتی مسائل پیش کرنا چاہتی ہے۔''

''اس کے علاوہ میں ایک اور بات بھی آپ لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں۔'' ڈیوڈ نے پھر گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگوں کی اطلاع کے لیے آئی ٹی وی کے مالک فہیم ہاشمی نے حال ہی میں شدت پسندوں کے نمائندوں سے بات کی ہے اور انہیں ایک مخصوص رقم ہر ماہ دینے کی پیش کش کی ہے تا کہ وہ اسٹیشن ٹرانسمیشنز کو تباہ نہ کریں۔'' ڈیوڈ نے اسٹیو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ہال میں بیٹھے لوگ بھی آہستہ آہستہ سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے تھے۔

''ویسے تو شدت پسندوں سے حفاظت رکھنا ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں ہے لیکن ہم اس بات کو یقینی بنانا چاہتے ہیں کہ ہماری نشریات میں وقفہ نہ آئے۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

''اور اگر ہم سے رقم لے کر انہوں نے اسے اپنے خودکش حملوں پر لگایا تو؟'' ہال میں موجود ایک شخص نے کہا۔

''اس پر تو ہم کوئی پابندی نہیں لگا سکتے، لیکن ہمیں اپنے اسٹیشن کی نشریات کو جاری رکھنے کے لیے یہ کرنا ہو گا۔''

''کہیں آئی ٹی وی کسی مصیبت میں نہ پڑ جائے، شدت پسندوں کی وجہ سے۔'' کامی نے آہستہ سے آزادے کے کان میں سرگوشی کی تو اس نے آنکھوں کے اشارے سے اسے روک دیا۔

''ہم نے یونیورسٹی کے کچھ طلبا کی ٹیم بنائی ہے جو گھر گھر جا کر آئی ٹی وی کی نشریات کے بارے میں لوگوں کا فیڈ بیک لیں گے۔ یہ ٹیمیں کابل، جلال آباد، مزار شریف اور قندھار میں کام کریں گی اس سے ہمیں معلومات حاصل ہوں گی وہ ہم اپنے ایڈورٹائزر کو دکھا سکتے ہیں کہ کتنے لوگ ہمارے پروگرام دیکھتے ہیں۔'' ڈیوڈ نے کہا۔ پھر اس نے ہال میں بیٹھے لوگوں کی طرف بغور دیکھا تھا۔

''کیا کوئی کچھ سوال کرنا چاہتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے کوئی سوال نہیں پوچھنا۔'' آزادے نے سب سے پہلے کہا۔ ''میں تو آپ سب کو مبارکباد دینا چاہتی ہوں، اس میٹنگ میں مجھے شریک کرنے کا شکریہ، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے دراصل میں کچھ یتیم بچوں کو لنچ کے لیے لے کر باہر جا رہی ہوں۔'' آزادے نے کہا۔

آزادے کی ٹیم بچوں سے دوستی غیر متوقع طور پر شروع ہوئی تھی۔ اس سال کے شروع میں جب وہ کابل میں تھی اور اپنے شو کی تیاری کر رہی تھی تو اسے بہت سے گمنام خط آئے جس میں اس سے درخواست کی جاتی تھی کہ وہ ان کے اشتہارات میں کام کرے، ان میں ملک کی دو مشہور کمپنیز بھی شامل تھیں ایک عزیزی بینک اور دوسرا کابل بینک 2010ء کے شروع میں اپنے فنانشل معاملات میں کچھ دشواریاں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ہومیوڈاکٹر محمد ہاشم مرزا

ڈاکٹر صاحب مرحوم 50 سال سے زائد عرصہ طب کے شعبے سے وابستہ رہے اور 20 سال سے زائد عرصہ "ماہنامہ آنچل" کے معروف سلسلے "آپ کی صحت" کے ذریعے قارئین کو ہومیوپیتھک طریقہ علاج کے مطابق طبی مشورے فراہم کرتے رہے۔ مندرجہ ذیل دوائیں ڈاکٹر صاحب کے 50 سالہ طبی تجربے کا نچوڑ ہیں۔

قدرتی بال، سر کی رونق بحال

ایک بوتل بذریعہ منی آرڈر

قیمت 700/= روپے

براہ راست کلینک سے لینے پر قیمت 500/= روپے

چہرے و دیگر غیر ضروری بالوں کا مستقل خاتمہ

ایک بوتل بذریعہ منی آرڈر

قیمت 900/= روپے

براہ راست کلینک سے لینے پر قیمت 800/= روپے

ایفروڈائٹ بریسٹ بیوٹی

ایک بوتل بذریعہ منی آرڈر

قیمت 600/= روپے

براہ راست کلینک سے لینے پر قیمت 500/= روپے

ایفروڈائٹ پین کلر

ایک بوتل بذریعہ منی آرڈر

قیمت 700/= روپے

براہ راست کلینک سے لینے پر قیمت 500/= روپے

منی آرڈر بذریعہ پاکستان پوسٹ بھیجنے کا پتا:
منی آرڈر کرنے کے بعد فارم نمبر، نام، ایڈریس، مطلوبہ دوا، بھیجی گئی رقم، 0320-1299119 پر SMS کردیں

ہومیوڈاکٹر محمد ہاشم مرزا کلینک

ایڈریس: دوکان نمبر C-5، کے ڈی فلیٹس فیز 4،
شادمان ٹاؤن نمبر 2، سیکٹر B-14، نارتھ کراچی 75850
فون نمبر: 021-36997059، صبح 10 تا رات 9 بجے
منی آرڈر کی سہولت میسر نہ ہونے کی صورت میں فون پر رابطہ کریں

زیر نگرانی:
محمد عاصم مرزا
محمد آصف مرزا
محمد عامر مرزا

Waqar Az
Pakistanipoint.com

پیش آئیں جنہیں دور کرنے کے لیے انہوں نے کچھ اشتہارات بنوائے اور آزادے کو ان میں اداکاری کرنے کے لیے آمادہ کرلیا اور اس نے کئی اشتہارات میں کام کیا یوں آزادے اپنے شو سے پہلے ان اشتہارات کی وجہ سے مقبول ہوئی اور ان اشتہارات میں اس نے جو لباس زیب تن کیے ان کی مانگ بڑھ گئی اور آزادے اپنے نام کے بجائے عزیزی بینک گرل کے نام سے مشہور ہوگئی ایک موقع پر جب آزادے اپنی والدہ نسرین کے ساتھ ایک میٹنگ میں گئی جو عزیزی بینک کے مالک میر واعظ عزیزی کے دفتر میں تھی تو وہ اسے رخصت کرنے باہر تک آیا۔

”تمہیں پتا ہے تمہارے یہاں ہونے کا اصل سبب کیا ہے؟“ اس نے آزادے سے کہا۔ ”کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ تم واقعی لوگوں کی مدد کرنا چاہتی ہو۔“ آزادے نے اس کی بات پر اثبات میں سر ہلایا تھا۔

آزادے کو یاد تھا کہ جب 2001 میں بہت چھوٹی تھی اور افغانستان میں نئی تبدیلیاں شروع ہو رہی تھیں تب اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی اس تبدیلی کا حصہ بنے وہ اپنے ملک کی سفیر بنے یا کسی بھی طرح اپنے وطن کے لوگوں کی مدد کرے خاص طور سے بچوں کی جو جنگ کے دوران پیدا ہوئے اور جن کی پرورش رفیوجی کمپنیوں میں ہوئی یا طالبات ی نگرانی میں۔

”دراصل میں یتیم بچوں اور مظلوم عورتوں کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔“ آزادے نے آہستہ سے میر واعظ کو جواب دیا۔ ”لیکن میں اپنے شو میں ان کی بات کرسکتی ہوں یہ نہیں جانتی کہ مزید ان کی مدد کیسے کرسکتی ہوں۔“

”کیا تم عزیزی فاؤنڈیشن کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتی ہو؟“ میر واعظ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اس سے پوچھا۔ ”ہماری فاؤنڈیشن کی آمدنی کا بیس فیصد حصہ افغانستان میں یتیم خانوں پر خرچ کیا جاتا ہے جو کابل کے جنوب مغرب میں موجود ہیں۔“

”میں ضرور ایسا کرنا چاہوں گی لیکن میرے وہاں جانے کا مقصد وہاں ان بچوں کے ساتھ تصویریں کھنچوانا نہیں بلکہ واقعی ان کے لیے کچھ کام کرنے کا ہوگا۔“ آزادے نے کہا اور پھر ان کے درمیان طے پا گیا کہ وہ مہینے میں دوبار مراسطون یتیم خانے کا دورہ کیا کرے گی پھر اس نے اپنے پہلے دورے کے بعد میر واعظ کو بتایا تھا کہ ان بچوں کو کس کس چیز کی ضرورت ہے ان میں کپڑے اور کھلونوں کا سامان بھی شامل تھا۔

اس وقت افغانستان میں دو لاکھ یتیم بچے تھے جو اپنے والدین کو یا ان میں سے کسی ایک کو کھو چکے تھے اور جنہیں انہوں نے جنگ میں، تشدد کے واقعات میں یا بیماریوں میں کھویا تھا۔ جن کے صرف والد فوت ہوئے تھے ان کی مائیں ان کے اخراجات پورے نہیں کرسکتی تھیں، بہت سے بچے سڑکوں پر رہنے کے لیے مجبور تھے، مراسطون یتیم خانے افغانستان کی ریڈ کریسنٹ سوسائٹی چلاتی تھی جو شہری لوگو سے بھی فنڈز لیتی تھی کچھ یتیموں کی دیکھ بھال این جی اوز کرتی تھیں، اسی کے لیے آزادے نے میر واعظ سے سامان کی درخواست کی تھی۔

میر واعظ نے جو سامان فراہم کیا وہ بہت بہترین تھا اگلی بار جب آزادے ان بچوں سے ملنے گئی تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بچے اپنے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے وہ حیران تھی کہ ان کے لباس اور جوتے کہاں تھے جو وہ دے کر آئی تھی۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

”وہ ہم سے وہ لوگ لے گئے۔“ ایک بچے نے پوچھنے پر بتایا اور آزادے کو اندازہ ہوگیا کہ ”وہ“ کا مطلب مراسطون یتیم خانے کی انتظامیہ کے لوگ ہی تھا، کیونکہ میر واعظ نے اسے پہلے ہی خطرہ ظاہر کیا تھا کہ ایسا ہوتا ہے کہ وہاں کی انتظامیہ دیا جانے والا نیا سامان بچوں کو نہیں دیتی اور واپس بازار میں بیچ کر پیسہ رکھ لیتی ہے چنانچہ آزادے مراسطون یتیم خانے کے ڈپٹی چیف سے ملی جو حاجی علی اکبر ڈوہاندی تھا اور اس کو پابند کیا کہ آئندہ وہ بچوں کے لیے جو بھی کچھ لائے گی وہ بچوں کو دیا جائے گا اور آزادے اس کے بارے میں خود حاجی اکبر سے پوچھے گی۔

اس کے بعد سے آزادے اکثر ان بچوں کو فیلڈ ٹرپس پر لے جاتی تھی کبھی کشتی رانی، کبھی کسی بڑے ہوٹل میں جہاں انہیں نہانے کے بڑے بڑے تالاب دکھاتی، خوبصورتی سے سجے ہال دکھاتی، جہاں فانوس آویزاں ہوتے انہیں کھانا کھلانے کے لیے پورے پورے ہال ریزرو کرواتی جہاں وہ آزادی سے گھومتے اور ان کے لیے افغانی روایتی کھانوں کے ساتھ ساتھ انواع واقسام کے غیر ملکی کھانے بھی ہوتے

اور آزادے سارے ہال میں انہیں کھانا کھاتے دیکھ کر خوش ہوئی، وہ یونہی اپنے خیالوں میں مگن تھی کہ اسے کامی نے چونکایا۔

"آزادے..... آزادے۔" کامی نے اسے آواز دیتی۔

"ہوں..... کک..... کیا ہوا؟" آزادے نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"تم کس سوچ میں پڑ گئیں..... ہال خالی ہو گیا..... میٹنگ ختم ہو گئی..... سب لوگ چلے گئے۔ میں دیکھ رہا ہوں تمہیں ارد گرد کا کچھ ہوش نہیں پتہ نہیں کہاں گم ہو؟" کامی نے کہا تو وہ ہنس دی۔

"تم چلو گے میرے ساتھ آج میں مراسطون یتیم خانے کے بچوں کو ایک بڑے ہوٹل میں لنچ کروانے لے جا رہی ہوں میں چاہتی ہوں تم بھی چلو۔" آزادے نے کہا اور کامی نے اثبات میں سر ہلایا۔

ہوٹل کے احاطے میں دور دور تک سبزہ لگا تھا احاطے کے باہر سخت سیکورٹی تھی کسی غیر متعلقہ شخص کو اندر آنے کی اجازت نہیں تھی وہاں مراسطون یتیم خانے کے بچے آزادے کے مہمان بن کر آئے تھے۔ احاطے میں جگہ جگہ بچوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ وقفے وقفے سے لگی میزوں کے درمیان دس دس فٹ کا فاصلہ تھا، ہر میز کے گرد دس بچوں کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں لگی تھیں اور ہر میز پر ان کی ایک نگہبان گائیڈ موجود تھی، بچے خوب صورت ملبوسات میں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے، کچھ اونچائی پر ایک اسٹیج سجا تھا، جس پر آزادے اور کامی آرکسٹرا کے قریب بیٹھے اپنے بچوں کے لے پیش کیے جانے والے نغموں کی ریہرسل کر رہے تھے۔ مراسطون یتیم خانے کے عملے کے کچھ لوگ اسٹیج کے سامنے لگے صوفوں پر بیٹھے تھے اور جگہ جگہ آئی ٹی وی کے کیمرے لگے تھے، کیونکہ آج یہاں ہونے والی میوزیکل کنسرٹ اور یتیم بچوں کی تقریب کو فلمایا جانا تھا۔

"اچانک رضا کاروں میں بجلی کی لہر سی دوڑ گئی وہ سب عجلت میں اپنی لائنیں درست کرنے لگے اور چند ایک گیٹ کی طرف بھی لپکے۔

"مہمان خصوصی آ گئے ہیں۔" کسی نے اسٹیج کے قریب سے گزرتے ہوئے اونچی آواز میں کہا اور اچانک اسٹیج کا پردہ گرا دیا گیا۔

"خواتین و حضرات، انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں، مبارک ہو ہمارے مہمان خصوصی جناب میر واعظ عزیزی تشریف لا چکے ہیں۔" فضا میں لیڈی اناؤنسر کی آواز گونجی اور اس کے ساتھ ہی آزادے ڈریسنگ روم کی طرف چلی گئی جہاں اس کے میک اپ اور تیاری کا انتظام کیا گیا تھا، پھر جتنی دیر میں میر واعظ اگلی نشستوں پر تشریف لائے تھے اور پروگرام تلاوت سے اسٹارٹ ہوا تھا آزادے، قاسم ابراہیم اور کامی زرگی کے ساتھ اسٹیج کے پچھلے حصے میں پہنچ گئی تھی پھر جیسے ہی پروگرام شروع ہونے کا میوزک بجا تھا اسٹیج کا پردہ اٹھا تھا اور قاسم ابراہیم اسٹیج پر نمودار ہوا تھا۔

"میں آج آزادے شو میں اپنے مہمان خصوصی محترم میر واعظ عزیزی کو خوش آمدید کہتا ہوں اور ہاں تشریف آوری کے لیے ان کا شکر گزار ہوں ہم نے آج آزادے شو اس ہوٹل میں کرنے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ اس شو میں ہمارے افغانی بچے ہمارے مہمان ہیں جن کی تعداد دو سو پچاس کے قریب ہے اور یہ سب آزادے کے بہترین دوست ہیں، چنانچہ آج کا پروگرام بھی انہی کے بارے میں ہوگا، اس پروگرام کے مہمان خصوصی بھی افغانستان کے علاقے کے ایک مراسطون یتیم خانے اور عزیزی بینک کے سربراہ میر واعظ ہیں سب سے پہلے میں آزادے کو اسٹیج پر بلانا چاہتا ہوں تاکہ وہ اپنی مدھر آواز میں اپنے دوستوں کو خوش آمدید کہیں جو صرف ان کی خاطر یہاں آئے ہیں۔" قاسم نے اپنی بات مکمل کی اور اسٹیج کے پیچھے سے آزادے نمودار ہوئی۔

"معزز مہمان خصوصی آئی ٹی وی انتظامیہ، اور اپنے مہمان بچوں کو سلام پیش کرتی ہوں۔" آزادی نے مائیک تک پہنچ کر بات کا آغاز کیا اس کے قریب ہی کامی بھی آ کھڑا ہوا تھا۔

"میرے دوستو، میں اپنے ہر پروگرام کی طرح اس پروگرام میں بھی آپ کو ایک پیغام دینا چاہتی ہوں۔" اس نے اسٹیج کے سامنے پنڈال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جن میں بچوں کی اکثریت تھی اور جو اسے دیکھ کر زور زور سے تالیاں بجا رہے تھے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"پیارے بچو! میں آج آپ سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں...... جی ہاں...... آپ سے آپ جو دنیا کی نظر میں چھوٹے اور کمزور ہیں لیکن میری نظر میں نہیں...... میں آپ کو بہت طاقتور اور ذہین سمجھتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ دنیا کی اس سوچ کو غلط ثابت کردیں کہ آپ کمزور ہیں اس کے لیے آپ کو ہمت کرنا ہوگی۔ اس کے لیے آپ کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ دنیا ہوگا وہ چاہے آپ کا وقت ہو، آپ کی کوئی صلاحیت ہو، آپ کی دعائیں ہوں یا آپ کی کوئی بھی پسندیدہ چیز، یاد رکھیں بعض اوقات ہمیں پتا ہی چلتا کہ ہم میں کیا خوبی ہے یا ہمارے پاس کیا دولت ہے اور ہم اپنی محرومیوں کا رونا روتے رہتے ہیں، لیکن بعض اوقات ہماری کمزوریاں اور محرومیاں ہی ہماری طاقت بن جاتی ہیں ہماری دعائیں اور ہماری صلاحیتیں ہمارے لیے ترقی کے راستے کھول دیتی ہیں۔"

آزادے چند لمحوں کو سانس لینے کے لیے رکی اور بچوں نے زور زور سے تالیاں بجانا شروع کردیں۔

"یاد رکھیں مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے یا خوابوں کی تعبیر حاصل کرنے کے لیے آپ کو محنت اور مسلسل محنت کرنا ہوگی۔" آزادے نے کہا اور مائیک کے قریب سے ہٹ گئی اب قاسم ابراہم نے ایک مائیک اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

"آج میں آپ کے لیے ایک گیت پیش کررہی ہوں آپ سب بھی میرے ساتھ آواز سے آواز ملا سکتے ہیں۔" آزادے نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر کامی کے ساتھ اسٹیج کے سرے پر آ کھڑی ہوئی قاسم ابراہیم بھی اس کے ساتھ تھا۔

"شیر بچہ افغانی۔" اس نے گانا شروع کیا اور بچوں نے تالیاں بجانا۔

قاسم بھی آگے بڑھ کر آزادے اور کامی کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ تینوں نے ایک ساتھ اپنے سر حاضرین کے سامنے جھکا دیئے اور فضا تالیوں سے گونج اٹھی۔

گانا ختم کرکے آزادے اسٹیج سے واپس چلی گئی تھی۔ جس کے بعد ہوٹل کے بڑے ہال میں مخصوص مہمانوں اور پنڈال میں بچوں کو کھانا سرو کیا گیا تھا۔ آزادے نے اندر ہال میں مہمانوں کے ساتھ لنچ کیا تھا اور پھر کامی کے ساتھ بچوں کے درمیان پنڈال میں آ گئی تھی۔ بچوں کے لئے ہر قسم کے کھانے فراہم کیے گئے تھے۔

آزادے کی نظر شاہ زمان پر پڑی جو دس سال کا بہت خوب صورت بچہ تھا اور آزادے سے خاصا بے تکلف ہو چکا تھا، اس نے کولڈ ڈرنگ کے کئی کین پتلون اور جیکٹ کی جیبوں میں رکھ لیے تھے۔

"شاہ زمان ان کا کیا کرو گے؟" آزادے نے پوچھا۔

"یہ میں نے اپنی امی اور اپنی بہن کے لیے رکھے ہیں۔" بچے نے جواب دیا۔ "وہ کبھی بھی مجھ سے ملنے آتی ہے اور اب جب وہ مجھ سے ملنے آئیں گی تو میں انہیں یہ دوں گا۔" بچے نے کہا۔

آزادے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس بچے کا مستقبل کیا ہوگا کیا وہ پھر کبھی اپنی فیملی کے ساتھ مل کر رہ سکے گا اور کیا کبھی اسے ایسی کوئی تربیت اور تعلیم حاصل ہو سکے گی، جس سے وہ کوئی بزنس کرنے کے قابل ہو سکے یا کوئی ایسی ٹیکنالوجی کا حصہ بن سکے جو افغانستان کی ترقی دینے میں مدد کرے۔ اس نے ذرا سی دیر میں بہت کچھ سوچ لیا تھا، پھر اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ میر واعظ سے بات کرکے کچھ ایسے پروگرام بھی ضرور شروع کرے گی، جن سے ان بچوں کی اعلیٰ تعلیم میں مدد مل سکے۔

"کیا سوچ رہی ہو آزادے؟" کامی نے اسے ٹوکا تو وہ چونکی۔

"بہت ضروری بات ہے میں واپس گیسٹ ہاؤس جا کر تم سے بات کرنا چاہوں گی۔" آزادے نے کہا۔

لنچ سے فارغ ہونے کے بعد پروگرام کا دوسرا حصہ شروع ہوگیا تھا، اس حصے میں سب سے پہلے آزادے کا ایک انٹرویو شامل تھا، جسے کرنے کے لیے سی این این کی ٹیم وہاں موجود تھی۔

س: آپ کے دل میں افغانستان کے بے سہارا اور یتیم بچوں کے لیے کچھ کرنے کا خیال کب اور کیسے آیا؟" اینکر نے اس سے سوال کیا۔

ج: میں، جب بہت چھوٹی تھی تب مجھے کئی بار یہاں کے حالات کی و[illegible] سے کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تب ہی میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ جب بھی مجھے موقع ملا میں اپنے ملک کے حالات بدلنے کے لیے کام کروں گی اور خاص طور سے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ہمارا بچوں کے لیے۔"

س: آپ اپنے شوز میں بہت ہلکے پھلکے انداز میں بہوں سے پردہ اٹھاتی ہیں اور پھر ان کا حل بھی پیش کرتی ہیں اس میں ایسے بھی مسائل ہوتے ہیں جن پر زیادہ لوگ بات نہیں کرتے۔"

ج: اب بھی افغانستان میں انتہا پسند لوگ ہیں۔ یوں سمجھیں کہ چاہے عورت پر تیزاب پھینکا جائے یا اسے مارا جائے وہ طلاق کے بارے میں نہیں سوچ سکتی، یہی اس کی زندگی ہے اسے اُف بھی کرنے کی اجازت نہیں، میرا کام یہ ہے کہ میں انہیں بتاتی ہوں کہ وہ اپنے حقوق کیسے حاصل کر سکتی ہیں، اپنی حدود میں رہتے ہوئے۔

س: آپ کو بہت تحفظ دیا جاتا ہے آپ افغانستان میں رہتے ہوئے بھی خطرناک قسم کے حالات میں بھی کام کرتی ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے اور آپ کو تحفظ کون دیتا ہے؟

ج: ساری دنیا کے وہ لوگ، جو ظلم پسند نہیں کرتے وہ میری مدد کرتے ہیں۔

س: آپ کا مزید کیا کرنے کا ارادہ ہے؟

ج: یہاں ایک آرگنائزیشن پندرہ اسکول بنا رہی ہے میں وہاں ٹیچر ٹریننگ پروگرام شروع کروں گی، میرا یقین ہے کہ تعلیمی اصلاحات ہی افغانستان کے مسائل کا حل ہے۔

س: آپ کی زندگی کا بڑا حصہ کینیڈا میں گزرا آپ وہاں سکون کی زندگی گزار رہی تھیں پھر واپس کیوں آ گئیں۔

ج: یہ ٹھیک ہے کہ میں نے کینیڈا میں زیادہ زندگی گزاری ہے، وہاں تعلیم حاصل کی ہے اور مجھے وہاں کی شہریت بھی حاصل ہے، لیکن میرے والد نے مجھے ہمیشہ یہی سمجھایا کہ کبھی اس بات کو مت بھولنا کہ تم ایک افغانی ہو اور تمہاری یہی پہچان ہے تم وہی خوش قسمت ہو جو سول وار میں یہاں تھیں، ہم نے یہاں کی مشکلات کا سامنا کیا، لیکن خدا نے نا صرف ہمیں محفوظ رکھا بلکہ دوسروں کے لیے بہتری پیدا کرنے کا موقع بھی دیا۔

س: آپ کئی بار مراسطون یتیم خانے گئیں اور ان بچوں سے ملیں ان سے مل کر آپ کو کیا لگتا ہے؟

ج: مجھے ان سے مل کر خوشی ہوتی ہے وہ نہیں جانتے کہ میں ایک بڑی اسٹار ہوں بلکہ وہ مجھ سے خوش ہو کر صرف اس

naeyufaq.com

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے

ماہنامہ آنچل کراچی

ملک کی مشہور معروف قلمکاروں کے سلسلے وار ناول ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں جو آپ کی آسودگی کا باعث ہو سکتا ہے اور وہ ہے صرف آنچل۔ آج ہی اپنی کاپی بک کرائیں۔

تیری زلف کے سر ہونے تک

جاندار اختلاف کے پس منظر میں لکھا گیا اقرا صغیر احمد کا بہترین ناول جو آپ کی سوچ کو ایک نیا رخ دے گا

اکائی

عشنا کوثر سردار کا ایک لازوال ناول جس کا ہر لفظ انمٹ نقوش چھوڑ دے گا

عشق دی ماری میں جھلی

سائرہ قریشی کی دلکش و دل موہ لینے والی تحریر غم و خوشی سے آراستہ ایک ناقابل فراموش کہانی

Info@naeyufaq.com

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں رابطہ کریں (03008264242)

لیے ملتے ہیں کہ میں بھی ان سے محبت سے ملتی ہوں اور انہیں یاد رکھتی ہوں۔

س: اپنے کام کو کرتے ہوئے کبھی آپ کو خطرے کا سامنا ہوا یا کوئی دھمکی وغیرہ ملی؟

ج: وہاں اکثر سامنا ہوتا ہے، بلکہ دھمکی آمیز خطوط اور ای میل تو آتے رہتے ہیں ایک بار تو افغان حکومت نے بھی میرے ایک شو کو نشر ہونے سے رکوا دیا تھا کیونکہ میں نے سر پر اسکارف نہیں پہنا ہوا تھا اور ان کا خیال تھا کہ اگر میں سر پر اسکارف نہیں پہنوں گی تو دوسروں کو بھی ایسا کرنے کی ترغیب دوں گی اور وہ میری تقلید کریں گے۔" آزادے نے ہنستے ہوئے کہا۔

س: آئندہ کے لیے آپ کا ارادہ کیا ہے؟

ج: میں شو کرتی رہوں گی، لباس کا میں خود پورا خیال رکھتی ہوں، میں مسائل پیش کرتی رہوں گی۔" آزادے نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی اسٹیج پر دھیما دھیما بجنے والا میوزک تبدیل ہوگیا۔ اب اس کے بچوں کے لیے گائے جانے والے ایک گیت جدوجہد جاری رکھو کی پرفارمنس کا وقت تھا جو بچے اس گیت میں اس کے ساتھ حصہ لے رہے تھے، وہ رنگ برنگے لباسوں میں باری باری اسٹیج پر آنے لگے اور اپنی اپنی مقررہ جگہ پر کھڑے ہونے لگے، قاسم ابراہیم ان کی مدد کر رہا تھا، آزادے اپنی جگہ سے اٹھی اور تھرکتی ہوئی ان بچوں کے درمیان جا کھڑی ہوئی، ایک مائیک اس کے ہاتھ میں دے دیا گیا تھا سارا پنڈال تالیوں سے گونج رہا تھا۔

وہ باری باری ہر بچے کے قریب جا کر اسے پیار کر رہی تھی اور آخر میں شاہ زمان کے قریب جا کر رک گئی تھی اور اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے روز کے اخبارات میں میراسطون یتیم خانے کے بچوں کے اعزاز میں دیئے جانے والے لنچ اور تقریب کا ذکر موجود تھا جب آزادے گیسٹ ہاؤس ہال میں ناشتہ کرنے پہنچی تو ڈیوڈ اور کامی اسی موضوع پر بات کر رہے تھے، بیٹھتے بیٹھتے ایک اخبار آزادے نے بھی اٹھا لیا تھا۔

"واؤ...... بہت خوب؟ بہت اچھی تصویریں آئی ہیں۔" آزادے نے تعریفی انداز میں کہا۔

"ہاں آزادے تمہارا شو بہت کامیاب جا رہا ہے سارے ملک میں اور ملک کے باہر اس کے چرچے ہو رہے ہیں دنیا کے دوسرے ٹی وی اسٹیشنز بھی ایسے پروگرام کرنا چاہتے ہیں اور تمہیں بحیثیت مہمان ان پروگراموں میں بلانا چاہتے ہیں۔" ڈیوڈ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس کے لیے میں آپ کی بے حد مشکور ہوں۔" آزادے نے کہا اور پھر کسی خیال سے وہ چونکی تھی۔

"ڈیوڈ کیا ایسا ممکن ہے کہ اگر میں چاہوں کہ کسی ایک بچے کو خاصی اہمیت دی جائے تو کیا یہ ممکن ہے؟"

"میں سمجھا نہیں؟"

"میرے کہنے کا مطلب ہے کہ یوں تو ہمارے پروگرام سے متاثر ہو کر بہت سی رضا کار تنظیمیں بھی ہماری مدد کرنے کو تیار ہیں لیکن اگر میں چاہوں کہ کسی ایک بچے پر خاص محنت کر کے اسے زندگی میں کسی اچھے مقام یا عہدے تک پہنچا دیا جائے اس میں ہمارا بھی نام ہوگا۔"

"ایسا بچہ کون ہے؟"

"شاہ زمان...... مراسطون کا دس سالہ شاہ زمان...... جس کے والد کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا تب شاہ زمان بہت چھوٹا تھا اس کی والدہ اور ایک بہن ہے وہ اس کی دیکھ بھال اور تعلیمی اخراجات پورے نہیں کر سکتی تھیں، تب سے وہ مراسطون میں ہی رہتا ہے بہت ذہین ہے اپنی ماں اور بہن کا سہارا بننا چاہتا ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"میں نے اس کی باتیں سنی ہیں وہ اکثر کہتا ہے میں بڑا ہو کر اپنی اپنی اور بہن کے لیے یہ کروں گا۔ وہ کروں گا اور کل کی تقریب میں اس نے اپنے کپڑوں کی جیبوں میں کولڈ ڈرنگ کے کئی کین ڈالے ہوئے تھے، جب میں نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ وہ چاہتا ہے کہ جب اس کی امی اور بہن اس سے ملنے آئیں تو وہ انہیں کولڈ ڈرنگ پیش کر سکے۔"

"بہت خوب، دوسروں کے لیے کوئی اچھا کام کرنا ایک خوبی ہے اگر اس بچے میں یہ جذبہ ہے تو ایک دن وہ ضرور کسی بڑے مقام تک پہنچے گا میں بھی دیکھوں گا کہ میں اس کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔" ڈیوڈ نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" آزادے نے کہا، اسی شام اس نے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کامی سے بھی اس سلسلے میں بات کی تھی اس نے محسوس کیا تھا کہ کامی بھی اپنے اکثر معاملات اس سے ڈسکس کرنے لگا تھا اور اسے بھی ہمیشہ اچھے مشورے ہی دیتا تھا اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ آزادے کے کام میں جتنی آسانیاں پیدا کرسکتا ہے کرے۔ اس کی اور قاسم ابراہیم کی بہت دوستی ہوگئی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کامی کی موجودگی میں خود آزادے کو سکون رہتا تھا۔

''تمہاری مرضی ہے آزادے اگر تم شاہ زمان سے اپنی متاثر ہو کہ اس کی مدد کرنا چاہتی ہو تو ضرور کرو میرا خیال ہے کہ کسی کو بھی اس پر اعتراض نہیں ہوگا۔''

''ہاں، کامی، میری آمدنی بھی اتنی ہے کہ میں اس کے اخراجات آرام سے پورے کرسکتی ہوں تو بجائے اس کے کہ میں کسی اور سے مدد مانگوں میں خود بھی تو اس کے اخراجات اپنے ذمے لے سکتی ہوں۔''

''میرے خیال میں یہ اچھا آئیڈیا ہے تم مراسطون یتیم خانے والوں سے بات کرلو اور اس کے اخراجات ماہانہ جمع کروادیا کرو۔'' کامی نے مشورہ دیا۔

''ہاں، یہ بالکل ٹھیک ہے۔'' آزادے نے جواب دیا، پھر اس نے ٹیلی فون پر مراسطون یتیم خانے کے منتظم سے بات کی تھی اور شاہ زمان کی ساری ذمہ داری خود قبول کرلی تھی اور شاہ زمان کے لیے اگلے تین ماہ کے اخراجات کا چیک مراسطون یتیم خانے کو بھجوادیا تھا۔

''مجھے یہ سب کرکے بہت خوشی ہورہی ہے کامی۔'' اس نے چائے کی پیالی اپنے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا، وہ کامی سے بات کررہی تھی اور کامی اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''اچھا، اب میری ایک سنو۔'' کامی نے بات کرتے کرتے اس کے ہاتھ پر پیار سے، ہاتھ رکھ دیا اور وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''میری امی تم سے بات کرنا چاہتی ہیں؟'' کامی نے کہا تو وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

''مجھ سے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں تم سے۔'' کامی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''لیکن کیوں؟''

''شاید ان کا خیال ہے کہ تم میرے بہت قریب آگئی ہو میری ہر گفتگو میں تمہارا ذکر ہوتا ہے۔''

''پھر؟''

''پھر یہ کہ مجھے تو اس کا احساس نہیں تھا، لیکن پچھلے ایک ماہ سے انہوں نے یہ بات شدت سے محسوس کی ہے کہ میری ہر بات تم سے شروع ہوکر تم پر ختم ہوتی ہے۔''

''تو اس کا کیا مطلب ہے؟''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم میری زندگی میں اہمیت اختیار کرگئی ہو اور ایسا کب ہوتا ہے؟'' کامی نے اس سے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

''کب ہوتا ہے؟'' آزادے نے نہ سمجھنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا حالانکہ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ کامی اسے پسند کرتا ہے لیکن اس نے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا آزادے بھی اسے چاہتی تھی، لیکن وہ بھی اظہار سے ڈر رہی تھی۔

''جب آپ کسی کو پسند کرنے لگیں اس کے بغیر خود کو ادھورا محسوس کرنے لگیں اس کے بغیر ایک پل بھی رہ نہ سکیں۔'' کامی نے ایک ایک جملے پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''کیا واقعی؟ ایسا ہے کامی؟'' آزادے نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سرہلایا۔

''میں نے کئی بار سوچا کہ تم سے بات کروں لیکن ہمت نہیں ہوئی پر اب چھپانا میرے بس میں نہیں، کیونکہ میری امی میری بہترین دوست ہیں اور ان سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہتی وہ تم سے اس لیے ہی ملنا چاہتی ہیں کہ وہ تم سے بھی میرے بارے میں رائے لینا چاہتی ہوں گی۔''

''بھلا وہ مجھ سے کیا بات کریں گی؟''

''یہ تو میں نہیں جانتا یہ تو تمہیں ان سے بات کرکے ہی معلوم ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، میں بات کرلوں گی؟''

''میں انہیں کال کروں گا اور تمہاری بات کروادوں گا۔'' کامی نے کہا۔

''لیکن کب؟''

''جب تم ذہنی طور پر تیار ہو۔'' کامی نے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر آج رات کھانے کے بعد ہم سکون سے بات کریں گے۔'' آزادے نے کہا اور کامی نے اثبات میں سرہلایا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"کیا امی سے بات کرنے سے پہلے میں جان سکتا ہوں کہ تم میرے بارے میں کیا سوچتی ہو، میں تمہیں کیسا لگتا ہوں۔" کامی نے بچوں کی طرح پوچھا اور آزادے کو ہنسی آ گئی۔

"کامی اگر تم مجھے پسند نہ ہوتے تو ایک ملاقات کے بعد شاید دوسری ملاقات ممکن نہ ہوتی، تم مجھے پہلی نظر ہی میں اچھے لگے تم سے مل کر اجنبیت کا احساس بالکل نہیں ہوا اور میں آہستہ آہستہ تمہاری معصومانہ باتوں کی شیدا ہوتی چلی گئی کیا تمہاری زندگی میں پہلے کوئی لڑکی نہیں آئی؟"

"نہیں، دراصل جب میں نے ہوش سنبھالا تو عراق میں بھی افغانستان سے مختلف حالات نہیں تھے وہاں بھی سول وار کا سماں تھا، ہر طرف دھماکے اور لاشیں تھیں، جو شاید دنیا میں تمام ہی مسلمان ممالک کا مقدر بن گئی ہیں ان حالات میں زیادہ تر انسان اپنی یا دوسروں کی زندگی بچانے اسے برقرار رکھنے کے لیے پہلے سوچتا ہے میرا بچپن انہی حالات سے گزار کر زندگی کی راہیں طے کرتا ہوا جوانی تک آیا ہے، اب میرے سامنے میرے ماں باپ کی زندگی ہے میں انہیں ہر غم سے دور رکھنا چاہتا ہوں اور ہر خوشی کو ان کی زندگی کا حصہ بنانا چاہتا ہوں میں نے اب تک اپنے بارے میں نہیں سوچا۔"

"مگر تمہاری والدہ نے تمہارے لیے شاید آئندہ زندگی کا فیصلہ بھی کرلیا۔" آزادے نے کہا۔

"ممکن ہے کرلیا ہو...... وہ ماں ہیں...... وہ ہمیشہ میرے بارے میں سوچتی ہی رہتی ہیں تم میں میری دلچسپی دیکھتے ہوئے معاملہ سمجھ گئی ہوں۔" کامی نے ہنستے ہوئے کہا تو آزادے بھی مسکرادی۔

"لیکن ابھی میں شادی کے بندھن میں بندھنا نہیں چاہتی۔"

"ابھی سے پریشان مت ہو، حالات پر چھوڑ دو، مجھے کوئی جلدی نہیں۔" کامی نے کہا۔

اسی رات کھانے کے بعد جب وہ آزادے کے سامنے اگلے پروگرام کی تیاری کی بات کررہا تھا تو اس نے اپنی والدہ کو کال ملائی۔

"ہیلو امی...... آپ کیسی ہیں؟" کامی نے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں...... آزادے کیسی ہے؟"

"میں ابھی اس کے پروگرام کی تیاری کررہا تھا۔"

"میں ابھی اس کا پروگرام ٹی وی پر دیکھ رہی تھی۔" اس کی والدہ نے کہا۔

"وہ ٹھیک ہے، آپ کو سلام کہہ رہی ہے۔"

"اچھا تمہارے ساتھ ہی ہے؟ میری بات اس سے کراؤ۔" اس کی والدہ نے پراشتیاق بھرے لہجے میں کہا اور کامی نے مسکراتے ہوئے ریسیور آزادے کو تھما دیا۔

"ہیلو!" آزادے نے آہستہ سے کہا۔ "السلام علیکم آنٹی؟"

"وعلیکم السلام آزادے، کیسی ہو؟"

"الحمدللہ؟ میں ٹھیک ہوں۔"

"بھئی تم نے کامی پر کیا جادو کردیا ہے یہ تو ہر بات میں تمہارا ہی ذکر نکال لیتا ہے۔" کامی کی والدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ان کی بات پر آزادے خاموش رہی تھی۔

"میرا دل چاہتا ہے کہ تمہیں اپنے پاس بلاؤں تم سے ملوں۔" انہوں نے پوچھا۔

"جی، میں بھی آپ سے ملنا چاہتی ہوں کبھی عراق آنا ہوا تو ضرور حاضر ہوں گی۔" آزادے نے کہا۔

"اگر ہم کسی اتفاق کے انتظار میں رہیں گے تب تو پتا نہیں کب ملنا ہو، کیوں نہ کسی فرصت کے دنوں میں تم لوگ خود ہی ملنے آجاؤ۔"

"ہاں، یہ بھی ہوسکتا ہے۔" "ابھی میرے پروگرام کا پہلا سیشن ختم ہونے والا ہے، اس کے بعد کچھ عرصے کے لیے ہم فارغ ہوں گے، چنانچہ دوسرا سیشن شروع ہونے سے پہلے آپ سے ملنے کا پروگرام ضرور بنائیں گے۔"

"ہاں، ضرور، میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

"جی بہتر۔" آزادے نے کہا اور ریسیور واپس کامی کو دے دیا۔

"جی امی! اپنا خیال رکھئے گا، میں جلد ہی آؤں گا۔" کامی نے کہا اور چند لمحے مزید بات کرکے فون بند کردیا۔

"کامی، میں نہیں جانتی کہ ہم نے جو قدم اٹھایا ہے وہ مستقبل میں ہمیں کہاں لے جائے گا لیکن میری زندگی میں آنے والے تم پہلے شخص ہو جس پر میں نے یوں بھروسہ کیا ہے۔" آزادے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھ پر یقین رکھو آزادے، تمہیں اندازہ نہیں کہ میرے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

دل میں تمہارے لیے کتنا پیار ہے اور تم اپنے وطن کے لیے اور دکھی انسانیت کے لیے جو کچھ کر رہی ہو اس کا مجھے کتنا احترام ہے، اس لیے میں اپنے ملک سے تمہارا پورا دوسرا سیشن کرنے کے لیے یہاں آ گیا ہوں، میری طرف سے کبھی بدگمان مت ہونا، تم ہمیشہ مجھے اپنے چاہنے والوں میں پاؤں گی۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" آزادے نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا اب میں چلتا ہوں کل ملیں گے کل تمہارے اس پہلے سیشن کے آخری پروگرام کی ریکارڈنگ ہے۔" کامی نے کہا تو آزادے نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کامی کے جانے کے بعد آزادے بہت دیر تک اس وقت کو یاد کرتی رہی تھی جب اس نے پہلی بار کینیڈا کی سرزمین پر قدم رکھا اور وہاں کے لوگ اور ماحول اس کے لیے اجنبی تھے۔ وہاں کے اسکول کے بچے اس کے لیے اجنبی تھے ان کی زبان اور ان کے کلچر سے وہ واقف نہیں تھی، اسکول میں اسے دوسرے بچوں سے بات کرنے میں مشکل ہوتی تھی، تب ایک ٹیچر اس کی مدد کرتی تھیں، جو اس کی ٹوٹی پھوٹی انگلش سمجھ کر ان بچوں کو بتاتی تھیں، وہاں پشتو اور فارسی سمجھنے والا کوئی نہیں تھا، آزادے کو کچھ اردو بھی آتی تھی، جو اس نے پاکستان میں قیام کے دوران سیکھی تھی، لیکن کینیڈا میں وہ بھی مقامی لوگ نہیں سمجھتے تھے زبان کی اس دوری نے اسے دوسرے بچوں سے دور کر دیا تھا وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے اسے پاکی، پاکی کہہ کر چھیڑتے تھے، وہ اسکول جانے سے کترانے لگی تھی اور اس کے والد اور والدہ اس کے ہمت بندھاتے تھے کہ یہ سب وقتی باتیں ہیں وقت کے ساتھ ساتھ جب اس کو کینیڈین آ جائے گی تو وہ ان بچوں سے آسانی سے بات کر سکے گی، سب اس کے دوست بن جائیں گے اور پھر ایسا ہی ہوا تھا جیسے جیسے اس کی انگریزی اور کینیڈین زبان بہتر ہوتی گئی تھی اس کی راہیں کھلتی چلی گئی تھیں، پڑھائی کے علاوہ آرٹیکل لکھنے لگی تھی اور شاعری کی مشق بھی شروع کر دی تھی اور پھر ہر وقت کی محنت مشقت نے اسے زندگی کے مختلف راستوں سے گزارتے ہوئے اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا جہاں سارے لوگ اسے جانتے تھے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں اس کے شوز دیکھے جا رہے تھے۔ اسے دوسرے ممالک کی دعوتیں دی جا رہی تھیں۔

☆......☆......☆

سیزن ون کا آخری شو ریکارڈ کرواتے ہوئے آزادے اداس تھی اس نے یہ شو بچوں اور خواتین کی تعلیم کے نام کیا تھا، اس میں پیش ہونے والا گیت بھی خود لکھا تھا اور اس شو میں ایسی خواتین کے انٹرویوز بھی شامل کیے گئے تھے جن میں تعلیم کی کمی ضرور تھی لیکن وہ اس کی اہمیت سے واقف تھیں مگر انہیں اپنے حالات یا ماحول کی وجہ سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

اسٹیج ہمیشہ کی طرح رنگ برنگی روشنیوں سے سجا ہوا تھا ہال میں آج عام مہمانوں کے علاوہ آزادے شو کی انتظامی ٹیم بھی شامل تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں آئی ٹی وی نے خاص طور سے آزادے شو پیش کرنے کے پہلے ملازم رکھا تھا اور ان کا کام صرف سیزن ون کے پروگرام تشکیل دینا اور انہیں پیش کرنا تھا، ان میں ڈیوڈ، اسٹیو، وکی، سبحان، نیلوفر وغیرہ شامل تھے آج انہیں اس پروگرام کو الوداع کہنا تھا۔

حسب معمول آزادے نے پروگرام کے شروع میں ایک نغمہ پیش کیا جسے بہت سراہا گیا اس پروگرام کے لیے آزادے نے سیاہ مون لائٹ کا ڈریس منتخب کیا تھا جو گلے سے ایڑیوں تک ایک لمبی میکسی کی صورت میں تھا، جب کہ کامی نے شو کے کو اسٹار کے طور پر اس کے ساتھ تھا۔ وہ اب آزادے سے کچھ زیادہ بے تکلف نظر آ رہا تھا، اس پروگرام میں آزادے اور اس کی آواز میں ایک دوگانہ بھی پیش کیا جانا تھا جس کی خاص طور سے ریکارڈنگ کی گئی تھی۔

"میں عورت ہوں
میں کمزور ہوں
تمہاری بہن ہوں
تمہاری ماں ہوں

بیک گراؤنڈ سے آزادے کے گنگنانے کی آواز آتی ہے اور ایک لڑکی جو سرخ لباس میں ملبوس ہے وہ زخمی حالت میں روتی سسکتی ہوئی اسٹیج پر داخل ہوتی ہے (یہ آزادے کے شو میں پیش کیا جانے والا ایک ٹیبلو تھا جو خاص طور سے آخری پروگرام کے لیے رکھا گیا تھا، اس منظر کو دیکھ کر حاضرین سنبھل کر بیٹھ گئے تھے پھر میوزک کی دھن پر شلوار قمیص میں ملبوس ایک لڑکا اسٹیج پر آیا تھا اور لڑکی اس کی طرف اشارے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کر کے اداکاری کر رہی تھی۔

اداکارہ لڑکی اور لڑکا ٹیبلو ختم ہونے پر حاضرین کے سامنے تعظیم سے جھکتے ہیں اور پھر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اسٹیج کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ ہال تالیوں سے گونجنے لگتا ہے۔

آزادے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی سٹیج کے اگلے حصے میں آ کھڑی ہوتی ہے۔

''محترم حاضرین...... جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ آج ہمارے آزادے شو کے سیزن ون کا آخری پروگرام پیش کیا جا رہا ہے میں چاہتی ہوں کہ ہماری منتظم ٹیم کے افراد یہاں آ کر اپنے خیالات کا اظہار کریں، میں سب سے پہلے اپنے پروگرام اسسٹنٹ ڈائریکٹر سبحان کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دیتی ہوں۔'' آزادے نے کہا اور سبحان اگلی قطار سے اٹھ کر اسٹیج پر آ گیا۔

''میں آپ سب کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے اس پروگرام کو پسند کیا اور آپ ہی کے اصرار پر ہمیں اب اس پروگرام کا دوسرا سیزن بھی کرنا ہوگا۔ اور شاید مزید سیزن بھی ہوں، یہ سب آپ کی دلچسپی اور پسند پر منحصر ہے۔'' سبحان نے سلام کے بعد بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''آزادے نے ہماری توقعات سے بڑھ کر اس پروگرام میں پرفارمنس دی ہے۔ یہ صرف ان کی پرفارمنس نہیں بلکہ ان کے دل کی آواز ہے وہ اس پروگرام کی خاطر کینیڈا سے یہاں آئیں اور انہوں نے سب سے بڑھ کر اس میں دلچسپی لی خود ہی موضوعات ڈھونڈے اور ان کا مواد تیار کیا وہ واقعی اپنے ملک کی آواز ساری دنیا میں پہنچانا چاہتی ہیں۔ اس پروگرام کے بعد انہیں آرام کے لیے چند ماہ کا ٹائم دیا گیا ہے، لیکن انہوں نے اس عرصے کے لئے بھی پلاننگ کر لی ہے اور وہ بین الاقوامی سطح کے طوفانی دورے کرنا چاہتی ہیں اس کے لیے وہ جگہ جگہ افغانستان اور یہاں کے عوام اور خاص طور پر خواتین اور بچوں پر ہونے والے مظالم کا ذکر کریں گی ان کی کوشش ہوگی کہ ان کمزوریوں اور مظالم پر قابو پانے میں یہاں کے لوگوں کی عالمی سطح پر مدد جا سکے، میں ان کے جذبے کو سلام کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ جب یہ واپس آئیں گی تو سیزن ٹو کے لیے مزید اہم موضوعات لے کر آئیں گی اور آپ سب کے لیے دلچسپی اور تفریح کا ذریعہ فراہم کریں گی۔''

سبحان تقریر کر کے اسٹیج سے چلا گیا اور ہال تالیوں سے گونجنے لگا، اس کے بعد باری باری سب لوگوں خطاب کیا تھا اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا تھا۔

دوسرے روز آزادے کامی کے ساتھ افغانستان سے عراق کے لیے روانہ ہوگئی تھی، کیونکہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کینیڈا میں کچھ وقت اپنے والدین کے ساتھ گزارے گی اور اس سے پہلے کامی کی والدہ سے بھی ملے گی، پھر دنیا کے دوسرے ممالک سے آنے والے میوزیکل کنسرٹ کے پروگراموں میں شرکت کرتے ہوئے واپس افغانستان چلی جائے گی، جہاں آزادے شو کے دوسرے سیزن کا آغاز کرے گی۔

عراق ایئر پورٹ پر کامی کے والدہ نے اس کا اور کامی کا استقبال کیا تھا وہ بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔

''خوش آمدید آزادے۔'' کامی کی والدہ نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''خوش آمدید آنٹی۔'' آزادے نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''السلام علیکم! کامی نے والدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو سیاہ کلر کے سوٹ میں ملبوس تھیں۔

''وعلیکم السلام۔'' انہوں نے خوش دلی سے جواب دیا۔

''گھر پہنچتے ہی کامی کی والدہ نے آزادے کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا تھا اور کولڈ ڈرنک نکال لائی تھیں۔

''تم لوگو کا سفر کیسا گزرا؟'' کامی کے والدہ نے آزادے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بہت اچھا، مجھے تو ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل لگ رہا تھا میں جلد از جلد آپ سے ملنا چاہتی تھی۔'' آزادے نے کہا۔

''میں بھی بہت بے چینی سے تمہاری منتظر تھی۔'' کامی کی والدہ نے کہا۔

''بھئی آپ کو مجھ سے ملنے کی کوئی خوشی نہیں ہو رہی ہے؟'' اچانک کامی نے درمیان میں مداخلت کی تو سب ہنس پڑے۔

''بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے بیٹا۔'' اس کی والدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میری زندگی کا محور تو تم ہی ہو۔ تمہاری خوشی میں میری خوشی ہے۔'' انہوں نے کہا اور پھر آزادے کی طرف مڑیں۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"آزادے، میں چاہتی ہوں تم لوگ فریش ہو جاؤ، پھر میں کھانا گرم کر کے لگواتی ہوں، میں نے تم لوگوں کی پسند کے کھانے بنوائے ہیں۔"

"ہم لوگوں کی پسند کے؟" آزادے نے حیرت سے کامی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کو میری پسند کیسے معلوم ہوئی؟"

"بھئی میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں، کامی نے مجھے تمہاری ساری پسند نا پسند بتادی ہے۔"

"کیا واقعی؟" آزادے نے غیر یقینی انداز میں کامی کو دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"وہ گھنٹوں مجھ سے تمہاری باتیں کرتا تھا، تم میں اس کی یہ دلچسپی دیکھتے ہوئے ہی میں نے تم سے ملنے کا فیصلہ کیا، چلو اب جلدی سے فریش ہو جاؤ کامی تمہیں تمہارا کمرہ دکھادے گا۔" کامی کی والدہ نے کہا اور ڈرائنگ روم سے نکل گئیں۔

"ٹھیک ہے۔" آزادے نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔

آزادے کا کمرہ ہلکے نیلے اور سفید کلر کے امتزاج سے بنا تھا۔ کمرے میں جاتے ہی ذہن پر سکون کا تاثر چھا گیا تھا کمرے کی الماری میں چند کتابیں اور آزادے کی تصویر رکھی تھی۔

"اوہ، کامی.... آنٹی کتنی محبت کرنے والی ہیں ان سے مل کر مجھے بالکل اجنبیت کا احساس نہیں ہو رہا ہے یوں لگ رہا ہے جیسے میں اپنے گھر میں ہوں۔"

"ہاں، مستقبل میں یہی تمہارا گھر ہوگا کیا تمہیں اس میں کچھ شک ہے؟" کامی نے پیار سے اس کے چہرے پر آجانے والی بالوں کی لٹ کو سنوارتے ہوئے کہا اور وہ جھینپ کر پیچھے ہٹ گئی۔

"اچھا تم ریلیکس ہو جاؤ تم مجھے مس کال دے دینا تھوڑی دیر میں ہم کھانا کھائیں گے۔" کامی نے واپس جاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

"ایک گھنٹے بعد آزادے، کامی اور اس کی امی کے ساتھ ڈائننگ ہال میں بیٹھی تھیں اور میز چار پانچ طرح کے کھانے سے بھری تھی۔

"آنٹی، اتنا کھانا...... میں تو اتنا کھانا نہیں کھاتی، کامی نے آپ کو نہیں بتایا؟"

"سب بتایا ہے لیکن میں اپنے دل کو کیا کروں کتنے عرصے سے یہ کابل میں تھا اسے میرے ہاتھ کے بنائے کھانے بہت پسند ہیں، چنانچہ میں نے آج یہ بنا لیے تم لوگ کھاؤ گے تو میں خوش ہوں گی۔"

"آپ نے بہت زیادہ محنت کر لی۔" آزادے نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں، میری ملازمہ برابر میری مدد کرتی ہے۔" انہوں نے کہا پھر کچھ سوچتے ہوئے وہ اس کی طرف بڑھی۔

"اچھا، آزادے یہ بتاؤ کہ تمہاری کتنے دن کی چھٹی ہے؟"

"ہمارے پاس دو ماہ ہیں جن میں مجھے کچھ دوسرے ممالک میں بھی پرفارمنس کرنا ہے اور کینیڈا جانا ہے۔ امی ابو سے ملنے۔"

"لیکن میں تو تمہیں ایک ماہ سے پہلے نہیں جانے دوں گی۔"

"نہیں آنٹی بس مجھے آپ کو دیکھنا تھا، آپ سے ملنا تھا میں تو ایک دو روز میں چلی جاؤں گی۔"

"اب اتنی بھی جلدی میں نہیں جانے دوں گی کچھ دن تو ٹھہرو۔" انہوں نے کہا اور آزادے دھیرے سے مسکرادی۔

"امی تمہیں نہیں جانے دیں گی۔" کامی نے ہی ہنستے ہوئے کہا۔

"پھر آزادے نے مزید دس دن کامی کی والدہ کے ساتھ گزارے تھے اس عرصے میں کامی نے اسے عراق کے اہم مقامات کی سیر کرائی تھی اور انواع و اقسام کے کھانے کھلائے تھے اس عرصے میں آزادے بھی کامی سے خاصی بے تکلف ہو گئی تھی، وہ دونوں اکثر اپنے ان پروگراموں کے بارے میں گفتگو کرتے رہتے تھے جو انہیں عراق سے روانگی کے بعد مختلف ممالک میں کرنا تھے۔

ایک رات آزادے اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی باہر دور دور تک پھیلے اندھیرے کو دیکھ رہی تھی۔ جس میں علاقے میں دور دور بنے گھروں کی روشنیاں دلکش سماں پیدا کر رہی تھیں، اچانک اسے اپنے شانے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا اس نے پلٹ کر دیکھا کامی اس کے قریب کھڑا تھا اس نے آزادے کی کمر میں اپنا بازو حمائل کر دیا تھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

''آزادے، میں سوچتا ہوں کہ تمہارے بغیر میری زندگی کتنی بے رنگ تھی، لیکن اب ایک ایک پل میں زندگی کا احساس ہوتا ہے، ایک بات پوچھوں؟'' اس نے پیار سے آزادے پر جھکتے ہوئے کہا۔

''ہوں...... '' آزادے جو اس کے سحر میں ڈوب چکی تھی مسکراتے ہوئے بولی، اس نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔

''شادی کے بعد تم کہاں رہنا پسند کروگی؟'' کامی نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا اور آزادے نے آنکھیں کھول دیں۔

''افغانستان۔'' اس نے خواب ناک لہجے میں کہا۔

''لیکن وہاں کے حالات کی وجہ سے تو تمہاری فیملی ہجرت کرکے کینیڈا چلی گئی تھی اور اب تمہارے پاس وہاں کی شہریت ہے پھر بھی؟''

''ہاں پھر بھی...... کوئی بھی محب وطن اگر کبھی مجبوری سے اپنا وطن چھوڑ جائے تو وطن سے اس کی محبت کم نہیں ہوتی بلکہ وطن کے فراق میں بڑھ جاتی ہے۔ مجھے اپنے وطن سے دوری ستاتی ہے اب میرے جینے کا ایک مقصد ہے اور وہ یہ کہ اپنے وطن میں کسی بھی طرح امن و سکون واپس لاسکوں۔''

''وہ تو تم کر رہی ہو تمہارے پروگراموں سے ماحول پر اچھا اثر پڑا ہے۔''

''اثر تو پڑا ہے کامی لیکن کچھ آنکھوں میں مجھے اپنے لیے نفرت کے سائے بھی منڈلاتے نظر آئے ہیں۔'' آزادے نے اس کی بانہوں سے نکلتے ہوئے کہا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ ہمارے پروگراموں کے مہمانوں میں سب ہمارے دوست ہی ہوتے ہیں۔''

''نہیں۔'' کامی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''میں نے اکثر نوٹ کیا ہے پروگرام کے دوران جب میں کوئی نغمہ پیش کررہی ہوتی ہوں تو جہاں ہمارے مہمان جھوم جھوم کر تالیاں بجارہے ہوتے ہیں وہاں ان میں موجود کچھ لوگوں کی آنکھوں میں نفرت کے سائے بھی لہرا رہے ہوتے ہیں یوں لگتا ہے کہ وہ وہاں اپنی پسند کی کچھ معلومات جمع کرنے آئے ہوں...... میری چھٹی حس کہتی ہے کہ مجھے خطرہ ہے۔''

''تمہارا وہم ہے آزادے۔''

''نہیں کامی تم نہیں جانتے جب میں پہلی بار افغان ایئر پورٹ سے اپنی والدہ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر آئی ٹی وی اسٹیشن جارہی تھی تو راستے سے گزرتے لوگ ہمیں نفرت سے دیکھ رہے تھے۔

''نفرت سے...... بھلا کیوں...... تم تو ان کے لیے اجنبی تھیں؟'' کامی نے پوچھا۔

''یہی تو اصلی بات تھی ہم اجنبی تھے میں نے اور میری والدہ نسرین نے لباس بھی افغانی نہیں بلکہ شرٹ اور ٹراؤزر پہنا ہوا تھا، لیکن ہمارے سروں پر اسکارف موجود تھا، یہاں کے انتہا پسند لوگ اپنے کلچر اور رسم و رواج میں کوئی تبدیلی پسند نہیں کرتے۔''

''تمہارا وہم ہے اور تم کلچر کو بدلنے تو نہیں آئی ہو تم نے اس گھٹن بھرے ماحول کو زندہ رہنے کے قابل بنانا چاہتی ہو؟'' کامی نے تعریفی انداز میں کہا۔

''تمہیں پتا ہے جس روز میں پہلی بار گیسٹ ہاؤس میں پہنچی اسی روز گیسٹ ہاؤس اور آئی ٹی وی کی عمارت کے درمیان ایک زبردست دھماکا ہوا تھا، جس سے گیسٹ ہاؤس کی عمارت سمیت اور دوسری عمارتوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے، اسے معمولی دھماکوں میں سے ایک دھماکا سمجھا جارہا تھا لیکن میرا خیال کچھ اور ہے۔''

''کچھ اور......؟'' کامی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں کچھ اور...... اسی شام ڈیوڈ نے صدقہ کرنے کے لیے ایک گائے منگوائی تھی میں نے خود وہ گائے اور اس کے مالک کو دیکھا تھا اور اس بارے میں پوچھا بھی تھا تو مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ وہ گائے صدقے کے لیے ہے لیکن یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ صدقہ کس کا ہوگا؟''

''پھر تمہیں کیسے پتا چلا کہ تمہاری جان کا صدقہ دیا گیا ہے؟''

''اس لیے کہ جس دن ہمارا پہلا پروگرام آن ایئر ہونا تھا اس دن بھی ایک راکٹ لانچر کا دھماکا کیا گیا ہمارے پروگرام میں اس کی وجہ سے تاخیر ہوئی اور اب ہونے والی آخری میٹنگ میں تو تم بھی موجود تھے، جب سبحان نے بتایا کہ اس پروگرام کی خاطر ایک مخصوص رقم شدت پسندوں کو دی جاتی ہے تاکہ وہ ہمارا پروگرام سکون سے ہونے دیں،

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"میں آسانی سے سمجھ سکتی ہوں کہ کس کس موقع پر انہوں نے مجھے اپنا نشانہ بنانا چاہا، لیکن میں اتفاقیہ بچتی رہی۔" آزادے کہہ رہی تھی اور کامی حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ بات معلوم ہونے کے باوجود تم پروگرام کرتی رہی ... اور تم نے سیزن ون مکمل کیا؟"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔"

"مگر میں نے ان سب باتوں پر بہت سوچنے کے بعد تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے، میں بھی اپنے ملک میں ایسے حالات کا شکار رہ چکا ہوں، جیسے حالات افغانستان میں ہیں۔ میری بھی دلی خواہش ہے کہ افغانستان میں امن ہو وہاں کے لوگ سکون کی آزاد زندگی گزاریں اور ہم یہ سب کرنے میں اپنی طرف سے ایک چھوٹا سا حصہ ڈالنا چاہتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو...... میری دعا ہے کہ اللہ ہماری یہ کاوش قبول کرلے۔" آزادے نے کہا۔

"اب کینیڈا جاتے ہوئے تم جو میوزیکل کنسرٹ کرنا چاہتی ہو کیا اس کے لیے نغمے تیار ہیں؟" کامی نے پوچھا۔

"ہاں، تقریباً ... نغمے میں نے خود لکھے ہیں اور ہمارے میوزیکل بینڈ نے اس کی موسیقی ترتیب دی ہے۔" آزادے نے کہا، پھر وہ کافی دیر تک بیٹھی کامی کو اپنے نغموں کی نوٹ بک دکھاتی رہی تھی، کچھ نغمے اس نے گنگنا کر کامی کو ان کی دھن کے بارے میں بھی بتایا تھا۔

"آج رات عراق میں ہمارے قیام کی آخری رات ہے آزادے کیا تم میرے ساتھ ڈنر پر چلنا پسند کروگی؟" کامی نے اس سے پوچھا وہ کچھ ہی دیر پہلے ناشتے سے فارغ ہوئے تھے۔

"لیکن تمہاری امی چاہتی ہیں آج رات ہم مل کر ایک مووی دیکھیں ٹی وی پر...... وہ یہ رات گھر پر ہی گزارنا چاہتی ہیں۔" آزادے نے اسے بتایا۔

"میں انہیں راضی کرلوں گا پھر پتا نہیں کب ہمیں واپس عراق آنا نصیب ہو میں تمہیں یہاں کا خوب صورت ترین ہوٹل دکھانا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے تو پھر اپنی والدہ کو بھی تم ہی تیار کروگے۔"

"تیار...... کیا تم انہیں بھی لے کر جارہی ہو؟" کامی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، تو کیا حرج ہے؟"

"اکیلے تمہیں لے جانا چاہتا ہوں حب الوطن۔" کامی نے مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا اور وہ ہنس دی۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

رات کو ڈنر پر روانگی سے پہلے آزادے نے کافی دیر اپنی تیاری پر لگائی تھی، کیونکہ کامی کی فرمائش تھی کہ وہ اپنا مخصوص سرخ لباس پہنا جو وہ اکثر کنسرٹ میں پہن چکی تھی، چنانچہ اس نے لباس کی مناسبت سے جیولری، سینڈل اور میک اپ کا سامان نکالا تھا اور تیار ہونے بیٹھ گئی تھی۔

"اوہ...... آج میرے بچنے کی کوئی امید نہیں۔" اچانک کامی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اسے دیکھ کر کہا، اور وہ ہنس دی۔

"تمہاری ہی فرمائش تھی ورنہ میں عام طور پر کبھی بھی......"

"ہاں ہاں مجھے معلوم ہے، صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں، بہت اچھی لگ رہی ہو، میں یہی چاہتا تھا۔"

"ابھی کتنی دیر میں چلیں گے؟ تم تو تیار ہی نہیں ہوئے؟" آزادے نے پوچھا۔

"مجھے کون سا میک اپ کرنا ہے بس لباس تبدیل کرکے چلتے ہیں۔" کامی نے کہا، پھر واقعی وہ آدھے گھنٹے میں تیار ہوگیا تھا اور دونوں کامی کی والدہ کو الوداع کہہ کر گھر سے نکل گئے تھے۔

"واپسی پر پکچر دیکھیں گے۔" کامی نے اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس بارے میں تو تم نے نہیں بتایا تھا؟"

"میں نے ضروری بھی نہیں سمجھا، اب ہم جیون ساتھی بننے جارہے ہیں تم پر اتنا اختیار تو بنتا ہی ہے۔" کامی نے کار کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا، آزادے بھی اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ کر دروازہ بند کرچکی تھی اور مسکراتے ہوئے کامی کو دیکھ رہی تھی۔

کامی نے کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی تھی اور شہر کی پرہجوم سڑکوں پر کار دوڑانے لگا تھا۔ ایک سیاہ رنگ کی بیوک کچھ فاصلے تک انہیں اپنے پیچھے نظر آتی رہی تھی لیکن ہوٹل تک پہنچنے سے پہلے ہی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔

ہوٹل کا مرکزی ہال روشنیوں سے جگمگا رہا تھا، جگہ جگہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

بھی میز کرسیوں پر مختلف جوڑے براجمان تھے، آزادے اور کامی بھی پہلے سے بک کروائی ہوئی جگہ پر جا کر بیٹھ گئے تھے جس کے لیے ایک ویٹر نے، ان کی رہنمائی کی تھی۔ وہ والہانہ انداز میں مسلسل اسے دیکھ رہا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' آخر چند لمحوں بعد آزادے نے پوچھ ہی لیا، کیا تم یہاں مجھے یونہی بٹھا کر خاموشی سے تکنے کے لیے لائے ہو؟''

''کیا حرج ہے؟ میں تمہارے ساتھ گزارے ہر ہر لمحے کو یادگار بنانا چاہتا ہوں۔'' کامی نے بے خودی سے کہا۔

''بس یہ سارے ڈائیلاگ کچھ ہی دنوں کے ہوتے ہیں بعد میں تو تم بدل ہی جاؤ گے۔''

''تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''کیونکہ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔'' آزادے نے لاپرواہی سے کہا اور کامی ہنس دیا۔

''آزمائش شرط ہے؟'' کامی نے دھیرے سے کہا۔

''چلو..... یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔'' آزادے نے کہا اور ہال میں موسیقی کی دھیمی دھیمی دھن بکھر گئی اور مختلف جوڑے اٹھ اٹھ کر ڈانس فلور میں جا کر تھرکنے لگے۔

آزادے انہیں دیکھ رہی تھی کہ کامی اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کا ہاتھ مانگنے کے انداز میں جھک کر اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا پھر وہ اسے ساتھ لئے ہوئے موسیقی کی دھن پر تھرکتا اس ہال فلور تک لے گیا تھا اور اس کی کمر میں اپنا بازو ڈال دیا تھا۔ اب وہ بھی اس کے ساتھ آہستہ آہستہ تھرک رہی تھی یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا جب وہ کسی غیر مرد کے ساتھ اتنی قربت میں محو رقص تھی، لیکن وہ مطمئن تھی، کامی اب اس کا جیون ساتھی بننے والا تھا، اس کے والدین نے کامی کو پسند کر لیا تھا اور کینیڈا پہنچنے کے بعد آزادے کے والدین کی طرف سے ایک تقریب میں ان دونوں کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا جانا تھا۔

آزادے نے رقص کرتے کرتے کامی کے کاندھے سے سر ٹکا لیا تھا۔ کامی نے اسے، دونوں ہاتھوں سے سنبھالا ہوا تھا اور وہ بے خودی کے عالم میں میوزک کی دھن پر آہستہ آہستہ کامی کے سہارے تھرک رہی تھی۔

موسیقی رکنے کے بعد کامی اس کا ہاتھ تھامے واپس اپنی میز پر آ گیا تھا، اس نے آزادے کو کرسی پر بٹھایا تھا اور ویٹر کو اشارہ کرتا ہوا خود بھی بیٹھ گیا تھا۔

''تم کھانے میں کیا لو گی آزادے؟'' اس نے پوچھا تو وہ اسے خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔

''آزادے.....؟'' کامی نے اس کے چہرے کے سامنے چٹکی بجاتے ہوئے آواز دی۔

''ہوں.....؟'' آزادے نے چونک کر ویٹر کی طرف دیکھا۔

''اوہ..... مم..... میں پہلے تھوڑا چکن سوپ اور پھر کلب سینڈوچ۔''

''بس؟ بھئی ہم ڈنر کرنے آئے ہیں کچھ اچھے کھانے کھا سکتے ہیں فش، بریانی، وغیرہ وغیرہ۔''

''نہیں، میں عام طور پر ایسے کھانے نہیں کھاتی میرے لیے یہی بہتر ہے۔''

''اوکے.....تو پھر میرے لیے بھی چکن سوپ اور چکن نکا نوڈلز لے آؤ۔'' کامی نے ویٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی بہتر۔'' ویٹر نے کہا اور چلا گیا، اس کے جانے کے بعد کامی نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی لال رنگ کی ڈبیہ نکالی تھی اور اسے کھول کر آزادے کے سامنے کر دیا تھا۔

''یہ تمہارے لیے میری طرف سے۔'' کامی نے کہا۔

''اوہ..... کامی، یہ تو بہت خوب صورت ہے..... مگر میں یہ نہیں لے سکتی..... اتنا قیمتی تحفہ؟''

''یہ تم سے زیادہ قیمتی نہیں آزادے۔'' کامی نے کہا اور ڈبیہ سے انگوٹھی نکال کر اس کی انگلی میں پہنا دی، سونے کی انگوٹھی میں زمرد جڑا بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ کامی نے اس کے ہاتھ کو چوم لیا تھا۔

''بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔'' کامی نے آزادے کی تعریف کی اور وہ شرما کر مسکرا دی ویٹر نے کھانا میز پر لگا دیا تھا۔

''چلو.....اب جلدی سے کھانا کھا کر سینما چلتے ہیں فلم کا ٹائم ہونے ہی والا ہے۔'' کامی نے کہا اور آزادے نے اثبات میں سر ہلایا۔

اسی وقت ہال میں زوردار فائر کی آواز گونجی تھی اور بھگدڑ مچ گئی تھی ہر کوئی صدر دروازے کی طرف دوڑ رہا تھا اور استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف بھی مجمع لگ گیا تھا۔ جہاں کھڑے لوگ زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔

میں ابھی آتا ہوں۔'' کامی نے کہا اور کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟ کامی...... میں یہاں اکیلی ہوں۔'' آزادے نے جلدی سے کہا اس نے کھانے کی ٹرے بھی پیچھے کھسکا دی تھی۔

''میں بس ابھی آیا...... دیکھ کر آتا ہوں کہ کیا ہوا ہے۔'' کامی نے جلدی سے کہا پھر وہ آزادے کا جواب سننے کے لیے رکا نہیں تھا، چند لمحے بعد جب وہ واپس آیا تو گھبرایا ہوا تھا۔

''کیا ہو، کون تھا، کس نے فائرنگ کی؟'' آزادے نے ایک ساتھ کئی سوال کر دیئے۔

''کوئی اجنبی تھا...... لوگ کہہ رہے ہیں وہ شلوار قمیص اور واسکٹ پہنے ہوئے تھا، اس کے سر پر پگڑی بندھی تھی، اسنے جیب سے ریوالور نکال کر فائرنگ کر کے ایک ویٹر کو مار دیا اس کی لاش کاؤنٹر کے قریب پڑی ہے، ویٹر اسے ہوٹل میں آنے نہیں دے رہا تھا اور اس سے اس کی شناخت کے بارے میں پوچھ رہا تھا، اس ہوٹل میں سیکورٹی کا بہت خیال رکھا جاتا ہے اور صرف ریزرویشن والے لوگ ہی اندر آ سکتے ہیں سب حیران ہیں کہ وہ اندر کیوں آنا چاہتا تھا۔'' کامی نے کہا۔

''چلو...... چلتے ہیں اب ہم سینما نہیں گھر جائیں گے۔'' آزادے نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ایک منٹ ٹھہرو، میں پے منٹ کر کے آتا ہوں۔'' کامی نے کہا اور پھر استقبالیہ کی طرف بڑھ گیا، کچھ ہی دیر بعد آزادے نے اسے صدر دروازے کی طرف جاتے دیکھا اور وہ حیران ہوئی کہ کامی اسے وہاں چھوڑ کر باہر کیوں جا رہا ہے اس نے جلدی سے اپنا پرس اٹھایا اور دروازے کی طرف لپکی۔

دروازے سے نکلتے ہی اس کی نظر کامی پر پڑی تھی جو ایک سیاہ رنگ کی بیوک میں بیٹھ رہا تھا۔ یہ وہی بیوک تھی جس نے ہوٹل آتے ہوئے ان کا پیچھا کیا تھا، آزادے نے نظر دوڑائی تھوڑے ہی فاصلے پر کامی کی کار بھی کھڑی تھی، وہ بغیر کچھ سوچے کار میں بیٹھی اور کار اسٹارٹ کر دی، آزادے نے محسوس کیا تھا کہ کامی کی پشت پر ایک شخص تھا جس نے شلوار قمیص اور واسکٹ پہنی تھی۔ اور سر پگڑی بندھی تھی، اس کا ایک ہاتھ قمیص کی نیچے کی جیب میں تھا اور وہ کامی کی کمر کو کور کر رہا تھا آزادے کو خطرے کا احساس ہو چکا تھا اس نے بیوک کے آگے بڑھتے ہی کچھ فاصلہ درمیان میں رکھتے ہوئے کار اس بیوک کے پیچھے ڈال دی تھی۔

کچھ دیر سفر کرنے کے بعد بیوک ایک غیر آباد علاقے میں داخل ہو گئی تھی سڑک کے دونوں طرف بڑے بڑے گھنے درخت لگے تھے اور اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں، بیوک ایک پرانی سی بلڈنگ کے سامنے جا کر رک گئی تھی۔ بلڈنگ کے اندر مکمل اندھیرا تھا۔ آزادے نے بھی اپنی کار سوگز کے فاصلے پر رکھتے ہوئے روک دی تھی۔ بیوک سے کامی کے علاوہ دو لوگ اور برآمد ہوئے تھے، اب ایک کے ہاتھ میں پکڑی ریوالور صاف نظر آ رہی تھی، وہ کامی کو ریوالور سے دھکا دیتے ہوئے عمارت کے اندر لے گئے تھے۔ بیوک کا ڈرائیور سب سے آخر میں اترا تھا اور بلڈنگ کے دروازے پر ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

آزادے آہستہ آہستہ سے کار سے نکلی تھی، اس نے کار کی چابی اپنی جیب میں ڈال لی تھی اور خود کو پوشیدہ رکھتے ہوئے عمارت کے پیچھے پہنچ گئی تھی، لیکن وہاں عمارت میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں تھا، وہ چپکے چپکے قدم اٹھاتی جھکی ہوئی عمارت کے سائڈ میں پہنچی تھی جہاں بڑی بڑی جھاڑیاں تھیں، پھر اس کی نظر عمارت کی اوپر منزل میں موجود ایک کھڑکی پر پڑی تھی جس سے روشنی باہر آ رہی تھی، وہ عمارت کی طرف بڑھی تھی تا کہ کسی طرح اوپر چڑھ کر کھڑکی تک پہنچ سکے۔ لیکن ابھی وہ چند قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ درختوں سے کسی نے ایک جال پھینکا جو اس پر آ گرا وہ بے بسی سے ہاتھ پاؤں چلانے لگی، لیکن اس جال سے نکلنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ پھر کسی نے زور سے کوئی چیز اس کے سر پر ماری تھی اور وہ اندھیروں میں ڈوبتی چلی گئی تھی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

خونی کتاب

شہزاد خان

جب سے دنیا وجود میں آئی ہے نیکی اور بدی کی قوتیں بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ کبھی نیکی بدی پر اور کبھی بدی نیکی پر غالب آجاتی ہے۔ زیر نظر کہانی بھی کچھ ایسے واقعات پر مبنی ہے جسے پڑھ کر آپ ایک لمحہ کے لیے خوف زدہ ضرور ہوجائیں گے۔

ایک ایسی کتاب کا احوال جس نے ایک گھر کو برباد کر دیا تھا

اکرم نے دکان کا شٹر بند کیا اور ہاتھ میں چمڑے کا تھیلا جس میں اس کی ضرورت کی چیزیں اور رقم تھی اپنی بغل میں دبایا اور دکان کے سامنے کھڑی اپنی سائیکل کا تالا کھولا اور گھر کی راہ لی۔ اکرم ایک چھوٹے سے قصبے دیپالپور میں رہتا تھا اس کے والدین عرصہ ہوا اسے دنیا میں اکیلا چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ اکرم نے کسی نہ کسی طرح میٹرک کر کے ایک پبلشر کے پاس ملازمت کر لی اور آہستہ آہستہ اپنی محنت اور لگن کی وجہ سے اس نے اپنے مالک کے دل میں اپنے لیے نرم گوشہ پیدا کر لیا۔ مالک اس کی ایمانداری سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا اور اس طرح اکرم نے اپنی ایمانداری کی بدولت اپنا مستقبل محفوظ کر لیا۔ دکان کے مالک نے اپنا تمام کام اس کے سپرد کیا اور خود یاد الٰہی میں مصروف ہو گیا۔ اب اکرم اس دکان کا تنہا مالک تھا اس نے اپنی روز و شب کی محنت سے دکان کو چار چاند لگا دیئے۔

اس کا کاروبار دوسرے لوگوں کی نسبت کافی ترقی کرنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا نام شہر کے بڑے پبلشروں میں لیا جانے لگا۔ ان سب باتوں کے باوجود اس نے شہر کی بجائے قصبے میں ہی رہائش رکھنے کو ترجیح دی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں اس کے جاننے والے زیادہ تھے اس کی نسبت

شہر میں رہنے والے افراد ایک دوجے کو پہچانتے تک نہیں ہیں۔ اور اس کے علاوہ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شہر میں ماحول کسی قدر گرد آلود اور آب وہوا گندی تھی لیکن اس کی نسبت قصبہ کی آب وہوا اور پانی صاف ستھرا اور صحت افزا تھا۔

اکرم کے تین بچے تھے۔ جن میں سب سے بڑا لڑکا دس سال کا اور اس سے بالترتیب دو لڑکیاں تھیں۔ قصبہ میں ایک پرائمری اسکول تھا جس میں وہاں کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے اگر کوئی صاحب حیثیت ہوتا تو اپنے بچوں کو مزید تعلیم دلانے کی خاطر شہر کا رخ کرتا اور اگر کوئی اس کی استطاعت نہ رکھتا تو وہ اپنے بچوں کو پانچ جماعتیں پڑھا کر گھر میں بٹھا لیتا۔ اکرم اپنے لڑکے کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کا ارادہ رکھتا تھا اس نے دل ہی دل میں عہد کیا ہوا تھا کہ اگر وہ آگے نہیں پڑھ سکا تو کیا لیکن وہ اپنی خواہش کو اپنے بیٹے کی شکل میں پورا کر سکتا تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے بیٹے کو مزید تعلیم دلانے کی خاطر شہر کے ایک اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ اسکول میں ہاسٹل کی سہولت ہونے کی وجہ سے اس نے روزانہ آنے جانے کی دردسری سے بچانے کی خاطر اسے ہاسٹل میں داخل کرا دیا تھا۔ اس کا لڑکا ہر جمعرات کی شام گھر آجاتا اور ایک دن ان کے پاس رہ کر واپس دوسری صبح شہر روانہ ہوجاتا۔ آج بھی جمعرات تھی اور اس کا بیٹا گھر آگیا ہوگا وہ یہی سوچتا ہوا جلدی جلدی سائیکل کے پیڈل چلاتا قصبہ کی طرف جانے والی سڑک پر چلا جارہا تھا۔ سورج دور افق میں ڈوب رہا تھا اور آسمان پر زردی کھنڈی ہوئی تھی شام کا جھٹپٹا ہر سو چھا رہا تھا۔ قصبے کی کچی سڑک کے دونوں جانب گندم کے سنہری خوشے ہلکی ہلکی ہوا سے لہرا رہے تھے، اور ان کے ٹکرانے سے سرگوشیاں سی پیدا ہورہی تھیں۔ اکرم رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے اپنے گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

قصبہ کا فاصلہ شہر سے تقریباً دس فرلانگ رہا ہوگا عام حالت میں یہ فاصلہ وہ آدھے گھنٹہ میں طے کر لیتا تھا مگر آج اسے یہی راستہ طویل ہوتا محسوس ہو رہا تھا اس کے ساتھ ساتھ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ ابھی اس نے ایک فرلانگ کا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ راستے میں ایک کتاب پڑی دکھائی دی۔ اس نے سائیکل ایک طرف کھڑی کی اور تیز تیز قدم اٹھاتے کتاب کی طرف بڑھ گیا اور جیسے ہی اس نے جھک کر کتاب اٹھانے کی کوشش کی تو اس کی چیخ نکل گئی۔

کتاب پر ایک ڈھانچے کی تصویر چھپی ہوئی تھی اور اس پر نامعلوم زبان میں ایک موٹی سرخی لکھی تھی، تصویر میں ایک ڈھانچے نے اپنا سوکھا سڑا ہاتھ اوپر اٹھایا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ کے ساتھ ایک کوبرا سانپ بل کھاتا ہوا لپٹا دیکھایا گیا تھا۔ وہ تو یہ سوچ کر کتاب اٹھانے کے لیے رکا تھا کہ اسکول جاتے ہوئے کسی بچے کی گر گئی ہوگی مگر اب اسے یہ اور ہی معاملہ نظر آ رہا تھا۔ پہلے تو اس نے کتاب کو یوں ہی پڑا رہنے دینے کا سوچا پھر کچھ سوچ کر اسے اٹھایا اور سائیکل کے کیریئر کے پیچھے رکھ کر گھر کی راہ لی۔ گھر میں اس کی توقع کے مطابق اس کا لڑکا آیا ہوا تھا سب اس کے گرد اکٹھے ہوئے اس سے شہر کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ مزے لے لے کر انہیں اپنے متعلق بتا رہا تھا باپ کو دیکھ کر اس کے بیٹے نے اسے سلام کیا۔

اکرم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے دعا دی اور سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے اس نے پیچھے رکھی کتاب اٹھا لی۔ گھر والوں کے پوچھنے پر اس نے اس کتاب کے بارے میں انہیں بتایا۔ یہ سن کر سب خوفزدہ نظروں سے اس کتاب کو دیکھنے لگے۔ اس کی بیوی تو اس بات پر اصرار کرنے لگی کہ اس منحوس کتاب کو فوراً کہیں دور پھینک آئے مگر اس کے سمجھانے پر انہوں نے کتاب کو کھول کر دیکھا۔

کتاب کے اوراق بوسیدہ تھے زمانہ کی گردش کے باعث اس کا رنگ گہرا زرد ہو گیا تھا۔ اس پر سیاہ چرمی کور چڑھا ہوا تھا اور سفید رنگ سے اس پر کچھ الفاظ کندہ تھے۔ اس کے اندر کچھ تصویریں بنی ہوئی تھیں اور نامعلوم زبان میں اس پر کچھ تحریریں درج تھیں۔ کہیں کہیں کسی پیرا کو سرخ روشنائی سے نمایاں کرنے کے لیے اس کے نیچے لکیر کھینچ دی گئی تھی۔ کافی دیر تک مغز ماری کرنے کے باوجود انہیں اس کا سر پیر نظر نہیں آیا تو انہوں نے اسے اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔

دوسرے روز اس کا لڑکا حامد اپنے والدین سے مل کر شہر جانے کے لیے گھر سے نکلا اور قصبہ کے واحد بس سٹاپ پر آ کر بس کا انتظار کرنے لگا۔ قصبہ کی آبادی کم ہونے کی وجہ سے شہر اور قصبہ کے درمیان صرف ایک ہی کھٹارہ بس چلتی تھی۔ جس میں وہی لوگ سفر کرتے تھے جن کا تعلق قصبہ سے تھا۔ کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد اسے دور سے ایک ہیولا سا آتا دکھائی دیا۔ اور پھر واضح ہوتے ہی ایک

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

پرانی سی بس اپنے پیچھے دھواں چھوڑتی کچی سڑک پر آتی دکھائی دی۔ بس میں برائے نام مسافر تھے حامد نے اسے ہاتھ کا اشارہ کیا اور بس اس کے نزدیک آ کر رکی اور اس کے سوار ہوتے ہی ایک جھٹکا لیتی شہر جانے والے راستے پر بھاگتی چلی گئی۔ بس ابھی شہر سے دو فرلانگ دور ہی ہوگی کہ اس کے ڈرائیور نے ایک جھٹکے سے بس کو بریک لگاتے ہوئے روک دیا حالانکہ سامنے دور دور تک کسی ذی روح کا نام ونشان تک نہ تھا۔ سب مسافر حیرت سے ڈرائیور کی طرف دیکھنے لگے۔ ڈرائیور بھی اب سامنے کے شیشے سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیچے سڑک کی جانب نظریں جمائے دیکھ رہا تھا۔

''چچا خیریت تو ہے بس کیوں روک دی؟'' حامد نے اسے اس طرح نیچے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے ابھی ابھی سامنے سڑک پر ایک شخص کو سفید کفن میں لپٹے ہوئے دیکھا تھا۔ اور اسے دیکھ کر ہی میں نے بس کو یکدم بریک لگائی تھی۔ مگر اب دور دور تک کوئی انسان تو کیا کوئی جانور تک دکھائی نہیں دے رہا۔'' ڈرائیور نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

اس کی بات سن کر بس میں سنسنی سی پھیل گئی۔ بس کے مسافر دہشت سے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔ مگر کسی کے منہ سے کوئی بات نہیں نکلی۔

''پا جی...... میرے خیال میں آپ کو وہم ہوا ہوگا یہاں تو دور دور تک کوئی شخص دکھائی نہیں دے رہا ہے۔'' ایک شخص نے سکوت توڑا اور ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔

ڈرائیور نے بھی سر ہلاتے ہوئے دوبارہ بس اسٹارٹ کی اور اسے سڑک پر دوڑانے لگا۔ لیکن ابھی اس نے چند قدم کا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا۔ کہ اس کا ہاتھ گھوما اور بس تیزی سے سڑک سے اتر کر سائیڈ میں لگے ایک پرانے برگد کے درخت کے ساتھ جا ٹکرائی۔ مسافر جو آپس میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ یکدم ایک دوسرے کے اوپر گرے بس کا آگے کا حصہ تقریباً سارا تباہ ہوگیا تھا ڈرائیور تو بس کے درخت میں لگتے ہی موقع پر اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ بس میں کل تیرہ افراد سوار تھے جن میں سے کچھ زخمی پڑے کراہ رہے تھے اور ان میں سے چند افراد کو صرف معمولی خراشیں آئی تھیں۔ بچ جانے والوں نے زخمی افراد کو سنبھالا اور ڈرائیور کی لاش بمشکل نکال کر زمین پر لٹا دیا۔ حامد کو بھی انہوں نے سیٹ سے اٹھا کر ایک درخت کے سائے میں لٹا دیا۔

جاں بحق ہونے والے مسافروں میں صرف ڈرائیور اور کنڈیکٹر ہی شامل تھے، ان میں سے دو تین افراد جنہیں معمولی چوٹیں آئیں تھیں قصبہ کی جانب دوڑ گئے تاکہ وہاں سے مدد لے کر آئیں۔ باقی مسافر درخت کے نیچے بیٹھ کر ان کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

حادثے میں بچ جانے والے مسافروں نے جیسے ہی قصبہ میں داخل ہو کر بس کے حادثہ کے متعلق بتایا تو پورے قصبے میں کہرام مچ گیا۔ ہر کوئی اپنے اپنے گھر سے نکل کر جائے حادثہ کی جانب دوڑ پڑا۔ اکرم ابھی شہر جانے کے لیے سائیکل صاف کر ہی رہا تھا کہ اس نے بھی بس کے حادثے کے متعلق خبر سن لی۔ گھبراہٹ میں اس نے سائیکل بھی نہیں لی اور خبر گیری کرنے کے لیے پیدل ہی اس طرف دوڑ گیا جہاں اس نے حادثہ کے بارے میں سنا تھا۔ قصبہ کے دوسرے افراد بھی وہاں پہنچ گئے تھے اور مل کر زخمیوں کو اٹھا رہے تھے۔

اکرم بدحواس ہو کر ایک ایک چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور جیسے ہی اس کی نظر ایک جانب پڑے حامد پر پڑی وہ چیختا ہوا اس کی طرف بڑھا اور اسے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ حامد کے سر پر چوٹ کا نشان تھا جس میں سے خون رس رس کر پپڑی کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اور اس کا لباس خون سے تربتر ہو رہا تھا۔ وہ اسے اٹھائے قصبہ کی واحد ڈسپنسری کی طرف چل پڑا۔

ڈسپنسری میں ایک شخص بیٹھا اونگھ رہا تھا اس نے جیسے ہی کسی کے چیخنے کی آواز سنی تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سامنے سے اکرم ہاتھوں پر ایک نوجوان لڑکے کو اٹھائے اس کی جانب بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اسے اس کے ہاتھوں سے لیا اور ایک طرف پڑے لمبی میز پر لٹا دیا۔ اکرم نے روتے ہوئے اسے تمام واقعہ بتا دیا۔ اس شخص نے پانی گرم کر کے اس کے زخم صاف کیے۔ اور مرہم وغیرہ لگا کر اس کی پٹی کر دی اور بعد میں ایک انجکشن لگا دیا۔

''فکر کرنے کی بات نہیں ہے جھٹکا لگنے کی وجہ سے اس کے سر پر چوٹ آئی ہے۔ ابھی کچھ دیر میں ہوش آ جائے گا۔'' اس نے ہاتھوں سے ربڑ کے دستانے اتارتے ہوئے اکرم سے کہا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اکرم دل ہی دل میں اس کے ہوش میں آنے کی دعائیں کرنے لگا اور پھر واقعی ہی کچھ دیر میں حامد نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے جیسے ہی گردن گھمائی تو اس کی نظر اپنے والد پر پڑی وہ ایک جھٹکے سے اٹھنے لگا مگر اس کے منہ سے ایک سسکاری سی نکل گئی۔ اکرم نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے دوبارہ میز پر لٹا دیا۔ اس کے ہوش میں آنے پر اکرم نے اس سے تفصیل پوچھی تو اس نے جو بتایا تو اسے سن کر اکرم کے ساتھ ساتھ ڈسپنسری میں موجود شخص بھی لرز گیا۔ اکرم فوراً سمجھ گیا کہ یہ حادثہ اس منحوس کتاب کی کارستانی ہے۔ اس نے سہارا دے کر حامد کو ٹیبل سے اٹھایا اور اسے لے کر گھر کی جانب چل دیا۔ گھر پہنچ کر اس نے سب سے پہلے اس کتاب کو پھینکنے کے لئے الماری کھولی تو یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ کتاب گدھے کے سر سے سینگ کے مصداق غائب تھی۔ حالانکہ وہ قسم کھا کر کہہ سکتا تھا کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے وہ منحوس کتاب اس الماری میں رکھی تھی اور تالا لگا کر اس کی چابی ابھی بھی اس کی جیب میں تھی۔ اس صورت میں گھر کے کسی اور فرد کا تو کتاب نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے الماری کو کھلا چھوڑا اور کمرے سے باہر آ کر اس نے جب گھر کے دیگر افراد کو کتاب کی گمشدگی کے بارے میں بتایا تو وہ سب بھی حیران اور خوفزدہ ہو گئے۔ [illegible] آئی ہوئی۔ کچھ دنوں میں ہی وہ لوگ اس کتاب کو بھول گئے مگر ایک روز ایک عجیب واقعہ ظہور پذیر ہونے پر انہیں یقین کامل ہو گیا کہ وہ پراسرار طور پر کسی آسیبی چکر میں پھنس گئے ہیں۔

ایک روز صبح کے وقت اکرم جب سو کر اٹھا تو اس کا بستر خون سے تر تھا اور اس کے اپنے کپڑے جو کہ ہلکے آسمانی رنگ کے تھے خون میں بھر کے سرخ ہو گئے تھے اس نے گھبرا کر اپنے گھر کے دیگر افراد کو آوازیں دے کر اٹھایا اور اسے اس حالت میں دیکھ کر اس کی بیوی اور بچے خوف سے سہم گئے۔ بستر پر صرف خون ہی چھپا ہوا تھا اس کے علاوہ کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ اس نے غسل کیا اور دوسرے کپڑے پہن لیے۔ اس کی بیوی نے بستر دھونے کی غرض سے لپیٹا تو اس کے نیچے سے ایک کتاب کا صفحہ نکلا جس کا رنگ گہرا زرد تھا اور پھر یہ دیکھ کر اکرم کی سٹی گم ہو گئی کہ یہ اسی منحوس کتاب کا ورق تھا جو الماری سے غائب ہو گئی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ صفحہ یہاں کس نے لا کر رکھا اور باقی کتاب کہاں چلی گئی۔ صفحہ پر ایک سانپ کی تصویر چھپی ہوئی تھی جس کا منہ کھلا ہوا تھا اور اس میں چڑیا بھی پھڑپھڑا رہی تھی۔ سانپ کا رنگ سیاہ تھا اور اس پر دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ آدھے حصے پر تصویر تھی اور آدھے صفحے پر عجیب سے ہندسے لکھے ہوئے تھے۔ اکرم نے کاغذ کو تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھا اور شہر کی طرف چل دیا۔

شہر پہنچ کر اس نے اپنی دکان پر جانے کی بجائے اپنے ایک دوست شبراتی بابا کے پاس جانے کا قصد کیا۔ شبراتی بابا مضافاتی کالونی میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہائش پذیر تھے۔ ان کے ساتھ دوستی ہونے کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ اور یادگار ہے۔ ایک دن اکرم اپنی دکان پر بیٹھا حساب کتاب میں مصروف تھا کہ اچانک ایک فقیر کی صدا سن کر اس نے اپنا سر اٹھایا تو سامنے ایک درویش صورت شخص کو کھڑے پایا جو اپنا ہاتھ پھیلائے اس سے سوال کر رہا تھا۔ وہ شروع ہی سے قدرے رحمدل واقع ہوا تھا اس لیے اس نے اس فقیر کو اندر بلا کر عزت و تکریم سے بٹھایا اور اس کی حاجت پوری کی۔ فقیر جس نے بعد میں اپنا نام شبراتی بابا بتایا اس سے کہنے لگا کہ وہ اپنی دکان ایک مہینے کے اندر اندر خالی کر کے کوئی اور دکان تلاش کر لے اس کے کہنے کے مطابق اس کی چھت کسی وقت بھی گر سکتی ہے اور یہ کہ وہ اس کا امتحان لینے کے لیے اس کے پاس آیا تھا اس نے اس کی عزت و تکریم کر کے اپنا نقصان ہونے سے بچا لیا ہے۔ اکرم نے بحث کرنے کی بجائے دوسرے روز ہی اپنی دکان خالی کر کے دوسرے بازار میں ایک اور مناسب جگہ لے لی اور ٹھیک ایک ہفتے کے بعد فقیر کا کہنا سچ ثابت ہوا۔ رات کے پچھلے پہر اس کی دکان کی چھت ایک زوردار دھماکے سے زمین بوس ہو گئی۔ جس کی اطلاع چوکیدار نے اسے گھر آ کر دی تھی۔ اس دن اس نے سمجھ لیا تھا کہ شبراتی بابا کوئی پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ اکرم کے دل میں ان کی عزت اور بڑھ گئی۔ اور وہ گاہے بگاہے ان کے پاس جانے لگا۔ اس نے کئی بار انہیں کچھ رقم نذرانے کی صورت میں دینے کی کوشش کی مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ انہیں ان مادی چیزوں سے شدید نفرت ہے۔ ان کا یہ جواب سن کر اس نے دوبارہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ہمت نہیں ہوئی۔ اب وہ دل ہی دل میں یہ دعا مانگتا ہوا جا رہا تھا کہ بابا اسے گھر پر ہی مل جائیں تاکہ وہ انہیں تمام صورت حال بتا کر کوئی مشورہ لے سکے۔

تھوڑی ہی دیر میں بابا کا گھر سامنے آ گیا اس نے سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ابھی اس نے دوبارہ دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اندر سے ایک چقندر کی شکل کا لمبوترے چہرے والا شخص جس نے سبز رنگ کا چغہ پہن رکھا تھا باہر نکلا اور اس کی طرف دیکھ کر اس نے اکرم کو اندر کی طرف آنے کا اشارہ کرتے ہوئے راستہ دیا۔ اکرم اسے سلام کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ صحن میں ایک جانب چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا جس کے سامنے کے رخ دو مٹکے رکھے تھے۔ کمرے میں ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی جس پر شبراتی بابا آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے تھے اس کے گرد دو تین مرید بیٹھے اس کے بازو داب رہے تھے۔ شبراتی بابا تسبیح ہاتھ میں تھامے جھوم رہا تھا۔ اکرم نے سلام کیا تو انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اسے پہچان گئے اور اسے قریب ہی بٹھا لیا۔ اکرم نے ان کا حال احوال پوچھنے کے بعد اسے کتاب ملنے سے لے کر حامد کے ایکسیڈنٹ اور اپنے بستر کا خون سے تر ہونے کا تمام قصہ تفصیل سے سنا دیا۔ اس دوران بابا خاموشی سے اس کی باتیں سنتے رہے۔ اکرم چپ ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ بابا نے تمام باتیں سن کر ایک گلاس منگوایا اور اس میں پانی بھر کر اپنے سامنے رکھ لیا اور خود کو ایک بڑی سی چادر میں چھپا لیا۔ اس کے مرید اور اکرم خاموشی سے ایک جانب بیٹھے اسے دیکھتے رہے۔ وہ چادر کے اندر ہی اندر کچھ پڑھتے جا رہے تھے اور ساتھ ساتھ ہل بھی رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے چادر اپنے اوپر سے ہٹا دی۔ انہوں نے دیکھا کہ پانی کا رنگ خون کی طرح گہرا سرخ ہو رہا تھا اور بابا کا چہرہ پسینے سے تر بتر تھا۔ ان کی حالت یوں ہو رہی تھی جیسے وہ میلوں سے دوڑتے ہوئے آئے ہوں۔ کچھ دیر تک وہ سانس بحال کرتے رہے۔ پھر اکرم کی طرف دیکھ کر مخاطب ہوئے۔

"میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی کہ تمام حالات سے پردہ اٹھ جائے مگر میں صرف اس قدر ہی جان سکا ہوں کہ جو کتاب تمہیں ملی تھی وہ دو ہزار سال پرانی کتاب ہے۔ صدیوں پرانی اس کتاب کا موضوع کالے علم پر مبنی ہے۔ اس کتاب کے متعلق ایک اہم بات جو مجھے معلوم ہوئی ہے وہ یہ کہ جس کسی کے پاس یہ کتاب ہوگی اسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اب جب کہ تمہارے کہنے کے مطابق وہ کتاب الماری سے غائب ہو چکی ہے تو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں ایک تعویذ بنا دیتا ہوں اسے اپنے گھر میں لٹکا دینا انشاء اللہ تمہیں یا تمہارے گھر کے دیگر افراد کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔" یہ کہہ کر بابا نے اسے زعفران سے ایک تعویذ لکھ کر دے دیا۔

اکرم نے انہیں سلام کیا اور واپس دکان پر آ گیا۔ سارا دن دکان میں مصروف رہنے کی وجہ سے وہ کافی تھک گیا تھا اس نے دکان قبل از وقت بند کی اور گھر کی جانب چل دیا۔ ابھی وہ رستے میں ہی تھا کہ اسے اپنی جیب میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی اس نے سائیکل روک کر اپنی جیب میں جھانکا تو اس کی چیخ نکل گئی جیب میں ایک ننھا سا سانپ بیٹھا صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے جیب الٹ دی۔ جیب میں رکھے پیسے اور دیگر کاغذات وغیرہ جن میں بابا کا دیا ہوا تعویذ بھی شامل تھا باہر نکل کر نیچے زمین پر گر گیا، اور پھر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جیسے ہی اس نے کاغذات نیچے گرائے تو وہ سانپ جو اس نے جیب میں دیکھا تھا کہیں نظر نہیں آیا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ تعویذ بھی سرے سے غائب ہو گیا تھا جو اسے بابا نے دیا تھا اور پھر اس کی سمجھ میں ساری بات آ گئی کہ یہ سب دھوکا ہوا ہے یہ سب کارستانی اس کی جیب سے تعویذ نکلوانے کے لیے تھی۔

بادل نخواستہ اس نے دوبارہ گھر کی راہ لی اور جیسے ہی وہ گلی میں مڑا تو اسے اپنے گھر کے سامنے ہجوم نظر آیا اور گھر میں سے رونے اور چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں وہ منظر دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس نے جلدی سے ہجوم میں سے چند افراد کو پرے دھکیلتے ہوئے اندر جانے کے لیے جگہ بنائی اور اسے دیکھتے ہی لوگوں نے اس کو اندر جانے کے لیے جگہ دی۔ سامنے چارپائی پر اس کی منجھلی بیٹی لیٹی ہوئی تھی اور اس کے گلے میں ایک کاغذ اس طرح پھنسا ہوا تھا جیسے بلیڈ کو صابن میں پھنسا دیا جائے اور پھر اسے کاغذ کو پہچاننے میں قطعی مبالغہ نہ ہوا کہ وہ کاغذ اسی منحوس کتاب کا ورق تھا۔ جسے وہ غلطی سے گھر اٹھا لایا تھا۔ لوگ ایک دائرے کی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

صورت میں چارپائی کے گرد کھڑے تھے اور کسی کو اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ آگے بڑھ کر لاش کے گلے سے اس پھنسے ہوئے کاغذ کو نکال سکے۔ اکرم نے جیسے ہی کاغذ کو ہاتھ سے پکڑ کر باہر نکالا تو خون ایک فوارے کی صورت میں زمین پر گرنے لگا۔ اس نے جلدی سے ایک کپڑے کا ٹکڑا لے کر لڑکی کے گلے پر باندھ دیا اور اس طرح خون کا بہاؤ رک گیا۔ لڑکی کا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا ہو رہا تھا اور نجانے کب اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ بعد میں ضروری رسومات سے فارغ ہو کر اسے دفنا دیا گیا۔

اکرم کی تو راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ اسے ہر وقت اپنے چاروں طرف زرد رنگ کے اوراق اڑتے نظر آنے لگے۔ وہ دن بہ دن کمزور ہوتا چلا گیا۔ دکان پر توجہ نہ دینے کی وجہ سے کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا۔ اور آہستہ آہستہ وہ معاشی طور پر بالکل ختم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اس دن کو کوس رہا تھا جس دن وہ اس منحوس کتاب کو اٹھا کر گھر لایا تھا۔ لیکن اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس لیے اب اس غلطی کا خمیازہ اسے اور اس کے گھر کے دیگر افراد کو بھگتنا ہی پڑ رہا تھا۔ ایک صبح وہ سو کر اٹھے تو ان کی چھوٹی لڑکی جس کی عمر تقریباً چھ سال کے لگ بھگ تھی مردہ حالت میں پائی گئی۔ اس کا چہرہ خراشوں سے بھرا تھا یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اس کے چہرے پر خنجر سے نشان بنا دیئے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ لرزا دینے والی بات یہ تھی کہ اس کی گردن کے پچھلے حصے میں ایک سوراخ بنا ہوا تھا اور جس میں سے مغز نکال لیا گیا تھا اور ایک گڑھا سا بن گیا تھا اور اس گڑھے میں ایک کاغذ کو گولا بنا کر بھر دیا گیا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر ان کی چیخیں نکل گئیں۔

سب سے دہشت ناک بات یہ تھی کہ وہ کاغذ اسی کتاب کا ورق تھا۔ پل دو پل میں تمام قصبہ میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اور آناً فاناً تمام لوگ اس کے گھر جمع ہونا شروع ہو گئے جو بھی بچی کو اس حالت میں دیکھتا خوف اور حیرت سے سہما سہما دور ہٹ جاتا۔ سب لوگ دل ہی دل میں اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگے۔ اکرم کی بیوی پر غشی طاری تھی۔ ان کے لیے اپنی پہلی بچی کا صدمہ ہی جان لیوا تھا کہ یہ دوسرا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ اکرم کی حالت سب سے زیادہ ناگفتہ بہ تھی وہ اپنی بچیوں کی اموات کا خود کو ذمہ دار سمجھ رہا تھا۔ لوگ انہیں دلاسے دے رہے تھے۔ مگر وہ اندر اندر ہی کھوکھلے ہوتے جا رہے تھے۔ اکرم دوبارہ شبراتی بابا کے پاس بھی گیا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ انہوں نے دوبارہ حساب لگا کر دیکھا ہے مگر وہ اس معاملے میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ کیونکہ بدی کی طاقت کے سامنے ان کا معمولی حاصل کیا ہوا روحانی علم کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس سے ٹکر لینے کے لیے بڑے عالم کی ضرورت ہو گی۔ بدی اور نیکی کی طاقتیں ازل سے ہیں اور وہ شروع سے ایک دوسرے کے خلاف کارفرما رہی ہیں۔ بابا کا ٹکا سا جواب سن کر اکرم کی رہی سہی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس لیے اس نے تمام معاملہ خدا پر چھوڑتے ہوئے چپ سادھ لی۔ مگر اب جس طرح پے در پے واقعات رونما ہونا شروع ہو گئے یہ اس کے لیے لمحہ فکریہ تھا لیکن وہ مجبور تھا۔ دکان بند رہنے کی وجہ سے نوبت فاقہ کشی تک پہنچ گئی۔ اور کوئی ان کا پرسان حال نہیں تھا۔ قصبہ کے لوگوں نے کچھ روز تک تو ان کی مدد کی لیکن آخر کب تک ہر کسی کے ساتھ پیٹ لگا ہوا تھا۔ اس لیے اب تو لوگ اس کے مکان کے نزدیک سے گزرنے سے بھی کترانے لگے تھے کہ کہیں نحوست کے سائے ان پر بھی نہ پڑ جائیں۔ اس دوران اس کا لڑکا حامد جو کہ شہر پڑھنے گیا تھا وہ بھی معاشی حالت پتلی ہونے کی وجہ سے فیس ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے ناکام ہو کر گھر لوٹ آیا۔ وہ اپنی عمر کی سولہ بہاریں دیکھ چکا تھا گھوم پھر کر مزدوری ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر کم عمر سمجھ کر نا کام رہا۔ گھر میں برے وقتوں کے لیے جو پونجی بچا کر رکھی تھی وہ کب کی ختم ہو گئی تھی۔ ایک روز اکرم جسے ٹی بی کا روگ لگ چکا تھا اسے قبر تک پہنچا کر ہی دم لیا۔ اس کی جدائی میں اس کی بیوی بھی چل بسی۔ اس بات کا حامد نے اپنے ذہن پر اتنا صدمہ لیا کہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا اور اب قصبہ کی گلیوں میں خاک اڑاتا پھرتا ہے شاید کبھی زندگی اس سے بھی روٹھ جائے اور وہ بھی اپنے والدین اور بہنوں کے پاس چلا جائے۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

سنہری دھوپ

دستگیر شہزاد

عزت سے اہم دنیا میں کوئی اور بات اہمیت نہیں رکھتی۔ اعتماد انسان کا وہ ہتھیار ہے جسے استعمال کرکے اپنی زندگی کو خوب صورت یا بد صورت بنایا جاسکتا ہے۔ جہاں پیار و محبت ہو وہاں عزت اور اعتماد نا ہو تو انسان کی گاڑی پٹڑی سے اتر کرنا ہموار جگہ پر چل پڑتی ہے جس کے نتیجے میں تباہی کے علاوہ کوئی دوسرا انجام نہیں ہوتا۔

حسین و دلکش لفظوں سے سجی کہانی بے شمار حقیقتوں سے روشناس کرائی گی تو وہیں یہ وفا اور محبت کی لازاول داستان سناتی نظر آئے گی۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

محبت و نفرت کے جذبوں سے معمور جذباتی کہانی

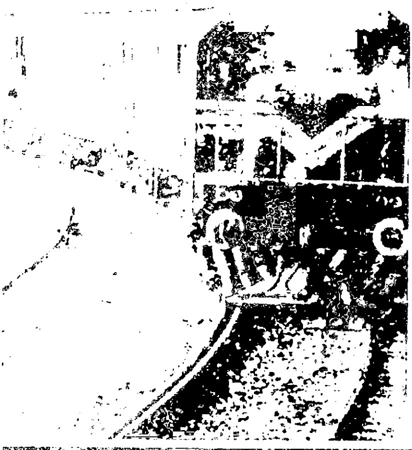

لائل پور (شہر فیصل آباد) سے باہر آم کے بوڑھے اداس اور زمانہ دیکھے ہوئے پرانے پیڑوں کے بیچ ذرا سی کھلی جگہ میں سفید رنگ کی ایک قبر دکھائی دیتی ہے جس پر کسی کے نام کی تختی نہیں ہے۔ قبر کے پاس ہی ایک سمادھی ہے...... اس کی اینٹوں پر بھی سفید رنگ کر دیا گیا ہے اس پر بھی کسی کا نام نہیں ہے آم کے پیلے لمبے پتوں والی شاخوں نے آگے آ کر قبر اور سمادھی پر سائبان سے تانے ہیں جن میں سے سورج کی چاندی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے گرتے رہتے ہیں شاخوں پر بیٹھے ہوئے سینکڑوں طوطے اس طرح آواز سے آواز ملا کر چیختے رہتے ہیں جیسے زمین کے قصے دہرا رہے ہوں اور کالی دھاری والی گلہریاں دوڑتے بھاگتے اچانک قبر کے پاس آ کر رک

جاتی ہیں اور اپنی دم کے سہارے سیدھی بیٹھ کر اگلے پنجے اس طرح اٹھا لیتی ہیں جیسے فاتحہ پڑھ رہی ہوں' ارائی کے ٹھنڈے سناٹے میں اس اکیلی قبر میں عبداللہ اور اسے متصل میں سونے والی کا نام شکنتلا ہے۔ یہ کہانی جنہیں معلوم ہے وہ کچھ نہیں کہتے مگر جنہیں معلوم نہیں ہے وہ حیرت کرتے ہیں کہ مسلم ہندو نفرت کے باوجود مسلمان ہندنی کا ایسا امر ملن کیسے ممکن ہے۔

مجھے یہ کہانی 1925 سے شروع کرنی چاہیے' جب شکنتلا پیدا ہوئی تھی مگر اس میں کیا خاص بات ہے' سارے بچوں کی طرح وہ بھی ایک دن پیدا ہو گئی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلوٹھی کی تھی' اس لیے سب کی لاڈلی تھی...... سوائے باپ کے' جسے بیٹی پیدا ہونے پر کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی' یہ بھی ممکن ہے خوشی ہوئی ہو اور کسی کو پتا نہ لگا ہو کیونکہ باپ ذرا الگ ہی قسم کا ہندو تھا۔ ہنسنے مسکرانے' خوش رہنے یا خوش رکھنے سے اس طرح بچتا تھا جیسے کٹر ہندو کتوں سے بچتے ہیں...... اب ایسے آدمی کے دل میں اگر باپ کی محبت جاگی بھی ہوگی تو بے چاری گھبرا کر کہیں دبک گئی ہوگی۔

اس لیے ہمیں یہ کہانی 1945 سے شروع کرنی چاہیے۔ جب شکنتلا کی زندگی کا پہلا بڑا موڑ آیا تھا۔

سترہ برس کی شکنتلا پڑھ رہی تھی اور گرلز اسکول کی اچھی طالبات میں شمار ہوتی تھی۔ اپنے ساتھ کی لڑکیوں میں بھی کافی مقبول تھی۔ کیونکہ پہننے اوڑھنے کا سلیقہ تھا اور صورت شکل بھی اچھی تھی گول چہرہ' صاف رنگ' بے حد بڑی بڑی آنکھوں کے اوپر چوڑا ماتھا' لمبے بالوں کی موٹی سی چوٹی جو کمر پر بل کھاتی رہتی تھی اور ہونٹوں پر لرزتی ہوئی ایک بے حد دل آویز مسکراہٹ' جسے دیکھ کے ڈر لگتا تھا کہ کہیں ہونٹوں سے گر کے ٹوٹ نہ جائے۔ ایک دن جب شکنتلا اسکول سے واپس آئی تو اس کے پتا انار کے پیڑ کے پاس آرام کرسی پر نیم دراز حقے سے شوق فرما رہے تھے۔ شکنتلا نے نمستے کہا اور اپنے کمرے میں جانے لگی تو ان کی آواز گونجی۔

''ٹھہرو۔'' شکنتلا جہاں تھی وہیں جم گئی۔

دل بہت زور سے دھڑکنے لگا۔ دماغ نے ہائی اسپیڈ میں سوچنا شروع کیا کہ اس گرج کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ آتے ہی نمسکار تو کیا تھا' سر بھی دوپٹے سے ڈھکا ہوا ہے۔ آنکھوں میں کاجل بھی نہیں دکھائی دے رہا ہے' جس سے پتا جی کو نفرت ہے۔ اسکول سے بھی کوئی شکایت نہیں آ سکتی کیونکہ آج ہی شاباش ملی ہے تو پھر کیا ہوا؟ اس نے ڈرتے ڈرتے باپ کی طرف دیکھا سفیدی مائل زرد رنگ کے چہرے پر بڑی سی ناک گالوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں' اور دھنسی ہوئی آنکھوں سے نکلتی ہوئی نظریں جو تیزاب کی دھار لگ رہی تھیں۔

''جی کہیے؟'' شکنتلا نے ہکلا کر پوچھا۔ تیزاب کی دھار نے اسے سر سے پاؤں تک بھگو دیا۔

''تم کل سے اسکول مت جانا۔'' شکنتلا کا دل ایک دم سے بند ہو گیا۔

کتابیں ہاتھ سے چھوٹ کر پیروں پر گر گئیں مگر وہ اٹھانے کے لیے نہیں جھکی...... اسے اپنی آواز ایک سرگوشی کی طرح سنائی دی۔

''مم مگر...... کیوں؟''

''اپنی آپا سے پوچھو۔'' پتا کے منہ سے گاڑھے دھوئیں کے ساتھ نکلا۔

شکنتلا کی آپا اس کی بہن نہیں تھی' وہ اس کی ماں تھی، وہ شکنتلا سے صرف سولہ برس بڑی تھی اور لگتی بھی بڑی بہن جیسی تھی' ان کو اماں کہنا بڑا الٹ پٹا لگتا تھا، اس لیے جب شکنتلا نے آپا کہا تو باقی بچے بھی آپا ہی کہنے لگے۔

اس کی اپنی ماں کی طرف دیکھا جو دھوئیں سے کالے باورچی خانے میں چولہے کے بالکل سامنے ایک پیڑھی پر بیٹھی پتیلی کے نیچے آگ تیز کر رہی تھی۔ سانولا چہرہ گرمی سے تمتما رہا تھا مگر آنکھوں میں جہاں عام طور سے تھکان اور اداسی کا ڈیرہ رہتا تھا ایک عجیب سی چمک تھی۔ جیسے وہ آنکھیں اپنے طور طریقے بھول کر مسکرانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ چہرے کی تمتماہٹ میں آنچ کے ساتھ خوشی بھی جھلک رہی تھی۔ شکنتلا کے لیے یہ منظر نیا تھا۔ اسے تو ہمیشہ آپا کی صورت میں وہ بکری دکھتی جو پانی پینے سے بھی اس لیے ڈرتی ہے کہ پتہ نہیں شیر کب آ جائے۔

''آپا' بھائی صاحب مجھے اسکول جانے سے کیوں روک رہے ہیں؟'' شکنتلا نے باورچی خانے کے دروازے میں کھڑے ہو کر پوچھا۔ آپا کی رعایت سے پتا جان کو بھی بھائی صاحب ہی کہا جاتا تھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

آپا، شکنتلا کو دیکھ کر مسکرائیں۔ یہ مسکراہٹ بھی نئی چیز تھی ایسی کوندتی ہوئی مسکراہٹ تو اس گھر میں کسی نے کبھی نہیں دیکھی ہو۔

''تم کچھ بولتی کیوں نہیں؟'' شکنتلا کو غصہ آنے لگا۔

''تمہاری شادی ہونے والی ہے۔'' آپا اسی طرح مسکراتی رہیں پھر دھیرے سے بولیں۔

''شادی......؟'' وہ دھک سے رہ گئی اس نے پیڑھی گھسیٹی اور پاس بیٹھ گئی۔

''یہ اچانک میری شادی کہاں سے آ گئی بیچ میں؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہارے بڑے پتا آئے تھے وہ چاہتے ہیں کہ تمہاری اور سنیل کمار کی شادی کر دی جائے۔'' آپا نے صحن کی طرف دیکھا جہاں حقے کا نیلا دھواں ہوا میں تیر رہا تھا اور آواز دبا کر بولیں۔

''سنیل کمار۔'' شکنتلا کے سامنے ایک پتلا دبلا لمبا سا لڑکا آ کھڑا ہوا جس کے بکھرے ہوئے بال اور سوئی سوئی آنکھیں دیکھ کر لگتا تھا کہ تھوڑی سی نیند باقی ہے۔ وہ آنکھیں اسے ہمیشہ اچھی لگتی تھیں۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

''وہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہولی کے بعد رسم کر دی جائے۔'' آپا نے بتایا۔

''میری پڑھائی؟ امتحان میں چار مہینے تو رہ گئے ہیں۔''

''ارے تمہیں کون سی نوکری کرنی ہے' بس جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا۔ تمہارا شوق پورا ہو گیا۔ اب اپنا گھر سنبھالو۔'' آپا نے جلتی ہوئی لکڑی چولہے سے باہر کھینچ کر آنچ کم کی اور ذرا سا منہ بنا کر بولیں۔

''مگر آپا'' اس نے احتجاج کیا۔

آپا کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ انہوں نے جھٹکے سے پتیلی اتاری اور ذرا سی اونچی آواز میں کہا۔

''اب جو کچھ کہنا سننا ہے اپنے بھائی صاحب سے کہو' فیصلہ تو ہو چکا ہے۔''

ایسا نہیں ہے کہ فیصلے پر شکنتلا کو کوئی اعتراض تھا، بس ایک خواہش تھی کہ میٹرک پاس کر لیتی۔ وہ اپنے خاندان کی ایک ہی لڑکی تھی جو اسکول جاتی تھی اور اگر امتحان دے سکتی تو پہلی لڑکی ہوتی جسے ڈگری یافتہ کہا جاتا مگر اب اس نے سر جھکا دیا تو یہ تھا شکنتلا کی زندگی کا پہلا بڑا موڑ۔

☆......☆......☆

بڑے پتا کی حویلی شکنتلا کے لیے نئی نہیں تھی۔ وہ کئی بار یہاں آ چکی تھی۔ اور ہفتوں رہ چکی تھی۔ حویلی کا کونا کونا اس کا دیکھا ہوا تھا۔ بڑے بڑے کمرے پیڑوں اور بیلوں سے سجے ہوئے آنگن' دالان کی محرابوں میں جھولتے ہوئے پردے' پتھر کی منڈیر والا کنواں اور وہ بے حد اونچا دروازہ جس کی اونچائی کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ کبھی اس دروازے سے ہاتھی گزرا کرتے تھے' سب کچھ شکنتلا کا دیکھا بھالا ہی تھا مگر پھر بھی جب وہ دلہن بن کر آئی تو اسے ایسے لگا جیسے سب کچھ نیا ہو' نئے پن کا احساس' رشتہ بدل جانے سے آیا تھا۔ پہلے وہ مہمان ہوا کرتی تھی' اب بہو تھی۔ اب یہ اس کا گھر تھا۔ آدھی درجن دیور اور نندیں سنیل کمار کے چھوٹے چچا ان کی اولادیں بھی وہیں رہتی تھیں۔

بیوہ پھوپھی اور ان کے بچے...... بس ایک ہنگامہ تھا جس پر گھر کی رونق موقوف تھی۔

شکنتلا کو ان سب لوگوں میں گھل مل جانے میں زیادہ وقت نہیں لگا اور نہ ہی کسی سسرالی عزیز نے شکنتلا کو اپنانے میں دیر لگائی۔ سوائے دو افراد کے جن کے رویہ کا بدل جانا اس کی سمجھ سے باہر کی چیز تھی۔ وہ اپنے دماغ پر بہت زیادہ زور ڈالتی کہ شادی سے پہلے جو بڑے پتا اور بڑی چچی آنکھیں بچھایا کرتے تھے اب بات بات پر کیوں آنکھیں دکھانے لگے ہیں۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ عام طور پر ایسی بہو کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے جو اچھا جہیز نہ لائے، شکنتلا کے ساتھ تو یہ بات بھی نہیں تھی۔ اس کے گھر والوں نے امید سے کہیں زیادہ دیا تھا۔ زیور کے چھ سات سیٹ تھے۔ تین بکسے بھر کے جوڑے تھے' دلہا پر پیسے بھی کم نہ نچھاور کیے گئے تھے مگر چچا، چچی کے تیور بدلتے گئے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ سنیل کمار ایک محبت کرنے والا پتی ثابت ہوا، ورنہ ماحول ایسا تھا کہ دم گھٹ جاتا۔

سنیل کمار لکڑی کا کاروبار کرتا تھا۔ جنگل ٹھیکے پر لیتا' پیڑ کٹواتا اور بیچ ڈالتا' اس کا کام اچھا چل رہا تھا مگر ملک کی سیاسی حالات بدل رہے تھے اور اس کا اثر ہر قسم کے کاروبار پر ہو رہا تھا۔ آئے دن کے فسادات مسلمان ہندوؤں کے بیچ بڑھتی ہوئی بے اعتمادی اور ملک تقسیم ہو جانے کا اندیشہ ایسی فضا پیدا کر رہا تھا جس میں ہر تجارت مار کھا رہی تھی'

ہندوؤں کا تو اور بھی برا حال تھا۔

سنیل کمار دونوں ہاتھوں سے اپنی ڈگمگاتی کشتی کو سنبھال رہا تھا مگر کب تک؟ وہ لوگ جو جنگل کٹنے سے پہلے پیسہ دے دیا کرتے تھے، اب ہچکچانے لگے تھے، سنیل کمار کا کاروبار تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ کشتی ڈوبنے کے قریب تھی اور ایک دن جب سڑکوں پر پاکستان زندہ باد، انقلاب زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے اور مسافر گاڑیوں پر حملے ہو رہے تھے، دکانیں لوٹی جا رہی تھیں اور بسوں میں آگ لگ رہی تھی، سنیل کمار نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا شہر بھی بدل دے گا اور بزنس بھی۔ اسے ایک پارٹنر مل گیا جو کنسٹرکشن لائن میں تھا اور سنیل کمار کو ساتھ لینے کے لیے تیار تھا۔ اس کی ایک ہی شرط تھی کہ جتنا پیسہ وہ لگائے گا، سنیل کمار کو بھی اتنا ہی لگانا پڑے گا مگر پیسہ تھا کہاں؟

شکنتلا سب کچھ دیکھ رہی تھی اور سمجھ بھی رہی تھی مگر صبر کرنے کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس رات بھی وہ دونوں بچوں کو سلا کر پوجا پاٹھ کے بعد کمرے میں آئی تو سنیل کمار کرسی پر آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ شکنتلا اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے غور سے سنیل کمار کو دیکھا۔ بال اب بھی بکھرے ہوئے تھے مگر روکھے اور الجھے ہوئے تھے۔ بند آنکھوں کے نیچے سرمئی دائرے، بن گئے تھے اور بڑھی ہوئی داڑھی میں ایک دو سفید بال بھی دکھائی دے رہے تھے۔

اسے اس تھکے ہوئے نڈھال سنیل کمار پر بہت پیار آیا۔

”کچھ کھاؤ گے؟“ دھیرے سی سر پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا۔

سنیل کمار نے آنکھیں کھول دیں۔ انہیں دیکھ کر اب بھی لگتا تھا کہ تھوڑی سی نیند باقی رہ گئی ہے مگر وہ نیند نہیں تھکان تھی۔

پیسے کا کچھ بندوبست ہوا؟ شکنتلا نے پوچھا۔

”نہیں......“

”تم بڑے پتاجی سے بات، کیوں نہیں کرتے؟“ اس نے مشورہ دیا۔ ”وہ تو جتنا مانگو دے سکتے ہیں۔“

”کی تھی۔“

”پھر انہوں نے کیا کہا؟“

”انکار کر دیا کہ اپنے چچا سے مانگو۔“ شکنتلا حیران ہو گئی۔

”بھائی صاحب سے؟ مگر ان کے پاس کیا ہے؟ ان کی جائیداد کی دیکھا بھال بھی تو بڑے پتا ہی کرتے ہیں۔ سارا حساب کتاب بھی انہی کے پاس ہے۔“

”کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے، مجھے سب معلوم ہے۔“ سنیل کمار کچھ جھنجلا کر بولا۔

شکنتلا چپ چاپ بیٹھی سنیل کمار کو دیکھتی رہی جو کانپتے ہاتھوں سگریٹ سلگا رہا تھا۔

”تم بڑے پتا سے میرے زیور لے کر بیچ ڈالو۔“ سنیل کمار کے ہاتھ سے سگریٹ گرتے گرتے بچی۔

”یہ کیا بک رہی ہو؟“ اس نے غصے سے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

”دو تین لاکھ تو مل ہی جائیں گے۔“ شکنتلا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”ارے تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟“ اس کا لہجہ بدستور غصے میں تھا۔

”تمہارا بزنس چل پڑے گا تو پھر بنوا دینا۔“ شکنتلا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اس نے سنیل کمار کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دھیرے سے بولی۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

شکنتلا کے سارے زیور بک گئے۔ حویلی چھوڑنے سے پہلے اس نے چاروں طرف دیکھا اس گھر میں اس نے پانچ سال گزارے تھے۔ اس کے بچے اس مٹی پر گھٹنوں چلے تھے، اسی آنگن کے موگرے سے اس نے اپنی کلائیوں کے لیے گجرے بنائے تھے۔ اسے ایسے لگا جیسے باسی پھولوں کی خوشبو اس کو روک رہی ہے۔ اس کے آنسو نکل آئے اس نے پلٹ کر دیکھا سب اسے رخصت کرنے کے لیے دروازے تک گئے تھے۔

”ارے مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا کہ یہی ہو گا۔ اچانک اسے چچی کی آواز سنائی دی۔ آتے ہی میرے بیٹے کو قبضے میں کر لیا اور اب ہمیشہ کے لیے لے کر جا رہی ہے۔“ چچی نے دہائی دیتے ہوئے کہا۔

شکنتلا سن ہو گئی۔ تو یہ تھی ان کی نفرت کی وجہ، مگر میں نے تو کسی کو کسی سے الگ نہیں کیا۔ اب اگر سنیل کمار مجھے چاہتا ہی اور زیادہ وقت میرے ساتھ گزارتا ہے تو میں کیا کروں اور پھر یہ تو ہر گھر میں ہوتا ہے۔ بہو کے لیے ہر سانس کو جگہ خالی کرنی ہی پڑتی ہے، وہ اپنی صفائی دینے کے لیے بڑھی مگر تب تک

چچی پلٹ کر اندر جا چکی تھیں۔
سنیل کمار اپنے بیوی بچوں کے ساتھ دوسرے شہر منتقل ہوگیا اور یہی وہ جگہ ہے جہاں شکنتلا کی زندگی کا دوسرا موڑ آتا ہے۔
لاہور کا گھر حویلی جتنا بڑا تو نہیں تھا مگر چھوٹا بھی نہیں تھا۔ ایک منزلہ مکان تھا۔ نیچے سنیل کمار کا پارٹنر عبداللہ رہتا تھا اور شکنتلا نے اپنی دنیا پہلی منزل پر بسائی تھی۔ اوپری منزل کا زینہ اس طرح بنایا گیا تھا کہ سیدھا سڑک پر اترتا تھا۔ مگر بیچ میں ایک دروازہ تھا جسے کھول دیا جائے تو نیچے اوپر کے مکان ایک ہوجاتے تھے۔ سنیل کمار، عبداللہ کے ساتھ کنسٹرکشن کے کام میں جٹ گیا مگر زمانہ خراب تھا۔ چاروں طرف سے فسادات کی خبریں آرہی تھیں۔
چالیس کروڑ ہندو سکھ اچانک پاگل ہوگئے تھے۔ مسلمانوں کو مار رہے تھے۔ لوٹ رہے تھے۔ بستیاں جلا رہے تھے۔ عبداللہ نے جوڑ توڑ کرکے سرکار سے ایک پل بنانے کا ٹھیکہ حاصل کرلیا تھا مگر وہاں سے بھی پیسہ نہیں آرہا تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کی قسمت میں پاکستان لکھا جاچکا تھا، تقسیم طے تھی، پاکستان جو ایک تصور تھا، حقیقت میں ڈھل جانے والا تھا۔ ہندو اس طرح سانس روکے ہوئے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی ٹائم بم پھٹنے والا ہو اور اس کی گھڑی ٹک ٹک کررہی ہو۔
کسی بھی کاروبار کی بنیاد اعتبار ہوتا ہے اور اعتبار تو جیسے اٹھ ہی گیا تھا۔ مسلمان ہندوؤں پر بھروسہ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ سب ڈرتے تھے کہ جن پر اعتبار کررہے ہیں وہ ہندوستان بھاگ گئے تو کیا ہوگا۔ سنیل کمار دفتروں کی خاک چھانتے، جگہ جگہ پر ٹینڈر بھرتے اور لوگوں کی خوشامد کرتے کرتے تنگ آچکا تھا۔
لہروں کی مخالف سمت تیرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ سنیل کمار بھی تھک گیا تھا مگر کر بھی کیا سکتا تھا۔ بیوی اور دو بچوں کے ساتھ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ شکنتلا حالت کو سمجھ رہی تھی۔ اسے سنیل کمار سے ہمدردی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ وہ کہیں مسلسل ناکامیوں سے ٹوٹ نہ جائے۔ سنیل کمار گھر آتا تو ہمت بڑھانے والی باتیں کرتی۔ اسے یقین دلاتی کہ وقت کبھی ایک جیسا نہیں رہتا، سنیل کمار کا وقت بدلے گا، وقت تو نہیں بدلا مگر سنیل کمار بدل گیا۔ ہوا یوں کہ عبداللہ اور سنیل کمار کنسٹرکشن کمپنی کا ایک ٹینڈر پاس ہوا، جس دن آفیسر سے ملاقات کے لیے جانا تھا عبداللہ کی طبیعت خراب ہوگئی اس لیے سنیل کمار کو اکیلے ہی جانا پڑا۔ آفیسر نے ٹینڈر کے بارے میں دو چار سوال کیے۔
”ہماری کمپنی کئی پروجیکٹ شروع کرنے والی ہے اگر آپ نے اس کام کو ٹائم پر ختم کردیا تو ہم دوسرے پروجیکٹ میں بھی آپ ہی کو ساتھ لیں گے۔ ہماری کمپنی محنتی اور ایماندار لوگوں کی بڑی عزت کرتی ہے۔ عبداللہ جی۔“ اس نے کہا۔
”جی شکریہ، مگر میں عبداللہ نہیں ہوں وہ میرا پارٹنر ہے۔“ سنیل کمار مسکرادیا۔
”آپ کا نام کیا ہے؟“ آفیسر نے حیرت سے دیکھا اور پوچھا۔
”سنیل کمار“ اس نے جواب دیا۔
آفیسر چپ ہوگیا اور اس نے سنیل کمار کی فائل کو کوئی بار الٹ پلٹ کر دیکھا پھر بولا۔
”سوری سنیل کمار صاحب، یہ کنٹریکٹ آپ کو نہیں دیا جاسکتا۔“
”مگر کیوں؟“ سنیل کمار نے حیران ہوکر پوچھا۔
”ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ......“
”ہم ہندوؤں کو کام نہیں دیتے، یہ ہماری کمپنی کی پالیسی ہے۔ آپ جاسکتے ہیں۔“ آفیسر نے اس کی بات کاٹ دی۔
اس رات سنیل کمار نے شراب پی اور اتنی پی کہ اپنے گھر کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے دوبار گرا اور ہاتھ زخمی کرلیے، شکنتلا نے دلاسا دیا مگر پانچ سال کی ناکامیاں سنیل کمار کے لیے پہاڑ بن گئیں تھیں اور اکیلا پتھر توڑ سکتا ہے، پہاڑ نہیں توڑ سکتا۔ ہاتھوں کے زخم دو چار دن میں بھر گئے مگر ایسا لگتا تھا جیسے کوئی زخم نہیں اور بھی لگا ہو جو بھرنے میں نہیں آرہا ہو۔ عبداللہ نے سمجھایا، شکنتلا نے تسلی دی مگر سنیل کمار سمجھ نہیں سکا۔ مایوسی بڑھتی گئی اور شراب بھی۔ وہ گھر میں آتا تو ایسا لگتا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ چیزوں کا پھینکنا، برتنوں کا توڑنا، ذرا ذرا سی بات پر بچوں اور شکنتلا پر چیخنا چلانا اور گالیاں دینا روزانہ کا معمول بن گیا۔
ایک دن تو حد ہی ہوگئی کھانے کی میز پر نمک نہ ہونے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کے جرم میں اس نے شگفتہ پر ہاتھ اٹھا دیا۔ انگلی میں پڑی ہوئی شادی کی انگوٹھی آنکھ کے اوپر لگی۔ بھوں پھٹ گئی۔ آنکھ خون سے بھر گئی۔ بچے دہشت سے چیخنے اور رونے لگے مگر سنیل کمار نے پروا بھی نہیں کی۔ وہ اٹھا اور باہر نکل گیا' جب دیر گئے لوٹا تو بچے سو چکے تھے۔ مگر شگفتہ گرم کھانا لیے اس کا انتظار کر رہی تھی لیکن سنیل کمار کو ہوش ہی کہاں تھا کہ وہ شگفتہ کی طرف دیکھتا' وہ لڑکھڑاتا ہوا کمرے میں چلا گیا اور بستر پر گر کے بے ہوش ہو گیا۔

کچھ دن بعد جب سنیل کمار باہر گیا تو بند دروازے کے باہر کھڑے ہو کر عبداللہ نے آواز دی۔

''بھابی۔'' شگفتہ دروازے کے دوسری طرف آ کے کھڑی ہو گئی۔

''جی عبداللہ جی۔''

''یہ کب تک چلے گا بھابی؟'' عبداللہ نے گلا صاف کیا اور ہچکچا کر بولا۔

''کیا سب تک چلتا رہے گا؟'' شگفتہ نادان نہیں تھی وہ ذرا سمجھ گئی کہ عبداللہ کیا کہہ رہا ہے' پھر بھی انجان بنتے ہوئے بولی۔

''یہی [illegible] دن کی مار پیٹ' گالی گلوچ' اب تو مجھے [illegible] بھی پوچھنے لگے ہیں کہ [illegible] روز کیا ہنگامہ ہوتا ہے؟'' [illegible] عبداللہ نے کہا۔

شگفتہ دروازے کے پیچھے چپ چاپ سر جھکائے [illegible] کو [illegible] رہی جو [illegible] سے ٹوٹ گئے تھے۔

''بھابی آپ سن رہی ہیں نا؟'' عبداللہ نے کہا۔

''میں کیا [illegible] میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا [illegible] کیا تک [illegible] مار [illegible] ہے۔'' شگفتہ کی آواز [illegible]

''سنیل کمار [illegible] آدمی ہے وہ [illegible] کا مطلب نہیں [illegible] آپ [illegible] آپ [illegible]

[illegible] عبداللہ نے کہا۔

''[illegible] کیا کر سکتی ہوں عبداللہ جی؟'' شگفتہ [illegible]

''[illegible] سنیل کمار کے والد کو خط لکھیے کہ وہ [illegible] میں [illegible] تو ہوگا جس کی بات کا سنیل کمار [illegible]'' عبداللہ نے پوچھا۔

> **قطعہ**
>
> یہ سب میری بربادی کا کب پوچھ رہے ہیں
> کیوں زندہ ہوں اب تک یہ سبب پوچھ رہے ہیں
> وہ شدت غم ہے میری جاں پر بنی ہے
> اور دوست سوالات عجب پوچھ رہے ہیں
>
> راؤ تہذیب حسین تہذیب...... رحیم یار خان

''ایک آپ ہی ہیں۔'' شگفتہ نے کہا۔ ''آپ کی وہ بہت عزت کرتے ہیں۔''

''میں تو سمجھا سمجھا کے ہار چکا ہوں۔'' عبداللہ نے مایوسی سے سر ہلایا اور بولا۔

''میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اتنا بدل جائے گا۔ بالکل جانور بن گیا ہے' جب وہ آپ کو مارتا ہے اور معصوم بچے چیخ چیخ کر روتے ہیں تو جی چاہتا ہے اندر گھس کر ایسی پٹائی کروں کہ سارا نشہ اتر جائے مگر لوگ پتا نہیں کیا مطلب نکالیں [illegible] چپ ہو جاتا ہوں۔''

''نہیں عبداللہ جی' آپ ان سے کچھ نہ کہیے۔'' شگفتہ نے اپنی آنکھوں [illegible] آنسو روکتے ہوئے کہا۔ ''بھگوان نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔ ''خدا ہر ایک کو آپ جیسی اچھی بیوی دے۔'' عبداللہ جانے کے لیے مڑا تو جم کر رہ گیا۔

سنیل کمار [illegible] کے پیچھے کھڑا ہو [illegible] سب کچھ سن رہا تھا۔

[illegible] آج تو یہ آدمی شگفتہ پر قیامت ہی توڑ دے گا اور وہی ہوا۔ قیامت ٹوٹی اور [illegible] ٹوٹی [illegible] الامان [illegible] جب [illegible] اور بچوں کے رونے کی آوازیں [illegible] پڑوسی جمع [illegible]

''[illegible] وہ [illegible] اندر آ جاؤں گا۔'' عبداللہ [illegible] چلا [illegible] کہا۔

''سالے [illegible] آوارہ [illegible] میرے [illegible] سے یاری [illegible]'' وہ تو پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔

عبداللہ نے بند دروازے کو [illegible] ماری [illegible] کے پیچھے [illegible] تو جو منظر دکھائی دیا اس نے عبداللہ کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ سنیل کمار [illegible] کی بوتل شگفتہ کے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

سر پر خالی کر رہا تھا' خون اور تیل میں بھیگا شکنتلا کا چہرہ ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی تصویر کے گیلے رنگوں پر پانی گرے اور رنگ بہنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ سنیل کمار شکنتلا کو ماچس دکھائے' عبداللہ نے اس کی گردن پکڑی اور زور سے دھکا دیا۔ سنیل کمار دیوار سے ٹکرایا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔

شکنتلا چیخی۔

"سنیل کمار' سنیل کمار" اور اسے سہارا دے کر اٹھانے لگی۔

عبداللہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ کیسی عورت ہے یہ؟ اس آدمی کو سنبھال رہی ہے جو ایک منٹ پہلے اسے زندہ جلا دینے والا تھا۔ سنیل کمار نے شکنتلا کا ہاتھ جھٹکا' دیوار کے سہارے کھڑا ہوا' دانت پیس کر عبداللہ کو دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"یہ بات ہے؟ ٹھیک ہے۔" وہ لڑکھڑا کر ایک قدم شکنتلا کی طرف بڑھا اور بولا۔

"میں تجھے طلاق دیتا ہوں' حرامزادی' بدچلن عورت۔"

(سکھوں میں طلاق کے معاملات پیچیدہ ہوتے ہیں۔ بات کو سمجھنے کے لیے یہ مختصر اصطلاح استعمال کی جا رہی ہے)

اس بات کو تین دن گزر چکے تھے گھر میں سب تھے مگر ایسا سناٹا تھا جیسے وہاں پرچھائیاں رہتی ہوں' عبداللہ انار کے پیڑ تلے' پتھر کے ٹوٹے چبوترے پر بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ زندگی کی کہانیاں اتنی الجھی ہوئی کیوں ہوتی ہیں' جن لکیروں میں قسمت چھپی ہوتی ہے' وہ تو اتنی الجھی ہوئی نہیں ہوتی ہیں۔

شکنتلا کی کہانی بھی' کہاں سے چلی اور کہاں پہنچ گئی۔ سنیل کمار کی الجھنوں کا ذمہ دار کون ہے؟ پاکستان کا قیام' تجارت میں ناکامی' شراب یا میں؟ اس نے بے خیالی میں چبوترے پر گری ہوئی انار کی کلی کو اٹھایا اور غور سے دیکھا۔ کملائی ہوئی کلی کے ادھ کھلے ہونٹ کچھ پوچھتے ہوئے سے لگے۔ شاید وہ پوچھ رہی تھی کہ میں نے تو شاخ کو نہیں چھوڑا پھر شاخ نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟

اچانک سنیل کمار کی آواز سنائی دی' جو اوپر سے جھانک رہا تھا۔ "عبداللہ اوپر آؤ۔"

آج یہ آدمی معلوم نہیں کیا ڈراما کرے گا' عبداللہ نے سوچا۔

شکنتلا اور سنیل کمار کے سوا اوپر کوئی نہیں تھا۔ شاید بچوں کو نوکر کے ساتھ باہر بھیج دیا گیا تھا۔ سنیل کمار نشے میں نہیں تھا اور بڑا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ شکنتلا سامنے صوفے پر بیٹھی تھی عبداللہ کو دیکھ کر اس نے سر پر پڑے دوپٹے کو چہرے پر کھینچ لیا تاکہ بے پردگی نہ ہو۔

"بیٹھو" سنیل کمار نے عبداللہ کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جس پر شکنتلا بیٹھی تھی۔

عبداللہ نے ایک نظر شکنتلا پر ڈالی اس کی بڑی بڑی کالی آنکھیں زمین پر جمی ہوئی تھیں' زرد چہرے پر زخم کا لال نشان تین دن پہلے کی کہانی کہہ رہا تھا۔ عبداللہ صوفے پر نہیں بیٹھا اس نے پاس پڑی کرسی گھسیٹی اور اس کے کنارے پر ٹک گیا۔ سنیل کمار' عبداللہ اور شکنتلا کو دیر تک دیکھتا رہا جیسے بولنے سے پہلے ذہن میں لفظوں کو ترتیب دے رہا ہو۔

"میرے گھر میں حرام کاری نہیں ہو سکتی۔" اس نے گلا صاف کیا اور عبداللہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"اس لیے میں نے اس عورت کو طلاق دے دی ہے۔ اب تمہیں اس سے نکاح کرنا پڑے گا۔"

"کیا...... نکاح...... تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟"

عبداللہ اچھل پڑا۔

عبداللہ نے سنیل کمار کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھگوان کے واسطے مجھ پر اتنی بڑی تہمت مت لگاؤ۔ بھگوان سے ڈرو' عبداللہ جی میرے بھائی جیسے ہیں۔" شکنتلا نے روتے ہوئے کہا۔

"بھائی ہے؟ یار ہے تیرا۔" سنیل کمار نے کہا۔

"تم بہت گھٹیا آدمی ہو' اپنی بیوی پر ایسا الزام لگاتے ہیئے شرم نہیں آتی؟" عبداللہ نے کہا۔

سنیل کمار کھڑا ہو گیا' اس نے کوٹ کی جیب سے پستول نکالا جو پچھلے سال عبداللہ نے ہی اسے خرید کر دیا تھا۔ سنیل کمار نے پستول شکنتلا کی طرف تان دی اور کہا۔ "کلمہ پڑھو......کلمہ......"

"یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟" شکنتلا نے چیخ کر کہا۔

"کلمہ پڑھو......" سنیل کمار نے پھر کہا۔

شکنتلا نے سنیل کمار کی آنکھوں میں دیکھا' ان میں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ایک عجیب سی چمک تھی جیسے وہ اپنے ہوش میں نہ ہو۔ شکنتلا نے موقع کی نزاکت کو سمجھ کر سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”بات کرنی ہے تو ٹھیک سے بات کرو، یہ پستول وستول کیوں دکھا رہے ہو؟“

”کلمہ پڑھو۔“ سنیل کمار چیخا۔

”سنیل کمار، بھگوان کے واسطے یہ سب مت کرو۔“ شکنتلا نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”کلمہ پڑھو ورنہ......“ سنیل کمار پر جنون سوار تھا، وہ دھاڑا۔

”سنیل کمار، پلیز۔“ عبداللہ نے کہا مگر اس کی بات پوری ہونے سے پہلے سنیل کمار نے گولی چلا دی، گولی عبداللہ کے پیچھے دیوار پر ٹنگی تصویر پر لگی۔ کانچ زوردار آواز سے ٹوٹ کر گرا۔ شکنتلا چیخی۔ عبداللہ بھی سہم گیا۔ یہ آدمی سچ مچ پاگل ہوگیا ہے۔

”زندہ نہیں چھوڑوں گا تم دونوں کو......“ سنیل کمار پستول ہلا کر چیخا۔

”ٹھیک ہے......ٹھیک ہے۔ میں کلمہ پڑھتی ہوں۔“ شکنتلا نے کہا۔

”لا الہ الا اللہ......“ شکنتلا نے کلمہ پڑھا۔

بعد ازاں خود ہی گن پوائنٹ پر ان دونوں کا نکاح پڑھا دیا تو سنیل کمار زور سے ہنسا۔ یہ ایک وحشی کی بے معنی ہنسی تھی جو خوشی کے اظہار کے لیے نہیں ہوتی۔ اس نے پستول جیب میں ڈالا اور باہر جاتے ہوئے بولا۔

”مبارک ہو اب تم دونوں جہاں چاہے جا سکتے ہو۔“

”خون پونچھ لیجیے۔“ سسکتی ہوئی شکنتلا کو زمین سے اٹھا کر صوفے پر بٹھایا پانی پینے کو دیا اور اپنا رومال دیتے ہوئے بولا۔

عبداللہ سوچنے لگا، وہ کیا کرے اسے اپنے آدمیوں سے اتنا پٹوائے کہ سارا پاگل پن ہرن ہوجائے یا پھر شکنتلا اور سنیل کمار کو ان کے حال پر چھوڑ کر چلا جائے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو وہ پیچھے جانے کے لیے مڑا۔

”عبداللہ جی، مجھے میرے ماں باپ کے گھر پہنچا دیجیے میں اب اس جہنم میں نہیں رہ سکتی۔“ شکنتلا نے اس کے پیر پکڑ لیے۔

”آپ ٹھیک کہتی ہیں، آپ کا چلا جانا ہی بہتر ہے، میں بھی اس آدمی کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ میں ایک دو دن میں کمپنی سے اپنا حساب لوں گا اور گھر چلا جاؤں گا۔ آپ اتنا تو ٹھہر سکتی ہیں نا؟“ عبداللہ نے کہا۔

شکنتلا نے سر جھکا لیا مگر عبداللہ کے اپنے گھر جانے سے یا شکنتلا کے میکے جانے سے پہلے ہی وہ ہوگیا جو کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ سنیل کمار دونوں بڑے بچوں رمیش اور راجیش کو لے کر غائب ہوگیا۔ شکنتلا دیوانوں کی طرح شہر شہر سنیل کمار اور بچوں کو ڈھونڈتی پھری۔ دودھ پیتی منی کو کندھے پر ڈالے ہر اس دروازے پر گئی جہاں سنیل کمار کے ہونے کا امکان ہوسکتا تھا مگر نہ سنیل کمار ملا، نہ بچے اور نہ اس کا پتہ۔ طعنے اور گالیاں ضرور ملیں، کیونکہ اس کی طلاق اور بدچلنی کی کہانیاں اس سے پہلے پہنچ چکی تھیں۔ وہ اپنے میکے میں تھی اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ سب لوگ سنیل کمار کے بارے میں جانتے ہیں مگر بتا نہیں رہے ہیں۔

”آپا سنیل بھائی بچوں کو لے کر کھوکھراپار کے رستے ہندوستان جا چکے ہیں۔“ ایک لڑکی نے اسے بتایا۔

شکنتلا کا جی چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے مگر آنسو اچانک تھم گئے۔ گلے میں کوئی چیز پھنسی مگر تھوڑی دیر میں پگھل گئی۔ ایک عجیب طرح کا قرار آ گیا جیسے پھانس نکل جانے کے بعد درد تو ہوتا ہے مگر سکون بھی مل جاتا ہے۔ اس نے سوچا جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ سنیل کمار بچوں سے بہت پیار کرتا ہے، اس لیے انہیں تکلیف نہیں دے گا، ہوسکتا ہے وہ خود بھی سدھر جائے اور ایک نئی زندگی شروع کرے جس میں ناکامی، شراب اور شکنتلا نہ ہو، مگر سوال یہ تھا کہ وہ خود کیا کرے؟

اس بات کا فیصلہ اسی شام ہوگیا۔ اس کے باپ نے حقے کے گاڑھے دھوئیں کے پیچھے سے اسے آواز دی اور کہا۔

”شادی کے بعد بیٹی کا گھر اس کی سسرال ہوتا ہے، تم اپنے سسر کے پاس چلی جاؤ۔“

”مگر میں وہاں کیسے جا سکتی ہوں؟ سنیل مجھے طلاق دے چکے ہیں۔“ شکنتلا نے کہا۔

”ارے شراب کے نشے میں دی گئی طلاق، طلاق نہیں ہوتی، تم چلی جاؤ۔ میں نے بھائی صاحب سے بات کر لی ہے وہ تمہیں رکھنے کو تیار ہیں۔“

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

شنشلا نے سر جھکا لیا اور سوچا جب دلہن بن کے گئی تھی تب نہیں رکھا تو اب کیا رکھیں گے؟

"تم نے جواب نہیں دیا؟" شنشلا نے پلکیں اٹھا کر باپ کے چہرے کو دیکھا ان آنکھوں میں رحم یا ہمدردی جیسا کوئی جذبہ دکھائی نہیں دیا۔ وہ اپنی چلم پر رکھے ہوئے کوئلوں کو پھونک رہے تھے جو بجھنے کے قریب تھے۔ انہوں نے شنشلا کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"جی ٹھیک ہے۔" شنشلا نے کہا۔ مرنے سے پہلے اس نے ایک آخری بار اپنے باپ کو دیکھنا چاہا مگر وہاں گہرے نیلے دھوئیں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

یہاں سے شنشلا کی کہانی اگلے پڑاؤ کی طرف آتی ہے۔ کچھ دن بعد جب وہ شورکوٹ کے ریلوے اسٹیشن پر بیٹھی آتی جاتی ٹرینوں کو بنا پلک جھپکائے دیکھے جا رہی تھی۔ اچانک کسی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

شنشلا نے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے عبداللہ کھڑا تھا۔ اتنے دن بعد پتا نہیں کہاں سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے بغیر کسی کی پروا کیے عبداللہ کے کندھے پر سر رکھ دیا اور اس طرح بلک بلک کے روئی جیسے اندر کوئی بند ٹوٹ گیا ہو۔

عبداللہ شنشلا کو لے کر لاہور پہنچا مگر اس کے گھر نہیں گیا۔

یہاں شنشلا کی یادیں بند پڑی تھیں۔ دونوں ساتھ میں رہ رہے تھے مگر ان کا رشتہ کیا تھا، یہ طے کرنا ضروری تھا۔

"کیا ہمارا نکاح ہو چکا ہے؟" ایک دن شنشلا نے [illegible] پوچھ ہی لیا۔

"نہیں وہ تو بس [illegible] مذاق تھا۔" عبداللہ [illegible] رشتہ [illegible] کوئی حیثیت [illegible]

"[illegible] رشتہ کیا ہے؟" شنشلا نے پوچھا۔

"[illegible]" عبداللہ نے سر ہلایا۔

"[illegible]" اس نے پوچھا۔

عبداللہ نے شنشلا کو [illegible] جو [illegible] میں [illegible] تھی۔

"[illegible] جاؤ گی؟" عبداللہ نے پوچھا "جتنے دروازے تھے [illegible] بند [illegible] باقی [illegible] سوچ [illegible] جس میں طلاق دی ہوئی عورت کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ تمہارے [illegible] تمہارے دروازے بند ہو چکے ہیں۔" عبداللہ نے کہا۔

"ایک دروازہ اب بھی کھلا ہے۔" شنشلا نے کہا۔

"مرنے کے بارے میں مت سوچنا، میں اس دودھ پیتی بچی کو اکیلا نہیں پال سکوں گا۔" عبداللہ نے مسکرا کر کہا۔

"مگر میں یہاں آپ کے ساتھ رہ بھی تو نہیں سکتی۔" شنشلا نے کہا، لوگ کچھ دنوں کے بعد انگلیاں اٹھانے لگیں گے۔"

"انگلیوں کی پروا مت کرو وہ تو بہت دنوں سے اٹھی ہوئی ہیں۔ ایک ہی طریقہ ہے جس سے ساری زبانیں بند ہو جائیں گی اور انگلیاں ہی نہیں آنکھیں بھی نیچی ہو جائیں گی۔" عبداللہ ہنسا۔

اس بات کے تیسرے دن مقامی مسجد میں شنشلا نے پہلے کلمہ پڑھا اور پھر عبداللہ اور اس کا نکاح ہو گیا۔

شنشلا کی زندگی میں بڑا انقلاب آ چکا ہے۔

اس کے خاندان میں جہاں مردوں نے سر پکڑ لیے اور عورتوں نے چھاتی پیٹ ڈالی۔ سب نے بڑا واویلا مچایا، جتنے منہ اتنی باتیں بنائی گئیں۔

عبداللہ کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ مسئلہ کیا ہے اور اسے دونوں میں سے کسی ایک کو چننا تھا، رشتے ناطے اور جائیداد یا شنشلا۔ اس نے شنشلا کو چن لیا۔

"میری اتنی قیمت نہیں ہے عبداللہ، میرے لیے اتنا مول مت چکاؤ، اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے اب بھی وقت ہے مجھے جانے دو میں کہیں نہ کہیں اپنا ٹھکانہ کر لوں گی۔" شنشلا [illegible] تو بلک پڑی۔

عبداللہ نے اس کے کندھے پکڑ کے کرسی پر بٹھا دیا اور [illegible] بیٹھ [illegible]

"[illegible] خواب دیکھتی ہو؟"

"ہاں۔" شنشلا نے سر ہلایا۔

"[illegible] سے کچھ خواب ایسے نہیں ہوتے جنہیں دیکھنے کے بعد دل [illegible] کہ کاش سچے ہو جائیں؟"

"ہاں۔" شنشلا نے سر ہلایا۔

"میں نے بھی ایک خواب دیکھا تھا اور بار بار دیکھا تھا کہ جو [illegible] میری زندگی میں آئے وہ خوبصورت ہو [illegible] محبت کرنے والی ہو [illegible] بہت اچھا بولتی ہو۔ تم میں وہ ساری خوبیاں ہیں۔ یہ سچ ہے کہ تم جن حالات میں ملی ہو وہ نارمل نہیں ہیں مگر کیا تمہارے بیک گراؤنڈ کی وجہ سے یا اپنے

Waqar Azeem
Pakistanpoint.com

اوپر آنے والے پریشر کی وجہ سے اپنے اس خواب کو خیرباد کہہ دوں جسے میں نے بار بار دیکھا ہے اور جس کی تعبیر اتفاق سے مل گئی ہے۔ تم سنیل کمار سے بہت محبت کرتی ہو' تمہارے دل میں سنیل کمار کی جو جگہ ہے وہ تو میں کبھی نہ لے سکوں گا' مگر اس کے دیئے ہوئے زخموں کو بھرنے کی پوری کوشش کرسکتا ہوں۔ کیا تم مجھے ایک موقع دوگی؟''

شکنتلا نے بہت روکا مگر آنکھیں چھلک ہی گئیں۔ اس نے آنسوؤں سے دھندلی ہوتی ہوئی آنکھوں سے عبداللہ کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا جیسے کسی عدالت میں فیصلے کا انتظار کررہا ہو۔ شکنتلا نے آنکھیں بند کرلیں' دل کے کھنڈروں میں اسے اپنی ہی آواز سنائی دی، یہ احسان نہیں ہے' یہ تیری کوئی نیکی ہے جو زندہ ہوگئی ہے۔

عبداللہ نے وہی کیا جو وعدہ کیا تھا۔ اس نے شکنتلا کی روح پر لگے ہوئے ایک ایک زخم پر مرہم رکھا اور اس کی سوکھی آنکھوں کو چوم کر کہا۔

''اگر کوئی زمین بنجر ہوجائے تو اس میں پھول کھلتے نہیں ہیں' کھلانے پڑتے ہیں۔'' عبداللہ نے کہا۔

شکنتلا مسکرادی۔ برسوں بعد یہ پہلی مسکراہٹ تھی جو دل سے نکلی تھی۔ خوشبو دور سے آسکتی ہے مگر رنگ تو پاس جانے پر ہی دکھائی دیتے ہیں۔ یہی حال کچھ شکنتلا کا ہوا۔ وہ عبداللہ کے قریب آئی تو معلوم ہوا کہ عبداللہ ایک سلجھا ہوا' خوش مزاج اور محنتی آدمی ہے' اس کے ارادے بہت بڑے تھے' مگر اس کی دنیا بہت چھوٹی تھی۔ ایک گھر' ایک آفس' کچھ کتابیں اور ایک ریڈیو اس کی کل کائنات تھی' اب اس میں شکنتلا بھی شامل ہوگئی تھی۔ شکنتلا نے عبداللہ کی محبت کا جسے وہ احسان کہتی تھی' جواب اس طرح دیا کہ وہ سارے دروازے بند کردیے جو باہر کی طرف کھلتے تھے۔ وہ بھول گئی کہ گھر کی چاردیواری کے باہر بھی ایک دنیا ہوتی ہے۔ اس کی دنیا تو عبداللہ سے شروع ہوتی تھی اور اسی پر ختم ہوجاتی تھی۔

پتا نہیں عبداللہ کے دل کی ندی پر کس نے بند بنایا تھا کہ ٹوٹا تو پیار کا سیلاب آگیا اور شکنتلا کا پور پور شرابور ہوگیا' وہی شکنتلا جو سنیل کمار کے لیے منحوس تھی۔ عبداللہ کے لیے پارس پتھر بن گئی۔ عبداللہ نے جس کام کے لیے ہاتھ ڈالا کامیابی ملی' ترقی اس کو شہر شہر اڑائے پھری' پھر وہ لائل پور (فیصل آباد) آگیا۔ یہیں اس کے تینوں بیٹے پیدا ہوئے' یہیں اس کے لگائے ہوئے آم کے پیڑوں پر بور آیا۔ طوطوں نے گھونسلے بنائے' گلہریوں نے سوکھے آباد کیے' شکنتلا کبھی کبھی اکیلی ہوتی تو پلٹ کر دیکھتی' اسے ایسا لگتا جیسے میدانی علاقے میں پہنچ کر ندی کی رفتار دھیمی ہوگئی ہو۔ جیسے زندگی نے ٹھہراؤ ڈھونڈ لیا ہو۔

شکنتلا کی کہانی کا آخری موڑ ہے۔ اس کے بعد چند جو چھوٹے بڑے حادثے ہوئے وہ خاص تو نہیں ہیں مگر اس کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ ان کے بغیر کچھ کونے خالی رہ جائیں گے۔ تو ہوا یوں کہ عبداللہ اور شکنتلا سے دشمنی ختم ہوگئی۔ شکنتلا کو اس کے خاندان نے معاف کردیا۔ وہ ہندوستان گئی اور اپنے بچوں سے ملی۔ جن میں منی بھی تھی۔ جس کو یہ کہہ کر زبردستی چھین لیا گیا تھا کہ ایک ہندو گھرانے کی بیٹی ایک مسلم کے زیرسایہ پرورش نہیں پاسکتی۔

عبداللہ اور شکنتلا کے بچے بہت ہونہار نکلے تینوں نے شکنتلا سے بے پناہ محبت کی' اس لیے نہیں کہ وہ ماں تھی بلکہ اس لیے کہ وہ ایک غیر معمولی عورت تھی۔ اپنے ٹوٹے ٹکڑوں کو خود ہی جوڑنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں ہوتا اور نہ ہر ایک میں اتنا حوصلہ ہوتا ہے کہ زندگی کے دیئے ہوئے آبلوں کو تمغہ سمجھ کر سینے سے سجالے۔ آج نہ شکنتلا ہی نہ عبداللہ' ان کی کہانی ختم ہوچکی ہے اور کچھ دنوں بعد دھندلی ہوتی یادوں اور پیلی ہوتی تصویروں میں سمٹ کر رہ جائے گی' مگر شاید آج کے ایک باغ میں گھنے پرانے پیڑوں کے سائے تلے ایک بے نام مزار اور ایک سمادھی بہت دنوں تک باقی رہیں گے، جن پر دھوپ کے سنہری پھول گرتے رہتے ہیں۔ جہاں طوطے زمین کے قصے دہراتے ہیں اور گلہریاں ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگتی ہیں۔

سنا ہے بے زبان محبت کی زبان جانتے ہیں جو دنیا کو سمجھ نہیں آتی۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

سنہری دھوپ

دستگیر شہزاد

ایک ایسے انسان کی کہانی جو اپنے ہی وجود کی کرچیاں سمیٹتے ہوئے وہ بہت دور نکل آیا تھا

وجود میں حیات تلاشنا آسان نہیں بسا اوقات وجود ہوتا ہے لیکن حیات نہیں اور کبھی حیات وجود تلاشتے تھک ہار کر جان ہی دے دیتی ہے مگر معلوم نہیں اس سلسلے میں کس موڑ پر وہ اپنے وجود سے الگ ہوئی حیات کو ڈھونڈ بھی پاتا ہے یا نہیں۔

زندگی انجان راستوں کا سفر ہے ۔ اس میں کون ،کب، کہاں اور کیسے مل جائے کوئی نہیں جانتا۔ لمحے جب کھو جائیں تو پچھتاوے باقی رہ جاتے ہیں۔ محبتوں کے پڑاؤ میں وفاؤں کے سائباں نہ ہوں تو راستہ کٹھن ہو جاتا ہے۔

رشتوں کے درمیان شیشے کی دیوار کی کہانی، محبتوں، عداوتوں اور سازشوں میں گندھی سحر انگیز سلسلے وار کہانی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

میدان میں موجود لوگ تیمور برنی پر ٹوٹ پڑے تھے۔ اگر شوکال اُسے چتا میں زندہ جلانے کے لیے قید کرنے کا حکم نہ دیتا تو شاید اب تک اس کی تکہ بوٹی ہو چکی ہوتی۔ تاہم انھوں نے اپنا غصہ ہلکا کرنے کے لیے مار مار کر اسے نیم بے ہوش کر دیا تھا۔ جب وہ لوگ اس کی دھنائی کر رہے تھے تو انھیں احساس ہوا کہ یہ شخص ان کا ساتھی نہیں بلکہ بیرونی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ اب ان کی تشویش مزید بڑھ گئی تھی۔

فاخر کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔ وہ جانے کیسے ضبط کر کے تیمور برنی پر ہونے والا تشدد دیکھ رہا تھا۔ اُسے قطعاً اُمید نہیں تھی کہ تیمور یوں دوڑ کر رباب کو بچانے کے لیے شوکال تک پہنچ جائے گا۔

اس وقت وہ عجیب شش و پنج میں تھا۔ ایک طرف رباب شوکال کے ہتھے چڑھ گئی تھی تو دوسری جانب تیمور برنی ان جنگلیوں کے نرغے میں پھنس گیا تھا۔ جبکہ وہ ان دونوں کی مدد کرنے سے قاصر دکھائی دے رہا تھا۔ اگر وہ کوئی خطرہ لینے کی کوشش کرتا تو خود اس کی اپنی جان بھی جاسکتی تھی۔

اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اسے تیمور برنی یا رباب سے ہمدردی نہیں تھی۔ یا وہ بزدل تھا اور اپنی جان بچانا چاہتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ان دونوں کی مدد کرنے کے لیے سب سے پہلے اسے خود کو محفوظ رکھنا تھا۔

فاخر کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ لوگ فوری طور پر تیمور برنی کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ شوکال اُسے چتا میں جلانے کا حکم دے چکا تھا اور باقی لوگ کسی صورت اس کی حکم عدولی نہیں کر سکتے تھے۔

اس طرح فاخر کو بچاؤ کی کوئی ترکیب سوچنے کے لیے مناسب وقت مل گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ وحشی لوگ کسی جشن کے بغیر کوئی کام نہیں کریں گے۔ اس لیے تیمور برنی کو چتا میں جلانے کے لیے بھی کوئی جشن منعقد کیا جائے گا۔ جس میں کئی دن لگ سکتے تھے۔

میدان میں جمع قبیلے کے لوگ نیم بے ہوش تیمور برنی کو گھسیٹتے ہوئے ایک جھونپڑے میں لے گئے تھے جسے شاید مجرموں کو قید کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ قید خانے کی جگہ دیکھنے کے بعد فاخر بھی خاموشی سے واپس اپنے ٹھکانے پر آ گیا۔

اسے وہاں پہنچے تھوڑی دیر گزری تھی کہ کسی کے سیڑھیاں اُترنے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحے بعد تہ خانے میں آنے والے کا چہرہ دکھائی دیا تو فاخر کا دل تیزی سے دھڑک اُٹھا۔ وہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کوئی اور نہیں سردار تھا۔ فاخر نے اس بات پر سکون کی سانس لی تھی کہ سردار کی آمد سے قبل ہی وہ بھیس بدلنے کے لیے پہنا جانے والا مقامی لباس چھپا چکا تھا۔

سردار کا چہرہ غصے سے لال تھا اور گال پھڑ پھڑا رہے تھے۔ وہ پھنکارتا ہوا آگے بڑھا اور فاخر کے قریب پہنچ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔

"میں پوچھتا ہوں تمہارا دوست یہاں سے باہر کیسے گیا؟"

"مجھے نہیں معلوم.... میں کچھ نہیں جانتا۔" فاخر نے گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا۔

"کیا تم یہ بھی نہیں جانتے کہ اس نے ہمارا لباس کہاں سے حاصل کیا؟"

"بالکل نہیں۔ میرا یقین کرو سردار، میں تمہارا دوست ہوں۔"

"تم کہاں تھے اُس وقت؟" سردار نے اُسے گھورا۔

"میں تو سو رہا تھا۔ جانے وہ کب اور کیسے یہاں سے نکل گیا۔"

"میں نے تم لوگوں پر اعتبار کر کے سخت غلطی کی ہے۔ تم لوگوں نے دوستی کی آڑ کر بہت فریب دیا ہے مجھے... میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ دل چاہتا ہے تمہارا احسان بھول کر ابھی تمہیں موت کے گھاٹ اُتار دوں۔" سردار نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تو فاخر نے ندامت سے سر جھکا لیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔

"سردار! اگر تم مجھے مار کر اپنی غلطی کا ازالہ کر سکتے ہو تو میں حاضر ہوں۔ نکالو خنجر اور کاٹ دو میرا گلا۔ شاید میرے لہو کی گرمی سے تمہارے دل پر لگا بے اعتمادی کا داغ دھل جائے۔"

سردار طیش کے عالم میں تھا۔ مگر اس نے خود پر قابو رکھا اور چند لمحے توقف کے بعد نرم لہجے میں بولا۔

"کوئی اور ہوتا تو شاید ابھی قتل کر ڈالتا۔ لیکن تم میرے دوست ہو۔ تم نے مجھ پر احسان کیا تھا اور میں احسان کا بدلہ ظلم و زیادتی سے نہیں چکانا چاہتا۔"

"شاید تمہیں میری بات پر یقین آ گیا ہے۔" فاخر نے ممنون نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ غلطی تمہاری نہیں۔ یہ حرکت تمہارے دوست نے کی ہے اور سزا بھی اُسی کو ملے گی۔ وہ شوکال دیوتا کے حکم سے عبرتناک سزا پائے گا۔"

"سردار میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" فاخر نے اُسے نرم پڑتے دیکھ کر کہا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" سردار نے بھی اپنائیت سے پوچھا۔

"کیا تم مجھ پر ایک اور احسان نہیں کر سکتے؟"

"فکر مت کرو تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ میں تمہیں یہاں سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

"میں اپنی بات نہیں کر رہا۔"

"تو پھر...."

"میرے دوست کی جان بچا لو...."

فاخر کی بات سنتے ہی سردار کا چہرہ یک لخت سرخ ہو گیا اور ہاتھ تیزی سے خنجر کے دستے پر پہنچ گیا۔ مگر اس نے جلد ہی اس نے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا اور خشک لہجے میں بولا۔

"تم چاہتے ہو کہ میں اپنے دیوتا کی حکم عدولی کروں۔ تا کہ اس جزیرے پر قہر نازل ہو۔ قسم ہے دیوتا کی اگر میری بیٹی بھی ایسی حرکت کرتی تو میں اُس کی گردن اُڑا دیتا۔ بہر کیف تم اپنی تیاری رکھو بہت جلد میں تمہاری واپسی کا بندوبست کر دوں گا۔ آیندہ اس جانب آنے کا خیال دل سے نکال دو۔ تم نے میری جان بچا کر مجھ پر جو احسان کیا تھا آج میں نے تمہاری جان بچا کر احسان کا بدلہ چکا دیا، آیندہ اس طرف آؤ گے تو دوستی کا رشتہ ٹوٹ چکا ہوگا۔ پھر میں تمہارے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو یہاں آنے والے اجنبیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔" یہ کہہ کر سردار تہ خانے سے باہر نکل گیا۔

فاخر کے لیے یہ صورت حال نہایت تشویش ناک تھی۔ سردار بگڑ گیا تھا۔ اب اس سے کسی ہمدردی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

فاخر کے سامنے اب دو اہم مسئلے تھے۔ رباب مندر میں جا چکی تھی اور تیمور برنی کی موت کا حکم سنا دیا گیا تھا۔ ان حالات میں وہ خود کو نہایت بے بس محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ایسی کوئی ترکیب نہیں تھی جس پر عمل کر کے ان دونوں کی جان بچا سکے۔

فاخر ایک مخلص انسان تھا۔ یہ بات اسے گوارا نہیں تھی کہ اپنی جان بچا کر یہاں سے بھاگ نکلے اور وہ دونوں

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

موت کی وادی میں گم ہو جائیں۔ اُسے مندر میں داخل ہونا کسی طور ممکن دکھائی نہیں دے رہا تھا اور تیمور برنی کو سزائے موت سے بچانا بھی اس کے بس سے باہر تھا۔ وہ سوچوں میں گم بیٹھا تھا کہ زینے پر ایک مرتبہ پھر کسی کے اُترنے کی دھمک سنائی دی۔ وہ چونک کر اس جانب دیکھنے لگا۔ یہ مایا تھی۔

اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی مشعل تھی جس کی لرزتی روشنی میں اس کا غموں سے چور چہرہ بہت پراسرار دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ وہ قریب پہنچ کر چند لمحے گم صم کھڑی رہی اور پھر زمین پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”یہ کیا ہو گیا..... کیوں کیا تمہارے دوست نے یہ سب۔“

”میں خود بھی پریشان ہوں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ فاخر نے بھی پریشانی کا اظہار کیا۔

”اب اُسے بھڑکتی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی، اور وہ اُس لڑکی کو بچانے کے لیے کیوں دوڑا؟“

مایا کا سوال سن کر فاخر نے چند لمحے خاموشی اختیار کی اور پھر سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا۔

”اس لڑکی کا نام رباب ہے۔ وہ تیمور برنی کی دوست ہے۔ ہم تینوں ایک ہی لانچ پر سفر کر رہے تھے کہ طوفان میں لانچ تباہ ہو گئی اور رباب ہم سے بچھڑ گئی۔ پھر جانے کس طرح وہ جزیرے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی اور تم لوگوں نے اُسے سمندر کی شہزادی سمجھ کر قربانی کے لیے منتخب کر لیا۔“

مایا کی آنکھوں میں اداسی اُتر آئی تھی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ تیمور برنی کی ساتھی ہے اور ان کے درمیان اتنا گہرا تعلق ہے کہ تیمور برنی نے اپنی جان کی پروا نہیں کی۔ وہ یک دم بجھ سی گئی تھی۔

”تم نے ٹھیک کہا ہے۔ وہ ساحل پر بے ہوش پڑی تھی۔ ہم نے وہاں سے اُٹھا لائے اور قربانی کے لیے منتخب کر لیا۔“

”میری معلومات کے مطابق تو قربانی کیلئے مقامی لڑکی کو منتخب کیا جاتا ہے؟“ فاخر نے سوال کیا۔

”ہاں ایسا ہی ہے۔ اس مرتبہ مجھے منتخب کیا گیا تھا۔ لیکن میرا باپ مجھے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ جب وہ لڑکی ساحل پر ملی تو میرے باپ نے مجھے بچانے کے لیے قربانی کی خاطر اُسے نامزد کر دیا؟“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور پھر بولی۔

”کیا وہ دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے رہتے ہیں؟“ مایا نے سوال کیا۔

”نہیں.....؟“

فاخر نے نفی میں سر ہلایا تو مایا کے چہرے پر تازگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اپنا شک دور کرنے کے لیے ساتھ ہی اُس نے دوسرا سوال داغ دیا۔

”کیا وہ لڑکی اس کی محبوبہ ہے؟“

”ہاں وہ ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔“

فاخر نے سچ بول دیا تھا..... لیکن اس سچ نے مایا کی زندگی تاریک کر دی۔ اس کے چہرے پر چھانے والی شگفتگی دم توڑ گئی اور آنکھیں ان چراغوں کی مانند تاریک ہو گئیں جن سے ہوا کا بے رحم تھپیڑا جینے کا حق چھین لیتا ہے۔

اب وہ لمحہ بھر کے لیے بھی اس کے پاس نہ ٹھہری اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی باہر نکل گئی۔

گزشتہ چند دنوں میں وہ تیمور کے بہت قریب آ گئی تھی اور اس سے عشق کرنے لگی تھی۔ لیکن آج جب اس کی بے وفائی کا بھید کھلا تو مایا کا دل ڈوب گیا..... اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اٹھا کر پاتال میں پھینک دیا ہو۔ دل پر ایسی چوٹ لگی تھی کہ قدم لڑکھڑا گئے تھے۔ شاید اسے پہلی بار علم ہوا تھا کہ باہر کی دنیا کے لوگ کتنے جھوٹے فریبی اور دغاباز ہوتے ہیں۔

مایا اُس جھونپڑے کے قریب سے گزر رہی تھی جس میں تیمور برنی قید تھا۔ یہ ایک پنجرہ نما جھونپڑا تھا جسے مضبوط لکڑی سے تیار کیا گیا تھا۔ مایا کی نظر جھونپڑے پر پڑی تو اس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔

اس وقت مایا کی آنکھوں میں چنگاریاں اور سینے میں انتقام کا الاؤ بھڑک رہا تھا۔ لیکن وہ مطمئن تھی کہ اُسے تیمور برنی سے انتقام لینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور بہت جلد اُسے بھڑکتی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جو کسی کو محبت میں دغا دے، اُس کے لیے یہ سزا بھی کم ہے۔

اپنے جھونپڑے میں پہنچ کر وہ گھاس پھونس کے بستر پر گر گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

سے تر تھا اور دل کو کسی طور چین نہیں مل رہا تھا، ملتا بھی کیسے اس زخمی دل میں اپنی محبت کو کھو دینے کا دکھ جو سما گیا تھا۔

☆☆☆

آسیہ بیگم کی وفات نے ارینا کو بالکل تنہا کر دیا تھا۔ دوسری طرف عذرا بیگم کی تو جیسے لاٹری نکل آئی تھی۔ ساس کے مرتے ہی وہ تمام سیاہ وسفید کی مالک بن بیٹھی تھی۔ ارینا کی حیثیت اس گھر میں اب ایک ملازمہ کی سی رہ گئی تھی جس کا کام عذرا بیگم اور اس کی بیٹی حنا کی خدمت کرنا تھا۔ جب کہ گھر کے سربراہ اور ارینا کے ماموں کاشف نے تو جیسے اپنی زندگی میں ہی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ عذرا بیگم نے شوہر کو کچھ یوں قابو کیا تھا کہ اب اُسے اپنی بھانجی پر ہونے والے مظالم دکھائی ہی نہیں دیتے تھے۔ اُسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ عذرا بیگم نے ارینا سے گھر کا کام کروانے کے لیے اسکول سے اتنی زیادہ چھٹیاں کروانا شروع کر دی ہیں کہ ذہین ارینا کا شمار اب نالائق طالبات میں ہونے لگا تھا۔

حنا فرسٹ ائیر کی طالبہ تھی، مگر پڑھائی کے علاوہ دیگر تمام مشاغل میں پی ایچ ڈی کر چکی تھی۔ عذرا بیگم کے لاڈ پیار نے اُسے اتنا بگاڑ دیا تھا کہ حنا کے نزدیک اب کوئی بری بات بری نہیں رہی تھی۔

عذرا بیگم کا تعلق خود تو ایک متوسط گھرانے سے تھا مگر اس کی ہمیشہ سے یہی خواہش رہی تھی کہ اپنی بیٹی کا رشتہ کسی امیر خاندان میں کرے۔ یہی سوچ کر اس نے حنا کی تربیت شروع دن سے اسی نہج پر کی تھی کہ وہ خود کو حُسن کی دیوی لگے۔ اب وہ اپنے علاوہ کسی کو انسان نہ سمجھتی تھی۔ خود کو آزاد خیال ظاہر کرنے کے لیے عذرا بیگم نے اُسے ایک ایسے کالج میں داخلہ دلوا دیا تھا جہاں شہر کے بگڑے ہوئے نواب زادوں کی بھرمار تھی۔ کاشف کو حنا کا اس کالج میں پڑھنا بالکل پسند نہیں تھا۔ لیکن عذرا کے سامنے اس کی ایک نہ چلتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کالج پہنچتے ہی حنا، فیصل نامی لڑکے کے ساتھ گھومتی دکھائی دینے لگی۔

فیصل ان کے گھر کے قریب ہی رہتا تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اُولاد تھا اور اس طبقے سے تعلق رکھتا تھا جہاں باپ کو کاروبار اور ماں کو سماجی خدمت کے نام پر گھومنے پھرنے سے فرصت نہیں ملتی۔ اسی بے پروائی نے فیصل کو آوارہ مزاج بنا دیا تھا۔

عذرا بیگم کو بھی ایسے ہی داماد کی ضرورت تھی جہاں نند ساس کا جھنجھٹ نہ ہو۔ لہٰذا اُس نے حنا کو کھلی چھٹی دے دی کہ وہ کسی بھی طرح فیصل کو اپنے سحر میں جکڑ لے۔ یوں حنا پڑھائی کے بہانے اکثر فیصل کے گھر جانے لگی۔

ان حالات میں ارینا کو ساتھ رکھنا اس کے لیے کسی ڈھال سے کم نہیں تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ فیصل کے گھر لے جاتی اور پھر ٹی وی لاؤنج میں بٹھا کر خود فیصل کے کمرے میں گھس جاتی تھی۔ وہ گھنٹوں کمرے میں بند رہتے تھے۔ رات بھر لمبی بات کرنے کے لیے فیصل نے حنا کو موبائل فون بھی لے دیا تھا۔

ارینا کم سن ہونے کے باوجود خوب صورتی میں حنا سے کہیں بڑھ کر تھی۔ وہ اپنی عمر سے بڑی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے لمبے بال اور چمکدار سیاہ آنکھیں ملنے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی تھیں۔ اُسے کسی طور فیصل کے گھر جانا پسند نہیں تھا۔ ایک دو بار اس نے اپنی ممانی سے فیصل کی شکایت کرنے کی بھی کوشش کی مگر عذرا بیگم نے اس بری طرح ڈانٹ دیا کہ ارینا نے آیندہ کے لیے اپنے ہونٹ سی لیے۔

اس روز حنا نے فیصل کو کالج کے کچھ نوٹس بھیجنے تھے جو دراصل فیصل سے ملاقات کا بہانہ تھا۔ فیصل کا موبائل فون صبح سے بند تھا جس پر حنا کی بے صبری بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ فیصل کے والدین کی موجودگی میں وہاں نہیں جانا چاہتی تھی۔

چناں چہ اس نے وہ نوٹس لفافے میں بند کر کے ارینا کے حوالے کیے اور ہدایت کی کہ اگر فیصل کے امی ابو گھر پر نہ ہوں تو فوراً واپس آ کر اُسے بلا لے جائے۔

یوں فیصل کے گھر جانے کا سن کر ارینا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ کسی صورت وہاں نہیں جانا چاہتی تھی لہٰذا اس بات کا ذکر عذرا بیگم سے کر بیٹھی۔ اس پر دونوں ماں بیٹی نے اسے کھری کھری سنائیں۔ خود کو مجبور پا کر ارینا نے نوٹس اُٹھائے اور گھر سے باہر نکل گئی۔

حنا کو یقین تھا کہ اگر حالات سازگار ہوئے تو فیصل فوراً اسے بلانے کے لیے ارینا کو واپس بھیج دے گا۔ مگر صورت حال الٹ ثابت ہوئی۔

ارینا کو گئے دو گھنٹے ہو گئے تھے۔ ابھی تک نہ تو وہ خود واپس آئی تھی اور نہ ہی کوئی فون کال۔ اب تو حنا کی بے چینی انتہا کو پہنچ گئی اور صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

عذرا بیگم بھی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ کیوں کہ کاشف کے گھر واپس لوٹنے کا وقت ہو رہا تھا۔ اس کی آمد سے قبل ارینا کا گھر میں موجود ہونا ضروری تھا۔ اس لیے وہ حنا کو ساتھ لے کر ارینا کی تلاش میں فیصل کے گھر روانہ ہو گئی۔

دونوں تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ رہی تھیں۔ عذرا بیگم مسلسل ارینا کو کوس رہی تھی۔ جب وہ فیصل کے گھر کے قریب پہنچیں تو گیٹ کے سامنے لوگوں کا ہجوم دیکھ کر عذرا بیگم کا دل دھک سے رہ گیا۔

لوگ گھر کے قریب ٹولیوں کی شکل میں کھڑے تھے۔ ان دونوں نے کسی انہونی کا سوچ کر جلدی سے اپنے چہروں پر نقاب کر لیا تھا۔

''کیا ہوا ہے..... یہاں اتنا ہجوم کیوں ہے۔'' عذرا بیگم نے قریب کھڑے لڑکے سے پوچھا۔

''رفیق صاحب کا بیٹا فیصل آج پھر کسی لڑکی کو گھر لے آیا تھا۔ مگر لڑکی نے شور مچا دیا.... اس کی چیخ و پکار سن کر محلے والے جمع ہو گئے۔ مگر فیصل گاڑی لے کر گھر سے بھاگ گیا۔''

''اور وہ لڑکی کہاں ہے؟''

عذرا بیگم نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ حنا کے پیروں تلے سے بھی زمین کھسک گئی تھی۔

''اندر ہے.... رفیق صاحب اور بیگم صاحبہ بھی آ گئے ہیں انھوں نے محلے والوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر واپس بھیج دیا ہے۔ ابھی انھوں نے کسی ڈاکٹر کو بھی بلایا تھا۔ مجھے تو معاملہ گڑبڑ دکھائی دے رہا ہے۔''

تفصیل سن کر عذرا بیگم اور حنا تیزی سے آگے بڑھیں اور گھر میں داخل ہو گئیں۔ اندر ٹی وی لاؤنج میں ارینا بت کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ اس نے خود کو چادر میں اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا اور چہرے پر زخم کا نشان تھا جس پر دوا لگائی گئی تھی۔

''ارینا! کیا ہوا تمہیں..... یہاں کیوں بیٹھی ہو؟''

عذرا بیگم کی آواز سن کر رفیق صاحب اور بیگم نے چونک کر ان دونوں کی جانب دیکھا۔

''کون ہیں آپ لوگ؟''

رفیق صاحب اور اُن کی بیوی، عذرا ہی نہیں حنا سے بھی ناواقف تھے۔ فیصل ہمیشہ والدین کی غیر موجودگی میں حنا کو بلاتا تھا۔

''جی میں اس بچی کی ممانی ہوں۔'' عذرا بیگم نے جواب دیا۔

''بہت خوب.... لگتا ہے آپ لوگوں نے بہت چھوٹی عمر میں لڑکی کو اس کام پر لگا دیا ہے۔ داد دینی پڑے گی کہ یہ ہے بھی اتنی تیز کہ مجال ہے جو اپنے بارے میں ایک لفظ بھی بتایا ہو۔'' رفیق صاحب نے طنز کیا۔

''لیکن یہ تو....''

حنا کچھ کہنے والی تھی کہ عذرا بیگم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دبا دیا اور خود بیگم رفیق سے مخاطب ہوئی۔

''قسم لے لیں بیگم صاحبہ! ہمیں تو قطعاً علم نہیں تھا کہ یہ اس حد تک گر چکی ہے۔ گھر سے اسکول کے لیے نکلتی ہے مگر نہ جانے کہاں کہاں منہ کالا کرواتی رہتی ہے.... وہ تو آج ہمیں شک ہوا اور ہم اس کی تلاش میں یہاں تک آ گئے۔''

''زہر کیوں نہیں دے دیتے تم لوگ ایسی بیٹی کو۔''

''کیا کروں ممانی ہوں۔ کچھ کہتی ہوں تو بری بن جاتی ہوں سب کی نظروں میں، ہم شریف لوگ ہیں۔ یہ بالکل اپنی ماں پر گئی ہے، مگر آپ کے بیٹے نے بھی تو غلط کیا ہے اس کے ساتھ۔''

''کچھ غلط نہیں کیا اس نے۔ بلکہ تمہاری لڑکی نے اُسے اکلوتا امیر زادہ سمجھ کر پھنسایا ہے۔ چوکیدار نے مجھے بتایا ہے کہ یہ پہلے بھی کسی لڑکی کے ساتھ یہاں آتی رہی ہے۔''

بیگم رفیق نے سخت لہجے میں انکشاف کیا تو حنا کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ انھیں پریشان دیکھ کر بیگم رفیق نے دباؤ مزید بڑھا دیا تھا۔

''اصولی طور پر تو یہ پولیس کیس ہے۔ مگر ہم نے سوچا کہ ایک گندی مچھلی کی وجہ سے باقی خاندان کی عزت کا جنازہ نہ نکلے۔ لہٰذا ہم نے معاملے کو گھر میں ہی رفع دفع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

رفیق صاحب نے بارعب لہجے میں کہا۔ ان کی بات مکمل ہوتے ہی بیگم رفیق نے سامنے پڑا لفافہ اُٹھا کر عذرا بیگم کی جانب بڑھا دیا۔

''اس میں پچاس ہزار روپے ہیں۔ یہ ہم اپنے بیٹے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کی نادانی کا جرمانہ سمجھ کر ادا کر رہے ہیں کہ وہ تمہاری اس بگڑی ہوئی بھانجی کے ہتھے چڑھ گیا تھا، خیر! اب لے جاؤ اس خبیث روح کو اور دوبارہ بھی اِدھر کا رُخ نہ کرنے دینا۔''

مفت میں پچاس ہزار روپے ہاتھ آئے تو عذرا بیگم اپنا احتجاج بھی بھول گئی۔ اس نے بیگم رفیق کے ہاتھ سے لفافہ پکڑا اور مورت کی مانند ساکت بیٹھی ارینا کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے بولی۔

''اُٹھ یہاں سے منحوس ڈائن.... اب گھر جا کر خبر لیتی ہوں تیری۔''

یہ کہہ کر وہ اس نے ارینا کا بازو پکڑا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے گھر لے گئی۔

-☆-☆-☆-

تیمور برنی اس پنجرہ نما جھونپڑے میں افسردہ اور اُداس بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت کی جانب بندھے ہوئے تھے۔ ہاتھ صرف کھانے کے وقت کھولے جاتے تھے مگر اس وقت پہرہ مزید سخت کر دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ دروازے پر ہر وقت دو مسلح پہرے دار کھڑے رہتے تھے۔ لہٰذا فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

تیمور برنی اپنی موت سے خائف نہیں تھا۔ وہ بڑی حد تک ان لوگوں کی زبان بولنے اور سمجھنے لگا تھا۔ اُسے اپنے انجام کی خبر ہو چکی تھی جب شوکال نے اسے آگ میں جھونکنے کا حکم دیا تھا۔ وہ فاخر کی مجبوریوں سے بھی واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب بھی فاخر کو اُس کی مدد کرنے کا موقع ملا وہ ضرور آئے گا۔

تیمور کو اگر دکھ تھا تو صرف اس بات کا کہ وہ اپنی جان دے کر بھی رباب کے لئے کچھ نہ کر سکا۔

پانچ دن گزر چکے تھے۔ تیمور برنی کو یقین تھا کہ اب تک شوکال، رباب کو قتل کر چکا ہوگا۔ اس احساس کے ساتھ ہی اس کے اعصاب تن جاتے تھے اور خون رگوں میں کھولنے لگتا تھا۔ جس کے باعث وہ لاشعوری طور پر رسی کی بندشیں توڑنے کی کوشش کرنے لگتا تھا۔ تیمور کو اطمینان تھا کہ اس نے بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اور رباب کو بچانے کی خاطر اپنی جان پر کھیل گیا تھا۔

دوستی کا اس سے بڑا امتحان اور کیا ہو سکتا تھا۔ اسی لمحے تیمور برنی کو مایا کا خیال آ گیا تو وہ ایک بار پھر اپنی فریب کاری پر شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ وہ نادم تھا کہ اس نے ایک معصوم لڑکی کے ساتھ محبت کا ناٹک رچایا اور اس کے پاکیزہ جذبات کو ٹھیس پہنچائی۔ تیمور برنی کو یہ بھی شرمندگی تھی کہ جب مایا کو حقیقت کا علم ہوگا تو وہ اس کے بارے کیا سوچے گی۔

تیمور برنی کو آگ میں جلانے کا وقت چاند کی چودھویں رات طے پائی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے باقی دن اسی قید خانے میں گزار رہا تھا۔ اسے دن میں صرف ایک مرتبہ کھانا دیا جاتا تھا۔ دن تیزی سے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ اس دوران سردار کئی مرتبہ اس کے پاس آیا تھا اور خوب برا بھلا کہا تھا۔ اپنی قید کے دوران تیمور نے دو مرتبہ مایا کو بھی دور سے دیکھا تھا مگر اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت دیکھ کر وہ مزید اُداس ہو گیا تھا۔

دن گزرتے رہے اور آخر کار وہ رات بھی آ گئی جب چِتا کو آگ دکھا دی گئی۔ جزیرے کے لوگوں نے بہت زیادہ لکڑیاں جمع کی تھیں اور بہت بڑی چِتا بنائی گئی تھی۔ لوگوں نے رات بھر اس الاؤ کے گرد رقص کر کے جشن منانا تھا۔ اس وقت شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے اور تپش دور تک محسوس ہو رہی تھی۔ موت کا وقت قریب آ رہا تھا اور تیمور برنی کا ذہن تیزی سے بچاؤ کی تدبیر سوچ رہا تھا۔ فاخر کی بھی کوئی خبر نہیں تھی۔

سورج غروب ہوتے ہی جشن کا آغاز ہو گیا۔ لوگ جوق در جوق شعلے اگلتی ہوئی چِتا کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اور رقص میں شریک ہوتے جا رہے تھے۔ نوجوان مختلف کھیل تماشوں میں مشغول تھے جب کہ عورتیں الگ سے ٹولیوں کی شکل میں گھوم رہی تھیں۔ جوان لڑکیوں کے نقرئی قہقہے مندر کی گھنٹیوں کی مانند فضا میں بکھر رہے تھے۔

اسی ہجوم میں مایا بھی موجود تھی۔ مگر وہ کسی چیز میں دلچسپی نہیں لے رہی تھی اور ایک جانب خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر کپکپاہٹ تھی۔

وہ وحشت زدہ نظروں سے چِتا کی طرف دیکھ رہی تھی جو تیمور برنی کے لیے تیار کی گئی تھی۔ لیکن تیمور کا خیال ذہن میں آتے ہی اس کے دل میں نفرت کا طوفان اُمڈ آیا۔ اس نے سر کو جھٹک کر خود کو سوچوں کے گرداب سے نکالنے کی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کوشش کی اور دل کو تسلی دی کہ مجھے ایک دغاباز انسان کے لیے افسوس نہیں کرنا چاہیے۔ اگر اس نے مجھے محبت کا زخم دیا تو دیوتا کے حکم سے خود بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔ ایسے لوگ ہمدردیوں کے مستحق نہیں ہوتے۔

جشن شروع ہوا تو مایا کی سہیلیوں نے اسے بھی اپنی ساتھ رقص میں شرکت کی دعوت دی مگر مایا نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر ٹال دیا۔ لڑکیاں کچھ دیر ضد کرنے کے بعد آگے بڑھ گئیں تو مایا کو نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بار پھر تیمور کا خیال آ گیا۔

وہ بہت بے چین ہو گئی تھی۔ اُسے بیتے دن یاد آنے لگے تھے۔ وہ بارہا تیمور کے سینے سے لگی تھی۔ اس سے باتیں کرتی رہتی تھی.... تیمور برنی سے نفرت کے باوجود یہ احساس اس کے دل میں کچوکے لگا رہا تھا کہ آج رات اُس بے وفا کو موت کی نیند سلا دیا جائے گا۔

اب اسے تیمور برنی پر رحم آنے لگا۔ بلا شبہ تیمور نے دھوکا دیا تھا مگر بہر حال وہ اُسے چاہتی تھی۔ اس کی سوچ میں تبدیلی پیدا ہونے لگی تھی۔

اس نے سوچا یہ درست ہے کہ تیمور نے اسے دھوکا دیا، مگر ظلم کا جواب ظلم سے دینا یا اپنے محبوب سے ان حالات میں بے وفائی کا انتقام لینا محبت کرنے والوں کو زیب نہیں دیتا۔ محبت کرنے والے تو معاف کر دیا کرتے ہیں۔ تیمور برنی نے جو کیا وہ اس کا اپنا ظرف تھا لیکن میں تو سچی محبت کرتی ہوں۔ اُسے آگ میں جلتا کیسے دیکھ سکتی ہوں۔

”نہیں، نہیں....“ وہ تڑپ اُٹھی۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اُسے آگ میں نہیں جلنے دوں گی.... مگر میں اس کے لیے کر بھی کیا سکتی ہوں۔ میرے بس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ شوکال دیوتا کا حکم کون ٹال سکتا ہے۔ میں اسے چتا میں پھینکنے سے کیسے روک سکتی ہوں۔“

وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑا رہی تھی کہ ایک نیا خیال ذہن میں آتے ہی پرسکون سی ہو گئی۔ کچھ دیر تک وہ اپنے منصوبے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتی رہی پھر اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ وہ دل میں حتمی فیصلہ کر چکی تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر مایا نے محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر کسی کو اپنی جانب متوجہ نہ پا کر میدان سے نکل آئی۔ اُس کا رخ تہ خانے کی جانب تھا جہاں فاخر کو قید کیا گیا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

جب وہ اپنی منزل پر پہنچی تو فاخر تہ خانے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ وہ مایا کو سامنے پا کر چونک گیا تھا۔ مایا اس کے قریب گئی اور اپنی بے ترتیب سانسیں درست ہونے پر تیز لہجے میں بولی۔

”میں نے ایک اہم فیصلہ کر لیا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں؟“ فاخر حیرت سے بولا۔

”میں چاہتی ہوں کہ تم یہاں سے فرار ہو جاؤ؟“ مایا نے انکشاف کیا تو فاخر حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ مایا کی سوچ یوں اچانک بدل بھی سکتی ہے۔

”میں تیمور برنی کے بغیر نہیں جا سکتا۔“ فاخر نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔

”وہ بے وفا بھی تمہارے ساتھ جائے گا۔“ مایا نے پُرعزم لہجے میں جواب دیا۔

”مگر کیسے.... وہ تو قید ہے؟“ فاخر چونکا۔

”میں اُسے آزاد کراؤں گی۔“

”تم کیسے آزاد کراؤ گی؟“

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ یہ میرا کام ہے، میں خود نبٹ لوں گی۔“

”مجھے تفصیل سے بتاؤ۔“ فاخر سوچ میں پڑ گیا تھا۔

”تم ابھی یہاں سے نکلو اور مندر کے دائیں جانب سیدھے چلتے جانا۔ اس طرح تم ساحل تک پہنچ جاؤ گے۔ وہاں ایک کشتی کھڑی ہے جسے ہم مچھلیاں پکڑنے کے لیے استعمال کرتے ہیں تم اس میں بیٹھ کر فرار ہو جانا۔“

”اور تیمور؟“ تفصیل سن کر فاخر نے سوال کیا۔

”تم اس کا وہیں انتظار کرنا.... جلد ہی تیمور بھی وہاں پہنچ جائے گا۔“

”کیا تم یہ کام کر سکو گی؟“ فاخر کے لہجے میں تشویش تھی۔

”بے فکر رہو۔ میں جانتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اب فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔“

”اگر سردار نے دیکھ لیا تو؟“

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

''بہت بزدل ہو تم۔ مرد ہو کر خطرات سے ڈرتے ہو۔ یہ بھی ذہن میں رکھو کہ اگر فرار کا منصوبہ ناکام ہو گیا تو تمہارے ساتھ ساتھ مجھے بھی چتا میں پھینک دیا جائے گا۔''

مایا کی بات سن کر فاخر کو شرم سی آگئی۔ وہ جلدی جلدی سامان سمیٹنے لگا۔ سامان تھا ہی کیا۔ صرف دو سفری بیگ تھے ایک تیمور برنی کا اور دوسرا اس کا اپنا.... اس کے علاوہ کچھ کھانے کی چیزیں تھیں جو مایا کے، کہنے پر اُس نے بیگ میں ڈال لی تھیں۔

کچھ دیر بعد مایا اور فاخر تہ خانے سے باہر آ گئے۔

ہر طرف سناٹا تھا۔ کیونکہ سب لوگ جشن میں شریک تھے۔ مایا نے اُسے سمت کا بتایا اور بولی۔

''تم وہاں پہنچو، کچھ دیر بعد تیمور بھی آ جائے گا پھر تم لوگ جزیرے سے بھاگ جانا۔'' فاخر، مایا کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑا۔ جبکہ مایا اس طرف مڑ گئی جدھر تیمور برنی قید تھا۔

جھونپڑے کے دروازے پر دو مسلح محافظ چوکس کھڑے تھے۔ مایا اُن کے قریب پہنچ کر بولی۔

''جلدی جاؤ تمہیں سردار نے بلایا ہے۔''

''کہاں ہے سردار؟'' ایک نے پوچھا۔

''چتا کے پاس.... جلدی وہاں پہنچو۔''

سردار کی بیٹی کا حکم سنتے ہی دونوں پہرے دار بنا سوچے سمجھے میدان کی طرف دوڑ پڑے۔ جہاں چتا روشن تھی۔ وہ مقام جھونپڑے سے کچھ فاصلے پر تھا۔

مایا فوراً جھونپڑے میں داخل ہو گئی۔ تیمور برنی کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور وہ زمین پر بیٹھا تھا۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندی ہوئی تھیں۔

مایا اسے عین موت کے وقت پُرسکون دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کچھ دیر وہ اُسے دیکھتی رہی۔ گزرے دنوں کو یاد کر کے اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ وہ تیمور کو آواز دینا چاہتی تھی مگر ہونٹ لرز رہے تھے۔ لحہ بھر میں اسے بہت کچھ یاد آ گیا۔ اسے تیمور کی جھوٹی محبت یاد آنے لگی۔

اس احساس نے مایا کے دل میں نفرت و انتقام کی آگ بھڑکا دی تھی۔ ایک لحہ کے، لیے مایا کے دل میں خیال آیا کہ وہ خنجر جو تیمور کی رسیاں کاٹنے کے لیے لائی تھی اس کے سینے میں اُتار دے کہ اس نے ایک مقدس جذبے کی توہین کی ہے۔

تھوڑی دیر دل و دماغ کے درمیان یہ جنگ جاری رہی۔ پھر اس نے نفرت کے احساس کو کچل دیا اور آگے بڑھی۔

اس نے تیمور کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔

''مایا تم یہاں....؟''

''میں تمہیں رہائی دلانے آئی ہوں....''

مایا نے مختصر جواب دیا اور خنجر نکال کر اس کی رسیاں کاٹنے لگی۔ جلد ہی تیمور برنی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''اس مہربانی پر میں تمہارا شکر گزار ہوں مایا۔ تم نے واقعی مجھے نئی زندگی دی ہے۔ تمہارے خلوص نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں حقائق بیان کروں اور تمہیں کسی غلط فہمی میں نہ رکھوں.... مجھے شرمندگی ہے کہ میں نے تمہیں محبت میں فریب دیا اور تمہارے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ اگر تم چاہو تو مجھ سے انتقام لے سکتی ہو۔''

تیمور برنی نے اس کے سامنے نظریں جھکا دیں تو مایا ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''مجھے حقیقت معلوم ہو چکی ہے۔ اگر مجھے انتقام لینا ہوتا تو اندر داخل ہوتے ہی خنجر تمہارے سینے میں اُتار دیتی۔ لیکن انسان جس سے محبت کرتا ہے اگر کوئی اُسے نقصان پہنچانے کی بابت سوچے تو وہ محبت نہیں خود غرضی بن جاتی ہے۔ میری غلطی یہی تھی کہ تمہیں اپنا دیوتا جانا اور تمہاری پرستش کی۔ جبکہ تمہارا کارنامہ یہ ہے کہ تم نے میرا نازک دل توڑ دیا۔''

مایا کے لہجے میں نشتر کی سی چبھن تھی۔ ایک لحہ توقف کے بعد وہ دوبارہ کہنے لگی۔

''میں نے باہر کی دنیا کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ لیکن اب عملی تجربہ سے گزری ہوں تو یقین ہو گیا ہے کہ باہر کی دنیا میں بے وفائی کا چلن ہے۔ وہاں اہمیت احساسات کی نہیں، مفادات کی ہے۔''

تیمور برنی خاموش تھا۔ اس کے پاس مایا کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''اب یہاں سے نکل جاؤ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں۔ پہرے دار کسی بھی وقت واپس آ جائیں گے۔''

''وہ کہاں گئے ہیں؟'' تیمور برنی نے باہر نکلتے ہوئے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

پوچھا۔

''میں نے جھوٹ بول کر انھیں چتا کی طرف بھیج دیا تھا۔ اب مجھے اس جھوٹ کی کڑی سزا ملے گی۔ ممکن ہے تمہاری جگہ مجھے جلتی ہوئی چتا میں پھینک دیا جائے۔ میں تمہارے فرار میں مدد کے الزام سے کس طرح بری ہو سکتی ہوں۔''

''یہ تم نے کیا کیا مایا.... میری رہائی کے لیے تم نے اپنی زندگی کیوں داؤ پر لگا دی؟'' تیمور اس کی بات سن کر تڑپ اُٹھا تھا۔

''اس لیے کہ محبت کرنے والے ہی قربانی دیا کرتے ہیں۔''

''تعجب ہے....'' تیمور برنی حیرت سے بولا۔

''کس بات پر؟''

''تم ایک قبائلی لڑکی ہو اور میں سمجھتا تھا کہ تم لوگوں میں جذبات اور احساسات کا فقدان ہے۔ مگر تم تو ترقی یافتہ انسانوں کی طرح سوچتی ہو، اور جذبوں کی قدر کرنا جانتی ہو۔''

''دوسروں کو کمتر سمجھنا شاید تم لوگوں کی فطرت کا حصہ ہے۔'' مایا کے لہجے میں طنز تھا۔

''کیا واقعی میرے فرار کے بعد وہ لوگ تمہیں چتا میں جلا دیں گے؟'' تیمور نے موضوع بدلا۔

''تمہیں اس سے غرض نہیں ہونا چاہیے۔ جب تم نے میرے دل کا خون کر دیا ہے تو زندگی کی پروا کیوں کر رہے ہو۔''

''تمہارے معاملے میں مجھ سے غلطی ضرور سرزد ہوئی، لیکن میں جذبات سے عاری نہیں کہ تمہیں موت کے منہ میں دھکیل کر اپنی جان بچا لوں۔ اگر تم میرے لیے ایثار کر سکتی ہو تو میں بھی تمہارے لیے قربانی دے سکتا ہوں۔'' تیمور نے جواب دیا۔

''بحث مت کرو۔ تمہیں فوراً یہاں سے جانا ہے۔'' مایا سخت لہجے میں بولی ''پہرے دار پہنچنے والے ہیں۔ تم میری فکر مت کرو۔ میں نے جس سے محبت کی، اس پر زندگی قربان کر کے میری روح کو قرار مل جائے گا۔''

''نہیں مایا! میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ تم مجھے دوبارہ باندھ دو۔ میں واپس نہیں جاؤں گا۔ چتا کی آگ میرے لیے جلائی گئی ہے اور میرا جسم ہی اس کا ایندھن بنے گا۔''

تیمور نے فیصلہ سنا دیا تو مایا کی آنکھوں سے بے بسی جھانکنے لگی اور وہ کرب ناک لہجے میں بولی۔

''دیکھو! میں نے تم سے محبت کی ہے۔ تم نے مجھے اس کے بدلے کچھ نہیں دیا۔ مگر آج میں تم سے کچھ مانگنا چاہتی ہوں۔ یوں سمجھو ایک التجا ہے میری۔''

''بولو.... میں تمہاری خواہش کی تکمیل میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھوں گا۔''

''وعدہ کرو۔''

''ہاں میں وعدہ کرتا ہوں تم سے۔''

تیمور کی بات سن کر مایا کے بجھے ہوئے چہرے پر تازگی آ گئی اور وہ بولی۔

''میں تمہاری زندگی چاہتی ہوں۔ اپنی جان بچا لو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ میں اپنی نظروں کے سامنے تمہیں مرتا نہیں دیکھ سکتی۔''

''مجھے منظور ہے، مگر ایک شرط پر۔'' تیمور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیسی شرط؟'' مایا نے پوچھا۔

''تمہیں بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''کہاں؟''

''میرے ساتھ.... میری دنیا میں۔'' تیمور نے کہا۔

''میں اس نئی دنیا میں خوش نہیں رہ پاؤں گی۔ وہاں تم جیسے لوگ ہی موجود ہوں گے۔ میرے لیے یہ پرانی دنیا ہی ٹھیک ہے۔ یہاں سچائی ہے، خلوص ہے اور لوگ ایک دوسرے کو دھوکہ بھی نہیں دیتے۔''

تیمور اُس کی باتیں سن کر سناٹے میں آ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ نوخیز لڑکی اتنی گہری سوچ رکھتی ہوگی۔ اس نے غور سے مایا کی طرف دیکھا۔

''مایا میں اس شرط پر یہاں سے جاؤں گا اگر تم میرے ساتھ چلو گی۔ یہ میری آخری فیصلہ ہے۔ میں اپنی جان بچانے کی خاطر تمہیں جہنم میں نہیں جھونک سکتا۔ اور یقین کرو کہ میری دنیا میں سب لوگ میرے جیسے نہیں ہیں۔ وہاں بہت اچھے لوگ بھی ہیں۔''

تیمور برنی نے اُسے سمجھانا چاہا تو اس نے بات کاٹ دی۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

''ٹھیک ہے.... میں تمہاری سلامتی کی خاطر ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں.... دیکھو وہ لوگ آ رہے ہیں۔ میرے ساتھ آؤ، وقت کم ہے۔''

بہت سے لوگوں کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر مایا نے اس کے ساتھ چلنے کی حامی بھر لی تھی۔ وہ کسی صورت تیمور کو مرتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اور یہی سوچا تھا کہ جب تیمور کشتی میں سوار ہو جائے گا تو وہ واپس آ جائے گی۔ اب وہ تیمور کا ہاتھ تھامے درختوں کے جھنڈ کی جانب دوڑ رہی تھی۔

ادھر کچھ ہی دیر میں لوگ جھونپڑے کے قریب پہنچ گئے۔ سب سے آگے دونوں پہرے دار تھے۔ ان کے پیچھے سردار اور دیگر لوگ تھے۔

سردار کی آنکھوں میں تشویش تھی۔ اس نے مایا کو یہ حکم نہیں دیا تھا کہ وہ پہرے داروں کو اس کے پاس بھیجے۔ اسی لیے وہ خود ساتھ چلا آیا تھا۔ جھونپڑا خالی دیکھ کر پہرے داروں نے تیمور کے فرار ہو جانے کا شور مچا دیا۔

''سردار قیدی بھاگ گیا ہے....؟''

تمہیں یقین ہے کہ وہ مایا ہی تھی۔'' سردار ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔

''ہاں سردار! وہ مایا ہی تھی، ہم نشے میں نہیں تھے۔''

ایک پہرے دار نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ اسی وقت ایک شخص نے دائیں جانب اشارہ کر دیا۔

''وہ رہے.... وہ جا رہے ہیں۔''

سردار نے چونک کر اس جانب دیکھا۔ اگرچہ وہ لوگ کافی دور نکل گئے تھے مگر لوگوں نے انھیں پہچان لیا تھا۔ وہ مایا اور تیمور برنی ہی تھے۔

سردار کے چہرے پر غیض و غضب کے آثار نمایاں ہو گئے تھے اور آنکھیں غصے سے اُبل پڑیں۔ وہ چیخ کر بولا۔

''ان کا پیچھا کرو.... اور تیروں کی بارش کر دو ان دونوں پر۔''

''سردار! مایا....'' ایک شخص نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''مایا میری بیٹی ہے۔ مگر اس نے دیوتا کے حکم کی نافرمانی کی ہے اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ میری پروا مت کرو، اور ان پر تیر برسانا شروع کر دو۔''

حکم ملتے ہی پندرہ بیس لوگ تیمور برنی اور مایا کے تعاقب میں دوڑ پڑے۔ ان میں سے بعض لوگ فرار ہونے والوں پر تیر بھی چلا رہے تھے۔

مگر تیمور اور مایا تیروں کی بارش سے بچتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ تیر ان کے اردگرد سے گزر رہے تھے اور بعض درختوں کے تنوں میں بھی پیوست ہو رہے تھے۔

''اور تیز بھاگو.... ہم تیروں کی زد میں آ گئے ہیں۔'' تیمور برنی نے تیز لہجے میں کہا۔

اگرچہ مایا کافی تیز دوڑ رہی تھی تاہم وہ ایک عورت تھی اور مرد کے مقابلے میں نہیں بھاگ سکتی تھی۔ لیکن پھر بھی اس کی کوشش جاری تھی۔ خوف زدہ ہرنی کی طرح اس کی رفتار بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

تعاقب کرنے والے بھی تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ اُن کا درمیانی فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ تیمور برنی نے مایا کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور دونوں ساتھ ساتھ دوڑتے چلے جا رہے تھے۔

اچانک تیمور نے محسوس کیا کہ مایا کی رفتار کم ہو گئی ہے۔ اب وہ دوڑ نہیں پا رہی بلکہ اپنے وجود کو زبردستی گھسیٹ رہی ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو مایا کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

جلد ہی تیمور برنی پر ایک خوفناک حقیقت واضح ہو گئی۔ اس کا دل تڑپ اُٹھا تھا کیوں کہ مایا کی پشت میں ایک تیر پیوست ہو چکا تھا۔ تیمور برنی نے لمحہ بھر کے لیے رُک کر مایا کو دونوں بازوؤں میں اُٹھا لیا اور دوبارہ دوڑنے لگا۔

اس وقت مایا کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی جیسے اُسے سارے جہاں کی خوشی مل گئی ہو۔ اور یہی مختصر سفر اس کی زندگی کا حاصل ہو۔

''تت.... تم کتنے اچھے ہو۔'' وہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔

''اب مجھے اپنی موت کا کوئی غم نہیں ہے۔ تمہاری آغوش میں سمٹ کر یوں لگ رہا ہے جیسے مجھے ابدی سکون مل گیا ہو۔ مگر تمہاری کوشش لا حاصل ہے۔ میں مر رہی ہوں اور چند لمحوں کی مہمان ہوں۔ تم مجھے یہیں چھوڑ دو اور خود اپنی جان بچانے کی کوشش کرو۔''

''نہیں مایا! میں تمہیں اس وقت تک خود سے جدا نہیں

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

اہم اطلاع

نئے اُفق گروپ آف پبلیکیشنز سے شائع ہونے والے ڈائجسٹ

آنچل نئے اُفق حجاب

کا ویب ایڈریس اور تمام کالموں کے ای میل تبدیل ہوگئے ہیں۔ قارئین نوٹ فرمالیں۔

پرانے ویب اور ای میل ایڈریس پر مسلسل صارفین کی شکایات موصول ہوتی رہیں۔ جس کی بنا پر ادارے نے اپنے ای میل ایڈریس تبدیل کرلیے ہیں۔ تمام سلسلوں کے الگ الگ ایڈریس اس پوسٹ میں لگائے جارہے ہیں۔ براہ کرم اسے اپنے پاس محفوظ کرلیجیے اور اپنے دوست احباب کو بھی اطلاع کردیں۔

نیا ویب ایڈریس یہ ہے

www.naeyufaq.com

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

info@naeyufaq.com	نئے افق، آنچل اور حجاب سے متعلق معلومات کے لئے یہ ای میل ہے
editorufaq@naeyufaq.com	نئے افق کی کہانیاں، سلسلے اور معلومات کے لئے
editor_aa@naeyufaq.com	آنچل کی کہانیاں، سلسلے اور معلومات کے لئے
editorhijab@naeyufaq.com	حجاب کی کہانیاں، سلسلے اور معلومات کے لئے
biazdill@naeyufaq.com	بیاض دل اور نیرنگ خیال
dkp@naeyufaq.com	دوست کے پیغام
yaadgar@naeyufaq.com	یادگار لمحے
aayna@naeyufaq.com	آئینہ کے لئے تبصرہ
bazsuk@naeyufaq.com	بزم سخن (شاعری)
alam@naeyufaq.com	عالم میں انتخاب شاعری منتخب شعرا کا کلام
shukhi@naeyufaq.com	شوخئ تحریر (اقتباسات)
husan@naeyufaq.com	حجاب میں تبصرے کے لئے حسن خیال

اپنی کہانیاں یونی کوڈ، ورڈز اور ان پیج پر ٹائپ کرکے ای میل کردیں۔ اردو رسم الخط میں موصول ہونے والی کہانیاں قابل قبول ہوں گی۔ نئے افق، آنچل اور حجاب کے کالم میں شریک ہونے کے لئے درست ای میل کا انتخاب کیجیے۔ بصورت دیگر ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔ تمام احباب سے گذارش ہے کہ ای میل ایڈریس محفوظ کرلیں تاکہ بوقت ضرورت آپ کو کسی قسم کی دشواری نہ اٹھانا پڑے۔

ہونے دوں گا جب تک تمہارے دل کی ایک بھی دھڑکن باقی ہے۔"

تیمور کی بات سن کر مایا کی دھندلائی ہوئی آنکھیں روشن ہوگئیں اور وہ نحیف لہجے میں بولی۔

"یہ میری خوش نصیبی ہوگی کہ تمہاری پناہ میں دم توڑ دوں.....مگر مجھ سے ایک وعدہ کرو۔"

"بولو.....میں ہر عہد نبھاؤں گا۔"

"بس اتنا کہ تم مجھے آخری سانس تک یاد رکھو گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں مرتے دم تک فراموش نہیں کروں گا.....مگر تمہیں بھی میرے ساتھ جینے کا وعدہ کرنا ہوگا۔تم مجھے بیچ سفر میں چھوڑ کر نہیں جاسکتی ہو۔"

تیمور برنی نے بھرائی آواز میں کہا۔

"تمہاری یاد ہمیشہ میری سانسوں میں بسی رہی گی اور تم میری کتاب زیست میں ایک اہم باب بن جاؤ گی۔"

مایا کے ہونٹوں پر ایک مرتبہ پھر مسکراہٹ نمودار ہوئی جس میں سکون ہی سکون تھا۔اس کی آنکھیں بھی چمک اٹھی تھیں۔مگر اگلے ہی لمحے ان خوب صورت آنکھوں کی چمک ہمیشہ کے لیے ماند پڑگئی۔

مایا کی گردن ڈھلک گئی تھی۔اس نے تیمور برنی کی بانہوں میں دم توڑ دیا تھا۔

مایا کے بہت دور چلے جانے کا احساس ہوتے ہی تیمور کے قدم بھی زمین نے جکڑ لیے۔

اس نے بیٹھ کر مایا کو زمین پر لٹا دیا۔اس کی آدھ کھلی آنکھوں کو بند کرنے کے بعد پیشانی پر بوسہ دیا اور ایک بار غور سے اس کے معصوم چہرے کو دیکھنے کے بعد ساحل سمندر کی طرف بڑھنے لگا۔

ساحل پر فاخر کشتی لیے تیار کھڑا تھا۔تیمور برنی نے بھاگتے بھاگتے پیچھے مڑ کر دیکھا۔سردار اور اس کے ساتھ مایا کی لاش تک پہنچ چکے تھے۔ادھر دور سے فاخر اُسے جلدی پہنچنے کے لیے پکار رہا تھا

چناں چہ وہ تیز رفتاری سے آگے بڑھتا ہوا کشتی تک پہنچ گیا۔پھر دونوں نے ایک ایک چپو سنبھال لیا اور تیزی سے کشتی کھینچنے لگے۔قبائلی اب ساحل پر پہنچ چکے تھے اور کشتی پر تیر برسا رہے تھے۔لیکن تیمور برنی اور فاخر ان تیروں کی زد سے دور نکل گئے تھے۔

"مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ ہم نے مایا کو دھوکا دیا۔وہ بہت مخلص اور باہمت لڑکی تھی۔" کھلے سمندر میں پہنچتے ہی فاخر نے مایا کا ذکر چھیڑ دیا۔

"ہاں وہ واقعی عظیم لڑکی تھی۔اس نے اپنی جان دے کر ہمیں اس جہنم سے بچ نکلنے میں مدد دی، جسے میں بھی بھلا نہیں پاؤں گا۔"

تیمور برنی کی آواز بھر آئی تھی۔

"کیا کہہ رہے ہو.....کیا مایا مرگئی.....کیسے کب؟" فاخر چونکا۔

"کچھ دیر پہلے میری بانہوں میں....." تیمور برنی نے انکشاف کیا اور شروع سے آخر تک تمام واقعات بیان کر دیے۔

"افسوس ہوا سن کر، کاش وہ نہ مرتی اور تم اُسے ساتھ لے آتے۔" فاخر نے کہا تو تیمور برنی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔وہ خاموشی سے سطح آب کر گھورتا رہا اور پھر بولا۔

"اب کیا ارادہ ہے؟"

"ہم واپس جا رہے ہیں۔کھلے سمندر میں کوئی جہاز ضرور مل جائے گا۔"

"واپس چل رہے ہو.....کیا مطلب؟" تیمور برنی نے چپو روک دیا۔

"واپسی کا مطلب واپسی ہی ہوتا ہے.....کیا تم دوبارہ جزیرے پر جانا چاہتے ہو۔" فاخر نے طنز کیا۔

"تم نے شاید رباب کو فراموش کر دیا ہے۔"

"مجھے اس کی المناک موت پر بہت دکھ ہے۔" فاخر نے جواب دیا۔"افسوس وہ شوکال کے ہاتھوں قتل ہو چکی ہو گی۔کافی وقت گزر چکا ہے اور اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ وہ زندہ ہو۔"

"شوکال تو زندہ ہوگا ناں.....؟" تیمور نے کہا۔

"شوکال سے تمہیں کیا دلچسپی ہے؟" فاخر نے پوچھا۔

"میں اس سے رباب کے قتل کا بدلہ لوں گا۔" تیمور برنی پر عزم تھا۔

"کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔تمہارے اس اقدام سے رباب کو دوبارہ زندگی نہیں مل سکتی۔ویسے بھی مندر میں داخل ہونا آسان نہیں۔اگر ہم کسی صورت اندر چلے بھی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

گئے تو جانے کس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑے ہم کوئی تربیت یافتہ جنگجو نہیں ہیں کہ مار دھاڑ کر کے سب کچھ بدل ڈالیں گے۔" فاخر نے اُسے سمجھایا۔

"میں نے حالات سے خائف ہونا نہیں سیکھا۔ میں شوکال سے رباب کے قتل کا انتقام لیے بغیر ہرگز واپس نہیں جاؤں گا۔" تیمور نے جواب دیا۔

"میرے خیال میں تمہارا یہ اقدام خود کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ جو کچھ ہو چکا، اتنا ہی کافی ہے۔"

"گویا تم جزیرے پر جانے سے انکار کر رہے ہو۔" تیمور برنی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"میں اسے مناسب نہیں سمجھتا۔" فاخر بھی ڈٹ گیا۔

"تم کیا مناسب سمجھتے ہو؟"

"واپسی...."

"ٹھیک ہے۔" تیمور چپو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "کشتی آگے نہیں جائے گی۔"

"پھر کہاں جائے گی؟"

"پیچھے جزیرے کی جانب۔" تیمور برنی نے فیصلہ سنا دیا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"تمہیں جوش نہیں ہوش سے کام لینا ہوگا۔ جذبات میں کوئی نئی بے وقوفی نہیں کرنی چاہیے ہمیں۔" فاخر نے اُسے سمجھایا۔

"میرے نزدیک یہ بیوقوفی نہیں۔ تم مجھے جزیرے پر اتار دو، پھر واپس چلے جانا مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہوگا میں نہیں چاہتا کہ تم میری وجہ سے اپنی جان خطرے میں ڈالو۔" تیمور نے جواب دیا۔

"تم مجھ سے ایسی امید رکھتے ہو۔" فاخر حیرت سے بولا "تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں تمہارا ساتھ چھوڑ دوں گا۔ مگر ذرا اس پہلو پر بھی غور کرو کہ جزیرے والے ابھی تک ہمارے لیے گھات لگائے بیٹھے ہوں گے اور ساحل پر پہنچتے ہی ہماری تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔" فاخر نے اس کی توجہ دلائی۔

"یہ ضروری نہیں کہ ہم اسی جگہ اتریں۔ جزیرہ بہت بڑا ہے۔ ہم کسی اور جگہ بھی اُتر سکتے ہیں۔" تیمور برنی نے تجویز پیش کی۔

"تمہاری رائے درست ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم کم از کم دو روز سمندر میں رہیں اور جزیرے کے قریب اِدھر اُدھر گھومتے رہیں۔ دو روز بعد جزیرے پر پہنچنا مناسب ہوگا۔ قبائلی اس وقت تک مایوس ہو چکے ہوں گے۔" فاخر نے اس سے اتفاق کیا۔

"اچھی ترکیب ہے۔"

تیمور نے بھی اس کی تجویز کو سراہا تھا۔ اب دونوں دوستوں کے دل صاف ہو گئے تھے۔ ساحل سے روانگی کے وقت فاخر تہ خانے پڑی ہوئی خشک خوراک اور دیگر پھل بھی ساتھ لے آیا تھا تاکہ سمندر میں سفر کے دوران اُنھیں کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

-☆-☆-☆-

دن تیزی سے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ نگار اب چندا بن کر نئی شناخت کے ساتھ رانی بائی کی سرپرستی میں پرورش پا رہی تھی۔

اس ننھی سی بچی نے گزشتہ کچھ عرصے میں بہت کٹھن حالات کا سامنا کیا تھا۔ لیکن اب اُسے ایک صبر سا آ گیا تھا۔ رانی بائی کے ہاں پہنچ کر چند روز تو وہ بہت خاموش رہی مگر پھر دھیرے دھیرے ان کے درمیان گھل مل گئی۔

نگینہ اور پائل کو تو جیسے اس چھوٹی سی لڑکی کے روپ میں کوئی کھلونا مل گیا تھا۔ وہ جب جب گھر میں موجود ہوتیں ان کی توجہ کا محور صرف چندا ہی رہتی تھی۔ کچھ ایسی ہی حالت بلبل کی بھی تھی وہ دن بھر اُسے کاندھوں پر بٹھا کر سیر کراتا اور خوب مزے مزے کی چیزیں کھانے کے لیے لا کر دیتا تھا۔

ان سب باتوں کے علاوہ اُس کی تعلیم پر بھی خاص توجہ دی جا رہی تھی۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ٹیوٹر نے اُسے پڑھانے کا آغاز بھی کر دیا تھا۔ اس تعلیم کا مقصد ان کے نزدیک چندا کو سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے کے ڈھنگ سکھانا تھا۔

"اماں تو نے اس کا نام کیوں بدل دیا... کتنا اچھا نام تھا اس کا نگار۔"

نگینہ نے کھانا کھاتے ہوئے کہا تو رانی بائی نے ہاتھ میں پکڑا فلمی میگزین میز پر رکھ دیا اور پان کی گلوری منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔

"نام کی اہمیت اس جگہ ہوتی ہے جہاں حسب نسب

دیکھا جائے۔ جہاں لوگوں کا اعلیٰ کردار ہی ان کی عزت اور معاشرتی وقار کی علامت ہو..... جس طبقے سے ہم لوگ تعلق رکھتے ہیں وہاں عورت کی پہچان اس کے نام سے نہیں بلکہ اداؤں اور جسم کے نشیب و فراز سے کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں عورت کا نام صرف پہچان کا ذریعہ ہے۔ تاکہ نگینہ کو بلانے پر پائل نہ آ جائے.... اور کچھ نہیں رکھا اس بحث میں۔"

"لیکن اماں اس کے ماں، باپ اور بہن بھائی بھی تو ہوں گے.... اُن پر کیا بیت رہی ہو گی اِسے کھو کر۔" پائل نے اُن کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاشم بتا رہا تھا کہ اس کا چند رشتے دار موجود تو ہیں مگر کسی دور دراز علاقے میں رہتے ہیں۔ یزدانی کی دشمنی چل رہی ہے اس کے باپ سے۔ اسی سے انتقام لینے کے لیے تو اس نے لڑکی کو میرے حوالے کیا ہے۔ مگر چھوڑو تم لوگ، ہمیں کیا لینا ان بڑے لوگوں کے لڑائی جھگڑوں سے۔ اور تم دونوں کو کتنی بار کہا ہے میں نے کہ مجھے اماں نہیں، باجی کہا کرو۔"

"کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ تمہیں باجی کہیں، مگر سچی بات ہے جو مزا اماں کہنے میں ہے وہ باجی کہنے میں کہاں.... کیوں اماں....؟" نگینہ نے چٹخارہ لیتے ہوئے کہا تو پائل نے بھی قہقہہ لگا دیا جبکہ رانی بائی کا منہ بن گیا۔

"کمبخت ماری نہ ہو تو.... جب بھی بولے گی نحوست پھوٹے گی۔"

"خیر اب اس میں ناراض ہونے کی تو بات نہیں۔ دیکھ ناں! اب ہمارے اور تمہارے بیچ عمر کا فرق بھی تو ہے نا۔ اگر ہم تمہیں باجی کہیں گے تو لوگ ہمیں سوتیلی بہنیں سمجھیں گے۔ سوچیں گے ان کے باپ کے دو شادیاں کی ہوں گی.... تب ہی تو کہتی ہوں اسٹیپ سسٹر سے اصلی ماں بہتر ہوتی ہے۔"

نگینہ نے بہت دلار سے کہا تو رانی بائی بھی پیار سے اُس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

"بہت زبان چلنے لگی ہے تم دونوں کی.... اچھا یہ بتا وہ سڑے والا سیٹھ زندہ ہے یا مار ڈالا تو نے اپنی اداؤں سے۔"

"ابھی تو قریب المرگ ہے۔ سوچ رہی ہوں شاندار مقبرہ بنواؤں گی اس پر جب پر کتبہ لگا ہو گا کہ لڑکیاں بالیاں اس قبر سے دور رہیں، یہاں ایک نامراد عاشق دفن ہے۔"

نگینہ نے کہا تو پائل ہنس پڑی جب کہ رانی بائی نے سر تھام لیا تھا۔

"کیا مطلب ہے تیرا.... کمبخت لڑکی! کہیں سچ مچ تو نہیں مار ڈالا اُس مردود بڈھے کو۔" وہ بیٹی کو گھورتے ہوئے بولی۔

"ارے نہیں اماں! اتنا بھی نازک نہیں وہ منحوس جو میرے چھوتے ہی مر جائے۔ کہتا ہے تمہارے چھونے سے خود کو جوان محسوس کرتا ہوں.... اب مسئلہ صرف یہ ہے کہ میری وجہ سے اُس کی اپنے بیٹے سے ٹھن گئی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنا رقیب سمجھنے لگے ہیں آج کل۔ اور مجھے ایک دوسرے سے چوری اپنی اپنی وفا کا یقین دلانے کے لیے مہنگے تحفے پیش کر رہے ہیں۔" نگینہ نے ادا سے بالوں کی لٹ کو جھٹکا دیا۔

"ایسا تو پھر ہوتا ہے، اِس طرح کے کاموں میں۔ اپنی جوانی میں میں نے بھی بہت ایڈونچر کیے تھے۔ ایک مرتبہ صرف باپ بیٹے کو نہیں دادا کو بھی پھنسا لیا تھا۔"

رانی بائی نے فخر سے بتایا تو ان کا قہقہہ سن کر بلبل بھی وہاں آ ٹپکا۔ پھر کمرے میں خاموشی چھا گئی اور نگینہ نے کچھ سوچتے ہوئے رانی بائی کی طرف دیکھا۔

"اماں ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں ہاں پوچھ لے.... تو کب سے اتنی مہذب ہو گئی کہ اجازت لے کر بات پوچھے گی۔ مگر دیکھ مطلب کی بات کرنا؟" رانی بائی نے اجازت دے دی۔

"کیا آنے والے وقت میں چندا بھی وہی کام کرے گا جو ہم کر رہی ہیں.... کیا لوگ اس کی بھی ویسے ہی قیمت لگایا کریں گے جیسے ہماری لگاتے ہیں۔"

"ہاں چندا کو بھی اسی پل صراط سے گزرنا ہو گا۔ اسے ہمارے پاس بھیجے جانے کا مقصد بھی یہی ہے۔"

رانی بائی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا اور اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ جبکہ نگینہ کی آنکھوں میں نہ چاہتے ہوئے بھی نمی سی اُمڈ آئی تھی۔

-☆-☆-☆-

کاشف دفتر سے واپس آیا تو دروازے پر تالا تھا۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ عذرا بیگم، حنا اور اریبا کو

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

لے کر اپنی امی کے ہاں گئی ہوگی۔ لیکن پھر یہ سوچ کر اُلجھ سا گیا کہ ایسی صورت میں وہ ہمیشہ کاشف کو فون کر کے آگاہ کر دیا کرتی تھی۔

وہ چند لمحے بند دروازے کے سامنے کھڑا غور کرتا رہا۔ پھر کچھ سمجھ نہ آنے پر اس نے پرس میں رکھی ہوئی اضافی چابی نکالی اور تالا کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی یہ دیکھ کر وہ مزید اُلجھن کا شکار ہو گیا کہ نا صرف کمروں کے دروازے کھلے تھے بلکہ باورچی خانے میں چولہا بھی جل رہا تھا۔

وہ حیران تھا کہ عذرا بیگم اتنی عجلت میں بچیوں سمیت کہاں جا سکتی ہے۔ کمرے میں پہنچ کر وہ اپنی سسرال میں فون کر کے عذرا بیگم کے بارے معلوم کرنے ہی والا تھا کہ گھر کا بیرونی دروازہ کھلنے کی آہٹ پا کر صحن میں نکل آیا۔

سامنے عذرا بیگم ارینا کو بازو سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے اندر لا رہی تھی۔ حنا بھی منہ لٹکائے اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

”کہاں چلے گئے تھے تم سب لوگ۔ سارا گھر کھلا پڑا ہے۔ ہزار بار کہا ہے کہ حالات اچھے نہیں۔ باہر جانے سے قبل احتیاط سے تالے لگایا کرو۔ مگر مجال ہے کہ کانوں پر جوں تک رینگے تم لوگوں کے۔“

”ہم کہاں گئے تھے، یہ بات مجھ سے نہیں اپنی اس لاڈلی بھانجی سے پوچھو.... وہ تو شکر کرو کہ ہم بروقت پہنچ کر اس کی ڈولی واپس لے آئے ورنہ یہ تو اس خاندان کی عزت کا جنازہ نکال چکی تھی۔“ عذرا بیگم نے کاشف کا سوال نظر انداز کر دیا۔

”کیا بولے چلی جا رہی ہو۔“ کاشف نے اس کا رویہ دیکھ کر کہا۔

”مجھ پر گرجنے برسنے کی ضرورت نہیں ہے سرتاج.... اگر کچھ کہنا ہے تو اس منحوس سے، پوچھو جو سڑک پار گلی میں ایک لڑکے کے ساتھ رنگ رلیاں، مناتی پکڑی گئی ہے۔“

”بکواس بند کرو....؟“ کاشف غصے سے دھاڑا۔

”ہاں ہاں میں ہی بکواس کر رہی ہوں جو تمہاری بدکردار بہن کی بدفطرت بیٹی کو گھر میں رکھ کر ناگن کی طرح پال رہی ہوں۔ جانتے ہو! کہیں کا نہیں چھوڑا اس منحوس نے ہمیں۔ سارا محلہ تھو تھو کر رہا ہے ہم پر، اور میری یہ حالت ہو رہی ہے کہ زمین پھٹے اور میں اس میں غرق ہو جاؤں۔“

پھر عذرا بیگم نے کاشف سے اصل حقائق چھپا کر باقی تمام ماجرا خوب مرچ مصالحہ لگا کر بیان کر دیا۔ اس نے کاشف کو وہ تمام باتیں سنا ڈالیں جو رفیق اور بیگم رفیق نے کہی تھیں۔ مگر اس قدر احتیاط سے ضرور کام لیا کہ اس تمام معاملے سے اپنی بیٹی حنا کا نام گول کر گئی بلکہ ان پچاس ہزار روپے کا تذکرہ بھی نہ کیا جو اُسے جرمانے کے طور پر ملے تھے۔

کاشف ساری تفصیل سنتے ہی آگ بگولا ہو کر آگے بڑھا اور کمسن ارینا پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ اپنی یتیم بھانجی کو پیٹتے ہوئے اس کی اپنی آنکھوں سے بھی آنسو رواں تھے۔ جبکہ عذرا بیگم اور حنا کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

جیسے ہی کاشف کے دل کی بھڑاس نکلی اُسے احساس ہو گیا کہ جس معصوم کو وہ وحشیوں کی طرح پیٹ رہا ہے اپنی جگہ پر کسی پتھر کی طرح ساکت بیٹھی ہے۔ ارینا کی آنکھوں میں ویرانی ہی ویرانی تھی۔ چہرے پر پڑنے والے تھپڑوں کے باعث اس کے ہونٹوں کے قریب سے تازہ لہو کی ایک ہلکی سی لکیر کر ٹھوڑی تک آ گئی تھی۔ مگر بچی کے چہرے پر نہ تو درد کے آثار تھے اور نہ ہی آنکھوں میں جینے کی اُمنگ۔

اس کی حالت دیکھ کر کاشف کا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا اور پھر وہ بنا کچھ کہے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کرتا ہوا کمرے میں چلا گیا۔

اس دن کے بعد ارینا نے ایسی چپ سادھ لی کہ نہ اُسے کھانے کا ہوش رہا اور نہ پہننے کا۔ اب ارینا کی حالت اس مریضہ کی سی تھی جو ہر وقت سکتے کی حالت میں رہتی ہو۔ پہلے چند روز تو عذرا بیگم نے کاشف کی توجہ اس کی جانب یہ کہہ کر مبذول نہ ہونے دی کہ یہ اپنی جان بچانے کے لیے بہانے بنا رہی ہے۔ لیکن ہفتہ دس دن بعد کاشف کو خود ہی احساس ہو گیا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔

اُسی شام وہ اُسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کر کے یہی بتایا کہ ارینا کو کسی بات کا ذہنی طور پر شدید صدمہ پہنچا ہے اور جب تک وہ اس کیفیت سے باہر نہیں آ جاتی نارمل نہیں ہو سکے گی۔ لہٰذا اس بات کی اشد

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ضرورت ہے کہ بچی کی زیادہ سے زیادہ خیال رکھا جائے۔ تاکہ اس کے ذہن پر چھائے خوف کے بادل چھٹنا شروع ہوں۔

گھر پہنچ کر کاشف نے عذرا بیگم کو بھی یہی سمجھایا کہ ارینا سے اپنے رویے کو بہتر بنائے لیکن وہ تو پہلے ہی تلوار سونت کر مقابلے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ لہٰذا بیوی سے گوشمالی کروانے کے بعد کاشف نے سب کچھ دکھائی دینے کے باوجود آنکھیں موند لیں اور اپنے کاموں میں مگن ہو گیا۔

یہ معاملہ ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا تھا کہ کاشف کے ادارے نے اُسے ترقی کی نوید سنا کر ہاتھ میں ٹرانسفر لیٹر تھما دیا۔ اب اسے کراچی جانا تھا جبکہ ملازمت کی نوعیت ایسی تھی کہ بار بار چھٹی لے کر بیوی بچوں کے پاس آنا بھی ممکن دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اپنے ملازم کی اس مشکل کو سامنے رکھ کر ادارے نے اُسے کراچی میں رہائش بھی فراہم کر دی تاکہ وہ اپنے اہل خانہ سمیت وہاں منتقل ہو جائے اور پوری دلجمعی سے کام کرے۔

ٹرانسفر لیٹر ملنے پر پہلے تو کاشف نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ لیکن پھر عذرا بیگم کے اصرار پر رضامندی ظاہر کر دی۔

اب جوش و خروش سے روانگی کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ اس دوران ارینا کی حالت میں کوئی خاطر خواہ بہتری نہیں آئی تھی جو کاشف کے لیے تشویش کی بات تھی۔

آخر روانگی کا دن بھی آ گیا.....

سب لوگ ریلوے اسٹیشن پہنچ چکے تھے۔ ٹرین اپنے مقررہ وقت پر کراچی کے لیے روانہ ہوئی تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ گاڑی تیز رفتاری سے اپنی منزل کی جانب گامزن تھی۔ رات گہری ہوتے ہی مسافروں پر نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں نے آنکھیں موند لیں۔ جو مسافر جاگ رہے تھے وہ بھی اونگھ رہے تھے۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب عذرا بیگم کی آنکھ کھلی تو ٹرین گھپ اندھیرے میں کسی نامعلوم مقام پر کھڑی تھی۔ یہ کوئی چھوٹا سا اسٹیشن تھا اور گاڑی کراس کی وجہ سے عارضی طور پر رکی ہوئی تھی۔

عذرا بیگم نے ماحول کا جائزہ لیا تو اسے احساس ہوا کہ پورے ڈبے میں سوائے ارینا کے سب لوگ سو رہے ہیں۔ ارینا اس وقت بھی اپنی سیٹ پر خاموش بیٹھی باہر اندھیرے میں کسی نادیدہ وجود کو گھور رہی تھی۔ جب سے اس لڑکی کے ساتھ یہ سانحہ پیش آیا تھا نہ وہ دن کو سوتی تھی اور نہ رات کو۔ اگر اُسے بستر پر لٹا بھی دیا جاتا تھا تو اس کی آنکھیں کھلی رہتی تھیں۔ وہ سچ مچ ایک زندہ لاش بن کر رہ گئی تھی جسے دیکھ کر عذرا بیگم کو شدید کوفت محسوس ہوتی تھی۔

لیکن آج دوران سفر جیسے ہی عذرا بیگم نے اُسے دیکھا تو ایک اچھوتا خیال ذہن میں آتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی۔ ارینا سے چھٹکارا پانے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔

عذرا بیگم نے گہری نیند سوئے ہوئے کاشف اور حنا کی جانب دیکھا اور پھر ارینا کا بازو تھام کر ٹرین کے دروازے میں لے آئی۔

عذرا بیگم نہیں چاہتی تھی عملے یا مسافروں میں سے کوئی بھی ارینا کو رات کے اس پہر پلیٹ فارم پر دیکھ کر مدد کے لیے آگے بڑھے۔ لہٰذا اس نے ارینا کو بجائے پلیٹ فارم پر اُتارنے کے دوسرے دروازے سے پٹری کے قریب زمین پر اُتار دیا اور دروازہ اندر سے بند کر کے واپس اپنی جگہ پر آ گئی۔

یہ سنگین جرم کرنے کے بعد اُس کے چہرے کی رنگت وقتی طور پر تو بدل گئی تھی مگر سب کو گہری نیند سوتا دیکھ کر وہ خاصی مطمئن ہو گئی اور پھر خود بھی چہرے پر چادر تان کر سوتی بن گئی۔

چند منٹ ہی گزرے تھے کہ گارڈ کا اشارہ ملتے ہی روانگی کا اعلان کر دیا گیا اور ٹرین دھیرے دھیرے ارینا کے قریب سے گزر کر اندھیرے کا حصہ بن گئی۔

-☆-☆-☆-☆-

دو دن کھلے سمندر میں گزارنے کے بعد فاخر اور تیمور برنی کی کشتی رات کے پچھلے پہر جزیرے کے سنسان ساحل پر آ لگی۔ فاخر نے دوبارہ جزیرے پر اُترنے کے لیے سوچ سمجھ کر اس حصے کا انتخاب کیا تھا۔ اس جانب جزیرے کے لوگ بہت کم آتے تھے۔ یہاں ہر طرف ساحلی چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ جنھیں پانی کی تیز لہروں نے کاٹ کاٹ کر گھاٹیوں میں بدل دیا تھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ساحل پر پہنچ کر انھوں نے سب سے پہلے اپنی کشتی کو ایک کھائی میں چھپا دیا اور پھر اپنے لیے بھی ایک پناہ گاہ تلاش کر لی۔ اب ان کے لیے سب سے اہم کام آئندہ حکمت عملی تیار کرنا تھا۔ وہ اپنی پناہ گاہ میں چھپ کر اگلا دن بھی اسی مسئلے پر بحث کرتے رہے۔ لیکن مندر میں داخل ہونے کی کوئی ترکیب سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ مندر کی دیواریں بہت بلند اور مضبوط تھیں اور انھیں سر کرنے کے لیے کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا۔

تیمور برنی کو اس بات کا یقین تھا کہ شوکال کا بیرونی دنیا سے کوئی رابطہ ضرور قائم ہوگا۔ اس سلسلے میں غور طلب بات یہ تھی کہ وہ رابطے کے لیے کون سا طریقے استعمال کرتا ہوگا۔ اسے قطعاً توقع نہیں تھی کہ رباب اب تک زندہ ہوگئی۔ وہ تو صرف پروہت سے، اس کے قتل کا بدلہ لینے آیا تھا جس میں فاخر ہر قدم پر اُس سے تعاون کر رہا تھا۔ مگر کبھی کبھی اس پر اکتاہٹ بھی طاری ہونے لگتی تھی۔

”آخر ہم کب تک چوہوں کی طرح بل میں گھس کر بیٹھے رہیں گے۔“

فاخر نے قدرے بیزاری سے کہا۔ اس وقت وہ پناہ گاہ سے نکل کر سمندر کے کنارے ایک پہاڑی کی آڑ میں بیٹھے تھے۔ تیمور برنی نے فاخر کو تسلی دی اور کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”میں بھی تو یہ سوچ رہا ہوں کہ مندر میں کیسے داخل ہوا جائے۔ لیکن کوئی ترکیب سمجھ نہیں آ رہی۔“

”ہمیں فیصلہ کرنے میں تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اب تو ہمارے پاس کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں بچا۔ وہ بسکٹ کے چند پیک بھی کب کے ختم ہوگئے ہیں جو ایمرجنسی کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ کچھ نہ ملا تو ناریل اور مچھلیاں کھا کھا کر بیمار پڑ جائیں ہم دونوں۔“

فاخر کی بات درست تھی۔ تیمور اثبات میں سر ہلا کر خاموش ہوگیا۔ پھر اچانک کوئی خیال ذہن میں آتے ہی فاخر پر جوش لہجے میں بولا۔

”مجھے یاد آ رہا ہے کہ روانگی کے وقت مایا نے مجھے ہدایت کی تھی کہ مندر کے عقب میں ہرگز نہ جاؤں۔ کیوں کہ شوکال نے اس طرف جانے سے منع کر رکھا ہے۔ جو شخص اس کی حکم عدولی کرتا ہے اس پر دیوتا کا قہر نازل ہوتا ہے اور وہ کبھی واپس نہیں آتا۔“

”زبردست.... تم نے پہلے یہ بات کیوں نہیں بتائی۔ یقیناً مندر کا خفیہ دروازہ اسی طرف ہوگا۔ اسی لیے عام لوگوں کو اس طرف جانے سے منع کیا گیا۔“ تیمور برنی کو یقین تھا کہ وہ اس مسئلے کو حل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

”فی الحال اور کوئی راستہ نہیں۔ ہمیں شوکال کے حکم کی خلاف ورزی کرنی پڑے گی۔ اور مندر کے عقب میں پہنچنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں ایسی کوئی بات ضرور ہے جس کے انکشاف کے خوف سے قبائلیوں کو اس طرف جانے سے منع کر دیا گیا۔“

وہ دونوں اپنی پناہ گاہ سے نکل آئے۔ ابھی انھوں نے مختصر فاصلہ طے کیا تھا کہ کافی فاصلے پر چند لوگوں کو اپنی جانب آتے دیکھا۔

”ہوشیار! چند لوگ ہماری جانب بڑھ رہے ہیں۔ شاید انھیں ہماری یہاں موجودگی کا علم ہوگیا ہے۔“ تیمور نے کہا تو دونوں بجلی کی سی تیزی سے چٹان کی اوٹ میں ہو گئے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

”حالات تو ایسے ہی دکھائی دے رہے ہیں۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ یہاں رکنا اور ان لوگوں سے الجھنا ہمارے حق میں بہتر نہ ہوگا۔“ فاخر نے تیز لہجے میں جواب دیا اور دونوں چٹانوں اور کھائیوں کو عبور کرتے ہوئے کافی فاصلے پر جا پہنچے۔

ایک محفوظ مقام پر پہنچ کر انھوں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ لوگ واپس جاتے دکھائی دیے۔ شاید وہ کسی اور مقصد کے لیے آئے تھے۔

”اچھا ہوا خطرہ ٹل گیا۔ ورنہ مفت کی مصیبت گلے پڑ جاتی۔“ فاخر نے سکون کی سانس لی۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مگر یاد رکھو ان حالات میں بھی ہم کمزور نہیں ہیں۔ ہمارے پاس ایک خنجر اور نیزے کے علاوہ مقابلہ کرنے کا حوصلہ بھی ہے۔“ تیمور نے اس کی بات سن کر جواب دیا۔

”خدا کے لیے اب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ ورنہ تمہارا یہ اقدام ہماری یہاں موجودگی کا اعلان ثابت ہوگا۔ اگر ہم نے کسی کو نقصان پہنچایا تو سارے جزیرے کے وحشی یہاں

پہنچ جائیں گے۔''

ان کے جاتے ہی وہ دونوں واپس آ گئے۔ لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھ رہے تھے راستہ دشوار ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جزیرے کے لوگ اس جانب کبھی نہ آئے ہوں۔ اس علاقے میں چٹانوں کے علاوہ غاریں بھی تھیں۔ ایک مقام پر پہنچ کر فاخر نے غار کی جانب اشارہ کیا۔

''یہ پناہ گاہ محفوظ دکھائی دیتی ہے۔ وہ لوگ یہاں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔''

''ہاں مگر یہ غار کافی گہرا ہے اور دہانہ بھی تنگ ہے۔ سمندر میں طغیانی آئی تو غار میں پانی بھر جائے گا۔ ایسی صورت میں ہمیں باہر نکلنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔'' تیمور برنی نے توجہ دلائی۔

''میں سمجھتا ہوں کئی برس سے پانی یہاں تک نہیں پہنچا۔ تم خوامخواہ اندیشوں کے جال بن رہے ہو۔ ہم عقب سے مندر تک پہنچنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اس طرح آمد و رفت بھی آسان ہو جائے گی۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ پناہ گاہ ہمارے لئے کافی محفوظ ثابت ہو سکتی ہے۔ ویسے بھی وہی پناہ گاہیں محفوظ تصور کی جاتی ہیں جو دشوار گزار ہوں۔'' فاخر نے جائزہ لیتے ہوئے کہا تو تیمور بھی کاندھے اُچکا کر خاموش ہو گیا۔

غار کا دہانہ اتنا تھا کہ ایک آدمی آسانی سے گزر جائے۔ تیمور نے اپنے واٹر پروف بیگ سے ٹارچ نکال کر روشن کی تو غار کافی کشادہ تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں غار کے اندر موجود تھے۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے غار مزید کشادہ ہوتا چلا جا رہا تھا اب اس نے ایک سرنگ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ فاخر گہری نظر سے غار کی ساخت کا اندازہ لگا رہا تھا۔ جبکہ تیمور ہاتھ میں ٹارچ تھامے آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک اُس نے پلٹ کر دیکھا اور بولا۔

''فاخر کیا تم نے ایک بات محسوس کی؟''

''کیسی بات؟'' فاخر چونکا۔

''اس غار کی تراش خراش میں انسانی ہاتھوں کا دخل محسوس ہو رہا ہے۔''

''ہاں میں بھی اسی پہلو پر غور کر رہا ہوں۔ یہ تو باقاعدہ سرنگ بنائی گئی ہے۔ وہ محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ کئی میٹر تک آگے بڑھنے کے بعد تیمور یک دم ٹھٹک کر گیا۔ فاخر نے چونک کر سامنے دیکھا تو دونوں کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

سرنگ اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی اور اب وہ ایک ایسے آہنی دروازے کے قریب کھڑے تھے جس کی موجودگی کا انہیں کسی طور یقین نہیں آ رہا تھا۔

''حیرت ہے.... خفیہ دروازہ۔''

فاخر نے دروازے کی مضبوط ساخت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم مندر میں داخل ہونے کے لیے ایک خفیہ راستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔'' تیمور برنی نے جواب دیا۔

''اور یہ کامیابی غیر متوقع ہے۔ ہم غار میں اس ارادے سے تو داخل نہیں ہوئے تھے۔''

''بعض اوقات کامیابی اسی طرح قدم چوم لیتی ہے۔ اب ہمیں دروازہ کے پار پہنچنے کے لیے ترکیب سوچنی چاہیے۔'' تیمور برنی نے کہا تو فاخر دروازے کا جائزہ لینے لگا۔

''دروازہ اندر سے بند اور بہت مضبوط ہے۔ اگر ہم نے لوہے کا دروازہ توڑنے کی کوشش کی تو یہ ڈھول کی طرح بج اُٹھے گا۔ لہٰذا کوئی ایسی ترکیب اختیار کی جائے کہ ہم بنا شور کے دوسری جانب پہنچ جائیں۔''

''مندر میں داخل ہونا ان کے لیے بہت اہم تھا۔ اس لیے دونوں ہر اس مسئلے کا حل سوچ رہے تھے۔ پھر اچانک تیمور برنی کو ایک تدبیر سوجھی۔

''ہمارے پاس کھدائی کے لیے نیزہ تو موجود ہے اگر ہم یہاں سے دروازے کے دوسری جانب ایک چھوٹی سے سرنگ بنالیں تو بآسانی اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔''

''بات تو قابل غور ہے۔ مگر نیزہ کھدائی کے لیے مناسب نہیں رہے گا۔ اس طرح تو کافی وقت لگ جائے گا۔ سرنگ کھودنا آسان کام نہیں۔'' فاخر نے کہا۔

''تمہارے خیال میں کتنا وقت لگ جائے گا۔ ہم نے بہت مختصر راستہ بنانا ہے۔ باقی زمین پتھریلی ضرور ہے مگر بھربھری بھی ہے۔ ہمیں کھدائی میں زیادہ محنت اور وقت نہیں

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

لگے گا۔ اگر ہمت کر لیں تو چند گھنٹوں میں دوسری جانب پہنچ جائیں گے۔"

تیمور کے قائل کرنے پر فاخر نے رضامندی کا اظہار کر دیا اور دونوں مل کر سرنگ کھودنے لگے۔ سورج غروب ہونے سے کچھ دیر قبل ہی وہ دوسری جانب پہنچ گئے۔ تاہم انھوں نے سرنگ سے باہر نکلنے کے لیے اندھیرا پھیلنے کا انتظار کیا۔

تیمور برنی نصف شب کے بعد مندر میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ دونوں واپس غار میں آ کر مناسب وقت کا انتظار کرنے لگے۔ قدرت نے مشکل وقت میں ان کی بہت مدد کی تھی ورنہ ان کے لیے مندر میں داخل ہونا آسان نہیں تھا۔

"مندر میں داخل ہونے کے بعد تمہاری کیا حکمت عملی ہوگی؟"

فاخر نے ہاتھ میں پکڑے، خنجر سے زمین کو کریدتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے سوچا ہے کہ آدھی رات کے بعد مندر میں داخل ہوں گا جب کہ تم یہیں میرا انتظار کرو گے۔ اگرچہ اس بات کا خدشہ نہیں ہے کہ کوئی اس سرنگ کے راستے ہمارے مندر میں داخل ہونے پر شور مچا دے گا مگر پھر بھی احتیاط بہت ضروری ہے۔" تیمور نے جواب دیا۔

"اس بات کو ذہن سے نکال دو کہ میں تمہیں تنہا اندر جانے دوں گا۔ ہم دونوں ایک، دوسرے کے لیے مر مٹنے کا عزم لے کر دوبارہ جزیرے پر آئے تھے۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ ایک بندہ اندر جائے اور دوسرا باہر انتظار کی سولی پر جھولتا رہے.... تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ مندر میں داخل ہونے کے بعد ہمیں پہلا کام کیا کرنا ہوگا۔"

فاخر نے یہ بات اس قدر جذباتی انداز میں کہی تھی کہ تیمور برنی اس کی خواہش کو رد نہ کر سکا اور چند لمحے توقف کے بعد اس کی جانب دیکھتے ہوئے اُمید بھرے لہجے میں بولا۔

"اندر پہنچ کر سب سے پہلے ہم رباب کے بارے معلوم کریں گے۔ اگر وہ زندہ ہے تو اس کو آزاد کروا کر واپس لانا ہے۔ لیکن اگر اس بدذات شوکال نے اُسے قتل کر دیا ہے تو ہمیں ہر صورت اُس شیطان کو واصل جہنم کرنا ہو گا۔" تیمور برنی نے بتایا۔

وہ دیر تک اس مہم کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے رہے اور پھر سرنگ کے راستے مندر میں داخل ہو گئے۔

جب وہ سرنگ سے باہر نکلے تو ہر طرف وحشت کا عالم تھا۔ اتنی جان لیوا خاموشی تھی کہ دونوں کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے تھے۔

جس جگہ وہ سرنگ سے باہر نکلے تھے وہ کھلا صحن تھا۔ جس کے کناروں پر تناور درخت کھڑے تھے۔ جبکہ صحن میں لمبی لمبی گھاس اور خاردار جھاڑیاں تھیں۔ درخت اتنے گھنے تھے کہ ان کی شاخیں زمین کو چھو رہی تھیں۔

تیمور برنی یہ دیکھ کر پرسکون تھا کہ مندر کا یہ حصہ سنسان ہے۔ مندر کا صحن اتنا وسیع تھا کہ اس میں ہزاروں لوگ جمع ہو سکتے تھے۔

مندر کی مرکزی عمارت وہاں سے قریباً سو گز دور تھی۔ تیمور برنی نے بیگ سے خنجر اور پنسل ٹارچ نکال لی۔ فاخر کے ہاتھ میں نیزہ تھا۔ وہ دبے پاؤں عمارت کی جانب بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

مندر کی مرکزی عمارت سے ملحق بہت سے کمرے بنے ہوئے تھے۔ جن کے آگے طویل برآمدہ تھا۔ ان کمروں میں سے ایک سے ہلکی روشنی چھن چھن کر کھڑکی سے باہر آ رہی تھی۔ یعنی وہاں کوئی موجود تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں مشورہ کیا اور اپنا رُخ اسی کمرے کی جانب موڑ لیا۔ وہ محتاط انداز میں برآمدے میں داخل ہوئے اور پھر کھڑکی کے قریب دیوار سے جا لگے۔

کچھ دیر ساکت کھڑے رہنے کے بعد تیمور برنی نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے اندر جھانکا تو کمرے میں ایک مشعل روشن تھی۔

مندر کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ شوکال کے سوا کوئی وہاں موجود نہیں اور غیبی طاقتیں اس کی غلام ہیں۔

لیکن یہاں تو کمرے میں فرش پر دو ہٹے کٹے آدمی بے خبر سو رہے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی جزیرے سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ انھوں نے پتلون اور شرٹس پہن رکھی تھیں اور بیرونی دنیا کے باشندے دکھائی دے رہے تھے۔

قریب ہی فرش پر ایک بیگ اور بریف کیس پڑا تھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

وہ فرش پر بچھے نرم و گداز بستر پر گہری نیند سو رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ دور دراز علاقے سے سفر کر کے یہاں پہنچے ہوں۔

تیمور برنی اور فاخر کے لیے یہ بات باعث تجسس تھی کہ وہ کون لوگ ہیں اور یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔ مندر میں ان کی موجودگی کا کیا مقصد ہے۔ انھیں بہت حد تک یقین تھا کہ ان دونوں افراد کا شوکال سے خاص تعلق ہوگا۔ ان حالات میں یہ بھی یقینی تھا کہ اگر ان کا شوکال سے تصادم ہوگیا تو یہ دونوں اس کی مدد کو پہنچ جائیں گے۔ لہٰذا ان کا بندوبست ضروری تھا۔

بندوبست کے ضمن میں یہی خیال آیا کہ انھیں ٹھکانے لگا دیا جائے۔ مگر دو آدمیوں کو بلا مقصد جان سے مار دینا انھیں انتہائی گھناؤنا فعل محسوس ہوا۔ ان کا تنازعہ شوکال سے تھا اور وہ اُسی سے انتقام لینے آئے تھے۔

وقت کم تھا اور انھیں اس مسئلے کا حل تلاش کرنا تھا۔

چناں چہ انھوں نے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئے۔ وہ بے پاؤں چلتے ہوئے ان کے سر پر پہنچ چکے تھے۔

تیمور برنی نے خنجر کا دستہ پوری قوت سے ایک شخص کی کھوپڑی پر جڑ دیا۔ آواز سن کر دوسرا شخص بیدار ہوگیا اور تیزی سے بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ صورت حال کو سمجھ پاتا فاخر نے پھرتی سے اس کی کنپٹی پر گھونسا مارا اور وہ چکرا کر گر پڑا۔

اگرچہ وہ دونوں بے ہوش ہوگئے تھے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کب تک ہوش میں آجائیں گے۔ تیمور برنی کو اس بات کا علم بھی نہیں تھا کہ ان کا مشن کتنا طویل ہوسکتا ہے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ اگر شوکال سے نمٹنے میں زیادہ وقت لگ گیا اور اس دوران یہ ہوش میں آگئے تو مشکل پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس لیے دونوں کے ہاتھ پاؤں رسی سے باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تاکہ ہوش آنے کی صورت میں بھی وہ دونوں حرکت کرنے یا چیخنے چلانے سے باز رہیں۔

اس کام سے فارغ ہو کر انھوں نے ان دونوں کی تلاشی لی تو سامان سے ایک ریوالور اور خنجر برآمد ہوگیا۔ ریوالور اور خنجر انھوں نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔

اب وہ دونوں باہر نکل آئے اور تیزی سے برآمدے میں آگے بڑھنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک نیم تاریک راہداری میں داخل ہوگئے جس کے دونوں جانب کمرے تھے ان کمروں کے دروازے بند تھے۔ وہ عمارت کی بھول بھلیوں میں آگے بڑھتے چلے جارہے تھے کہ ایک ادھ کھلے دروازے سے آتی روشنی دیکھ کر محتاط ہوگئے۔

فاخر نے آگے بڑھ کر کمرے میں جھانکا تو وہاں کا منظر دیکھ ششپٹا سا گیا۔ کچھ ایسی ہی حالت تیمور برنی کی تھی۔ سامنے فرش پر اس شوکال کی لاش پڑی تھی جو کچھ دن قبل جشن کی رات رباب کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

آج وہی شوکال ایک لاش کی صورت میں فرش پر بے یارومددگار پڑا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی آخری رسومات بھی ادا نہیں کی گئی تھیں۔ اس کا منہ غار کی مانند کھلا ہوا تھا اور منجمد آنکھوں میں وحشت اور ویران تھی۔ لاش دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اُسے گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔

”اگر شوکال مر چکا ہے تو رباب کہاں ہے ....اور پھر شوکال کو کس نے اور کیوں قتل کیا.... یعنی اس کے علاوہ یہاں اور لوگ بھی موجود ہوسکتے ہیں۔“

فاخر نے کئی سوالات کر ڈالے جن کا جواب ابھی کسی کے پاس نہیں تھا۔

شوکال کا عبرتناک انجام دیکھنے کے بعد وہ دونوں واپس جانے والے تھے کہ عقب میں دروازے کے پیچھے دوسری لاش کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ یعنی اس کمرے میں ایک نہیں دو لاشیں تھیں۔ دوسری لاش کسی بوڑھے کی تھی۔ جس نے شوکال جیسا ہی لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کی لاش زیادہ بھیانک اور روح کشید تھی۔ اس کا سر تن سے جدا کردیا گیا تھا جو اُس کی ٹانگوں کے پاس پڑا تھا۔ کٹی ہوئی گردن سے بہنے والا خون اِدھر اُدھر پھیل کر سیاہ ہو چکا تھا۔

مندر کا سناٹا، رات کی تنہائی اور دو بھیانک لاشوں کے درمیان تیمور برنی اور فاخر کی عجیب سی کیفیت تھی۔ انھیں اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہورہی تھی۔

”میرا خیال ہے انھیں ان دونوں مسلح افراد نے ہی قتل کیا ہوگا جن سے ہم نبٹ کر آرہے ہیں۔“ فاخر نے کہا۔

”ممکن ہے ایسا ہی ہو۔“ تیمور برنی نے سر کو جنبش دی۔ ”اب ہمیں رباب کا سراغ لگانا ہوگا۔“ مندر میں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

داخل ہونے کے بعد انھیں قدم قدم پر نت نئے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔

"ابھی خطرہ ٹلا نہیں۔ ممکن ہے رباب اس دوسرے شخص کی قید میں ہو جو اب یہاں شوکال کی جگہ قابض ہے؟"

فاخر نے کہا تو تیمور برنی بھی چونک گیا۔

"تمہاری بات بہت اہم ہے۔ لیکن وہ شخص کہاں ملے گا اتنے بڑے مندر میں اسے تلاش کرنا آسان نہ ہو گا۔" تیمور برنی نے تشویش کا اظہار کیا۔

"اُسے مندر کے مرکزی حصے میں ہونا چاہیے۔ یوں لگتا ہے جیسے عمارت کے اس ویران حصے کو غیر ضروری کاموں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمیں یہاں وقت ضائع کرنے کے بجائے تلاش کا دائرہ مندر کے مرکزی حصے تک پھیلانا ہوگا۔" فاخر نے مشورہ دیا۔

وہ کمرے سے نکل کر محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگے۔ ساری عمارت ویران تھی۔ انھیں کہیں کسی جیتے جاگتے انسان کی آہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی۔

مختلف راہداریوں سے گزر کر وہ ایک ایسے کمرے کے پاس پہنچ گئے جس کی کھڑکیوں سے تیز روشنی باہر آ رہی تھی۔ چند قدم کے فاصلے پر دروازہ بھی کھلا تھا۔

تیمور برنی دیوار کے ساتھ ساتھ کھڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُسے یہ خطرہ بھی تھا کہ اندر موجود شخص کی نظر کھڑکی کی جانب نہ ہو۔ مگر اسے ہر صورت خطرہ مول لینا تھا۔

تیمور نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ اگرچہ کمرہ مکمل طور پر نظر نہیں آ رہا تھا مگر تیمور کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ مندر کی مرکزی عبادت گاہ ہے۔

کمرے کی چھت پر روشنی منعکس کرنے والے رنگ برنگے شیشے جڑے ہوئے تھے۔ جن کے درمیان ایک بڑا سا گھنٹہ لٹک رہا تھا۔ ایک جانب تخت بچھا ہوا تھا جس پر سرخ مخمل بچھی ہوئی تھی۔ اس تخت پر ایک انسانی جسم لاش کی مانند ساکت پڑا تھا۔ اُس پر کفن کی مانند سفید چادر اوڑھی ہوئی تھی۔

کمرے کا منظر کچھ ایسا طلسماتی تھا کہ تیمور برنی مبہوت ہو کر دیکھنے لگا۔ اُسے محو دیکھ کر فاخر بھی آگے بڑھ کر اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا تھا۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

وہ جس کمرے میں جھانک رہے تھے ایک عبادت گاہ ہی نہیں قربان گاہ بھی تھی۔ اس کی ایک دیوار کے ساتھ بے شمار چھوٹی بڑی مورتیاں برابر رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان دیوتا کا ایک بڑا مجسمہ بھی تھا۔ وہ تخت جس پر سفید چادر سے ڈھکی ہوئی لاش پڑی تھی اسی بت کے قدموں کے قریب موجود تھا۔

"یہاں کا ماحول تو بہت پراسرار ہے۔ ہر چیز آسیب زدہ دکھائی دے رہی ہے۔ فاخر نے سرگوشی کی تو تیمور برنی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں! میرا خیال ہے ہمیں اندر جا کر یہ راز جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ یہ لاش کس کی ہے؟" تیمور برنی نے تخت کی طرف اشارہ کیا۔

"ہمارا اندر جانا خطرناک ہو سکتا ہے۔" فاخر نے اُسے احساس دلایا۔

"ہمارا یہاں رکنا بھی تو کسی طور خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

یہ کہتے ہی تیمور برنی آگے بڑھا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ اُسے جاتا دیکھ کر فاخر نے بھی کندھے اُچکا کر اُس کی پیروی کی۔

اس بڑے ہال کمرے میں لاش کے علاوہ کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے تخت کے قریب جا پہنچے جس پر وہ لاش سفید چادر سے ڈھکی ایک دیو ہیکل بت کے قدموں میں پڑی تھی۔

لاش کے سرہانے پہنچ کر تیمور برنی نے ایک نظر فاخر کی جانب دیکھا اور پھر ہاتھ بڑھا کر لاش کے چہرے پر سے کپڑا اٹھا دیا۔

لیکن لاش کا چہرہ دیکھتے ہی ان کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔

ان کے سامنے تخت پر کوئی اور نہیں بلکہ رباب بے حس و حرکت پڑی تھی.... اس کا چہرہ برف کی مانند سفید تھا اور گردن دائیں جانب ڈھلکی ہوئی تھی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

جیت کی نشانی

ببرک کارمل جمالی

غیرت کسی خاص انسان کی میراث نہیں مگر ایک قوم ایسی ہے جس کا طرہ امتیاز عزت و غیرت کے سوا کچھ نہیں۔ وہ عزت و ناموس کے لیے اپنی جان دے اور لے سکتے ہیں تو وہیں وہ اپنی عزت پر ہاتھ ڈالنے والوں کو اس کے انجام سے دوچار بھی کرسکتے ہیں۔
یہ کہانی بھی ایک ایسے تاریخی کردار کی ہے جس نے اپنی طاقت پر اپنے ارد گرد رہنے والوں کی حفاظت کی تھی

Azeem
tanipoint.com

ایسے انسان کا احوال جس نے اپنی قوم کی شان میں اضافہ کیا تھا

شام ہونے کو تھی سورج دائیں طرف پہاڑی میں ڈوب رہا تھا۔ بکریوں کے بچے دودھ پینے کے بعد اپنے ماؤں کے گرد کھیل کود کر رہی تھیں جبکہ شیر خان دیسی قالین پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ سورج کی سرخ مائل کرنیں پہاڑی کی آخری چوٹیوں کو رخصت کرنے کو تھیں۔
تھوڑا سا اندھیرا چھا گیا تو اچانک بکریوں میں ہلچل سی ہوئی بکریاں یہاں وہاں بھاگنے لگیں۔ یا اللہ رحم آج دوبارہ بھوت خان ایک بکرے کو لیکر جائیں گے اور اپنے لئے سجی بنائیں گے۔ شیر خان سر پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہے تھے۔
شیر خان ننگے پاؤں بھوت کی جانب دوڑنے لگا۔ چند قدم جانے کے بعد واپس مڑا اور وہاں سے آواز دی جیجو میرا تلوار نکال کے دو۔ بھوت خان سفید بکرے کو گھیر کر پہاڑی پر بجلی کی مانند دوڑے جا رہا تھا اس کے گھوڑے کی رفتار بجلی کی طرح تیز تھی شیر خان او شیر خان بھیڑیوں کا پیچھا کرنا چھوڑ دو بکریوں کو سنبھالو شیر خان کی بیوی چیخ کر کہہ رہی

تھی۔

تاریکی چاروں طرف پھیل گئی ہے۔ بھوت خان ان پر دوبارہ حملہ آور نہ ہو۔ شیر خان بیٹے کے ہمراہ دوسری پہاڑی کی طرف دوڑ پڑا، ایک گھاٹی پار کرنے کے بعد دیکھا تو ایک بکری کا کچھ خون پڑا ملا تھا۔ بھوت خان اپنا شکار کر کے چلا گیا تھا۔

''چلو بیٹا واپس چلتے ہیں۔'' کچھ دیر یہاں وہاں رکنے کے بعد شیر خان نے کہا۔

''اب ہمیں پہاڑوں سے نیچے کی جانب نقل مکانی کرنا ہوگا۔ یہاں رہنا ٹھیک نہیں، یہ بھوت خان نے ایک ہفتے میں دوسرا حملہ ہمارے ریوڑ پر حملہ کیا ہے، پچھلی بار وہ کالا دنبہ لے جانے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے، مگر اب کی بار وہ سفید بکرا لے کر گئے ہیں۔'' شیر خان کے بیٹے نے اپنے باپ سے کہا۔

باپ بیٹے کھیر تھر کی پہاڑی سے اترے اور دوبارہ اپنے گھر کی جانب رواں دواں ہوئے۔

❖❖❖❖

بھوت خان کی تیز رفتاری کا اندازہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ اس کے بڑے لمبے بال تھے وہ عظیم شہ سوار تھا اس کی شہ سواری اور گھوڑے کی تیز رفتاری پورے علاقے میں بہت مشہور تھی۔ وہ آتا بھی بھوت کی طرح تھا اور اپنا شکار کر کے سیکنڈوں میں غائب ہو جاتا تھا وہ کھانے پینے کا بہت شوقین تھا۔

بلوچستان کے لوگ کھانوں کے بہت شوقین ہیں۔ ان کھانوں میں ایک ایسی روٹی پکائی جاتی ہے جو پاکستان میں کہیں بھی نہیں ملتی، جس کا نام ''کاک روٹی'' ہے۔ کاک روٹی تیز آگ کی حدت پر براہِ راست پکائی جاتی ہے۔ کاک روٹی گرم گول پتھروں پر آٹا لپیٹ کر انگاروں پر پکائی جاتی ہیں۔ بھوت خان کی بیوی کاک روٹی پکانے میں مہارت رکھتی تھی۔ وہ پہلے ایک سائز کے گول پتھروں کو انگاروں پر خوب گرم کرتی تھی۔ پھر ان پر آٹا لپیٹ کر ہلکی انگاروں پر رکھ دیتی تھی، اور ہلکی آنچ سے یہ گولہ اندر تک اچھی طرح پک جاتا تھا۔ کاک روٹی کے پیڑے کے اندر ایک پتھر ہوتا تھا جسے بعد میں نکال کر کھایا جاتا تھا اور جب یہ روٹی آگ کے قریب رکھی جاتی تھی تو اس کے اندر موجود پتھر بھی گرم ہو جاتی تھی، جس کی وجہ سے یہ روٹی اندر سے بھی پک کر تیار ہو جاتی تھی۔

اپنے ذائقے میں کاک روٹی بے حد لذیذ ہوتی ہے۔ یہ روٹی کئی کئی روز تک بھوت خان سفر میں بھی کھاتا تھا شاید یہ روٹی جنگوں کے دوران بہت کھائی جاتی رہی ہے اس روٹی کا ذائقہ کبھی ختم نہیں ہوتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ بلوچ قوم نے جتنے درد جنگوں میں دیکھے وہ کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ کاک روٹی کا رواج روایتی طور پر بلوچستان میں ہوتا ہے۔ بلوچستان میں اکثر سجی کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ کاک روٹی سجی کے ساتھ کھاتا تھا اور سفر پر بھی ساتھ لے جاتا تھا۔ وہ پینے کے پانی کیلئے خود (کھلی) مشکیزہ بنانا تھا اور بکری کی کھال خود اتارتا تھا اور خود چھوٹی بکری اور بکرا کو ذبح کرنے کے بعد اس کی کھال آرام سے اتارتا تھا پھر اس کو دس ہفتوں تک کھال کو خشک کرتا تھا۔ اور پھر گرم پانی میں ابالتا تھا اور پھر ریشم کے دھاگے سے سی دیتا تھا۔ پھر اپنے ہاتھ کے بنے مشکیزے کا پانی سفر میں پیتا تھا۔

❖❖❖❖

شیر خان بلوچستان کے غیور چہرہ تھا وہ مختلف کھیلوں میں مہارت رکھتا تھا۔ جن میں کوڈی کوڈی یا کبڈی کبڈی بہت مشہور تھا۔ شیر خان اکھاڑے میں مخالف کھلاڑیوں کو زور کا جھٹکا لگاتا تھا تو ان کی کمر تک توڑ دیتے تھے۔ وہ سندھ اور بلوچستان میں کبڈی کے میدان میں کسی بھی پہلوان کو دھول چٹانے میں مہارت رکھتا تھا۔ بلوچستان اور سندھ کے سب حکمران کبڈی میں شیر خان کا مقابلہ دیکھنے آتے تھے تو مقابلہ دیکھ کر دانت چبانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ شیر خان انتہائی سخی آدمی تھا۔ وہ اپنے کھیتوں میں ہمیشہ گندم کی فصل خود کرتا تھا اور جب فصل تیار ہو جاتا تو وہ سب علاقے کے غریبوں میں تقسیم کرتا تھا۔ اس کے تقسیم کا طریقہ بہت الگ تھا وہ گندم کے اناج ٹیلے کے اوپر بیٹھ جاتا تھا اور پورے علاقے کو لوگوں کو کہتا تھا کہ آؤ اپنا نصیب لے جاؤ۔ سب غریب لوگ فجر کی اذان سے مغرب تک گندم اٹھا اٹھا کے تھک جاتے مگر شیر خان کو دعائیں دینا نہیں بھولتے۔ اگر شیر خان کسی کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور تھا وہ تھا بھوت خان۔ اس کے سامنے سب

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

تدبیریں ناکام تھی۔

شیر خان رومانوی داستان سننے کا بہت شوقین تھا اس کے گھر میں ایک لالٹین مٹی کے تیل سے جلتی تھی اس کے بیچ میں ایک ایسا دھاگہ ہوتا ہے جو مٹی کے تیل کو اوپر کھینچتا تھا جسے لوگ دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے پرانے زمانے لالٹین ہی روشنی کا ذریعہ ہوتا تھا۔ اسی لالٹین کی روشنی پر شیر خان مختلف رومانوی کہانیاں روتوں کو سنتے تھے۔ رات سے صبح تک ایک روپے تک مٹی کا تیل بمشکل جلتا تھا۔ حتیٰ کہ بلوچ قبائل کے جنگ کے دوران لالٹین تک پہنچنا لازمی تھا۔ جب کسی علاقے کے سردار کے محل پر اگر کوئی قبائل حملہ آور ہوتا تھا تو جب تک اس کا ہاتھ اسی روشن لالٹین تک نہیں پہنچ پاتا اس وقت تک فتح کو تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، اور یہی اس لالٹین کی مقبولت کا اصل وجہ تھی یعنی لالٹین ایک جیت کا نشان تصور کیا جاتی تھی۔ شیر خان کے گھر میں لالٹین تو جلتا تھا مگر بجھانے ہمیشہ بھوت خان آجاتا تھا۔ اور اپنا شکار کر کے واپس چلا جاتا تھا۔

شیر خان اس روز بھوت کے ظلم وستم سے تنگ آکر اس وقت کے بلوچ سردار شہداد خان ٹالپر کے پاس فریاد لے کر چلا گیا۔

ٹالپر سردار شہداد خان نے شیر خان کو ایک چاندی کے کٹورے میں پانی دیا اور اس میں ایک تنکا ڈالا تو شیر خان حیران ہوا یہ تنکا کیوں ڈالا گیا ہے۔ وہ پانی احتیاط سے پی رہا تھا تاکہ تنکے کو نگل نہ سکے۔ ٹالپر سردار شہداد خان نے شیر خان کو بتایا کہ تھکا ہوا خالی پیٹ جلدی پانی سے نقصان ہوتا ہے۔ شیر خان، ٹالپر سردار شہداد خان کی اس دانائی سے بہت متاثر ہوا اور فیصلہ کیا کہ وہ بھوت خان کے قتل کرنے میں ضرور مدد کروائے گا۔

شہداد خان ٹالپر سردار نے چار لوگوں کا انتخاب کر کے شیر خان کو دیے جس میں ایک شخص کے لمبے لمبے بال تھے، جبکہ ایک شخص قد کا لمبا تھا، اور ایک شخص قد کا چھوٹا تھا جبکہ چوتھا شخص انتہائی چالاک تھا جو پیروں کے نشانات دیکھ کر منزل تک شکار تک پہنچا دیتا تھا۔ شیر خان کے سامنے ان چاروں کی خوب تعریفیں شہداد خان نے باندھ دی تھیں، اور کہا کہ جو شخص بھوت خان کا سر قلم کر لائے گا اس کو انعامات سے نوازا جائے گا جو آج تک کسی کو نہیں دیے گئے ہیں۔

شیر خان خود بھی چالاک ترین لوگوں میں سے ایک تھا مگر بھوت خان تک نہیں پہنچ پا رہا تھا۔

شیر خان نے شہداد خان کو الوداع کہا اور واپسی کا راستہ اپنایا دو دن کی مسافت کے بعد شیر خان گھر پہنچا رات کو ایک بڑے سفید بکرے کی سجی بنائی گئی اور لالٹین کی روشنی میں مہمانوں کو رومانوی کہانی سنائی گئی تھی۔ مسلسل دو دن تک مہمانوں کو آرام دیا گیا۔ تھکن اتارنے کے بعد یہ لوگ بھوت خان کی تلاش میں کھیر تھر کے پہاڑوں کی جانب نکل پڑے۔

شیر خان اور اس کے دوست دن رات بھوت خان کو ڈھونڈنے لگے، مگر ان کو بھوت خان کا نام ونشان بھی نہ ملا۔ اسی طرح پورے ایک ہفتہ کھیر تھر پہاڑوں پر بھوت خان کو تلاش کرتے رہے مگر بھوت خان تو بھوت کی طرح غائب ہو گیا تھا۔

وہ جمعرات کی رات تھی۔ جب یہ پانچوں لوگ بھوت خان کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ سویا ہوا تھا۔ شیر خان نے جب ان کو دیکھا تو تمام لوگوں کو واپس چلنے کا حکم دیا۔ سب لوگ بھوت خان کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اتنا لمبا قد اتنا لمبا خونخوار اور نیند میں خوفناک خراٹے لے رہے تھا۔ جس سے ماحول مزید خوف ناک ہو رہا تھا۔ شہداد ٹالپر کے چاروں لوگ بھوت خان کی طرف دیکھ کر کانپنے لگ گئے، اور شیر خان کو کہا۔

''موقع اچھا ہے۔ بھوت کو قتل کردو۔''

''آپ میں کسی میں ہمت ہیں تو ہاتھ لگا کے دیکھائے بھوت خان کو، ویسے بھی بلوچوں میں ایک رواج ہے کہ ہم عورتوں کے ساتھ سوئے ہوئے مرد کو کبھی نہیں مارتے ہیں۔'' شیر خان کہنے لگا۔

سب لوگ واپس ہوئے۔ کھیر تھر کے پہاڑوں کو الوداع کیا۔

''بلوچ قوم میں نیند ہمارے لئے مقدس ہوتی ہے، ہم نیند کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں کسی کی نیند اس کی عزت ہوتی ہے اس لیے ہم اپنے چوٹ (جوتوں) کے ساتھ واپس ہوئے ہیں۔ دوستوں، نیند وہ چیز ہے جس کے تقدس وحفاظت کے لیے ہم بلوچ اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں اور اسی طرح دوسروں کے نیند کو بھی عزت و

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

تکریم دینا ہم بلوچوں کا شیوہ اور فرض ہوتا ہے یہ ہماری بلوچ قوم کی روایت اور غیرت کے خلاف ہے کہ ہم کسی کو نیند میں قتل کردیں۔'' شیر خان نے چاروں دوستوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

شیر خان تکیے سے ٹھیک لگائے بیٹھا ہوا تھا جبکہ مہمان تکیوں کے اوپر بیٹھ گئے۔

''چھوٹا مشکیزہ اور کٹورہ لاؤ اور مہمانوں کو پانی پلاؤ۔'' شیر خان نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ بیٹے نے سب کو پانی پلایا۔

رات کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ سب لوگوں نے اپنی اپنی تلواروں کو تیز کیا اور پہاڑی کا رخ کیا۔ بھوت خان کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی وہ ہر روز اپنا ٹھکانہ بدلتا رہتا تھا۔ کھیر تھر کے لمبے لمبے پہاڑ جو بہت دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان پہاڑوں پر بھوت خان کی حکمرانی چلتی تھی۔ بھوت خان کو پہاڑوں پر ڈھونڈنا انتہائی مشکل کاموں میں ایک کام تھا۔ مسلسل ایک ہفتے تک بھوت خان کو ڈھونڈتے رہے وہ جمعرات کا دن تھا جب ایک بکرے کے خون کے نشانات شیر خان کو مل گئے۔

''بھوت خان سے آج رات کسی بھی وقت ہمارا مقابلہ ہوگا۔'' شیر خان نے سب کو بلا کر کہا

مسلسل پوری رات شیر خان کو ڈھونڈنے کے بعد ایک پہاڑ کی ٹکری پر شیر خان نے بھوت خان کو دیکھا جو تنہا بیٹھا ہوا تھا اور تلوار تیز کر رہا تھا۔

''بھوت خان آج آپ سے شیر خان کا مقابلہ ہے۔'' شیر خان نے بلند آواز دی۔

''شیر ہمیشہ اپنا شکار اکیلا کرتا ہے۔'' بھوت خان نے ہنستے ہوئے کہا۔

شیر خان کی اونچی اور تیز آواز سن کر چاروں نے اپنی اپنی تلواروں کو نیچے پھینک دی۔ بھوت خان سمجھ گیا یہ لوگ میرا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اپنے ہتھیار پھینک دیئے ہیں۔

''بھوت خان ابھی میں زندہ ہوں تمہارا مقابلہ تو مجھ سے ہے۔'' شیر خان نے بلند آواز میں کہا۔

دونوں نے طرف تلواریں نکال لیں، شیر خان اور بھوت خان کے تلواریں تیز تیز چل رہی تھیں۔ کبھی شیر خان تلوار کی زد سے بچ جاتا کبھی بھوت خان۔ مسلسل تلواریں ایک دوسرے پر برس رہی تھیں۔ رات تاریکی ڈوب رہی تھی اور سورج کی کرنیں نکل رہی تھیں۔ رات کا اندھیرا ختم ہو چکا تھا۔ چاروں تماشائی دور سے مقابلہ دیکھ رہے تھے۔

اسی طرح صبح سے دوپہر ہونے والی تھی، دونوں کا پیاس کے مارے برا حال تھا، سامنے پانی کا مشکیزہ رکھا ہوا تھا مگر پانی کوئی نہیں پی رہا تھا۔

''پانی وہی پیئے گا جو زندہ ہوگا۔'' اسی وقت بھوت خان نے باآواز بلند کہا۔

''یہ پانی کا مشکیزہ بھی میرا ہے اور پانی بھی میں پیوں گا۔'' اسی دوران شیر خان کی تلوار ایسے تیزی سے چلی کہ بھوت خان کے ایک کان کا ایک ٹکڑا کٹ گیا، شیر خان ہنسا ابھی بھوت خان کا صرف کان کٹا تھا مگر گردن باقی تھی۔

بھوت خان کو درد ہو رہا تھا، تلوار بھی ٹھیک سے چلا نہیں پا رہا تھا، پھر بھی بھوت خان کے حوصلے پست نہیں ہو رہے تھے۔ اچانک تیز تلوار بھوت خان کے گردن سے ایسے گزری کہ اس کا سر دھڑ سے الگ ہو گیا۔ شیر خان نے بھوت خان کا کٹا ہوا کان جلدی سے اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔

''آ جاؤ دوستوں اور اب اٹھاؤ گردن بھوت خان کی اور پیش کرو سردار شہداد خان ٹالپر کو، اور ان سے کہنا شیر خان اپنا شکار کبھی نہیں چھوڑتا ہے۔'' شیر خان نے بلند آواز میں کہا۔

اس وقت یہ چاروں آپس میں کچھ کھسر پھسر کر رہے تھے اور شیر خان سمجھ گیا کہ یہ لوگ اب مجھے مارنا چاہتے ہیں۔ شیر خان انتہائی چالاک تھا۔

''یہ گردن اٹھاؤں اور سردار کو پیش کرو اور اپنا انعام جا کرلو، میں یہاں کا باسی ہو مجھے انعام کی کوئی ضرورت نہیں ہیں۔ میرا کام تھا بھوت خان سے علاقے کے لوگوں کو نجات دلانا جو میں انہیں دلا چکا ہوں۔'' اس نے ان چاروں کی طرف دیکھ کر کہا۔

چاروں نے شیر خان کی گردن اٹھائی اور سردار شہداد خان ٹالپر کو جا کر پیش کی۔

''ہم تینوں نے بھوت خان کو مار دیا ہے۔''

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"شیر خان کہاں گیا؟" سردار نے کہا۔

"وہ تو بھوت خان کو دیکھ کر بھاگ گیا تھا۔ ہم چاروں نے اس کو بہت مشکل سے مارا ہے بڑا دلیر شخص تھا، یہ رہی بھوت خان کی گردن۔"

"آپ کو انعام ضرور دوں گا مگر ایک ہفتے کے بعد۔" سردار نے کہا وہ گردن دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

سردار شہداد ٹالپر سمجھ گیا کہ اتنا بڑا دلیر شیر خان آخر کیوں بھاگا اگر کچھ تو راز ہوگا ایک ہفتے تک سب پتہ چل جائے گا۔

اس روز فجر کی اذان ہو رہی تھی سردار شہداد خان ٹالپر وضو کر کے نماز پڑھنے لگا۔ وہ پچھلی صف میں کھڑا تھا۔ نماز کے بعد جیسے سردار نے دوسری جانب سلام پھیرا تو نماز میں شیر خان کو بیٹھا ہوا پایا تھا۔

"ارے شیر خان تم...... کیسے ہو...... تم تو بھوت خان کو مارنے کے بجائے اسے دیکھ کر بھاگ گئے۔"

"یہ جو تمہارے ساتھ بیٹھے چار لوگ تھے سب فراڈی ہیں۔ میں نے جب بھوت خان کو مار کر سر تن سے الگ کیا، تو انہوں نے مجھے مارنے کا پلان بنایا تھا، اور مجھے مار کر یہ آپ سے انعام لینا چاہتے تھے، اس لیے میں نے لڑائی کے دوران بھوت خان کی جو کان کٹ گیا تھا وہ اپنے پاس رکھلیا تھا، تاکہ آپ کو دکھا سکوں یہ لوگ جنگجو کم فراڈیے زیادہ ہیں۔" شیر خان نے سرخ رومال کھولا اور کان کا ٹکڑا شہداد خان ٹالپر کو تھماتے ہوئے کہا۔ "ان سے پوچھو کہ بھوت خان کا سر تو لائیں ہیں مگر کان کہاں ہے۔"

"مجھے پتا تھا دال میں کچھ کالا ہے، اس لیے میں نے انہیں اس وقت انعام دینے کے بجائے ایک ہفتے بعد انعام دینے کا فیصلہ کیا تھا مجھے اندازہ تھا تم ایک ہفتے کے اندر میرے پاس آ جاؤ گے اور اپنا انعام لے جاؤ گے۔" سردار نے شیر خان کو دیکھ کر کہا۔

❖❖❖❖

شہداد خان ٹالپر سردار نے صبح سب کو دربار میں بلایا اور بلند آواز دے کر شیر خان کو مخاطب کیا اور کہا کہ وہ بھوت خان سے لڑائی کا احوال بیان کرے۔

شیر خان نے بولنا شروع کیا۔ سب سن رہے تھے۔ سب کی آنکھیں دو سے چار چار ہو رہی تھیں۔ جب شیر خان نے کان کا ٹکڑا سب کو دکھایا۔

"ہم انعام کے لالچ میں آ گئے تھے اور شیر خان کو مارنا چاہتے تھے، مگر شیر خان انتہائی چالاک نکلا، چاروں نے سر خم کیا اور کہا۔

شہداد خان ٹالپر کے یہ اسلحہ بند بہادر جوان جو دو گھنٹے قبل سب کو آنکھیں دیکھا رہے تھے، اور ماتھے پر بل لا کر اشاروں میں معزز لوگوں کو سردار سے دور کر رہے تھے۔ اب وہ خود دور کھڑے بے بسی کی مثال بنے ہوئے تھے۔

دنیا اور تاریخ کے اوراق کو جب پلٹنا شروع کریں گے تو ایسے بہت سے شخص ملیں گے جنہوں نے انا، شہرت، ذات، ذاتی رشتوں، ضد، ڈر و خوف آسائش و سہولیات اور دشمن کے مختلف حربوں کو نظر انداز کر کے صرف اور صرف اپنی مقصد کو حاصل کرنے کیلئے جھوٹ بولا ہے وہ ہمیشہ نقصانات میں گئے ہیں۔

❖❖❖❖❖

میر شہداد خان ٹالپر کا شمار سندھ کے عظیم جرنیلوں میں کیا جاتا ہے ٹالپر خاندان جن کا تعلق بلوچستان سے تھا، جو بعد میں سندھ میں آباد ہو گئے تھے۔ میر شہداد خان تالپور کئی سالوں تک بلوچ لشکر کا سربراہ تھا۔ وہ بلوچ علاقوں میں امن امان بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میر شہداد خان ٹالپر جو شیر خان کی جرات اور بہادری سے بہت متاثر تھے اس لیے اسے بلوچستان والی زمین جاگیر کے طور پر عنایت کر دی تھی۔ شیر خان نے تاریخ کے اوراق میں امن و امان کیلئے لازوال قربانیاں دی تھیں اور اپنی قوم کو ظلم و جبر غلامی اور سماج کے مختلف خوف و خطروں سے نکال دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ شیر خان کا مقبرہ نصیر آباد میں موجود ہے آج کل ان کا مقبرہ گرنے پر ہے اور جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اس عظیم سپہ سالار کو لوگ آج بھی عزت کی نگاہ سے یاد کرتے ہیں۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

چال

سجاول خان

کہتے ہیں ہر انسان کے اندر ضمیر ہوتا ہے وہ کبھی نہ کبھی ضرور جاگتا ہے اور جب ضمیر جاگتا ہے تو انسان کی ایسی کایا پلٹ ہوتی ہے کہ دنیا یقین کرنے کو تیار نہیں ہوتی۔ ایک ایسی ہی عبرت اثر کہانی کا احوال جس پڑھ کر احساس ہوگا کہ برائی کا انجام ہمیشہ برا ہی ہوتا۔

دولت کی زیادتی نے اسے جنگلی شیر بنادیا تھا

Waqar Azeem
pakistanipoint.com

ہر طرف خون ہی خون تھا۔ دو جوان کاریگر ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے ان کے ہاتھوں میں کلہاڑے تھے اور وہ اس سے ایک دوسرے پر وار کر رہے تھے۔ کلہاڑوں کے ٹکرانے سے چنگاریاں سی اڑ رہی تھیں۔ فرش ان دونوں کے خون سے لت پت تھا۔ دونوں کی کوشش تھی کہ وہ دوسرے حریف کو کاری سے کاری ضرب لگاسکیں۔ تھوڑی دیر پہلے وہ جس پتھر کے مجسمے پر اپنا پسینہ بہا رہے تھے وہ اب ان کے خون کے چھینٹوں سے بھر پڑا تھا۔ وہ اس وقت انسان نہیں بلکہ کسی جانور کی طرح لگ رہے تھے جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔

پادری اور ایک سنگ تراش حسینہ ابھی مندر کے وسط میں ہی پہنچے تھے کہ وہ یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ یوں جنگلیوں کی طرح لڑتے ان سنگ تراش کو دیکھ کر پریشان اور سخت حیرت میں مبتلا تھے تبھی پادری زور سے چلایا۔

”رک جاؤ...... رک جاؤ...... خدا کے لیے ایک رک جاؤ۔“ پادری نے التجا آمیز لہجہ میں کہا۔

حیرت انگیز طور وہ پادری کی بات مان گئے اور انہوں نے لڑائی روک دی تھی۔ ان کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔ خون و پسینہ سے ان کے جسم تر تھے۔

"بس اب بہت ہوا...... دوبارہ ایسی حرکت کرنے کی ہمت بھی مت کرنا...... کبھی بھی نہیں......" وہ چلائی۔ وہ انہیں غصہ سے دیکھ رہی تھی۔ اسے غصہ تو لازمی بات ہے آنا ہی تھا کیونکہ وہ لڑ رہے تھے اور یہ کوئی اچھا کام تو نہیں تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے غصہ پر قابو کیے ہوئے تھی۔

اس کے بعد وہ پادری چھوٹے چھوٹے قدم بھرتا ہوا ان دونوں لڑکوں کی جانب بڑھا۔ اس نے ہاتھ ہوا میں بلند کر رکھے اور وہ جیسے انہیں سمجھانے بجھانے کے مقصد سے جا رہا تھا۔ تبھی اچانک سے ان دو لڑاکوں میں سے ایک کے حلق سے ایک دردناک چیخ ابھری اور وہ تیورا کر فرش پر جا گرا۔

❖❖❖❖

جولیا کا باپ ایک کاریگر تھا۔ وہ یہاں پر برسوں سے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے باپ کی وفات کے بعد اسے ان مردوں کے معاشرے میں قبول کر لیا گیا کیونکہ اس کے باپ کی ایک ساکھ تھی۔ ان ڈھیر سارے مردوں میں عورتوں کی تعداد گنی چنی ہی تھی۔ اسے بھی اپنے باپ کی وجہ سے ہی یہاں رہنے کی اجازت تھی۔ وہ ایک ماہر سنگ تراش تھی اور اسے اپنے فن میں کمال حاصل تھا۔ وہ بڑے بڑے پتھروں کے ساتھ تو کام کر نہیں سکتی تھی کیونکہ انہیں سنبھالنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے پتھروں پر اپنی کلا کاری دکھاتی۔ دیواروں اور چھتوں پر وہ اپنے فن سے ایسے شاہکار تخلیق کرتی کہ دیکھنے والے دم بخود رہ جاتے۔ اسے ویسے تو یہاں پر کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر دو کاریگر تھے جن سے وہ نالاں تھی۔

ایک کا نام بلال تھا اور دوسرے کا نام ریاض تھا۔ وہ دونوں کسی ایشیائی ملک سے یہاں آئے تھے۔ وہ دونوں ٹاپ کے کاریگر تھے۔

بلال سب سے زیادہ اسے تنگ کرتا تھا۔ وہ خود کو دیومالائی حسن کا دیوتا سمجھتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ ہر عورت اس کے حسن کی اسیر ہے۔ اس نے کئی بار سرعام جولیا سے تعلقات کا اظہار کیا مگر جولیا نے اسے سختی سے منع کر دیا۔ مگر بلال بھی ڈھیٹ تھا وہ اس انکار کو بھی اپنی جیت سمجھتا تھا۔ وہ بڑے فخر سے اپنے دوستوں کو اپنے معاشقوں کے قصے سناتا۔ یہ سوسائٹی مادر پدر آزاد تھی۔ یہاں پر ناجائز تعلقات کو برا نہیں سمجھا جاتا تھا اور وہ بھی جولیا کے ساتھ کچھ ایسے ہی تعلقات کا خواہش مند تھا۔ مگر جولیا اس کے سخت خلاف تھی۔

ریاض اس کی نسبت ایک شرمیلا اور دھیمے مزاج کا شخص تھا۔ وہ بھی جولیا کو چاہتا تھا مگر وہ اسے بلال کی طرح سرعام بدنام نہیں کرتا پھرتا۔ اسے بلال کا یوں جولیا کے اردگرد گھومنا اور اسے تنگ کرنا بالکل بھی پسند نہیں تھا۔

ریاض، جولیا کے بارے میں سنجیدہ تھا۔ ان دونو جوانوں کے کردار اور چال چلن میں ہی نہیں ان کی شخصیتوں میں بھی تھا۔ بلال ایک لمبا چوڑا اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ وہ مردانہ وجاہت کا ایک شاہکار تھا جبکہ ریاض پستہ قد تھا اور اس کا جسم قدرے فربہ مائل تھا۔ اس میں خود اعتمادی کی بھی شدید کمی تھی۔ دوسرے لوگوں کے برعکس اسے زبان کے بھی مسائل تھے۔ وہ ابھی تک اتنی روانی سے ان کی زبان نہیں سیکھ پایا تھا۔

جولیا کا خیال تھا کہ شاید ریاض اس کا اصل نام نہیں تھا بلکہ اس کا نام بگاڑ کر رکھا گیا ہوگا۔ اسے وہ تیز اور چالاک لگتا تھا۔

ایک دن جب جولیا کسی کام سے جا رہی تھی تو اچانک سے بلال اس کے راستے میں آ گیا۔ جولیا نے اسے دیکھ کر راستہ بدل لیا۔

"جولیا! تم ایک ہیرا ہو اور میں تمہیں اپنے مجسمے کے شاہکار میں ضرور سجاؤں گا۔ تم تو میری ہو کر رہو گی۔" وہ پیچھے سے چلایا۔

"تم یہ خواب دیکھنا چھوڑ دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ہیرا تمہیں کاٹ کر نہ رکھ دے۔" جولیا رکی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور تیز لہجے میں اسے جواب دیا۔ اس کے بعد جولیا تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

❖❖❖❖

انسانوں کے اس جانور پن اور خاک وخون کے مناظر دیکھ کر پادری اور جولیا ابھی بھی سکتے میں تھے۔ کیسے ایک انسان جو کہ اشرف المخلوقات بھی ہے وہ اس حد تک گر سکتا ہے کہ ایک دوسرے کے خون کا ہی پیاسا ہو جائے۔

ریاض کے خون بھرے ہاتھوں نے ابھی وہ خون آلودہ کلہاڑا تھام رکھا تھا جس سے وہ تھوڑی دیر پہلے لڑ رہے تھے بلال اس کے پیروں میں خون میں لت پت پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

وہ دونوں ان کی جانب دوڑے۔ بلال میں ابھی بھی کچھ سانسیں باقی تھیں۔ جولیا اس کے قریب بیٹھ گئی اور اس کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ بلال نے آخری سانس لی اور وہیں دم توڑ دیا۔

"تم نے اسے قتل کر دیا ہے۔" پادری ریاض کی جانب مڑا اور اس کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"میں نے اسے نہیں مارا ہے۔ یہ تو خود ہی گر گیا تھا۔ میں نے اسے قتل نہیں کیا ہے۔" ریاض چلایا۔

"تمہارا کلہاڑا تو اسی کے خون سے سنا ہوا ہے۔" پادری نے خون میں لت کلہاڑے کی جانب اشارہ کیا۔

"نہیں، جب تک ہم لڑ رہے تھے۔ یہ بالکل ٹھیک تھا اور اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔ زخم تو ہم دونوں کو لگے تھے مگر اتنے کاری نہیں تھے۔ پھر اچانک ہی یہ گر پڑا۔" ریاض نے اپنی صفائی پیش کی۔

"اب یہ تو کمیونٹی میٹنگ میں ہی فیصلہ ہوگا کہ تم بے گناہ ہو یا گناہ گار۔ تب تک کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ اب وہی تمہاری قسمت کا فیصلہ ہوگا۔" پادری نے کہا۔

اور اسے لے کر ایک سمت کو بڑھ گیا۔

"جولیا...... جولیا۔ پلیز میری مدد کرو۔ میں بے قصور ہوں۔ میری مدد کرو۔" بلال چلایا جب پادری اسے لے جانے لگا۔

مگر جولیا اس کے لیے کیا کر سکتی تھی۔ وہ بس اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

❖❖❖❖

زیادہ تر عورتوں کو لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنے رہنا اچھا لگتا ہے وہ چاہتی ہیں کہ وہ ہر کسی کی نگاہ کا مرکز ہوں۔ مگر جولیا کو یہ سب بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ زیادہ تر الگ تھلگ رہنا پسند کرتی تھی۔ اس کا دل بھی کسی کے لیے دھڑکا تھا، پچھلے بہار کے ایک فیسٹیول میں اس کی ملاقات ایک نوجوان پادری سے ہوئی تھی وہ پہلی ہی ملاقات میں بس اسے دل دے بیٹھی تھی۔ مگر وہ وہاں اس کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزار پائی تھی کیونکہ اسے اس کے مندر میں دوبارہ بلوا لیا گیا تھا کسی کام کے سلسلے میں۔ کام تو کام تھا اسی لیے اسے جانا پڑا۔ مگر وہ ابھی بھی اس پادری کو یاد کرتی تھی۔

ان دونوں نوجوانوں کا اس کے لیے لڑنا اور جان تک گنوا دینا۔ اسے نہایت ہی گھٹیا کام لگا۔ یہ سب ایک جان کا ضیا
تھا۔ اس کا کوئی مقصد نہیں بنتا تھا اور یہ نہایت ہی خوفناک
تھا۔ جو خون اور موت کا خوفناک منظر جولیا نے دیکھا تھا ا
نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور کافی پریشان بھی تھی۔ اس۔
جو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ اسے کچھ صحیح نہیں لگا تھا کہیں کچھ نہ کچھ گڑبڑ تھی۔

ریاض ایک قاتل نہیں لگتا تھا۔ اب شاید یہ اس کی بد قسم
رہی ہوگی کہ اس کا کوئی وار اتنا کاری رہا ہوگا کہ اس نے بلا
کی جان لے لی اور اسے ایک قاتل بنا دیا۔ وہ دوبارہ ا
جائے وقوعہ کی جانب لوٹی اور لاش کا معائنہ شروع کیا۔ اس
نے اس کے زخموں کو چیک کیا۔ پہلے اس نے اس کے سر
دیکھا اس پر کافی خون لگا ہوا تھا۔ لیکن سر کے زخمی یا خرا
ہونے کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس پر ہلکے ہلکے زخم ضرور تھے مگر وہ اوپری اوپری تھے اور اتنے گہرے نہیں تھے جس سے موت واقع ہو سکے۔

"کیا یہ انہی زخموں سے مرا ہوگا۔" جولیا نے خود سے سوال کیا۔

اس کے بعد باقی جسم کا بھی معائنہ شروع کیا۔ اس کے
چہرے پر کوئی خاص زخم نہیں تھے۔ اس کی ناک بھی بالکل
صاف تھی مگر جب اس نے اس کے منہ کا معائنہ کیا تو اسے
کچھ عجیب سا لگا۔ اس کے منہ میں کچھ عجیب سا چپچپا سا مواد
لگا ہوا تھا جو کہ اس کے دانتوں اور جیب پر موجود تھا۔ اس کے
منہ کی بو بھی کچھ عجیب سی تھی۔ اس کچھ غلط لگا اور اس نے مزید تفتیش کرنے کا فیصلہ کیا۔

❖❖❖❖

انتظامیہ کی جانب سے اعلیٰ حکام کو اس واقعہ کی اطلا
دی جا چکی تھی اور اگلے دن کو میٹنگ بلانے کا فیصلہ کیا گیا
جس میں ریاض کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا۔

ابھی تک کے اسے ایک کوٹھڑی میں بند کیا گیا تھا۔ یہ
مندر سمندر کے کنارے واقع تھا۔ یہاں کئی چھوٹی غاریں
تھیں جنہیں تھوڑی سی مرمت کے بعد ایک جیل کا درجہ دے
دیا گیا تھا اور اس جیل میں کئی چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں شامل
تھیں جہاں گناہ گاروں کو قید کیا جاتا تھا۔ ریاض بھی اسی جیل
کے ایک کوٹھڑی میں بند تھا۔ جب جولیا اسے دیکھنے کے لیے
گئی تو اسے دیکھ کر ریاض ایک بار تو رو پڑا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"مہربانی کر کے میری مدد کرو۔" اس کی آواز میں کرب تھا۔

"میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی کہ میں تمہارے لیے کیا کرسکتی ہوں۔ جب تک تم مجھے پوری بات نہیں بتا دیتے۔ تم اپنے الفاظ میں مجھے پورا قصہ سناؤ۔" جولیا نے کہا۔

"ہم ایک دوسرے کو دیوانہ وار مار رہے تھے۔ ہم دونوں ہی خون میں نہائے ہوئے تھے پر اپنے قدموں پر کھڑے تھے میں اصل حقیقت بتاؤں تو ہم دونوں تھک چکے تھے اور بری طرح ہانپ رہے تھے۔ جب تم دونوں وہاں آئے ہم بری طرح تھکے ہوئے تھے اور ستانے کا موقع تلاش کر رہے تھے۔ پھر اچانک سے ہی بلال اپنا پیٹ پکڑ کر اوندھا ہوا اور پھر زمین پر گر پڑا۔" ریاض سمٹ کر بیٹھ گیا اور اپنی بات شروع کی۔

"کیا تمہارے علاوہ اس کے اور بھی کوئی دشمن تھے......؟" جولیا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔" ریاض نے کہا۔

"زیادہ بنو مت۔ مجھے پتا ہے تم دونوں لڑکیوں رہے تھے۔ تم دونوں مجھے لے کر جھگڑ رہے تھے۔ تم جانتے تھے کہ اس کے ہوتے ہوئے تمہارے کوئی چانس نہیں تھا۔ اس نے تمہیں چڑایا ہوگا اور تم دونوں لڑ پڑے ہوگے۔" جولیا نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ میں مانتا ہوں کہ میں اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر میں اسے قتل نہیں کرنا چاہتا تھا میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔" ریاض نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

"لڑائی کے دوران تمہارے چہرے کے جو تاثرات تھے وہ تو کچھ اور ہی کہانی سنا رہے تھے۔" جولیا نے کہا۔

ریاض کی آنکھوں میں آنسو ڈھلک گئے اور وہ رونے لگ گیا۔

"اب یہ رونا دھونا بند کرو اور مجھے میرے سوالوں کا جواب دو۔ کیا اس کے کوئی اور بھی دشمن تھے؟" جولیا نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔

"وہ ایک عاشق مزاج آدمی تھا اور وہ عورتوں میں خاصا مقبول تھا۔ اس کے کئی عورتوں سے معاشقے تھے جن میں شادی شدہ عورتیں بھی شامل تھیں۔" ریاض نے اپنے آنسو پونچھے اور اپنے آپ کو سنبھالا۔ وہ سمٹ کر بیٹھ گیا اور دوبارہ بات شروع کی۔

"اس کے بارے میں تو بہت سن چکی ہوں۔ کیا ان میں کوئی خاص بھی تھی؟" جولیا نے ایک اور سوال داغا۔

ریاض تھوڑا ہچکچایا۔

"اب بتاؤ بھی۔" جولیا نے زچ ہو کر کہا۔

"ہاں۔ اس کا کئی شادی شدہ عورتوں سے چکر چل رہا تھا۔ وہ اس کے بارے میں سنجیدہ بھی تھیں مگر یہ نہیں تھا۔ یہ تو ایک مغرور سا شخص تھا۔ ابھی حالیہ ہی اس کا جس کے ساتھ چکر چل رہا تھا اس کا نام الیانا تھا اور وہ ایک کسان کی بیوی تھی۔"

"آخری بار کب بلال اس کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔" جولیا نے پوچھا۔

"میرا پہلے خیال تھا کہ ان کے بیچ سب ختم ہو چکا ہے اور وہ ایک دوسرے سے نہیں ملتے ہیں۔ کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ اب اس کی توجہ الیانا سے ہٹ کر تم پر آ گئی تھی۔" ریاض اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ تھوڑا توقف کیا اور پھر گویا ہوا۔

"لیکن آج وہ آئی۔ اس کے ہاتھ میں کھانا تھا۔ جو کہ اس نے بلال کو پیش کیا۔ بلال نے اس سے کھانا لے لیا اور پھر توہین آمیز انداز میں اسے وہاں سے جانے کا کہا۔

الیانا نے اس بات کا بہت برا منایا اور وہ اسے برا بھلا کہتے ہوئے وہاں سے واپس چلی گئی۔"

"یہ سب کس وقت ہوا؟" جولیا نے جلدی سے پوچھا۔

"ٹھیک ہمارے لڑنے سے تھوڑی دیر پہلے۔" ریاض شرمندہ نظر آنے لگا۔

"وہ ایک نہایت ہی غلیظ اور گھٹیا انسان تھا۔ میں نے اس جب اس الیانا کی ساتھ اس برے برتاؤ کی وجہ پوچھی تو وہ مسکرانے لگا اور کہنے لگا کہ اب اس کا شوہر واپس آگیا ہے اور وہ میرے کسی کام کی نہیں رہی ہے۔ اس کی نظر اب تم تھی، اور وہ تمہارے بارے میں غلط باتیں کرنے لگا جس کی وجہ سے ہماری لڑائی ہوگئی۔" ریاض نے جولیا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں اپنا دفاع کر سکتی ہوں اور میرے کردار کی تمہیں صفائی دینے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا بہت شکریہ۔ کیا تم نے وہ کھانا کھایا تھا جو الیانا لائی تھی؟" جولیا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

”نہیں۔ وہ سارا کھانا خود ہی کھا گیا تھا۔ کھانے میں بھنا ہوا گوشت تھا۔“ ریاض نے جواب دیا۔

جولیا وہاں سے جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ اس نے اسے مشورہ دیا کہ وہ مقتول کے بارے میں بری بھلی باتوں سے گریز کرے کیونکہ یہ اس کے مخالفت میں بھی جا سکتی ہیں۔ اس نے ریاض سے وعدہ کیا کہ وہ اس کی مدد کی ہر ممکن کوشش کرے گی اور دیکھے گی وہ کیا کر سکتی ہے۔

ریاض نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ اس کی اس امداد کے وعدہ کا سن کر کافی ممنون نظر آیا۔

اس کے بعد وہ وہاں سے چلی گئی۔

❖❖❖❖

ریاض کے ساتھ ہونے والی ملاقات کے بعد جولیا نے الیانا سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے الیانا کے گھر کا پتہ معلوم کیا اور ملاقات کے لیے چل پڑی۔

الیانا کا گھر ایک فارم کے بالکل سامنے تھا۔ اس نے جا کر دروازے کی بیل بجائی۔ اندر سے ایک عورت برآمد ہوئی۔

”کیا آپ الیانا ہیں؟“ جولیا نے سوالیہ انداز میں کہا۔

”جی ہاں۔ میں ہی الیانا ہوں...... آپ کون؟“ الیانا نے پوچھا۔

”میں جولیا ہوں اور ایک سنگتراش ہوں۔ یہاں کے ایک مندر میں کام کرتی ہوں۔“ جولیا نے مسکراتے ہوئے کہا

فرمایئے کیا کام ہے آپ کو۔“ الیانا نے سر ہلاتے ہوئے کہا

”مجھے آپ سے کسی مسئلہ پر بات کرنی ہے۔“ جولیا نے کہا۔

”آیئے اندر آجایئے۔“ الیانا نے اسے اندر آنے کا کہا۔

الیانا نے اسے اندر بٹھایا اور اس کے لیے چائے بنانے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چائے اور دیگر لوازمات کے ساتھ برآمد ہوئی۔ اس نے سب چیزوں کو میز پر سجایا اور خود میز کی دوسری طرف کرسی پر بیٹھ گئی۔

جولیا نے الیانا کے سراپے کا بغور جائزہ لیا۔ وہ ایک پتلی سی خوبصورت نقوش والی لڑکی تھی۔ اس کا حسن بہت ہی متاثر کن تھا۔ ایک عورت ہونے کے ناطے جولیا نے محسوس کیا کہ الیانا امید سے تھی اور ابھی اس کے ابتدائی ماہ ہیں۔ وہ واضح طور پر تو محسوس نہیں ہو رہے تھے مگر جولیا کی نظروں نے بھانپ لیا۔

”جی فرمائیں۔ کیا کام تھا آپ کو مجھ سے؟“ الیانا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”مجھے آپ سے بلال کے بارے میں بات کرنی تھی۔“ جولیا نے الیانا کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

بلال کا ذکر سن کر الیانا کے چہرے کا رنگ ایک لمحہ کو بدل سا گیا

”اس کے بارے میں کون سی بات کرنی ہے آپ کو؟“ الیانا نے الجھی ہوئی نظروں سے کہا۔

”تمہارے اور بلال کے معاشقے کے قصے بہت سنے ہیں۔ کیا ان میں کوئی سچائی ہے؟“ جولیا نے سوال داغا۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“ الیانا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

”ہر کوئی اس کے بارے میں جانتا تھا۔ اس کے ساتھ کام کرنے والے سارے مزدوروں کو اس بارے میں پتا تھا۔“ جولیا نے کہا۔ تھوڑی دیر کے توقف کے بعد جولیا نے ایک اور دھما کہ خیز سوال کیا۔

”تمہارے پیٹ میں جو یہ بچہ ہے کیا یہ اس کا ہے یا تمہارے شوہر کا۔“ جولیا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”تت...... تم...... تمہیں کیسے پتا چلا......؟ میں نہیں جانتی اس کے بارے میں۔“ پہلے تو الیانا بوکھلا سی گئی۔ پھر اس نے رونا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر فرش پر گر رہے تھے۔

”کتنی بے پرواہ ہو تم۔ تمہیں اپنے ہونے والے بچے کے بارے میں بھی نہیں پتا؟“ جولیا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

الیانا دیر تک روتی رہی۔ کچھ دیر بعد اس کے آنسو تھمے اور پھر اس نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے جولیا کو دیکھا اور بولی۔

”میرا شوہر اس بچے کو قبول کر لے گا۔ اگر بلال اس کے بارے میں کسی کو نہ بتائے تو۔

”لگتا ہے تم اپنے عاشق کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔ وہ تو ہر بات کا ڈھنڈورا پیٹتا پھرتا ہے۔ وہ اپنے ہر عاشقی کے قصے کو مرچ مصالحہ لگا کر دوستوں کی محفلوں میں بیان کرتا ہے۔ کیا وہ یہ بات کسی کو نہیں بتائے گا۔“ جولیا نے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اس کی طرف رحم آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
یہ سب سن کر الیانا کے آنسو پھر سے چھلک اٹھے۔
''تو تم نے بلال کو زہر دیا تھا۔'' جولیا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
الیانا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اسے یہ امید نہیں تھی کہ جولیا کو اتنی جانکاری ہوگی۔
''تمہیں کیسے پتا؟'' الیانا کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔
''مجھے سب کچھ پتا ہے، اور تمہارے حق میں بہتر یہی ہوگا کہ تم مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔'' جولیا نے دوٹوک لہجے میں کہا۔
''کیا وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے؟'' الیانا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
''وہ مر چکا ہے۔''
''اوہ، دکھ ہوا سن کر۔'' الیانا نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
''مگر میں نے یہ سب نہیں کیا ہے۔'' الیانا نے کہا۔
''مجھ سے جھوٹ مت بولو۔''
زہر بلال کو تم نے ہی دیا تھا۔ مگر شاید تمہاری نیت اسے مارنے کی نہیں تھی۔'' جولیا نے کہا
''تم صحیح کہ رہی ہو۔'' الیانا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
''پر سوال یہ ہے۔ کہ کیا وہ اس سلوک کا حقدار تھا۔ اور کیا ہم اسے ایک راز رکھ سکتے ہیں۔ جو تم نے اس کے ساتھ کیا۔'' جولیا نے کہا۔
''کیا واقعی تم اسے راز رکھ سکتی ہو؟'' الیانا کا چہرے پر امید کی کرن ابھری۔ راز رکھنے کی بات کا سن کر اسے کچھ امید بندھی۔
''میں نہیں جانتی۔'' جولیا نے سچ گوئی سے کام لیا۔
''انسانیت کے تقاضوں کے مطابق میرا پہلا فرض تو یہ بنتا ہے کہ میں ریاض کی زندگی بچاؤ۔ کیونکہ وہ اس سب معاملہ میں بالکل بے گناہ ہے۔ تمہیں بچانا میری دوسری ترجیح ہوگی۔ مگر یہاں مسئلہ صرف تمہاری زندگی کا نہیں ہے بلکہ اس معصوم بچے کا بھی ہے جو ابھی اس دنیا میں آیا بھی نہیں ہے۔'' جولیا نے پوری تفصیل گویا کی۔
''تو تم اس مسئلے میں کیا کر سکتی ہو؟'' الیانا نے امید افزاء نظروں سے جولیا کو دیکھا۔
''میں دیکھتی ہوں کہ کیا کر سکتی ہوں۔'' جولیا نے اٹھتے ہوئے کہا۔
اس کے بعد جولیا وہاں سے چلی گئی

❖❖❖❖

جولیا دوبارہ مندر میں واپس آ گئی۔ وہ اپنے کمرے میں گئی اور ستانے کے لیے لیٹ گئی۔ پورے دن کی اس دوڑ دھوپ نے اسے تھکا کر رکھ دیا تھا۔ مگر یہ وقت آرام کرنے کا نہیں تھا۔ ذرا سی دیر سے کسی کی زندگی و موت کا مسئلہ بن سکتا تھا۔ جولیا نے تھوڑا سا آرام کیا اور پادری کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ پادری اپنے کمرے میں موجود تھا وہ اندر داخل ہوئی اور پہلے جھک کر سلام کیا اور پھر عرض کی۔
''جناب عالی! کیا میں آپ کا کچھ وقت لے سکتی ہو؟''
''ہاں، جولیا کیا بات ہے۔'' پادری نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
''آپ کو کچھ دکھانا تھا کیا آپ میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔'' جولیا نے کہا۔
پادری اس کے ساتھ جانے کو راضی ہو گیا۔ وہ اسے لی لر وہاں چلی گئی جہاں بلال کی لاش پڑی ہوئی تھی۔
''جناب کبھی کبھی جو ہم دیکھتے ہیں وہ ہوتا نہیں ہے۔ ہم جسے سچ مان کر چل رہے ہوتے ہیں وہ تو ہماری آنکھوں کا دھوکا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی سچ بالکل ہماری آنکھوں کے بالکل سامنے ہوتا ہے اور ہماری نظر اس تک نہیں جاتی ہے۔'' جولیا نے تمہید باندھی۔
''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' پادری نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔
''یہ دیکھیے۔ اس کے سر پر جو چوٹیں ہیں وہ بالکل سطحی ہیں۔'' جولیا نے بلال کے سر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے سر سے خون کافی بہا ہے مگر جو چوٹیں اسے سر پر لگی وہ اتنی مہلک نہیں تھیں کہ اس کی جان لے سکیں۔ آپ کو یاد ہے جب ہم نے انہیں لڑتے ہوئے دیکھا تھا تو اس کے بعد بلال اپنا پیٹ پکڑ کر گرا تھا اور اس کی موت ہوئی تھی؟'' جولیا نے بات اُدھوری چھوڑتے ہوئے پادری کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
پادری نے بنا کوئی لفظ کہے آہستہ سے ہاں میں سر ہلایا۔
''اس کے منہ میں دیکھیے۔ اسے دیکھ کر صاف پتا چل رہا ہے کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔'' جولیا نے اپنی بات مکمل کی۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

پادری نے اس کے منہ کا معائنہ کیا تو جولیا کی بات کی تصدیق ہوگئی۔ وہ حیران رہ گیا۔

"مجھے لگتا ہے کہ مجھے پتا ہے، کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا ہے اور کس نے کیا ہے۔" جولیا نے کہا۔

"کس نے کیا ہے؟" پادری کے لہجے میں تجسس تھا۔

جولیا نے سارے واقعات کو ذہن میں دہرایا اور پھر یوں گویا ہوئی۔

"کچھ دن پہلے بلال کا ایک کسان سے کسی بات پر جھگڑا ہوا تو میں سے بات آگے بڑھ کر ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ اس کسان کی بیوی نے ان کے درمیان بیچ بچاؤ کی کوشش کی مگر بلال نے اسے بھی بے عزت کر کے بھگا دیا۔ اس نے انہیں گالیاں بھی دیں اور اس کے شوہر کو مارنے کی بھی دھمکی دی۔ وہ عورت ڈر گئی۔ وہ اُمید سے تھی، اور نہیں چاہتی تھی کہ اس کا واحد سہارا اس کا شوہر بھی چھن جائے۔ اس نے ایک فیصلہ کیا۔ اس نے بلال کو صلح کے طور پر کھانا پیش کیا۔ جسے بلال نے قبول کر لیا۔ وہ ریاض اور بلال کے بیچ ہونے والی لڑائی سے تھوڑی ہی دیر پہلے آئی تھی۔ گھبراہٹ اور جلدی میں اس عورت نے جس مصالحہ سے اس کا کھانا تیار کیا وہ پرانا تھا اور اسے پتا نہیں تھا کہ وہ زہریلا ہو چکا ہے۔ وہ کھانا شاید اسے اتنا نقصان نہ پہنچاتا وہ بس بیمار ہوتا مگر ریاض کے ساتھ ہونے والی لڑائی نے سب بدل کر رکھ دیا۔ وہ کھانا اس کے ساتھ ری ایکشن کر گیا وہ کچھ دیر بعد ہی مر گیا۔" جولیا نے تفصیل سے ساری روداد سنائی۔

"کیا وہ عورت اس بارے میں جانتی ہے؟" پادری نے سوال کیا۔

"نہیں، اسے تو اس سب کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ جب تک میں نے اسے ڈھونڈا نہیں اور مل کر اسے بتایا نہیں۔ وہ بے قصور ہے اور یہ سب ایک حادثہ تھا۔ یہ سب اس عورت نے جان بوجھ کر نہیں کیا، اور ریاض بھی بے قصور ہے اس کا ان سب سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔" جولیا نے بات مکمل کی۔

"چلو میں یہ مان لیتا ہوں کہ اس کی موت زہر کی وجہ سے ہوئی ہے اور ریاض اس سارے معاملے میں بے قصور ہے۔ مگر باقی سب کا کیا؟" بوڑھا پادری مسکرایا اور پھر بولا۔ "ہم سب بلال کے شادی شدہ عورتوں سے معاشقوں کے بارے میں جانتے ہیں۔ میں یہ سمجھ سکتا ہوں کہ اس عورت کے شوہر کی بلال کے ساتھ لڑائی کی وجہ کیا رہی ہوگی۔ یقیناً وہ اسی بات کو لے کر جھگڑے ہوں گے۔ پھر بھی تم نے ایک اچھی کہانی سنائی ہے۔ ان مسئلوں کا فیصلہ کرنا زیادہ تر میرے اور چیف کے ذمہ ہی ہوتا ہے۔" پادری ساری بات اس کے سامنے رکھ دی۔

"ریاض کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ وہ بے قصور ہے۔ کسان بھی اپنے بچے کو ہنسی خوشی قبول کر لے گا، اور وہ عورت بھی اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہے اور ان سے تائب ہو چکی ہے۔ اس لیے اس سے بہتر اور کہانی میں کیا سناتی آپ کو یا چیف کو۔ یہ کئی جانوں کا معاملہ ہے اور اب سب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اب آپ کو ہی حتمی فیصلہ کرنا ہے۔" جولیا نے سب کچھ اس پادری پر چھوڑ دیا اور اس کے فیصلے کا انتظار کرنے لگی۔

پادری نے اس پر سوچا اور اس معاملے کے ہر پہلو کا جائزہ لینے کے بعد بولا۔

"بلال ایک بری ساکھ کا حامل شخص تھا۔ تو مجھے لگتا ہے کہ تمہاری کہانی سے بہتر ایک کہانی بن سکتی ہے۔ اگر ہم کہیں کہ بلال نے خود ہی غلطی سے وہ زہریلا مصالحہ کھانا میں شامل کر دیا تھا جس سے اس کی موت ہوئی تھی۔ ہم اس کہانی میں اس عورت کو شامل ہی نہیں کرتے ہیں۔ اسے شامل کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے ورنہ اس سے بچے کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ لیکن تمہیں ریاض کو سب کچھ سمجھانا ہوگا کہ اسے کیا بولنا ہے اور میٹنگ میں کیا بیان دینا ہے۔" پادری نے حتمی فیصلہ سنایا۔

"میں یہ سب اسے سمجھا دوں گی۔" جولیا نے اسے تشکر آمیز نظروں سے دیکھا۔

"لیکن آخر کار یہ سب تو کمیونٹی میٹنگ میں ہی طے کیا جائے گا کہ کون بے گناہ ہے اور کون قصوروار۔" پادری نے معنی خیز لہجہ میں کہا۔

ان دونوں کے چہروں پر تبسم بکھر گئی۔ ایک معنی خیز مسکراہٹ۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

چھوٹا چور

محمد سلیم کرد

معاشرہ کتنا ہی ترقی کیوں نا کر جائے مگر جب تک انسان میں انسانیت نہیں ہوگی ہم پستی کی گہرائیوں میں ہی رہیں گے۔ بہترین معاشرہ انسانوں سے بنتا ہے، یہ تب ہی ممکن ہے جب ہم میں انسانیت زندہ ہوگی۔

زیر نظر کہانی بھی ایک ایسے غربت کے مارے انسان کی ہے جس کو مردہ پرست انسانوں نے حقارت کی آخری سطح پر پہنچادیا تھا۔

غربت کے ہاتھوں تنگ انسان جسے لوگوں نے نشانہ بنایا

Waqar Azeem
pakistanipoint.com

دو اطراف میں بلند و بالا عمارتیں سر اٹھائے شان سے کھڑی تھیں۔ درمیان میں شاہراہ بچھی ہوئی تھی۔ جس پر دو قطاروں میں ٹریک رواں دواں تھا اور فضاء میں ایک بے ہنگم شور مچا ہوا تھا۔ یہ عالی شان عمارتیں اور ان کے درمیان شاہراہ پر ایک دوسرے کے آگے پیچھے دوڑتی ہوئی رنگ برنگی موٹر کاریں انسانوں کی تھیں۔ مصروف شاہراہ کے کنارے فٹ پاتھ پر پیدل چلنے والے راہ گیروں میں شائل علی خان بھی ہو بہو ایک ایسا انسان تھا سراتا پا گوشت پوست کا ایک ایسا عام انسان جس کے سینے میں بھی جذبات اور امنگوں سے لبریز دل دھڑکتا تھا لیکن یہ الگ بات تھی کہ اب یہ تمام خواب اور امنگیں اس سے کوسوں دور کھڑے اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ معمولی نوعیت کے سپنے جو عین اس کی بساط کے مطابق تھے اب اس کی دسترس سے دور تھے۔

بھرے پرے شہر میں زندگی کی چہل پہل اپنے عروج پر تھی لیکن آج علی خان کو پوری دنیا بڑی حد تک پرایا اور اجنبی محسوس ہو رہا تھا وہ ملک کے سب سے بڑے انسانوں کے

سمندر جیسے شہر میں خود کو بے پناہ تنہا اور بے دست و پا محسوس کر رہا تھا اور خاصی اضطراری کیفیت میں فٹ پاتھ پر مسلسل آگے کی سمت رواں دواں تھا۔ ساتھ ساتھ اس کی بے قرار نگاہیں فٹ پاتھ کے کنارے واقع دکانوں کی قطار پر ٹھہرتی جا رہی تھیں۔ دراصل اس کے ذہن میں دگرگوں حالات کے طفیل خود بخود ایک منصوبہ بن گیا تھا جو اس کے سادہ مزاج اور تربیت کا خاصہ نہیں تھی۔ لیکن آج اسے فوری طور پر ہر حال میں اس منصوبے پر عمل کرنا لازمی تھا اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

چلتے چلتے جب وہ جوتوں کی ایک دکان کے سامنے پہنچ گیا تو اس کے قدم خود بخود اپنی جگہ جم گئے ایک ناخوشگوار واقعہ فوراً اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا اور نفرت کی ایک تند لہر سینے میں سر اٹھانے لگی اس کی دونوں مٹھیاں غصے کی شدت سے بھنچ گئیں لیکن اس نے جلد اپنے اعصاب پر قابو پا لیا۔ دکان کے اندر وہی دراز قامت اور طوطے جیسی مڑی ناک والا دکان دار چند گاہکوں کو نمٹانے میں مصروف تھا۔ جس نے اس دن نہ صرف علی خان کی عزت نفس کو حقارت بھرے جملوں سے مجروح کیا تھا بلکہ بڑی بے دردی کے ساتھ ایک بھرپور لات اس کی کمر پر رسید کردی تھی لات لگنے سے وہ زمین بوس ہو گیا تھا اور اس کا ہاتھ گھائل ہو گیا تھا۔

☆☆

علی خان کی عمر اٹھارہ سال کے تھی اور وہ ایک ردی چننے والا لڑکا تھا اس دن وہ ردیوں کی میلی گٹھری کاندھے پر اٹھائے جب اس دکان کے سامنے پہنچ گیا تو اس کی نظریں دروازے پر پڑے ہوئے چند ناکارہ اور مڑے تڑے جوتوں کے خالی ڈبوں پر پڑیں تو وہ ٹھہر گیا۔ اس وقت دکان میں کوئی گاہک نہیں تھا اور دکان دار دکان کے اندر اکیلا کھڑا جوتوں کو ایک ترتیب سے رکھنے میں مصروف تھا جس کی پشت علی خان کی طرف تھی۔ علی خان ایک امید کے ساتھ دکان کے اندر داخل ہوا اور اجازت طلب لہجے میں مخاطب ہوا۔

"صاحب جی کیا میں ان ڈبوں کو اٹھا سکتا ہوں؟"

دکان دار عقب میں آواز سن کر گھوما تو اسے چند قدموں کے فاصلے پر سامنے ایک میلا کچیلا سا لڑکا نظر آیا جو کاندھے پر ردیوں کی ایک میلی سی گٹھری ڈھوئے ہوئے تھا۔ یہ دیکھ کر دکان دار کے چہرے پر فوراً ناگواری کے آثار نمودار ہوئے۔

"ابے گدھے تجھے کس نے دکان کے اندر آنے کی اجازت دی ہے۔" دکان دار حقارت سے بولا جو ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا جس کی ناک طوطے کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی تھی دوسرے لمحے اس نے علی خان کا بازو اپنی گرفت میں لیا اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ چھوڑتے ہوئے ایک دفعہ پھر تحقیر آمیز انداز میں بولا۔

"ابے غلاظت کے ڈھیر تجھے چھونے کے لیے کوئی صاف جگہ بھی باقی ہے کیا؟"

غیر متوقع صورت حال کے سبب علی خان ان کی گھگی بندھ گئی وہ کوئی الفاظ منہ سے ادا کیے بغیر پلٹا اس سے قبل کہ وہ دکان سے نکل جاتا طوطے جیسی ناک والے دکان دار نے اس پر بھی اکتفا نہ کیا اور یہ سوچنا بھی گوارا نہیں کیا کہ میلے کچیلے لباس کے اندر ہو بہو اس کی طرح کا گوشت پوست کا جیتا جاگتا انسان موجود ہے۔ بڑی سفاکی کے ساتھ علی خان کی کمر پر پاؤں کی ایک شدید ٹھوکر رسید کرنے میں تاخیر نہ کی۔ اپنی رو میں قدم اٹھاتا علی خان لات کھانے کے فوراً بعد منہ سے آہ کی آواز نکالتا ہوا گٹھری سمیت دروازے پر ڈھیر ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ دکان دار ایک اور ٹھوکر اس پر آزماتا وہ برق رفتاری کے ساتھ فرش سے اٹھا اور گٹھری کو تقریباً گھسیٹتا ہوا دکان سے قدرے دور نکل آیا۔ طوطے جیسی مڑی ہوئی ناک والے دکان دار کے منہ سے مغلظات کی بارش برس رہی تھی اُدھم اور شور کی وجہ سے راہ گیر دکان کے سامنے جمع ہو رہے تھے۔ علی خان ٹھہرا نہیں اور سامنے آنے والی ایک بغلی گلی میں داخل ہو گیا اور ردیوں سے بھری ہوئی گٹھری کو ایک جھٹکے کے ساتھ کاندھے پر ڈالا اور مختلف چھوٹی بڑی گلیاں عبور کرتے ہوئے مصروف شاہراہ سے کافی دور نکل آیا وہ گٹھری کو کسی حالت میں بھی کھونا نہیں چاہتا تھا۔ گٹھری میں ردی کی صورت میں اس کے لیے روٹیاں موجود تھیں، چلتے چلتے اچانک علی خان کو اپنے دائیں ہاتھ میں درد کا احساس ہوا اس نے ہاتھ پر نگاہ ڈالی تو گھبرا اٹھا۔ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی لہولہان تھی اور خون کے قطرے بڑی تیزی کے ساتھ ٹپک رہے تھے۔ علی خان بغور دیکھنے لگا۔ ہتھیلی کٹی ہوئی نظر آئی جیسے کسی نے تیز دھار آلے سے گوشت پر چیرا لگایا ہو۔ گھاؤ گہرا تھا۔ دکان دار کے ہاتھ میں کوئی چھری چاقو نہ تھا۔ علی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

خان غور کرنے لگا۔ پھر وہ سوچ کر اس نتیجے پر پہنچا کہ پاؤں کی ٹھوکر کھاتے ہی اس کے دونوں ہاتھ فطری طور پر آگے کی طرف تھے اور شوکیس اس کے دائیں طرف بالکل قریب ہی تھا۔ فرش پر گرنے سے قبل دایاں ہاتھ یقیناً شوکیس کے کسی نوک دار و تیز کنارے پر زور کے ساتھ ٹکرایا ہوگا۔ اس وقت ہو میں حرارت کی وجہ سے اسے درد و تکلیف کا احساس نہیں ہوا تھا اور اُدھم کی وجہ سے وہ بہتے لہو سے بے خبر تھا۔ مگر اب سے درد کا احساس ہو رہا تھا۔

کافی رش تھا مگر اچھی بات یہ تھی کہ ابھی تک کوئی اس کے زخمی ہاتھ کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ لوگ اس کی حالت پر متوجہ ہوتے وہ ایک ویران اور سنسان گلی میں آ گیا اور جیب سے ایک رومال نکال کر اس کی پٹی کس کر زخمی ہتھیلی پر باندھ لی، یہ بھی اچھی بات ہوئی تھی کہ آستین کے سوا باقی پورا لباس لہو کے سرخ دھبوں سے بچ گیا تھا۔ علی خان نے لہو سے سرخ آستین چڑھا لیا۔ اس طرح خون آلود آستین چھپ گئی اور پھر دوبارہ اپنی راہ لی۔

ہاتھ کا گہرا گھاؤ روزانہ کی مرہم پٹی سے دو ماہ میں مندمل ہوگیا۔ ہتھیلی پر صرف زخم کا نشان باقی رہ گیا مگر علی خان کی روح پر تذلیل آمیز جملوں کی چوٹ اب بھی بھری نہیں تھی۔ اپنے پیشے اور حلیے کی وجہ سے کئی بار اس کا سابقہ حقارت بھرے رویوں سے پڑ چکا تھا مگر اس دن اس کا دکان دار نے جو رویہ اس کے ساتھ برتا تھا وہ ہر لحاظ سے مختلف اور قابل نفرت تھا۔

علی خان نے اپنے ہاتھ پر یک اچٹتی نگاہ ڈالی جس پر گھاؤ کا نشان باقی تھا پھر دکان دار کو دزدیدہ نظروں سے دیکھنے لگا اس کا سینہ ایک دفعہ پھر جل اٹھا۔ خون رگوں میں بڑی تیزی گردش کرنے لگا نفرت دو آتشہ ہونے لگی، وہ سوچ چکا تھا کہ اسے اس دکان دار پر اپنے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانا ہوگا تاکہ اگلا پچھلا تمام حساب بھی برابر ہوجائے۔ وہ کوئی پیشہ ور چور لٹیرا تھا اور نہ کبھی اس قسم کی واردات کے بارے میں سوچا تھا۔ وہ بالکل نہتا، پیادہ اور ناتجربہ کار تھا وہ ایک اضطراری کیفیت کے زیر اثر ایک بے بس انسان تھا۔

علی خان نے بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ حالات کبھی اسے ایسے نہج پر بھی لا کھڑا کریں گے کہ اس جیسا بے ضرر لڑکا بھی کسی کو لوٹنے کے لیے آمادہ ہوگا۔ وہ چٹ ان پڑھ لڑکا تھا مگر اس کے تین جماعت پاس مزدور پیشہ والد کی نصیحتیں ہمیشہ اس کے ساتھ بندھی ہوتی تھیں۔ وہ اکثر اس سے کہا کرتا تھا۔

"کوئی کام چھوٹا بڑا نہیں ہوتا کوئی پیشہ حقیر نہیں ہوتا۔ یہ صرف انسان کی نیت پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اپنے اصل ڈگر سے ہٹ کر ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے کام کو حقیر ثابت کرے یا پوری ایمانداری کے ساتھ جی لگا کر اسے بڑا ثابت کرے۔ سوچ اور انداز چھوٹے بڑے ہوتے ہیں اور کام صرف کام ہوتا ہے۔ محنت کرو کبھی اس سے گھبراؤ مت۔"

علی خان صرف ایک سال کا شیر خوار بچہ تھا اس کے والدین ملک کے ایک دور افتادہ گاؤں سے روزگار کے لیے شہر آئے تھے۔ علی خان کے والد کی بڑی خواہش تھی کہ وہ اپنے بچے کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرے مگر غربت و افلاس خواہش کی تکمیل کے آگے رکاوٹ بن گئی، جس کا احساس علی خان کو بھی تھا۔ بہر کیف علی خان نے اپنے والد کی نصیحتوں پر عمل کر کے دکھایا۔ وہ سارا دن ردی چنتا تھا۔ دو وقت کی روٹی کمانے میں والد کا ہاتھ بٹاتا تھا اور اس پر مطمئن اور خوش تھا۔

علی خان کے والد چار سال قبل دار فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ بروقت اور مناسب علاج نہ ہونے کے باعث ایک عام سی نوعیت کی بیماری نے ان کی جان لے لی تھی۔ باپ اور بیٹے کی کل ملا کر آمدنی واجبی سی تھی بمشکل ضروریات زندگی کا خرچہ نکلتا تھا۔ جمع پونجی تو بڑی دور کی بات تھی ایسے میں مناسب اور بہتر علاج کا بندوبست کرنا ناممکن بات تھی۔

والد کی وفات کے بعد بھی علی خان نے ہمت کا دامن تھامے رکھا اور صبح سے شام تک شہر کے مختلف مقامات سے ردی چن چن کر حلال رزق کماتا رہا۔ وہ برے دنوں کو فراموش کر چکا تھا اور اپنی ماں کی خدمت میں مصروف تھا۔ مگر حالات نے اچانک پلٹا کھایا اور اسے بھاری رقم کی اشد ضرورت پیش آ گئی جو اس جیسے مفلوک الحال ردی چن انسان کے پاس کہاں تھی۔ علی خان نے اس بارے میں چند واقف کار لوگوں کے سامنے اپنا مدعا بیان کیا اور التجا آمیز انداز میں قرض اور کار خیر دونوں صورتوں میں مدد کی اپیل کی مگر کوئی بھی آڑے وقت میں اس کی مدد کے لیے تیار نہیں ہوا اور ہر ایک نے مختلف جواز پیش کرتے ہوئے اس سے معذرت

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

کی۔ یہ علی خان جیسے خوددار انسان کی زندگی کا پہلا تلخ تجربہ تھا۔ اس کے یاسیت زدہ ذہن میں بڑی تیزی سے ساتھ ایک منصوبہ تیار ہوگیا۔ لوگوں سے مدد کی اپیل اور منت سماجت اسے فضول اور وقت کا ضیاع محسوس ہو رہا تھا گو کہ یہ کام پرخطر اور اس کی سوچ وفکر کے برعکس تھا۔ مگر اس کے سوا اور کوئی چارہ گر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

طیش اور یاسیت کے عالم میں وہ جوتوں کی اس دکان کے سامنے پہنچ گیا تو دکان دار کے چہرے نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا۔ علی خان کو اپنے والد کی نصیحت آموز باتیں برابر یاد آ رہی تھیں مگر یہ سب اب اس کے لیے لغو اور بے معنی ہو چکی تھیں۔ وہ غور کر رہا تھا کہ ایسی باتوں کا حقیقی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں ہر کوئی زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کے چکر میں ہے اور اس چکر ویو میں جائز و ناجائز کوئی معنی نہیں رکھتے۔ علی خان نے ایک لمبی جمائی لی اور اپنی دزدیدہ نگاہیں طوطے جیسی ناک والے دکان دار کے چہرے سے ہٹا کر اپنے ہاتھوں پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا۔

''سارے شہر کی ردی چنی ہے ان مضبوط ہاتھوں نے آج قیمتی ردی چھین لینے کی باری آئی ہے۔'' علی خان مناسب موقع کی تاک میں تھا۔

رش کافی بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ لوگ شاپنگ کرنے میں مصروف تھے۔ فٹ پاتھ پر پیدل چلنے والے راہ گیر دکانوں اور مختلف اشیا کے اسٹال پر نگاہیں ڈالتے ہوئے ایک دوسرے کے آگے پیچھے رواں دواں تھے۔ مطلوبہ دکان میں مزید خریدار اندر داخل ہوگئے اور خریداری میں مصروف ہوگئے یہ دیکھ کر علی خان بے زاری اور بے قراری کے عالم میں مصروف شاہراہ کی طرف گھوما۔ مطلوبہ دکان کے عین سامنے شاہراہ کے کنارے فٹ پاتھ پر برگد کے درخت کے سائے تلے پہنچ گیا۔ اس کی ساری توجہ دکان کی طرف تھی۔ چند ایک گاہک اب بھی دکان میں موجود تھے۔ ان کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جلد فارغ ہونے والے ہیں۔ توقع کے مطابق گاہکوں نے سودا سمیٹا اور دکان سے نکل گئے۔

مطلوبہ دکان کے دونوں طرف واقع دکانوں کا فاصلہ زیادہ تھا اور درمیان میں گلی نما خالی سی جگہیں واقع تھیں جو علی خان کے لیے ایک اچھی بات تھی۔ علی خان مطلوبہ دکان کا اندرونی جائزہ پہلے لے چکا تھا کہ رقم کہاں اور کس دراز میں موجود ہیں اور اس میں کسی دقت کی بات بھی نہیں تھی ادھ کھلا دراز اور لاک سے چابیوں کا لٹکتا ہوا گچھا خود اس بات کی نشاندہی کے لیے کافی تھے۔

گاہکوں کو نمٹانے کے بعد دکان دار دکان میں اکیلا تھا اور ایک گوشے میں کھڑا ہوا تھا۔ پھر وہ رقم والے دراز کے قریب بچھی ہوئی کرسی پر دراز ہوگیا اور چھت پر گھومتے ہوئے پنکھے کو گھورنے لگا۔ علی خان جس موقع کی تاک میں تھا وہ اب اسے میسر آ گیا تھا۔

دکان دار گرد و پیش سے بے خبر خیالات میں مستغرق چھت پر گھومتے ہوئے پنکھے کو گھور رہا تھا۔ علی خان کا دماغ بھی گھوما وہ کسی بھوکے عقاب کی طرح دکان کے اندر جھپٹا اور دوسرے لمحے نیم کھلے ہوئے دراز کو کھینچ کر ہاتھ اندر ڈالا۔

دکان دار کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ باہر سے کوئی زن سے دکان کے اندر اس طرح وارد ہوگا۔ وہ چند سیکنڈ ہکا بکا رہ گیا۔ پھر وہ فوری طور پر جمود کی کیفیت سے نکل کر علی خان پر جھپٹ پڑا اور ساتھ ساتھ گلا پھاڑ کر چور چور کا شور مچانے لگا۔

علی خان کی مٹھی میں بے شمار چھوٹے بڑے کرنسی نوٹ آ گئے تھے۔ علی خان کو دکان دار نے پشت کی طرف جا لیا تھا لیکن علی خان کی طاقت اور غیض کے سامنے دکان دار کی مزاحمت کافی حد تک کمزور تھی اس کے پاس اپنے دفاع کے لیے ایک بہتر راستہ شور مچانے کا باقی تھا اور وہ بدستور چیخ و پکار کر رہا تھا۔

علی خان پر غیض و غضب کی کیفیت طاری تھی اسے ہر حال میں دراز صفایا کرنے کا جنون سوار تھا۔ اس نے دوسرا ہاتھ بھی دراز کے اندر ڈالا اور نہایت نفرت آمیز لہجے میں بولا۔

''ابے طوط کے بچے۔ تمہیں وہ دن یاد ہے نا جب میں نے تم سے چند بے کار ڈبے مانگے تھے، اور تم نے مجھے ذلیل کر کے دکان سے نکال تھا اور تیری لات کی وجہ سے میرا ہاتھ زخمی ہوگیا تھا۔ آج میں ردی چننے نہیں آیا قیمتی ردی (کرنسی نوٹ) چھین لینے آیا ہوں، تیرا صفایا ہو جائے گا۔''

''تم وہی ہو؟'' دکان دار چیخنے کے انداز میں بولا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

دکان دار کی چیخ و پکار سن کر لوگ دکان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور چند ایک دکان کے اندر بھی پہنچ گئے تھے صورتحال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے علی خان نے ایک زور کا جھٹکا پیچھے کی طرف دیا۔ دکان دار کے ہاتھ چھوٹ گئے اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ علی خان کی دونوں مٹھیاں کرنسی نوٹوں سے بھری ہوئی تھی اور چند نوٹ فرش پر بھی بکھرے ہوئے تھے۔ علی خان نے رخ دروازے کی طرف کیا جہاں دکان میں داخل ہونے والے چند افراد شش و پنج کے عالم میں کھڑے نظر آئے۔ دوسرے لمحے علی خان بڑی برق رفتاری کے ساتھ ان کے درمیان زن سے باہر نکل گیا۔ دکان دار بدستور مدد کے لیے چیخ رہا تھا۔ ہر طرف سے لوگ نکل کر دکان کی طرف آ رہے تھے مگر محتاط قدموں کے ساتھ دوران کے چہروں پر خوف و تجسس کے ملے جلے تاثرات بھی واضح تھے۔ علی خان نے مٹھیوں میں بھرے ہوئے کرنسی نوٹ اندرونی جیبوں میں ٹھونس لیے۔ کرنسی نوٹ سے بھری مٹھیوں کو عجلت سے جیب میں ٹھونس لینے کی وجہ سے علی خان کی نشاندہی کافی لوگوں میں ہوگئی۔ رہی سہی کسر دکان کے سامنے کھڑے ہوئے ان افراد نے اُدھم مچا کر کی جنہوں نے علی خان کو محض چند ثانیے قبل ہی دکان دار کے ساتھ سینہ زوری کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

"پکڑو اسے یہ دکان لوٹ کر فرار ہو رہا ہے۔" انہوں نے علی خان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

لوگوں نے جب دیکھا کہ میلے سے اٹے ہوئے لباس میں ملبوس نوجوان لڑکا ہی چور ہے جو غیر مسلح بھی ہے تو وہ بلا خوف و خطر ایک ہجوم کی صورت میں علی خان کی طرف لپک پڑے۔ اس سے قبل کہ ہجوم اسے جا لیتا علی خان تیزی سے شاہراہ کی طرف دوڑا علی خان کو اچھی طرح علم تھا کہ شہر میں جا بہ جا سی سی ٹی وی کیمروں کا جال پھیلا ہوا ہے اور ہر کاروباری مراکز میں سکیورٹی گارڈ کا انتظام بھی ہے اور یہ شہر کا ایک اہم کاروباری مرکز تھا۔ سکیورٹی کا انتظام بھی یقینی تھا لیکن علی خان کے منصوبے کا بنیادی مقصد صرف چوری نہیں تھا اسے ہر حال میں ایک دفعہ اپنے گھر لازمی طور پر پہنچنا تھا جو اس کے منصوبے کا اہم اور آخری مرحلہ تھا۔ اس کے بعد چاہے وہ پکڑا کیوں نہیں جاتا، اس لیے اس وقت اس کے ذہن میں ہر طریقے سے اپنے گھر پہنچنے کا خیال سوار تھا۔ جس پر دراصل اس کے منصوبے کی کامیابی کا دارومدار وابستہ تھا۔

علی خان زن کے ساتھ مشروب فروش کی ریڑھی کے برابر پہنچ گیا دو رویہ شاہراہ پر ٹریفک بھی محدود تھا علی خان کے لیے بنا کسی مشکل کے پار کرنا آسان تھا۔ لیکن عین اسی وقت اچانک کہیں سے ایک مسلح باوردی سکیورٹی گارڈ نمودار ہو کر اس کے سامنے آ گیا۔ علی خان کے اٹھتے قدم اپنی جگہ پر جم گئے۔

"ہینڈز اپ، ورنہ گولی مار دوں گا۔" سکیورٹی گارڈ نے علی خان کے سینے کی طرف رائفل تان کر اپنی پتلی اور مریل سی آواز میں وارننگ دیتے ہوئے کہا۔

اس کے لہجے میں جیسے وارننگ سے زیادہ درخواست تھی اس کی آواز کی طرح اس کا جسم بھی دبلا پتلا تھا اور اس کے بدن پر موجود یونیفارم ڈھیلی ڈھالی تھی چہرے پر لمبی ڈیوٹی کی تھکاوٹ اور بیزاری واضح تھی۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

علی خان کے پاس سوچنے کی مہلت کہاں تھی، ایک ایک پل اس کے لیے قیمتی تھا اور وہ لانگ بوٹ میں کسی بانگڑ بلے کی طرح اس کے سامنے ایستادہ تھا اور رائفل کے بھیانک دہانے کا رخ اس کے سینے کی طرف تھا۔

علی خان کی رگوں میں لہو بدستور تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ دفعتاً علی خان نے رائفل کے نال پر بڑی پھرتی کے ساتھ ہاتھ ڈالا اور فائر کی زد سے محفوظ رہنے کی خاطر اپنی جگہ سے قدرے سرک گیا اور دوسرے لمحے پوری طاقت سے رائفل کو کھینچ لیا۔ گولی ہوا میں چلی اور مریل بدن سکیورٹی گارڈ چہرے پر حیرت کا تاثر لیے تقریباً ہوا میں اچھلتا ہوا مشروب فروش کی ریڑھی کے ساتھ دھڑام سے جا ٹکرایا۔ رائفل یکے بعد دیگرے دونوں کے ہاتھوں سے نکل کر کافی دور فٹ پاتھ پر جا پڑی ٹکراؤ کے باعث ریڑھی ہل کر رہ گئی اور شیشے کے گلاس نیچے گر کر چکنا چور ہو گئے۔

شاہراہ پر مڈ بھیڑ کی وجہ سے ٹریفک کی روانی سست ہو گئی تھی اور فائر کی وجہ سے ہجوم قدرے منتشر ہو گیا تھا ٹریفک کی سست روی علی خان کے لیے بہتر تھی ایک دفعہ پھر علی خان کے راستے صاف تھے۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ قدم اٹھانے لگا اس سے قبل کہ وہ ٹریفک کی آڑ لے کر دوسری طرف نکل جاتا عین اسی وقت مشروب فروش نے فوراً شیشے کا ایک گلاس

اٹھایا اور پوری قوت ساتھ علی خان کی سمت پھینکا گلاس فضا میں تیزی کے ساتھ گھومتا ہوا شاہراہ پر بھاگتے ہوئے علی خان کے عین سر کے عقب میں زور کے ساتھ جا پڑا۔ علی خان کے سر پر گویا آسمان ٹوٹ پڑا۔ آگے کی سمت تیزی کے ساتھ اٹھتے قدم یک دم پیچھے کی طرف لڑکھڑانا شروع ہو گئے اور نگاہوں کے سامنے بڑی تیزی کے ساتھ تاریکی چھانے لگی۔ علی خان بری طرح گھائل ہو چکا تھا اور اب اس کے بدن پر موجود لباس پر میل کے ساتھ لہو کی سرخی کا اضافہ ہو رہا تھا۔

ہجوم نے جب زخم سے بے حال علی خان کو ڈگمگاتے دیکھا تو اس کی طرف بے خوف بھیڑیوں کے غول کی طرف لپکا۔ انہیں دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے ایک آسان ہدف ہاتھ آ گیا تھا۔ لڑکھڑاتا علی خان ابھی زمین بوس بھی نہیں ہوا تھا کہ مشتعل ہجوم کی لاتوں، گھونسوں اور تھپڑوں کی بے رحمانہ بارش نے پہلی فرصت میں اسے ڈھیر کر دیا طوطے جیسی ناک والا دکان دار بھی پیچھے نہیں تھا وہ معصوم صورت بنا بنا کر مشتعل ہجوم کے اشتعال میں مزید شدت لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مارو اس خطرناک ڈاکو کو۔ یہ پہلے بھی ایک دفعہ مجھے لوٹنے آیا تھا۔" وہ بھڑکا رہا تھا۔

ہجوم میں ہر ایک کی خواہش تھی کہ وہ اس میلے کچیلے زخمی لڑکے پر زیادہ سے زیادہ ہاتھ آزمائے سب مارنے والے تھے اور بس مار رہے تھے۔ بے دردی کے ساتھ سڑک پر گھسیٹ رہے تھے لیکن بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ پوری دنیا اس کی جان کے در پر تھی۔ جیسے ہجوم کی تمام بنیادی سہولیات سے محرومیوں کا ذمہ دار علی خان ہو اور اس کی موت تمام محرومیوں کے ازالے سے مشروط ہو، علی خان کو چیخنے اور چلانے کا موقع بھی نہیں ملا اور مشتعل ہجوم اس کے جسم سے آخری سانس تک نکالنے کے بعد ہانپتا ہوا منتشر ہو گیا طوطے جیسی ناک والے دکان دار نے لاش کی جیبوں سے اپنی چھینی ہوئی تمام رقم حاصل کی، جو پچیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ یہ سب کچھ چند منٹوں میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ جسے کیمروں کی آنکھ نے قید کر لیا تھا۔

نیوز چینل پر خبر بریک ہوئی۔

"شہریوں نے ڈکیتی کی کوشش کے دوران ڈاکو کو پکڑ کر تشدد کا نشانہ بنایا، پولیس کے پہنچنے سے قبل ڈاکو دم توڑ گیا

naeyufaq.com

ماہنامہ
حجاب
کراچی

خاندانی رسم و رواج کس طرح لڑکیوں کو باغی کرتا ہے
ریحانہ آفتاب کی نوک قلم کی ایک خوب صورت تحریر

ایک حادثے نے اسے عشق نگر کا مسافر بنا دیا
ندا حسنین کی دلکش اور مدتوں یاد رہ جانے والی کہانی

آنگن کی چڑیا

قارئین کے تعارف پر مبنی سلسلہ

عالم میں انتخاب

ہر ماہ ایک شاعر کا انتخاب

اس کے علاوہ

Info@naeyufaq.com
(021)35620771/2
0300-8264242

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

وغیرہ وغیرہ۔'' علی خان کی جیب سے قومی شناختی کارڈ کے سوا اور کوئی قابل ذکر چیز برآمد نہیں ہوئی۔

تمام قانونی ضابطوں کو مکمل کرنے کے بعد قومی شناختی کارڈ میں درج معرفت پر پولیس کی ایک ٹیم اے ایس آئی ضمیر حسین کی قیادت میں علی خان کی لاش لیے اس کے گھر کی طرف روانہ تھی۔ لاش ایک فلاحی ادارے کی ایمبولینس میں موجود تھی جو سائرن بجاتی ہوئی پولیس جیپ کے آگے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

پولیس کارواں جلد ایک ایسے علاقے میں داخل ہوگیا جو غربت و افلاس کا منظر پیش کر رہا تھا۔ خستہ حال اور بوسیدہ مکانات جن میں بیشتر کے دروازوں پر بورے لٹکتے ہوئے نظر آرہے تھے تنگ اور غلیظ راستے جن پر گاڑیوں کو آگے بڑھانے سے دقت ہو رہی تھی۔ چند ثانیے بعد پولیس علی خان کے گھر کے سامنے پہنچ گئی۔ گھر کے سامنے لوگوں کا ایک چھوٹا سا مجمع اکٹھا تھا جو سائرن بجاتی ہوئی ایمبولینس اور پولیس جیپ کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیرت زدہ نظروں سے تک رہے تھے۔ مجمع گھر کے سامنے دیکھ کر اے ایس آئی ضمیر حسین سمیت کارواں میں شامل ہر فرد یہ خیال کرنے لگا کہ انہیں علی خان کی ہلاکت کی خبر ہوچکی ہے مگر انہیں اپنے اس خیال کی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب فلاحی ادارے کے رضا کاروں کو ایمبولینس سے ایک لاش نکالتے ہوئے دیکھ کر لوگوں کی حیرت دو چند ہوگئی اور ایک نئے سوالیہ چہرہ لیے اسٹریچر پر موجود لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ کون ہے سر جی؟''

یہ سن کر پولیس کاروان میں شامل ہر ایک چونک سا گیا۔

''اندر بھی ایک لاش پڑی ہوئی ہے اور ہم مرحومہ کے بیٹے کے منتظر ہیں کہ وہ آئے اور اپنی ماں کو کاندھا دے کر آخری آرام گاہ تک پہنچائے۔'' نوجوان نے گویا انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر اے ایس آئی ضمیر حسین ایک لمحے کے لیے دنگ رہ گیا۔ باقی ساتھی بھی محو حیرت تھے۔

''کیا کہہ رہے ہو آپ۔'' اے ایس آئی ضمیر حسین بولا۔

''علی خان کی ماں بھی چلی گئی؟'' اے ایس آئی ضمیر حسین نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''جی ہاں سر پچھلے چھ سات دنوں سے وہ بیمار تھی مگر کل صبح سے طبیعت خاصی بگڑ گئی تھی علی خان کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ اپنی ماں کو کسی سرکاری اسپتال میں داخل کرتا۔ وہاں بھی سر دوائی وغیرہ خریدنے اور دیگر ضروریات کو پورا کرنے کے لیے روپے پیسوں کی ضرورت پیش آتی ہے اور آخر شہر کے کچرا کنڈیوں سے ردی چننے والے ایک انسان کے پاس پیسے کتنے جمع ہوتے ہیں۔ وہ مدد کے لیے اپنے گنتی کے چند واقف کار لوگوں کے در پر گیا مگر کوئی بھی مدد کے لیے تیار نہیں ہوا، کوئی کسی غریب مفلس کی مدد کیوں کرتا، ہر کوئی کسی مفاد کی امید میں کسی کی مدد کرتا ہے اور علی خان جیسے ردی چننے والے انسان سے لوگ آئندہ کیا امید رکھتے۔ ہم جیسے غربت کے ستائے ہوئے لوگ کسی کی مدد کا جذبہ دل میں ضرور رکھتے ہیں۔ مگر بساط اتنی نہیں کہ آڑے وقت میں کسی کی مدد کرسکیں۔ وہ کل شام کے وقت مجھے اسی جگہ ملا تھا سر وہ بہت پریشان تھا اس کا یہ کہنا تھا کہ مالی مدد کے لیے لوگوں کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے وہ عاجز آچکا ہے اور ایک ایسا مختلف قدم اٹھانے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہے جس کے اٹھانے سے لوگ اس کی حالت زار پر متوجہ ہوجانے پر مجبور ہوجائیں گے اور اس طرح اس کی بیماری ماں کا علاج بھی ممکن ہوگا۔ میں سمجھا کہ وہ پریشانی کے عالم میں ایسی بے تکی باتیں سوچ رہا ہوگا۔ آج صبح سویرے ہی وہ گھر سے نکل گیا تھا اور ابھی تک وہ واپس نہیں لوٹا تھا۔'' نوجوان جو اپنی باتوں سے ایک معقول انسان نظر آرہا تھا آخر میں ایمبولینس کی طرف دیکھتے ہوئے تشویش بھرے انداز میں آہستگی سے بولا۔ اس وقت فلاحی ادارے کے رضا کار علی خان کی لاش کمرے میں رکھنے کے بعد خالی اسٹریچر اٹھائے واپس آرہے تھے۔ ان کے پیچھے تین چار اور آدمی بھی علی خان کے گھر سے نکل کر آرہے تھے جو محلے دار تھے۔

''بڑے دکھ کا مقام ہے آپ لوگ علی خان کے منتظر ہو اور وہ ایک لاش کی صورت میں واپس آگیا ہے۔ ماں اور بیٹے دونوں کو غربت کے عفریت نے اکٹھے نگل لیا۔'' اے ایس آئی ضمیر حسین بڑے تاسف سے بولا۔ یہ سن کر لوگوں کی آنکھیں نم ناک ہوگئیں، وہ ایمبولینس سے ایک لاش کو نکالتے وقت اندازہ کر چکے تھے کہ علی خان کے ساتھ اچھا نہیں ہوا ہوگا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اے ایس آئی ضمیر حسین نے علی خان کی المناک موت کے متعلق سارا واقعہ مختصر الفاظ میں بتایا اور کہا کہ علی خان کا اقدام جو اس نے باقی دنیا کے اپنے دگرگوں حالات کی طرف راغب کرنے کے ارادے سے اٹھایا تھا خود اس کی موت کا سبب ثابت ہوگیا۔ مزید اس نے علی خان کے کردار اور چال چلن کے حوالے سے لوگوں سے سوال کیا تو ہر چھوٹے بڑے کا یہ جواب تھا کہ وہ ایک سادہ لوح اور شریف النفس انسان تھا اور کبھی کسی کے ساتھ اس کا جھگڑا دیکھنے میں آیا تھا اور نہ کبھی کسی منفی قسم کی سرگرمیوں میں ملوث رہا تھا۔ اپنے کام سے مطلب رکھنے والا انسان تھا۔

اہل محلہ کی زبانی علی خان کی تعریف و توصیف سن کر اے ایس آئی ضمیر حسین مطمئن ہوگیا۔

......☆☆......

اے ایس آئی ضمیر حسین نے ماں اور بیٹے دونوں کی تجہیز و تکفین کا خرچہ خود اٹھایا وہ روایتی طرز کا پولیس آفیسر نہیں تھا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ باشعور اور حساس دل رکھنے والا آفیسر تھا۔ اسے ماں اور بیٹے دونوں کی موت پر دلی دکھ تھا اور بالخصوص علی خان کی المناک موت پر زیادہ رنجیدہ تھا لیکن یہ سب محض ذاتی جذبہ تھا۔ اسے علم تھا کہ محکمہ طور پر وہ کوئی عملی اقدام نہیں کر سکتا۔ اس نے ویڈیو فوٹیج کا بھی اچھی طرح جائزہ لیا تھا۔ علی خان دکان دار سے چھینا جھپٹی ضرور کر رہا تھا مگر وہ صریحاً غیر مسلح تھا کسی جرائم پیشہ ڈاکو کی طرح وہ گن پوائنٹ پر نہیں لوٹ رہا تھا۔ اور سر پر گلاس کی چوٹ کھانے کے بعد تو وہ بالکل بآسانی ہجوم کے ہاتھوں آ گیا تھا اسے بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتارنے کی کیا ضرورت تھی۔ علی خان نے ایک معمولی جرم کا مرتکب تھا اور ہجوم نے قانون اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑا جرم کیا تھا۔ اے ایس آئی ضمیر حسین زمینی حقائق کی رو سے کیس پر غور کرنے لگا۔ علی خان جیسے نادار اور لاوارث انسان کے قتل پر کوئی تفتیش ہوتی ہے اور نہ کسی قسم کی کمیٹی تشکیل دی جاتی ہے۔ آئے روز اس قسم کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جن کے فائل تیزی کے ساتھ بند ہوتے رہتے ہیں۔

اس وقت وہ اپنے آفس میں اکیلا بیٹھا ہوا علی خان کے کیس کے متعلق سوچ رہا تھا اور وہ تھوڑی دیر پہلے اردلی کو ایک کپ چائے بنانے کا حکم دے چکا تھا۔ حسب توقع آفس کا دروازہ کھلا اور اردلی چائے کا کپ ٹرے میں اٹھائے اندر داخل ہوا۔ وہ ضمیر حسین کے مزاج سے بہتر واقف تھا اور یہ جانتا تھا کہ صاحب اس وقت کس بات پر غور کر رہے ہیں۔

''ایک سوال پوچھنے کی اجازت ہے سر؟'' اردلی نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے مودبانہ انداز میں کہا۔

''ہاں بھئی بولو کیا سوال ہے۔'' اے ایس آئی دوستانہ انداز میں بولا وہ اپنے ماتحت ملازموں کے ساتھ دوستانہ سلوک روا رکھنے میں پورے محکمے میں مشہور تھا۔

''سر یہ مقتول علی خان کسی فلاحی ادارے کے پاس اپنا مدعا لے کر مدد کے لیے کیوں نہ گیا۔ شہر میں ایسے فلاحی اداروں کی کمی بھی تو نہیں ہے؟'' اردلی نے استفسار کیا۔

''وہ سادہ لوح اور ناتجربہ کار تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ اسے فوری طور پر روپے پیسوں کی ضرورت پیش آ گئی پہلے تو اس نے یہ سوچا ہوگا کہ اس کی والدہ سیلف میڈیسن لینے سے صحت یاب ہو جائے گی مگر اس کی حالت میں جب بہتری کے بجائے ایک دن اچانک بڑی حد تک ابتری آ گئی تو وہ گھبرا اٹھا اور روپے پیسے بروقت وہ کام آتا ہے جو انسان کی اپنی جیب میں موجود ہو۔'' ضمیر حسین بولا۔

''جی سر میں سمجھ گیا۔'' اردلی اثبات میں بولا۔

''وہ ایک کیفیت کے زیر اثر ایک معمولی چور تھا جس کا تعلق سماج کے نچلے طبقے سے تھا بڑے چور اور ڈاکو وہ ہیں جن کی لوٹ کھسوٹ کبھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی اور ان کی لوٹ مار اور استحصال کی وجہ سے معاشرے میں غربت، بھوک و افلاس اور بیماریاں جنم لیتی ہیں اور مجبوری کے ہاتھوں علی خان جیسے بے ضرر انسان بھی کسی کو لوٹنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ بڑے چوروں کو کبھی سزا نہیں ملتی اور ہمیشہ چھوٹے چور اشتعال، انتقام اور غیض و غضب کا شکار بن جاتے ہیں اور مرض کی بنیادی جڑیں اپنی جگہ پر قائم رہتی ہیں۔'' اے ایس آئی ضمیر حسین نے خلا میں گھورتے ہوئے متفکر انداز میں کہا اور اردلی اثبات میں سر ہلاتا رہ گیا۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

(قسط نمبر 5)

بساط گر

وحید سلطان

دلچسپ کہانیوں کے شائق قارئین کے لیے بطور خاص ہر لمحہ رنگ بدلتی ایک ناقابل فراموش کہانی

دنیا کے مسترد کردہ جاگیردارانہ معاشرے کی ایک جھلک جو اب بھی ہمارے خطے میں اپنی تمام تر توانائیوں اور برائیوں کے ساتھ زندہ ہے۔ جہاں زمین کو ماں کا درجہ دے کر معصوم انسانوں کا خون بہا کر اسے سیراب کیا جاتا ہے۔ جہاں گھوڑی کی چوری کو بیٹی کے اغوا کے برابر تصور کیا جاتا ہے۔

ایک لڑکی کی محبت میں مبتلا دو دوستوں کی سازشی لڑائی کا ایک دلچسپ احوال۔ سمجھوتے کے تحت شادی کرنے والے جوڑے کی نفرت اور محبت کی کہانی۔شوہر کی موت کا دشمن سے بدلا لینے کا انوکھا طریقہ اختیار کرنے والی بیوی کی داستان،محبت کرنے والوں کی کہانی دشمن ان کے پیچھے ،موت کی طرح تعاقب میں تھے۔دو ایسے بااثر افراد کا قصہ خاص جو مزاج میں ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

دلچسپ کہانیوں کے شائق قارئین کے لیے بطور خاص ہر لمحہ رنگ بدلتی ایک ناقابل فراموش کہانی

عشرت کو ہوش آیا تو اس کی پہلی نظر تیمور پر پڑی تو اس کے ذہن میں بے ہوش ہونے سے پہلے کا وہ منظر ایک جھماکے کی طرح نمودار ہوا جب اس نے تیمور اور مہر النساء کو ایک ساتھ دیکھا تھا۔ منظر یاد آتے ہی عشرت کا ذہنی دباؤ بڑھنے لگا تھا۔ وہ بیڈ سے اٹھی اور اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی تو اس کے سر کے پچھلے حصے میں شدید قسم کے درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں تھیں۔ اس نے ناگوار نظروں سے پورے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر بیڈ پر تیپے کے ساتھ پڑے پرس پر لمحہ بھر کے لیے اس کی نگاہیں مرکوز ہو گئیں۔ پرس کو دائیں کندھے پر لٹکانے کے بعد وہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ وہاں سے وہ تیمور کے پورے آفس کو دیکھ سکتی تھی۔ پورے آفس میں گھومنے کے بعد عشرت کی نگاہیں آفس کے دروازے پر مرکوز ہو گئیں۔ عشرت کے ذہن میں ایک شک سا پیدا ہوا۔ اسے لگا تیمور آفس کے باہر مہر النساء کے پاس ہے۔ عشرت کھڑکی سے دور ہٹ گئی اور اب وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ کھولا تو اس کے سامنے سیڑھیاں تھیں۔ اسے یاد آیا کہ بے ہوش ہونے سے پہلے وہ انھیں سیڑھیوں سے اترتے ہوئے گر گئی تھی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے خوفزدہ ہوئی لیکن پھر ہمت کر کے اس نے پہلے زینے پر قدم رکھا تو اب کی بار پورے سر میں درد کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ وہ فوراً واپس مڑی اور کمرے میں چلی گئی۔

”جب میں سیڑھیوں سے گری تھی شاید تب میرے سر میں شدید چوٹ لگی ہوگی۔“ عشرت نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے سوچا اور پھر جب درد کی شدت کم ہوئی تو وہ دوبارہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر حیرت اور غصے کے ملے جلے آثار نمودار ہو گئے۔ تیمور صوفے پر بیٹھا تھا اور ایک خوبصورت لڑکی اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ وہ دونوں چائے پی رہے تھے اور ساتھ باتیں بھی کر رہے تھے کہ اچانک تیمور اٹھا اور فون کان سے لگا کر آفس سے باہر چلا گیا۔ عشرت نے دیکھا کہ جس لڑکی کے ساتھ تیمور باتیں کر

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

رہا تھا اس لڑکی نے اپنے پرس سے کوئی چیز نکالی۔

''ارے اس لڑکی نے تیمور کی چائے میں کیا ڈالا ہے۔'' عشرت نے آنکھیں سکیڑ کر اس لڑکی کو کھڑکی سے دیکھتے ہوئے سوچا تھا جبکہ وہ لڑکی اب تیمور کے کپ میں چمچ گھماتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ تیمور کو واپس آتا دیکھ کر اس نے فوراً چائے سے چمچ نکال کر میز کے نیچے پھینک دیا اور خود اب معصومانہ انداز میں چائے پی رہی تھی۔ تیمور چائے پینے کے چند منٹوں بعد بے ہوش ہو گیا تو اس لڑکی نے تیمور کا موبائل فون پکڑا اور اس پر کوئی نمبر ڈائل کر رہی تھی۔

''یہ لڑکی تو تیمور کے ساتھ کوئی سازش کر رہی ہے۔'' عشرت نے سوچا جبکہ اس لڑکی نے فون پر مختصر گفتگو کی اور فون تیمور کے سامنے پڑے میز پر رکھا۔

''میں اس لڑکی کی گھناؤنی سازش کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔'' عشرت نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر آفس میں آئی تو اس نے دیکھا کہ تیمور بے ہوشی کی حالت میں صوفے پر پڑا تھا جبکہ جس لڑکی نے تیمور کی چائے میں بے ہوشی والا پاؤڈر مکس کیا تھا وہ اب آفس میں نہیں تھی۔

''وہ لڑکی کہاں گئی؟'' عشرت نے متلاشی نگاہوں سے پورے آفس کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ عشرت اب اسی صوفے کے پاس کھڑی تھی جس صوفے پر وہ لڑکی بیٹھی تھی۔ عشرت حیران اور پریشان ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی تو وہ لڑکی صوفے کے پیچھے سے اٹھی اور اس نے کلوروفارم لگا رومال عشرت کے منہ اور ناک پر رکھ دیا۔ عشرت کسمسائی اور خود کو اس کی گرفت سے چھڑوانے کی بھرپور کوشش کی اور ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ پرس میں ڈال کر پستول پکڑا ہی تھا کہ اگلے لمحے وہ بے ہوش ہو گئی۔ پندرہ سے بیس منٹوں بعد مہرالنساء آفس میں آئی۔ تیمور اور عشرت کو بے ہوشی کی حالت میں دیکھ کر وہ حیرت زدہ ہو گئی۔ اس نے ابھی قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ کسی نے اس کے منہ اور ناک پر کلوروفارم لگا رومال رکھا تو وہ بھی بے ہوش ہو کر اس لڑکی کے بازوؤں میں جھول گئی۔ اس لڑکی نے مہرالنساء کو کلائیوں پر اٹھایا اور آفس سے لے گئی۔

❖❖❖❖

شہر کے جدید ٹاؤن میں موجود دو منزلہ عمارت کے نیچے کار رکی۔ اس میں سے طلحہ نکلا۔ اس نے نہایت عالیشان عمارت پر نظر ڈالی۔ عمارت کے اوپر ایک بورڈ لگا تھا جس پر ''صابی ہاؤس'' لکھا تھا۔ اس نے طویل سانس لی اور پھر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ عمارت کے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دوسری منزل پر پہنچا۔ اس کا سامنا پانچ آدمیوں سے ہوا جو اسے گھورتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ شکل ہی سے غنڈے لگ رہے تھے۔ اس نے جیسے ہی بائیں جانب مڑنا چاہا تو وہ سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''کدھر جا رہے ہو؟'' ان پانچوں میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص نے مونچھوں کو مروڑتے ہوئے کرخت لہجے میں پوچھا تو طلحہ کے بڑھتے قدم رک گئے اور وہ اس شخص کی جانب متوجہ ہوا۔

''قاسم صاحب سے ملنا ہے۔'' طلحہ نے نارمل لہجے میں کہا تو باقی کے چار آدمی الرٹ ہو گئے اور انہوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

''کون ہو تم اور کیا کام ہے؟'' کرخت اور بارعب لہجے میں طلحہ سے پوچھا گیا۔

''میں کام صرف اور صرف قاسم کو ہی بتاؤں گا۔'' طلحہ نے کہا۔

''وہ نہیں ملے گا، وہ سو رہا ہے اور تم کل آنا۔'' سامنے کھڑے آدمی نے تیزی سے کہا۔

''میں نے فون کیا ہے، بولو طلحہ آیا ہے۔'' اس نے خشک لہجے میں سختی سے کہا تو چند لمحے سوچنے کے بعد بات کرنے والے نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ ان میں سے ایک تیزی سے چلا گیا اور باقی چار آدمی وہیں کھڑے رہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بندہ واپس آیا۔

''آؤ'' اس نے سر کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو طلحہ اس کے پیچھے چلتا گیا۔ طلحہ اس آدمی کے ہمراہ ایک پرآسائش کمرے میں داخل ہوا تو قاسم نے اسے خوش آمدید کہا۔ قاسم چونکہ ریوالونگ چیئر پر براجمان تھا لیکن طلحہ کو اس نے صوفے پر بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا۔

''کل میں سارہ کے ساتھ لالہ زار چوک میں کسی شکار کی تلاش میں تھا کہ ہمارا سامنا بھتہ مافیا کے ایک آدمی سے ہوا، جس وقت میں اس کے پاس کھڑا تھا تو سارہ نے اسے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

دھکا دے دیا اور بعد میں معلوم ہوا کہ اس آدمی کو گولی سے نشانہ بنایا گیا تھا، ہم اسے فوراً اپنے اڈے پر لے آئے تھے۔'' طلحہ نے قاسم کو تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''وہ آدمی کون تھا اور کس کے لیے کام کرتا ہے؟'' قاسم نے پوچھا۔

''اس نے اپنا نام مہرو بتایا ہے اور وہ ذونیا نامی لڑکی کے لیے کام کرتا ہے۔'' طلحہ نے کہا۔

''کیا وہ ہمارے لیے کام کرنے کے لیے آمادہ ہے؟'' قاسم نے پوچھا تو طلحہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''پھر تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ایسی صورت میں تمہیں کیا کرنا ہے۔'' قاسم نے بارعب لہجے میں کہا تو طلحہ نے سر ہلایا۔

قاسم سے ملاقات کے بعد طلحہ اپنے اڈے پر واپس پہنچا اور اس نے سارہ کو طلب کیا۔ کچھ ہی دیر بعد سارہ اس کے روبرو کھڑی تھی۔

''جب تک مہرو ہمارے لیے کام کرنے پر آمادہ نہیں ہو جاتا تب تک وہ ہمارے پاس ہی رہے گا، مہرو کی محبوبہ ذونیا کے قبضے میں ہے، اب تمہیں اس کی محبوبہ بننا ہے اور اسے اپنے قابو میں کرنا ہے۔'' طلحہ نے پلاسٹک کی ڈبی سارہ کو دیتے ہوئے کہا۔

''جی میں سمجھ گئی کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔'' سارہ نے پلاسٹک کی ڈبی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''چلو پھر اب جاؤ اور اپنا کام شروع کر دو۔'' طلحہ نے سارہ سے کہا تو وہ سر ہلاتی چلی گئی۔

❁❁❁❁

تیمور کو جب ہوش آیا تو عشرت نے اسے وہ تمام احوال بتا دیا تھا جو اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے دیکھا تھا۔

''مطلب وہ لڑکی کوئی کسٹمر نہیں تھی بلکہ کوئی نوسر باز تھی۔'' تیمور نے سوچا اور پھر فرش پر پڑے پرس پر اس کی نظر پڑی تو تیمور فوراً صوفے سے اٹھا اور فرش پر پڑے پرس کی طرف بڑھا۔

''یہ تو مہر النساء کا پرس ہے۔'' تیمور نے کہا اور پھر عشرت کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہاں یہ تو مہر النساء کا پرس ہے لیکن اس کا پرس یہاں کیسے آ گیا؟'' عشرت حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''میں سی سی ٹی وی فوٹیج چیک کرتا ہوں، سب معلوم ہو جائے گا۔'' تیمور نے کہا اور وہ آفس سے نکل کر بزنس روم کی طرف بڑھ گیا۔ بزنس روم میں پہنچا تو وہاں اسٹاف موجود نہیں تھا تو تیمور گن مین کے پاس گیا تو گن مین شوروم کے باہر بے ہوشی کی حالت میں فرش پر پڑا تھا اور اس سے کچھ فاصلے پر سونے کے جھمکے پڑے تھے۔

''یہ تو مہر النساء کے جھمکے ہیں، جب وہ مشرف سے ملاقات کے لیے میرے آفس آئی تھی تو اس نے یہی جھمکے پہنے ہوئے تھے۔'' تیمور نے جھمکوں کو اٹھاتے ہوئے سوچا اور پھر آفس میں چلا گیا تو عشرت نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میرے آفس کا اسٹاف غائب ہے اور کسی نے کیمروں کی کیبل کاٹنے کے بعد تمام کمپیوٹرز آف کر دیئے تھے۔'' تیمور نے کہا اور جھمکے عشرت کی طرف بڑھا دیئے۔

''یہ تو مہر النساء کے ہیں۔'' وہ جھمکوں کو دیکھتے ہوئی بولی اور پھر تیمور کی جانب متوجہ ہوئی۔

''آپ کے بے ہوش ہو جانے کے بعد اس لڑکی نے آپ کا فون بھی استعمال کیا تھا، بس یہی ایک بات میں آپ کو بتانا بھول گئی تھی۔'' عشرت نے تیزی سے بولتے ہوئے کہا تو تیمور نے صوفے کے سامنے پڑی میز سے اپنا فون اٹھایا اور فون کی اسکرین پر انگلیاں پھیرنے لگا تھا۔

''میرے موبائل فون سے آخری بار مہر النساء کا نمبر ڈائل کیا گیا ہے، اس کا مطلب اس لڑکی نے میرے نمبر سے مہر النساء کو کال کر کے یہاں بلایا تھا۔'' تیمور نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''مطلب مہر النساء اغوا ہو چکی ہے۔'' لمحہ بھر توقف کے بعد تیمور نے کہا تو عشرت کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوئے اور وہ صوفے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی جبکہ تیمور نے فون پر انسپکٹر کامران کا نمبر ڈائل کیا۔

❁❁❁❁

''میں لالہ زار چوک جاؤں گی جبکہ تم گندم منڈی جاؤ گے، یہی دو جگہیں ہیں جہاں کاشف کو تلاش کیا جا سکتا ہے اور انہیں دو جگہوں پر ان لوگوں سے ہمارا سامنا ہو سکتا ہے جنہوں نے مہرو کو اغوا کیا ہے۔'' ذونیا نے عبایا اوڑھتے ہوئے کہا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

''کاشف کا معاملہ سمجھ میں آتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے مہروان دو سیٹھوں پر ہی بھتہ اکٹھا کرتا ہے لیکن جنہوں نے مہرو کو اغوا کیا ہے وہ وہاں کیوں آئیں گے؟'' عقیل نے پوچھا۔

''یہ بات طے ہے کہ مافیا کا وہ گروہ جس نے مہرو پر گولی چلائی تھی اور جنہوں نے اسے بچایا اور پھر اغوا کیا وہ دونوں مجھے ٹارگٹ کر رہے ہیں اس لیے مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے ضرور تلاش کر رہے ہوں گے۔'' ذونیا نے عقیل کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''پھر تو ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' عقیل نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''اسے پہن لو۔'' ذونیا نے عقیل کو عبایا دیتے ہوئے کہا تو عقیل نے اسے گھورتے ہوئے دیکھا۔

''عقیل! اسے پہن لو اور ساتھ ہی گلوز بھی پہن لو۔ اپنی حفاظت کے پیش نظر یہ تمہیں پہننا ہی پڑے گا۔'' ذونیا نے تحکمانہ لہجے میں کہا تو عقیل نے لمحہ بھر توقف کے بعد عبایا پکڑ لیا۔

پلان کے مطابق ذونیا لالہ زار چوک جبکہ عقیل گندم منڈی چلا گیا۔ ذونیا مختلف مارکیٹوں اور دکانوں میں جاتی اور واپس دوبارہ لالہ زار چوک آ جاتی تھی۔ وہ مسلسل ایک گھنٹے سے کاشف کو تلاش کر رہی تھی جبکہ برقعہ میں ملبوس عقیل بھی متلاشی نظروں سے گندم منڈی میں گھوم رہا تھا۔ عقیل نے دو مشکوک افراد کا تعاقب شروع کر دیا جو متلاشی نظروں سے گندم منڈی میں کسی کو تلاش کر رہے تھے۔ وہ ایک پرانی عمارت میں داخل ہوئے تو عقیل بھی ان کا تعاقب کرتے ہوئے اس پرانی عمارت میں گھس گیا۔ اس عمارت کی ہر شے بہت پرانی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ بلیک اینڈ وائٹ اسکرین پر ساٹھ یا ستر کی دہائی کی کسی فلم کا سین دیکھ رہا ہو۔ وہ دبے پاؤں ہال نما ایک کمرے میں داخل ہوا تو وہ دونوں افراد جن کا وہ تعاقب کر رہا تھا ایک دم اس کے جانب پلٹے اور انہوں نے اس پر گولیاں فائر کر دیں۔ عقیل نے اندھا دھند جوابی فائرنگ کی لیکن وہ زیادہ دیر ان کا سامنا نہ کر سکا۔ دو گولیوں نے عقیل کا سینہ چیر دیا تھا اور اب فرش پر اس کا جسم بے جان پڑا تھا۔

☆☆☆☆☆

ایک ڈیڑھ گھنٹہ گشت کے بعد ذونیا کاشف کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

''تمہاری شہرناز میرے پاس ہے، اگر تم اس سے ملنا چاہتے ہو تو میرے پیچھے آ جاؤ۔'' ذونیا کاشف کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کاشف کے پاس سے گزر گئی۔ کاشف نے متحیر نگاہوں سے عبایا میں ملبوس اس عورت کو دیکھا جو ابھی ابھی سرگوشی کرتے ہوئے اس کے پاس سے گزری تھی۔

''یہ تو ذونیا ہی ہو سکتی ہے۔'' کاشف نے سوچا اور پھر اس کے پیچھے چل پڑا۔

ٹائروں والے گودام میں پہنچتے ہی ذونیا نے برقعہ اتار کر ایک طرف پھینکا اور گہری سانس لی جبکہ کاشف ذونیا کی جانب متوجہ ہوا۔

''کہاں ہے میری بیوی شہرناز؟'' کاشف نے کرخت لہجے میں ذونیا سے پوچھا۔

''مجھے ایک فون کال کر لینے دو پھر تمہیں شہرناز کے پاس لے جاؤں گی۔'' ذونیا نے معنی خیز نظروں سے کاشف کو دیکھتے ہوئے کہا اور پھر فون پر عقیل کا نمبر ڈائل کر دیا۔ کال اٹینڈ ہو چکی تھی لیکن دوسری جانب مکمل خاموشی تھی۔

''عقیل! تم کہاں ہو؟'' ذونیا نے فون پر بات کرتے ہوئے پوچھا تو جواب میں دوسری جانب سے زوردار قہقہہ لگایا گیا تھا۔ ذونیا نے حیران ہوتے ہوئے فون اسکرین کو دیکھا تو اسے تسلی ہو گئی کہ اس نے عقیل کا نمبر ہی ڈائل کیا تھا اور ذونیا نے فون دوبارہ کان سے لگا لیا۔

''تم نے برقعہ میں لپیٹ کر جو بہروپیا ہمارے پاس بھیجا تھا وہ میری گولی کا نشانہ بن چکا ہے اور اب تمہاری باری ہے۔'' دوسری طرف سے دھمکی خیز لہجے میں کہا گیا اور کال منقطع ہو گئی۔

''اب مجھے شہرناز کے پاس لے چلو۔'' کاشف نے کہا تو ذونیا نے اسے غصیلی نگاہوں سے دیکھا۔

''تم تھوڑی دیر کے لیے خاموش نہیں رہ سکتے۔'' ذونیا نے روہانسا ہو کر کہا اور پھر سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

☆☆☆☆☆

''مشرف کبھی بھی اتنا غافل نہیں تھا، اس نے کبھی فون آف نہیں رکھا تو پھر آج اس کا فون کیوں آف ہے؟'' قاسم

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

مہرالنساء کی تصویر کے سامنے کھڑا اپنی سوچوں میں گم تھا کہ طلحہ کسی وہاں آ گیا۔

"یس باس...... مجھے کیوں بلایا ہے؟" طلحہ نے پوچھا تو وہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔

"دو دن پہلے مشرف مہرالنساء سے ملاقات کے لیے گیا تھا اور اس کے بعد اس کی کوئی خبر نہیں ہے اور اس کا فون بھی بند ہے۔" قاسم نے اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"باس! فکرمند نہ ہوں، میں ابھی اس کی خبر لیتا ہوں۔" طلحہ تیزی سے کہتا ہوا واپس مڑ گیا تو قاسم دوبارہ مہرالنساء کی تصویر کی جانب متوجہ ہو گیا۔

??????

تقریباً دو گھنٹوں بعد طلحہ دوبارہ قاسم کے پاس آیا اور اسے صورتحال سے آگاہ کرنے لگا تھا۔ اس نے قاسم کو بتایا کہ مشرف اور اس کا ڈرائیور نبیل دونوں ہی غائب ہیں اور پھر اس نے ایک سی ڈی ڈسک قاسم کی جانب بڑھائی جس کی بیک سائیڈ پر یہ عبارت درج دی تھی (قاسم کے نام پیغام)

ڈسک کی بیک سائیڈ پر اپنا نام دیکھ کر قاسم بوکھلا گیا اور وہ طلحہ کے ہمراہ دوسرے کمرے میں گیا۔ طلحہ نے لیپ ٹاپ آن کیا تو قاسم نے ڈسک سی ڈی روم میں لگا دی اور ایک منٹ کے بعد لیپ ٹاپ کی اسکرین پر ایک وڈیو ڈسپلے ہو گئی۔ وڈیو دیکھتے ہی قاسم کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور اس کی آنکھوں میں غصہ تر آیا۔ وڈیو دیکھنے کے بعد قاسم بی ایم ڈبلیو کار میں سوار ہو کر اپنے سیکیورٹی گارڈز کے ہمراہ صابی ہاؤس سے روانہ ہو گیا۔ دس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بی ایم ڈبلیو کار ایک چھوٹے سے سپر ون پٹرولنگ اسٹیشن کے سامنے رکی۔ یہ سپر ون پٹرولنگ اسٹیشن آبادی سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ قاسم تین مسلح افراد کے ساتھ کار سے نکلا تھا جبکہ دوسری کار سے طلحہ چار مسلح افراد کے ساتھ نکلا۔ سپر ون پٹرولنگ اسٹیشن کی مغربی دیوار کے ساتھ پکی راہداری تھی جو پٹرولنگ اسٹیشن کے عقب میں ایک بڑی چاردیوار کے گیٹ پر ختم ہوتی تھی۔ قاسم اور طلحہ مسلح افراد کے ساتھ اس چاردیواری میں داخل ہوئے۔ چاردیواری میں درختوں کی منظم قطاریں تھیں اور درمیان میں سے گزرنے کے لیے راستہ موجود تھا۔ قاسم اور طلحہ کے ساتھ موجود تمام مسلح افراد پوری طرح سے الرٹ تھے۔ اب وہ مستطیل شکل کے بڑے سے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ جب تمام مسلح افراد داخل ہو گئے تو سب سے آخر میں قاسم اور طلحہ اندر داخل ہوئے۔

"پیارے قاسم خوش آمدید۔" نسوانی آواز میں کہا گیا تھا اور یہ نسوانی پورے کمرے میں گونجی تھی جیسے کوئی لاؤڈ اسپیکر میں بولا تھا۔

قاسم نے اطراف میں نظریں دوڑائیں تو اسے معلوم ہوا کہ کمرے کا کچھ حصہ تاریک تھا اور کچھ روشن۔ قاسم روشن حصے کی طرف بڑھ گیا۔ قاسم نے دیکھا کہ ایک کرسی پر مہرالنساء زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔

"پیارے قاسم! پہلے اپنی محبوبہ کے پاس جانا پسند کرو گے یا اپنے دوست مشرف کے بارے میں اچھی خبر سننا پسند کرو گے؟" پورے کمرے میں نسوانی آواز گونجی تھی۔

"باس! ہم نے کمرے کا کونہ کونہ چیک کر لیا ہے، ہمیں بالکل معلوم نہیں ہو سکا کہ اسپیکر کہاں پر فکس ہے۔" طلحہ نے قاسم کے برابر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"کھیل بہت دلچسپ ہے، فی الحال اس کھیل سے مجھے لطف اندوز ہونا ہے۔" قاسم نے سرد لہجے میں کہا اور مہرالنساء کی جانب بڑھ گیا۔

"پیارے قاسم! تم نے محبوبہ کو ترجیح دی اور بیچارے دوست کا دل توڑ دیا۔" آواز ایک بار پھر گونجی تھی۔

"اس کا مطلب یہاں خفیہ کیمرے بھی فکس ہیں۔" قاسم نے طلحہ کی جانب دیکھتے ہوئے سوچا جبکہ طلحہ نے قاسم کی جانب دیکھتے ہوئے یہی بات سوچی تھی۔

"تمہارا دوست مشرف میرے پاس ہے، اگر تم مشرف کو دوبارہ زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو مہرالنساء کو حقیقت بتا دو، اس کو بتا دو کہ اس کے والد کا قتل تم نے کیا تھا۔" لاؤڈ اسپیکر میں بولتے ہوئے کہا گیا تھا جبکہ قاسم ایک دم شاکڈ ہو گیا تھا۔

"اصل میں مجھے مہرالنساء کی تلاش تھی لیکن خوش قسمتی سے مشرف سے میرا سامنا ہو گیا تھا، میں اسے اٹھا کر یہاں لے آئی تھی، مشرف مجھے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ مہرالنساء کہاں ہے تو اس لیے مجبوراً مشرف پر بہت زیادہ تشدد کرنا پڑا۔" نسوانی آواز پھر سے گونجی تھی۔ لوہے کی زنجیروں میں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

جھکڑی مہرالنساء نے متحیر نگاہوں سے قاسم کو دیکھا جبکہ قاسم اور طلحہ نے پریشان ہوتے ہوئے کمرے کی چھت پر نگاہیں دوڑائیں۔ چھت سوکھی ہوئی گھاس اور لکڑی کے شہتیروں پر مشتمل تھی۔ پورے کمرے میں نسوانی قہقہوں کی آوازیں گونجنے لگیں تھی۔

''یہاں اس کمرے میں لاؤڈ اسپیکر، مائیک اور کیمرے موجود ہیں لیکن تم چاہ کر بھی تلاش نہیں کر سکتے۔'' گونجتی ہوئی آواز کو نظر انداز کرتے ہوئے قاسم مہرالنساء کی جانب متوجہ ہوا تو مہرالنساء اسے غصے اور نفرت بھری نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ قاسم اس کے پاس گیا اور تھوڑا جھک کر اسے دیکھنے لگا۔

''اتنے برسوں بعد تم سے ملاقات ہوئی ہے، تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔'' قاسم نے مہرالنساء کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو مہرالنساء نے خود کو زنجیروں سے آزاد کروانے کے لیے اپنی پوری قوت لگادی مگر وہ ناکام رہی اور کسمسا کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں غصے کی شدت مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ پھاڑ کھانے والی نظروں سے قاسم کو دیکھ رہی تھی۔

''کیا اپنی زندگی میں تم نے کبھی مجھ سے جھوٹ بولا ہے؟'' مہرالنساء نے خشک لہجے میں پوچھا۔

قاسم کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں ہوگئے اور اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر وعدہ کرو آج بھی مجھ سے جھوٹ نہیں بولو گے۔'' مہرالنساء کے لہجے میں شدید غصہ اور کپکپاہٹ تھی جبکہ اس کی آنکھوں میں نمکین پانی اتر آیا تھا تو قاسم نے وعدہ کرلیا کہ وہ مہرالنساء کے ساتھ جھوٹ نہیں بولے گا۔

''بدر نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ اس نے تمہارے کہنے پر میرے بابا کو زہر دیا تھا، کیا یہ بات سچ ہے؟'' مہرالنساء نے غصیلے لہجے میں پوچھا تو قاسم نے نظریں جھکا لیں اور اثبات میں سر ہلایا جبکہ مہرالنساء کی آنکھوں سے ایک تسلسل کے ساتھ آنسو جاری ہوگئے۔

''ملک ہشام نے حالات ہی کچھ اس طرح سے پیدا کر دیئے تھے کہ میں غلط فہمی کا شکار ہوگیا تھا، میں نے زرشاد ماموں کو اپنے ڈیڈی کا قاتل مان لیا تھا اور ڈیڈی کے قتل کا انتقام لینے کے لیے زرشاد ماموں کو قتل کرنا مناسب سمجھا۔'' قاسم نے کہا۔

ملک ہشام کا نام سنتے ہی مہرالنساء کے آنسو تو تھم گئے لیکن اس کے اندر کا وبال اس قدر شدید تھا کہ وہ اپنے غصے کو کنٹرول نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ تیز تیز اور گہری سانسیں لے رہی تھی اور بہت عجیب نگاہوں سے قاسم کو گھور رہی تھی۔

''آفاقی صاحب میرے ڈیڈی کے دوست تھے اور جب ان سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ میرے ڈیڈی کو قتل کروانے والا ملک ہشام تھا اور میں نے غلط فہمی کا شکار ہو کر زرشاد ماموں کو ناحق ہی قتل کروا دیا تھا۔'' قاسم نے ساری حقیقت بیان کرتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

''پیارے قاسم! آپ کا کھیل ختم ہوا، آپ کا دوست مشرف اس عمارت کے باہر پکی راہداری پر موجود ہے، مہرالنساء اور مشرف کے لاکرز کی کنجیاں ان کی کرسیوں کے نیچے لٹک رہی ہیں۔'' لاؤڈ اسپیکر میں کہا گیا۔

لاؤڈ اسپیکر میں بولا گیا پیغام سنتے ہی قاسم نے مہرالنساء کو زنجیروں سے آزاد کیا۔ پکی راہداری پر وہ سب واپس آئے تو مشرف کرسی پر بیٹھا تھا اور وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ طلحہ نے کرسی کے نیچے سے کنجیاں لیں اور مشرف کو زنجیروں کی قید سے آزاد کروایا۔

قاسم مشرف کی جانب متوجہ ہوا تھا۔ مشرف کا چہرہ بری طرح سے زخمی تھا۔ ناک اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ مشرف کو بری طرح سے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

''تمہاری یہ حالت کس نے کی؟'' قاسم نے سرگوشیانہ انداز میں مشرف سے پوچھا تو مشرف نے بند ہوتی آنکھوں کو پوری قوت سے کھولا اور قاسم کو ایک نظر دیکھا اور آنکھیں میچ لیں۔

''باس! یہ تو بے ہوش ہوگیا ہے۔'' طلحہ نے مشرف کی جانب دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

طلحہ نے مشرف کو کندھے پر اٹھایا جبکہ مہرالنساء کا قاسم سے رویہ نامناسب تھا۔

❖ ❖ ❖ ❖

قدیر اور اجالا سپرون پٹرولنگ اسٹیشن کی بیسمنٹ میں موجود ایک کمرے سے نکل رہے تھے۔ اجالا، قدیر کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھی۔

''تمہارا پلان میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔'' قدیر نے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

انتباہ

نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز کی جانب سے متنبہ کیا جاتا ہے جو ویب سائٹس ہمارے ادارے سے شائع ہونے والے ڈائجسٹوں کی کہانیاں شائع کر رہے ہیں اور وہ سوشل میڈیا گروپ و پیج ہمارے ادارے کا نام استعمال کر رہے ہیں ان کا ادارے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے ایسے تمام افراد کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ ادارے کا نام اور مواد کا استعمال فوری ترک کر دیں تاکہ ہمارے قارئین کسی بھی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین' افسانے' اور کہانیاں بلا اجازت اور غیر قانونی طور پر اپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں۔ انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں' بصورت دیگر ادارہ' سائبر کرائم کے قانون کے مطابق

PREVNTION ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

Waqar Azeem

اور

Pakistanipoint.com

COPYRIGHT ORDINCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد / اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

ماہنامہ **آنچل** **نئے افق** **حجاب** کراچی

نئے افق گروپ آف پبلیکیشنز

81 نیپر بیرکس، ہاکی اسٹیڈیم، نزد آنچل پریس کراچی 75510

35620771/2 فون 03008264242

تبصرہ کرتے ہوئے کہا تو اجالا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"تم قاسم اور اس کے گینگ کو باآسانی مار سکتی تھیں لیکن......" قدیر نے کہا اور جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"قدیر! میں تم سے کھل کر بات کرنا چاہتی ہوں۔" اجالا نے کہا تو قدیر نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا جبکہ اب وہ دونوں بیسمنٹ سے نکل کر گیراج کی طرف جا رہے تھے۔

"میں قاسم سے بہت محبت کرتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ ہمارا ملن ممکن نہیں۔" اجالا نے کہا۔

قدیر نے اسے متجسس نگاہوں سے دیکھا۔

"قاسم کی باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اب بابا کا دشمن بن چکا ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ بابا کی وجہ سے نہ تو قاسم کو کوئی نقصان پہنچے اور نہ ہی قاسم میرے بابا کو کوئی ایذا پہنچا سکے اور اس ساری صورتحال کو ممکن بنانے کے لیے مجھے تمہاری ضرورت ہے۔" اجالا نے قدیر کو پرامید نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر کار کا دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر سوار ہو گئی جبکہ قدیر ڈرائیونگ سیٹ پر سوار ہو گیا۔

"میں ہر طرح سے تمہاری مدد کروں گا اور بدلے میں مجھے بھی کچھ چاہیے۔" قدیر نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"میں جانتی ہوں تمہیں کیا چاہیے۔" اجالا نے اداس ہوتے ہوئے کہا تو قدیر نے اسے پرمسرت نگاہوں سے دیکھا اور کار کو بیک کر لیا۔

"کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟" قدیر نے پوچھا تو اجالا نے اثبات میں سر ہلایا اور نگاہیں دوسری جانب پھیر لیں جبکہ قدیر نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور کار روڈ پر چڑھا دی۔

"کیا تم اپنے بابا کو قائل کر لو گی؟" قدیر نے پوچھا۔

"مجھے خود پر یقین ہے کہ میں یہ کر لوں گی۔" اجالا نے دوبارہ قدیر کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا تو قدیر من ہی من میں خوش ہو گیا اور اس نے کار کی اسپیڈ بڑھا دی۔

☆☆☆☆☆

یہ وہ عمارت تھی جہاں ملک ہشام نے اپنی حفاظت کے پیش نظر خود کو نظر بند کیا ہوا تھا۔ اجالا کو دیکھتے ہی ملک ہشام حیران سا ہو گیا۔

"بابا جانی! آج میں بہت خوش ہوں۔" کمرے میں داخل ہوتے ہی اجالا نے مسکراتے ہوئے کہا تو ملک ہشام نے اسے متجسس نگاہوں سے دیکھا۔

"آخر کار میں قاسم اور مہرالنساء کا سامنا کروانے میں کامیاب ہو گئی۔" اجالا نے پرمسرت لہجے میں کہا تو ملک ہشام کے تجسس میں مزید اضافہ ہو گیا۔

"بیٹی! یہ سب تم نے کیسے کیا اور کیا ناہید بیگم بھی وہاں موجود تھی؟" ملک ہشام نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

"میں نے سب سے پہلے مشرف کو اٹھایا اور اس پر خوب تشدد کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ مہرالنساء تیمور کے شو روم آفس اکثر آتی رہتی ہے، پھر میں نے قدیر کے ساتھ مل کر مہرالنساء کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا، میں اور قدیر مل کر اس شو روم پر نظر رکھے ہوئے تھے جس کا پتہ مشرف نے ہمیں بتایا تھا، ہمیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا اور مہرالنساء وہاں آ گئی، وہ آفس کے اندر گئی تو ہم اسے اغوا کرنے کے لیے آفس کے قریب پہنچ گئے اور کچھ دیر بعد ہم نے دیکھا کہ مہرالنساء بے ہوشی کی حالت میں تھی اور ایک لڑکی اسے کار میں ڈال کر لے گئی۔" اجالا ملک ہشام کو تفصیل بتا رہی تھی کہ ملک ہشام نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اس کا مطلب کوئی اور بھی ہے جو مہرالنساء کو اغوا کرنا چاہتا تھا۔" ملک ہشام نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ لڑکی مہرالنساء کو دوسرے شہر لے جانا چاہتی تھی لیکن میں نے قدیر کی مدد سے اس کا راستہ روکا اور گن پوائنٹ پر مہرالنساء کو اس سے چھین لیا تھا۔" اجالا نے ملک ہشام کو بتایا۔

پھر کیا ہوا تھا؟" ملک ہشام نے پوچھا۔

"پھر میں نے ڈیجیٹل ڈسک میں قاسم کے نام دھمکی خیز پیغام ریکارڈ کروایا اور اسے باور کروایا کہ مہرالنساء کو معلوم ہو چکا ہے کہ زرشاد چودھری کے قتل کے پیچھے تمہارا ہاتھ تھا۔" اجالا نے قاسم کو جو دھمکی دی تھی اس کے بارے میں ملک ہشام کو بتاتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں قاسم کا پتہ معلوم تھا؟" ملک ہشام نے پوچھا تو اجالا نے نفی میں سر ہلایا اور ملک ہشام نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"مجھے قدیر نے بتایا تھا کہ مشرف قاسم کے لیے کام کرتا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ہے اور اسے اندازہ تھا کہ جب مشرف قاسم کے پاس نہیں جائے گا اور نہ ہی اس سے ٹیلیفونک رابطہ کرے گا تو قاسم کے آدمی مشرف کے آفس ضرور جائیں گے، پس میں نے وہ ڈیجیٹل ڈسک مشرف کے آفس بھجوا دی جس میں قاسم کے لیے دھمکی خیز پیغام ریکارڈ کروایا تھا، اس کے بعد قدیر نے بدر کی ملاقات مہرالنساء سے کروا دی تو بدر نے اسے بتایا تھا کہ اس نے قاسم کے کہنے پر زرشاد چودھری کی چائے میں زہر ملایا تھا اور زرشاد چودھری کو زہر آلود سگریٹ بھی دیا تھا۔" اجالا نے ملک ہشام کے ذہن میں ابھرنے والے سوالوں کے جوابات دیتے ہوئے ساری تفصیل بتادی تھی۔

"تم نے قاسم اور مہرالنساء کی ریکارڈنگ کی وڈیو ناہید کو دے دی؟" ملک ہشام نے اجالا سے پوچھا۔

"اس وڈیو میں کچھ ایسی باتیں موجود تھیں جو می جان کو شک میں مبتلا کر سکتی تھیں اس لیے ان باتوں کو وڈیو سے ریموو کرنا ضروری تھا۔" اجالا نے کہا اور ملک ہشام کے چہرے کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا باپ اب سے کون سا سوال کرے گا اور اس نے ملک ہشام کے بولنے سے پہلے ہی اپنی بات شروع کرنا مناسب سمجھا۔

"قاسم نے مہرالنساء کو بتایا تھا کہ آپ نے قاسم کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ اس نے اپنے والد کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے غلط فہمی کا شکار ہوتے ہوئے زرشاد چودھری کو قتل کروایا تھا اور اسے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے والد کو آپ نے قتل کروایا تھا۔" اجالا نے نظریں چراتے ہوئے ملک ہشام سے کہا تو ملک ہشام کے چہرے کے تاثرات یکسر بدل گئے۔

"تمہارے پاس موقع تھا تو تم نے قاسم کو قتل کیوں نہ کر دیا۔" ملک ہشام نے خشک اور سخت لہجے میں پوچھا۔

"بابا جانی! میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ قاسم میری پہلی محبت ہے اور بھلا کوئی اپنی پہلی محبت کو قتل کر سکتا ہے؟" اجالا نے ملک ہشام کی بات سنتے ہوئے سوچا جبکہ ملک ہشام نے اپنا سوال دوبارہ دہرایا۔

"بابا جانی! اصل میں پلاننگ کرتے وقت میں نے قاسم کو قتل کرنے کا سوچا نہیں تھا اور منصوبہ بندی کے بغیر قاسم کو قتل کرنے کی کوشش کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔" اجالا نے تیز تیز بولتے ہوئے کہا۔

❁❁❁❁

جس کمرے میں مہرالنساء تھی اسی کمرے سے قاسم باہر آیا تو اس کی حالت بگڑی ہوئی تھی۔ اس کے لباس اور بالوں کی حالت دیکھ کر طلحہ گھبرا سا گیا۔

"کیا ہوا ہے؟" طلحہ نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

"مہرالنساء نے مجھ پر حملہ کیا، اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی، اس نے میری گردن کو دبوچ لیا تھا بہت مشکل سے اس کی گرفت سے اپنی گردن آزاد کروا کر آیا ہوں۔" قاسم نے کھسیائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ اس کے باپ کے قاتل ہیں، نفرت کا اظہار کرنا اس کا حق ہے۔" طلحہ نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"مشرف نے کچھ بتایا؟" قاسم نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

"مشرف نے بتایا ہے کہ اسے اجالا نے اغوا کیا تھا اور وہ مہرالنساء کا پتہ جاننا چاہتی تھی، پتہ نہ بتانے کی وجہ سے مشرف کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا اور آخر کار مشرف نے بے بس ہوتے ہوئے اجالا کو بتا دیا کہ مہرالنساء اکبر تیمور کے آفس میں رکھی ہے۔" طلحہ نے مشرف سے حاصل ہونے والی معلومات کی ساری تفصیل بتادی۔

"جتنا جلد از جلد معلومات حاصل کرو کہ اجالا کون ہے اور یہ بھی معلوم کرو کہ اجالا کا تعلق مافیا سے ہے یا نہیں۔" قاسم نے طلحہ کو ہدایات جاری کرتے ہوئے کہا۔

"مشرف نے بتایا ہے کہ جب اجالا مہرالنساء کو یرغمال بنا کر لائی تھی تو اس کے ساتھ قدیر بھی تھا۔" طلحہ نے کہا تو قاسم نے اسے آنکھیں سکیڑتے ہوئے دیکھا۔

"مطلب وہ لڑکی قدیر کے گینگ کا حصہ ہے اور بدر نے قدیر کے کہنے پر مہرالنساء کو بتایا ہوگا کہ اس کے باپ کا قاتل میں ہوں۔" قاسم نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"مشرف کہہ رہا تھا مہرالنساء سے اجالا کے بارے میں مزید معلومات مل سکتی ہے۔" طلحہ نے کہا۔

"وہ بہت غصے میں ہے، وہ کچھ نہیں بتائے گی۔" قاسم نے کہا۔

"آپ مجھے ایک بار کوشش تو کرنے دیں۔" طلحہ نے کہا تو قاسم نے اسے اس کمرے میں جانے کے لیے اشارہ

کیا جہاں پر مہر النساء موجود تھی۔

"السلام وعلیکم۔" کمرے میں داخل ہوتے ہی طلحہ نے کہا تو مہر النساء نے سلام کا جواب دیتے ہوئے طلحہ کو گردن سے پاؤں تک گھورا اور پھر اس کی نگاہیں طلحہ کے کوٹ کی دائیں جیب پر مرکوز ہوگئیں اور پھر وہ بیڈ سے اٹھی اور طلحہ کے روبرو کھڑی ہوئی۔

"مجھے اجالا کے بارے میں کچھ معلومات چاہیے۔" طلحہ نے کہا تو مہر النساء نے ایک نظر اس کے چہرے کی جانب دیکھا اور دوبارہ کوٹ کی دائیں جیب پر نگاہیں مرکوز کر لیں۔

"اجالا ملک ہشام کی سگی بیٹی ہے۔" مہر النساء نے کہا تو طلحہ نے اسے متحیر نگاہوں سے دیکھا جبکہ مہر النساء نے اچانک طلحہ کے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر اگلے لمحے طلحہ کا پستول مہر النساء کے ہاتھ میں تھا۔ طلحہ اسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جبکہ وہ پستول کی نال طلحہ کی پیشانی پر رکھ چکی تھی۔ جب طلحہ کمرے سے باہر آیا تو طلحہ آگے چل رہا تھا اور مہر النساء اس کے عقب میں تھی۔ طلحہ کی گردن کے گرد مہر النساء کا بازو حصار کی طرح تھا جبکہ دوسرے ہاتھ کی مدد سے مہر النساء نے طلحہ کی کنپٹی پر پستول تان رکھا تھا۔ قاسم یہ منظر دیکھ کر مزید پریشان ہوگیا جبکہ قاسم کو دیکھتے ہی مہر النساء کا غصہ مزید بھڑک اٹھا اور اس نے طلحہ کی گردن پر گرفت مضبوط کر دی۔

"مجھے یہاں سے جانے دو ورنہ میں تمہارے ساتھی کی جان لے لوں گی۔" مہر النساء نے غراتے ہوئے کہا تو قاسم نے سینئر گارڈز کی طرف دیکھا۔ اسی دوران طلحہ نے ہاتھ سے قاسم کو اشارہ کیا کہ وہ پرسکون رہے تو قاسم نے گارڈز کو اپنے اردگرد اکٹھا کر لیا اور مہر النساء کو جانے کے لیے محفوظ راستہ دے دیا۔ صابی ہاؤس سے نکلنے کے بعد مہر النساء نے طلحہ کو کار ڈرائیو کرنے کے لیے بولا اور اگلے ہی لمحے طلحہ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھا جبکہ مہر النساء کار کی عقبی سیٹ پر موجود تھی۔ اس نے طلحہ کے سر پر پستول تان رکھا تھا جبکہ طلحہ مہر النساء کی ہدایات کے مطابق کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ جونہی کار نے روڈ کا رخ کیا تو طلحہ نے سائیڈ مرر میں دیکھا کہ ایک دوسری کار اس کی کار کا تعاقب کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد مہر النساء محتاط انداز میں جھانکتے ہوئے روڈ کی اطراف کا جائزہ لینے لگی۔ جب کار بڑی بڑی عمارتوں کے درمیان والے روڈ سے گزر رہی تھی تو مہر النساء نے طلحہ کے سر پر سے پستول کی نال اٹھالی اور یکے بعد دیگرے اس نے دوبار پستول کا دستہ طلحہ کے سر میں مارا تو کار کا توازن بگڑ گیا۔ کار فٹ پاتھ پر چڑھ گئی اور پھر درخت سے ٹکرا گئی۔

❖❖❖❖

تیمور اپنے کمرے میں موجود تھا۔ وہ کافی پریشان تھا لیکن اس کے والد کی باتیں اس کی پریشانی میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔

"میرے بیٹے! تم نے کہانیوں میں پڑھا بھی ہوگا اور ایسی کہانیاں بھی سنی ہوں گی جن میں اکثر یہ ذکر ہوتا ہے کہ فلاں بادشاہ نے اپنی بیٹی کی شادی کسی دور دراز کی ریاست کے شہزادے سے کی، بادشاہ ایسا اپنے سیاسی مفادات کے لیے کرتے تھے اور آج کل بھی سیاستدان اپنی اولاد کی شادیاں سیاستدانوں کے خاندانوں میں کرتے ہیں، ایسا کرنا دونوں خاندانوں کے مفادات میں بہتر ثابت ہوتا ہے اور مجموعی طور دونوں خاندانوں کا سیاسی دھڑا مضبوط ہوتا ہے۔" محمود صاحب رطب اللسان بول رہے تھے۔

تیمور غصیلی نگاہوں سے محمود صاحب کو گھورتے ہوئے سن رہا تھا۔

"اگر تمہاری شادی یاور صاحب کی بیٹی سے ہو جائے تو یاور صاحب کی نسبت اس شادی میں میرے مفادات زیادہ ہیں۔" محمود صاحب نے کہا تو تیمور صوفے سے اٹھا اور محمود صاحب کے روبرو کھڑا ہوگیا۔

"میں کسی صورت، کسی بھی قیمت پر یاور صاحب کی بیٹی سے شادی نہیں کروں گا۔" تیمور نے دوٹوک انداز میں کہا۔

محمود صاحب غصہ کرنے کی بجائے مسکرانے لگے اور اسی دوران ایک ملازمہ کمرے میں آئی تو محمود صاحب اس کی جانب متوجہ ہوئے۔

"سیٹھ صاحب! آپ نے واچ مین سے کہا تھا کہ وہ مہر النساء کو کوٹھی کے اندر مت آنے دے لیکن وہاں کولاونج تک لے آیا۔" ملازمہ نے کہا۔

"اسے یہاں لے آؤ۔" محمود صاحب نے کہا تو تیمور حیران سا ہوگیا۔

مہر النساء کمرے میں آئی تو اسے دیکھتے ہی تیمور کو اندازہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ہو گیا تھا کہ وہ کافی پریشان اور افسردہ ہے۔

''ڈیڈی! میں تنہائی میں مہر النساء سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' تیمور نے کہا تو محمود صاحب نے تیمور اور مہر النساء کو گھورتے ہوئے دیکھا اور پھر وہاں سے چلا گیا۔

''آپ پچھلے دو دن سے کہاں تھی؟'' تیمور نے مہر النساء کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا تو مہر النساء اسے دیکھتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''مجھے پہلے اجالا نے اغوا کیا تھا اور پھر قاسم زبردستی مجھے اپنی رہائشگاہ لے گیا تھا۔'' اس نے افسردہ لہجے میں بتایا تو تیمور مہر النساء کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''اجالا کون ہے؟'' تیمور نے پوچھا۔

''وہ ملک ہشام کی بیٹی ہے۔ اور انڈر ورلڈ میں کافی اثر و رسوخ رکھتی ہے۔'' مہر النساء نے تیمور کو بتایا۔

''قاسم تو آپ کا محبوب ہے نا۔'' تیمور نے شرارتی نگاہوں سے مہر النساء کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب وہ میرا دشمن ہے۔'' اس نے کہا تو تیمور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ کمرے کے دروازے کی طرف متوجہ ہوا۔ شہزاد چار نقاب پوشوں کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔ تیمور کے ساتھ ساتھ مہر النساء بھی حیرت زدہ ہو گئی۔

''یہ سب کیا ہے؟'' تیمور نے متحیر لہجے میں شہزاد سے پوچھا۔

''یہ آپ کے ڈیڈی کا حکم ہے۔'' شہزاد نے مختصر جواب دیا جبکہ چاروں نقاب پوشوں نے تیمور کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور پھر تین نقاب پوش عورتیں آئیں اور مہر النساء گھسیٹتے ہوئے کمرے سے لے گئیں۔

''چھوڑو مجھے، یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہو؟ اسے کہاں لے کر جا رہے ہو؟'' تیمور غراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

تیمور نے خود کو نقاب پوشوں کی گرفت سے آزاد کروانے کے لیے پوری قوت لگا دی تھی لیکن نقاب پوشوں نے اسے ایک قدم تک آگے نہ بڑھنے دیا تھا۔

''مجھے چھوڑو، میں ڈیڈی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' تیمور ایک بار پھر غرایا۔

''تھوڑا صبر کرو، آپ کے ڈیڈی کچھ دیر تک یہاں آپ کے پاس آئیں گے۔'' شہزاد نے کہا تو تیمور نے اسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھا۔

''برسوں سے میں تمہیں اپنا دوست سمجھتا رہا لیکن تم بھی ڈیڈی کے چمچے نکلے ہو۔'' تیمور نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

''آپ بہت بے وقوف ہیں، یہ میں نہیں کہہ رہا بلکہ ایسا آپ کے ڈیڈی کہتے ہیں۔'' شہزاد نے مسکراتے ہوئے کہا تو تیمور نے نفرت بھری نگاہوں سے شہزاد کو گھورا اور اس نے شہزاد پر جھپٹنے کے لیے پوری قوت لگا دی لیکن وہ نقاب پوشوں کے مضبوط ہاتھوں میں کسمسا کر رہ گیا۔

❖❖❖❖

طلحہ زخمی حالت میں قاسم کے پاس پہنچا تو اس نے افسردہ و پریشان ہوتے ہوئے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''مہر النساء نے میرے سر میں پستول دستہ مارا تھا تو میں اسٹیئرنگ کو سنبھال نہ سکا اور گاڑی درخت سے ٹکرا گئی تھی جبکہ مہر النساء پستول گاڑی میں ہی پھینک کر بھاگ گئی۔'' طلحہ نے قاسم کو بتاتے ہوئے کہا۔

''میں نے تمہارے پیچھے دو آدمی بھیجے تھے؟'' قاسم نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

''وہ دونوں مہر النساء کے تعاقب میں گئے تھے لیکن وہ ایک شاپنگ مال میں گھس گئی تھی اور پھر وہ دوبارہ انہیں نظر نہ آسکی۔'' طلحہ نے کہا۔

''مہر النساء نے اجالا کے بارے میں کچھ بتایا تھا؟'' قاسم نے پوچھا تو طلحہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اس نے مجھے بتایا تھا کہ اجالا ملک ہشام کی سگی بیٹی ہے۔'' طلحہ نے کہا۔

''اجالا کو اب اغوا کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے، تم مرہم پٹی کروا لو اور پھر اجالا کو تلاش کرنا شروع کر دو۔'' قاسم نے تحکمانہ لہجے میں کہا تو طلحہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے چلا گیا۔

❖❖❖❖

''بابا جانی! ویڈیو میں جہاں جہاں بھی قاسم نے آپ کے متعلق بات کی تھی وہاں سے ویڈیو ریموو کر دی گئی ہے اب جو ریکارڈنگ باقی بچی ہے اسے دیکھ کر ناہید امی کو یقین ہو جائے گا کہ آپ نے زرشاد چوہدری کو قتل نہیں کیا تھا۔'' اجالا نے ملک ہشام کو یو ایس بی فلیش ڈسک دیتے ہوئے کہا۔

''بیٹی! تم نے مجھے خوش کر دیا۔'' ملک ہشام نے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

مسکراتے ہوئے کہا۔

''بابا جانی! قدیر نے میری بہت مدد کی ہے، مجھے اس کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے۔'' اجالا نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''تم اور عشرت تمہیں تلاش کر رہے ہوں گے اس لیے میں گارڈز کو تمہارے ساتھ بھیج دیتا ہوں۔'' ملک ہشام نے کہا۔

''اس کا مطلب آپ کو میری صلاحیتوں پر بھروسہ نہیں ہے۔'' اجالا نے ملک ہشام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، بیٹی! ایسی بات نہیں ہے۔'' ملک ہشام نے کہا۔

''بابا جانی! مجھے اپنی حفاظت کے لیے گارڈز کی ضرورت نہیں ہے۔'' اجالا نے دوٹوک انداز میں کہا تو ملک ہشام نے اسے اکیلے جانے کی اجازت دے دی۔

❖❖❖❖

ناہید بیگم وہ وڈیو دیکھ چکی تھی جو اجالا نے ملک ہشام کے لیے ناہید کو بھیجی تھی۔ یہ وڈیو دیکھنے کے بعد ناہید بیگم کو یقین ہو چکا تھا کہ زرشاد چوہدری کا قاتل ملک ہشام نہیں بلکہ قاسم ہے۔

''میں بہت شرمندہ ہوں۔'' ناہید بیگم نے کہا تو ملک ہشام نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''میں نے آپ کے خلاف بہت سازشیں کیں اس لیے میں بہت شرمندہ ہوں۔'' ناہید بیگم نے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔

''کون سی سازشیں؟'' ملک ہشام نے ناہید بیگم کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کو جو سانپ دکھائی دیتے تھے وہ سازش تھی، عشرت نے میرے کہنے پر آپ کے کمرے میں ایک آلہ نصب کیا تھا جو نشے والا دھواں چھوڑتا تھا۔'' ناہید بیگم نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''یہ سازش نہیں تھی۔'' ملک ہشام نے کہا۔ ناہید بیگم نے ملک ہشام کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''یہ تو ایک شرارت تھی اور اس چھوٹی سی شرارت پر آپ کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔'' ملک ہشام نے مسکراتے ہوئے کہا تو ناہید بیگم اب بھی شرمندگی سے سر جھکائے ہوئے تھی۔

''آپ مسکرانے کی بجائے اب بھی شرمندہ ہیں؟'' ملک ہشام استفہامیہ انداز میں بولا۔

''میری سازش کی وجہ سے بہرام ہسپتال میں شدید زخمی حالت میں پڑا ہے، اسی وجہ سے میں سخت شرمندہ ہوں۔'' ناہید بیگم نے کہا۔

''مطلب؟'' ملک ہشام نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے ایک سازش کے تحت بہرام سے کہا کہ وہ شریف صاحب کی زمینوں سے صابرہ مائی کا قبضہ ختم کروائے اور جب بہرام نے اس معاملے پر ہاتھ ڈالا تو صابرہ مائی کی زمینوں پر کام کرنے والے مزدوروں نے اچانک بہرام کی گاڑی پر پتھر اور پھر بہرام پر ڈنڈے برسائے، بہرام شدید زخمی ہو کر کوما میں چلا گیا۔'' ناہید بیگم نے ملک ہشام کو ساری تفصیل بتا دی۔ ملک ہشام ناہید بیگم کی باتیں سن کر رنجیدہ ہو گیا اور وہ ناہید کی جانب دیکھے بنا ہی کمرے سے چلا گیا۔

❖❖❖❖

اجالا نے ایک شاپنگ مال سے قدیر کے لیے کچھ تحفے خریدے۔ شاپنگ مال سے نکلتے ہی وہ پارکنگ ایریا کی طرف چلی گئی۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ اچانک کسی نے اس کی کلائیوں کو پکڑا جبکہ دوسرے آدمی نے کلوروفام لگا رومال اس کی ناک پر رکھا۔ اجالا بے ہوش ہو گئی تو ایک آدمی گاڑیوں کے درمیان سے اسے گھسیٹتے ہوئے ایک پک اپ وین کے پاس لے گیا۔ اجالا کو بازوؤں سے پکڑ کر وین کے اندر سیٹ پر لٹا دیا۔ پک اپ وین نے روڈ کا رخ کیا۔ ابھی وین تھوڑی دور ہی گئی تھی کہ اچانک کسی نے وین کے ٹائر پر گولی چلائی اور ٹائر پھٹ گیا اور وین کو روڈ کے کنارے روک لیا گیا۔ وین کی فرنٹ سیٹ پر جو آدمی براجمان تھا وہ باہر آیا اور جھک کر ٹائر کو دیکھنے لگا تھا کہ تیز رفتار موٹر سائیکل آئی اور اس سے ٹکرا گئی۔ وہ آدمی دو فٹ کے فاصلے پر جا گرا جبکہ موٹر سائیکل سوار روڈ کے کنارے ایک چھوٹی سی کھائی میں جا گرا۔ موٹر سائیکل سوار نہایت پھرتی سے اٹھا اور ادھر ادھر نظر دوڑانے لگا تو اس کی نظر ایک ڈنڈے پر پڑی جو کچھ ہی فاصلہ پر پڑا تھا جبکہ اسی دوران

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان جو آدمی تھا وہ پستول تھامے وین سے باہر آیا اور اس جانب پلٹا جس جانب موٹر سائیکل سوار کھڑا تھا۔ دوسری جانب پلٹتے ہی اس آدمی کی پیشانی پر ڈنڈا مارا گیا اور اگلے ہی لمحے ڈنڈا اس کی کلائی پر مارا گیا تھا اور اس کے ہاتھ سے پستول گر گیا تھا۔ موٹر سائیکل سوار نے باری باری دونوں آدمیوں پر خوب ڈنڈا برسایا تھا اور پھر وہ اجالا کو وین سے نکال کر کلائیوں پر اٹھا کر لے گیا تھا۔

❖❖❖❖

اجالا کو جب ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک کمرے میں بستر پر پایا۔ اس کے پاس ایک لڑکی بیٹھی تھی۔

"میرا نام ذونیا ہے۔" اجالا اس لڑکی کی طرف متوجہ ہوئی تو اس نے اپنا نام بتاتے ہوئے کہا۔

"میں یہاں کیسے پہنچی تھی؟" اجالا نے پوچھا۔

"کسی نے آپ کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی بلکہ وہ لوگ آپ کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے تو پھر میرے کسی جاننے والے نے آپ کو ان لوگوں سے چھین کر مجھ سے رابطہ کیا اور میں آپ کو یہاں لے آئی تھی۔" ذونیا نے اجالا کو تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔

"مجھے بچانے والا کون تھا؟" اجالا نے پوچھا۔

"اس کا نام مہرو ہے۔" ذونیا نے اجالا کے سوال کا جواب دیا تو اگلے لمحے ذونیا کا فون تھرتھرانے لگا تھا۔ فون کی اسکرین پر کاشف کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ ذونیا نے کال اٹینڈ کی اور فون کان سے لگالیا۔

"مجھے شہرناز کے پاس کب لے کر جاؤ گی؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"آج شام کو لے جاؤں گی لیکن اس بات کا دھیان رکھنا کہ مہرو کو معلوم نہ ہو کہ تم یہاں میرے پاس ہو۔" ذونیا نے کاشف کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا اور کال منقطع کر دی۔

اب وہ اجالا کی جانب متوجہ ہوئی تو اجالا ایسے لیٹی تھی جیسے اس نے اس فون والی گفتگو پر بالکل دھیان نہ دیا ہو۔

"آپ نے اپنا نام نہیں بتایا مجھے۔" ذونیا نے اجالا کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا نام عزیزہ ہے۔" اجالا نے کہا۔

"ویسے وہ لوگ آپ کو کیوں اغوا کرنا چاہتے تھے؟ آپ کو کچھ آئیڈیا تو ہوگا؟" ذونیا نے پوچھا تو اجالا چونک پڑی۔

ماہنامہ آنچل حجاب کراچی

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

850 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے
8000 روپے

مڈل ایسٹ ایشیا افریقہ یورپ کے لیے
6000 روپے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ منی آرڈر منی گرام ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہیں۔

0316-0128216

0300-8264242

0300-8264242

نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز

فون نمبر: +922-35620771-2

naeyufaq.com

Info@naeyufaq.com

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

''نہیں...... مجھے کوئی آئیڈیا نہیں ہے، میری تو کسی سے کسی قسم کی کوئی دشمنی بھی نہیں ہے۔'' اجالا نے نارمل لہجے میں کہا۔

''آپ مجھ سے دوستی کرنا پسند کرو گی؟'' ذونیا نے پوچھا۔

''ہاں...... بالکل...... ضرور۔'' اجالا نے ذونیا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ اپنے بارے میں مطلب اپنی فیملی کے بارے میں بتانا پسند کریں گی؟'' ذونیا نے پوچھا۔

''ہاں میں بتاؤں گی لیکن ابھی مجھے اپنے کسی دوست سے فون پر بات کرنی ہے۔'' اجالا نے کہا۔

''کیا آپ کو اس کا فون نمبر یاد ہے؟'' ذونیا نے پوچھا تو اجالا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ذونیا نے اپنے پرس سے تین فون نکالے اور ان میں سے ایک فون اجالا کو دے دیا۔ اجالا نے فون پر نمبر ڈائل کیا اور کال اٹینڈ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

''قدیر! میں نے تمہیں شیخو کالونی کی اسٹریٹ نمبر چھ میں ایک زیر تعمیر عمارت کی تصویر ای میل کی تھی اور تمہیں وہاں آنے کا کہا تھا لیکن کسی نے مجھے بے ہوش کر دیا تھا اور مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔'' اجالا نے فون پر بات کرتے ہوئے کہا۔ قدیر کو اجالا کی بات سے اندازہ ہو گیا تھا کہ فون پر اجالا بات کر رہی ہے جبکہ قدیر کا نام سنتے ہی ذونیا چونک پڑی اور اب وہ اجالا کو مشکوک انداز میں دیکھ رہی تھی۔

''اب تم ٹھیک ہو؟'' قدیر نے پوچھا تو اجالا نے ''ہاں۔'' اجالا نے جواب دیا۔

''میں اسی زیر تعمیر ویران عمارت میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' قدیر نے کہا۔

''بس تھوڑا سا اور انتظار کر لو میں تھوڑی دیر تک وہاں آ رہی ہوں۔'' اجالا نے ممنون انداز میں کہا۔

''اوکے۔'' قدیر نے کال منقطع کر دی۔

اجالا نے ذونیا کو یقین دلایا کہ وہ اب ٹھیک ہے اور وہ اپنے دوست کے پاس جانا چاہتی ہے۔ ذونیا نے حامی بھر لی کہ وہ جہاں بولے گی ذونیا اسے، وہاں ڈراپ کر دے گی۔

❖ ❖ ❖ ❖

''تمہاری موجودگی میں مہرو یہاں سے فرار کیسے ہو گیا؟'' طلحہ نے گرجدار آواز میں سارہ سے پوچھا تو وہ سہم سی گئی۔

''مہرو نے کہا تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کو بازیاب کروانے کے بعد یہاں واپس آ جائے گا اور ہمارے ساتھ کام کرے گا، میری غلطی بس اتنی ہے کہ میں اس کی باتوں میں آ گئی تھی۔'' سارہ نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

''تم نے اسے چھوڑ دیا تھا تو اس نے میرا اور میرے آدمیوں کا تعاقب کیا، اجالا ہمارے ہاتھ لگ گئی تھی لیکن کمبخت مہرو اسے اپنے ساتھ لے گیا۔'' طلحہ نے غصیلے لہجے میں کہا اور اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اجالا کا ہاتھ سے نکل جانا اس کے لیے کتنا اذیت ناک اور پچھتاوے کا سبب تھا۔

''آپ میرے لیے جو بھی سزا طے کریں گے وہ میں بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔'' سارہ نے کہا۔

''تمہاری سزا یہی ہے کہ تم مہرو کو دوبارہ اغوا کر کے میرے پاس لاؤ گی۔'' طلحہ نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

❖ ❖ ❖ ❖

شیخو کالونی کی اسٹریٹ نمبر چھ میں زیر تعمیر عمارت کے سامنے ذونیا کی کار رکی۔ اجالا نے ذونیا کا شکریہ ادا کیا اور کار کا دروازہ کھول کر پاؤں باہر رکھا۔

''یہ زیر تعمیر عمارت آپ کی ہے؟'' ذونیا نے پوچھا۔

''یہ میرے بابا جانی کی ہے۔'' اجالا نے اس عمارت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کا دوست یہاں آپ کا منتظر ہے؟'' ذونیا نے پوچھا تو اجالا نے اثبات میں سر ہلایا اور کار سے باہر نکل گئی۔ ذونیا بھی کار سے باہر نکلی اور اجالا کے پیچھے چل پڑی۔

''یہ ذونیا ہے اور اسی کے دوست نے مجھے اغوا ہونے سے بچایا تھا۔'' اجالا نے کہا اور پھر اگلے لمحے وہ حیرت زدہ ہو گئی۔ قدیر نے آگے بڑھ کر ذونیا پر پستول تان لیا اور ذونیا نے قدیر کی ٹھوڑی پر پستول تان لیا۔

''قدیر! اسے چھوڑ دو۔'' اجالا نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''یہ آفاقی صاحب کی قاتل ہے، اسے کیسے چھوڑ دوں؟'' قدیر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

''آپ دونوں اپنے اپنے پستول ہٹاؤ۔'' اجالا نے کرخت لہجے میں کہا۔
''آفاقی صاحب نے ایک بیٹی کی طرح میری پرورش کی تھی، اگر آپ دونوں مجھے آفاقی صاحب کی بیٹی کا درجہ دیتے ہیں تو اپنی پستولیں نیچے کرلیں، فیصلہ آپ دونوں کا ہے۔'' اجالا نے بارعب لہجے میں کہا۔
قدیر نے اپنا دوسرا ہاتھ ذونیا کی چوٹی کی طرف بڑھایا جبکہ ذونیا نے اس کی کلائی پکڑ لی اور قدیر کا ہاتھ ذونیا کی چوٹی تک نہ پہنچ سکا۔
''اگر تم دونوں مافیا کی دنیا میں اپنا وجود برقرار رکھنا چاہتے ہو تو آپس کی دشمنی ختم کردو ورنہ کوئی بڑا بھیڑیا آپ کی دشمنی کا فائدہ اٹھا کر باری باری تم دونوں کا خاتمہ کردے گا۔'' اجالا نے قدیر اور ذونیا کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
''شہر میں تیسرا گینگ اپنے قدم جما چکا ہے، اسی گینگ نے مہرو کو اغوا کیا تھا اور پھر عزیزہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی۔'' ذونیا نے اجالا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو قدیر نے اپنی کلائی ذونیا کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کی۔
''قدیر! تمہیں میری قسم اپنی پستول ذونیا کی پیشانی سے ہٹادو۔'' اس بار اجالا نے التجائیہ لہجے میں کہا۔
ان دونوں نے اپنی اپنی پستول نیچے کرلیں۔
''قدیر! تم ذونیا کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ۔'' اجالا نے قدیر سے کہا تو اس نے اجالا کی بات کی پیروی کرتے ہوئے ذونیا سے ہاتھ ملالیا۔

❖❖❖❖❖

غم و غصہ اس کے دماغ پر حاوی تھا اس کے باوجود وہ خود کو بے بس اور مجبور محسوس کررہا تھا۔ اپنے حریف کو پاؤں کی ٹھوکر پر رکھنا اس کی عادت تھی لیکن آج اس کا کوئی حریف نہیں تھا۔ اس کے مقابل اس کا باپ تھا۔ باپ کے خلاف چال چلنا اسے مناسب نہیں لگ رہا تھا اس لیے اس نے اپنے باپ کے سامنے ہار ماننے کا فیصلہ کیا۔ اس کے کہنے پر محمود صاحب کو خبر دے دی گئی تھی کہ ان کا بیٹا ان سے ملنا چاہتا ہے اور وہ مہرالنساء والا مسئلہ بات چیت کے ذریعے حل کرنا چاہتا ہے۔ کچھ دیر بعد محمود صاحب اس کمرے میں آئے جہاں پر تیمور نظر بند تھا۔
''مجھے اندازہ ہے کہ تم نے یاور صاحب کی بیٹی سے نکاح کے عوض کچھ شرائط طے کی ہوں گی۔'' محمود صاحب نے کہا تو تیمور نے محمود صاحب کو پراعتماد نظروں سے دیکھا۔
''اپنی شرائط بیان کرو۔'' محمود صاحب نے کہا۔
''ایس ایچ او منیر کا ٹرانسفر، انسپکٹر کامران کی پروموشن اور مہرالنساء کی بازیابی...... یہ تین شرائط پوری ہوتے ہی میں یاور صاحب کی بیٹی سے نکاح کرلوں گا۔'' تیمور نے پراعتماد لہجے میں کہا تو محمود صاحب نے تیمور کی تینوں شرائط قبول کرلیں۔

❖❖❖❖❖

قاسم فریش ہونے کے بعد اپنے مخصوص کمرے میں آیا تو اسے بتایا گیا کہ طلحہ ملاقات کے لیے آیا ہے۔ قاسم نے ملازمہ کو اشارہ کیا تو وہ سر ہلاتی کمرے سے چلی گئی اور دو سے تین منٹوں بعد طلحہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے رسمی گفتگو کرتے ہوئے قاسم کے سامنے کسی لڑکی کی تصویر رکھی تو قاسم تصویر کو دیکھتے ہی چونک پڑا۔
''یہ کون ہے؟'' قاسم نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔
''یہ اجالا کی تصویر ہے، اسے اغوا کرنے سے پہلے لی تھی۔'' طلحہ نے قاسم کے بیڈ سے کچھ فاصلے پر پڑے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''تم نے اجالا کو اغوا کرلیا...... کہاں ہے وہ؟'' قاسم نے طلحہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''مجھے افسوس ہے کہ وہ ہمارے ہاتھ سے نکل گئی لیکن ہم دوبارہ اسے اغوا کرنے کی پلاننگ کرچکے ہیں۔'' طلحہ نے قاسم کو بتایا۔
''اپنی منصوبہ بندی کی وضاحت دو مجھے۔'' قاسم نے کہا۔
''اصل میں مہرو بھاگ گیا تھا اور اسی نے ہی اجالا کو ہمارے کارندوں سے چھینا تھا لیکن آج اس نے مجھ سے رابطہ کیا اور مجھے بتایا کہ اجالا، قدیر کے مافیا گروپ کا حصہ ہے، اجالا کی کوشش سے قدیر اور ذونیا نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملالیا ہے، مہرو نے مجھے بتایا کہ آج شام دونوں گروپ کسی ڈانسنگ کلب میں جائیں گے۔'' طلحہ نے قاسم کو ساری تفصیل بتادی۔
''مہرو تو ذونیا کے لیے کام کرتا ہے، وہ تمہیں یہ سب کیوں بتائے گا؟'' قاسم نے پوچھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

”اسے پیسے اور کچھ اسلحہ چاہیے تھا، اس نے مجھے معلومات فراہم کی اور میں نے، اس کی ضرورت پوری کر دی۔“ طلحہ نے قاسم کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”ہوسکتا ہے مہرو ہمارے ساتھ کوئی چال چل رہا ہو؟“ قاسم نے استفہامیہ انداز میں کہا۔

”میں ہر قسم کے حفاظتی اقدامات کا بندوبست کرنے کے بعد ہی ڈانسنگ کلب جاؤں گا، اب مجھے کوئی محفوظ ٹھکانہ چاہیے جہاں میں اجالا کو اغوا کرنے کے بعد منتقل کر سکوں۔“ طلحہ نے کہا تو قاسم نے اسے بتایا کہ مشرف محفوظ ترین جگہ کا بندوبست کر دے گا۔

❖ ❖ ❖ ❖

شام پھیل کر رات میں ڈھلنے لگی تھی۔ قدیر، بدر، کاشف، اجالا اور ذونیا سب اکٹھے ایک ساتھ ڈانسنگ کلب پہنچ چکے تھے۔ ذونیا نے اپنے اردگرد نظریں دوڑائیں اور پھر پریشان ہوتے ہوئے فون پر مہرو کا نمبر ڈائل کیا۔ مہر کا نمبر بند تھا۔ ذونیا تیز تیز چلتے ہوئے کاشف کے پاس گئی۔

”مہرو یہاں نہیں آیا، اس کا مطلب وہ وہاں چلا گیا ہے جہاں شہرناز ہے۔“ ذونیا نے کاشف کے کان میں سرگوشی کی تو اس نے متحیر نگاہوں سے ذونیا کو دیکھا۔

”اسے اس جگہ کا پتہ کیسے معلوم ہوا ہوگا؟“ کاشف نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے گذشتہ شام جب میں تمہیں شہرناز کے پاس سے لے گئی تھی تو ہوسکتا ہے مہرو نے ہمارا تعاقب کیا ہو اور اسے اس مکان کا پتہ معلوم ہو گیا ہو جس میں شہرناز موجود ہے۔“ ذونیا نے کہا تو کاشف اس کی بات سنتے ہی پریشان ہو گیا۔

”چلو یہاں سے نکلتے ہیں۔“ کاشف نے سرگوشیانہ انداز میں کہا تو ذونیا اجالا کے پاس گئی۔

”ہمارا ایک ساتھی مشکل میں ہے اس لیے ہمیں ابھی جانا پڑے گا۔“ ذونیا نے اجالا سے کہا۔

”کیا ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں؟“ اجالا نے پوچھا۔

”نہیں ضرورت نہیں ہے۔“ ذونیا نے کہا اور پھر کاشف کے ہمراہ وہاں سے چلی گئی جبکہ اجالا قدیر اور بدر کے ساتھ ڈانسنگ کلب میں ہی رک گئی۔

❖ ❖ ❖ ❖

مہرو تالا توڑ کر کمرے میں داخل ہوا تو شہرناز اسے دیکھتے ہی خوفزدہ ہو گئی۔

”تت...... تم یہاں؟“ شہرناز ہکلاتے ہوئے بس اتنا ہی بول سکی تھی جبکہ مہرو اس کے بالکل قریب آ گیا تھا۔ شہرناز کو مہرو کی گرم سانسیں اپنے چہرے پر محسوس ہوئیں تو وہ مزید خوفزدہ ہو گئی۔

”تمہیں کسی ایک کو چننا ہوگا۔“ مہرو سرد لہجے میں بولا۔

”میرے دل میں تمہارے لیے کوئی جذبات نہیں، تم جانتے ہو میں کاشف سے محبت کرتی ہوں۔“ شہرناز نے مہرو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو مہرو کا غصہ مزید بھڑک اٹھا۔ اس نے شہرناز کو بازو سے پکڑ کر اسے گھورتے ہوئے دیکھا۔

”میرا بازو چھوڑو، اب میں کاشف کی بیوی ہوں۔“ شہرناز نے اسے غصیلی نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا تو مہرو اس کی بات سن کر حیران ہو گیا۔ اس نے اپنا پستول نکالا اور شہرناز کی پیشانی پر پستول کی نال رکھ دی۔

”اگر تمہارے دل میں میرے لیے محبت نہیں ہے تو پھر تمہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“ مہرو نے کہا اور گولی فائر کر دی۔ مہرو فوراً کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تو اس کے سامنے ذونیا اور کاشف موجود تھے۔ مہرو گھبرا گیا اور وہ کاشف کو دھکا دے کر وہاں سے بھاگ گیا جبکہ کاشف فرش پر گر گیا تھا۔ کاشف اٹھا اور اس نے متحیر نگاہوں سے ذونیا کو دیکھا اور پھر اس کے ہمراہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ شہرناز کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ کاشف نے شہرناز کی نبض چیک کی اور پھر اس نے ذونیا کی طرف دیکھا۔ اگلے ہی لمحے وہ شہرناز کی لاش سے لپٹ کر رونے لگا جبکہ ذونیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

❖ ❖ ❖ ❖

طلحہ اور مشرف بھی ڈانسنگ کلب میں آ چکے تھے۔ وہ دونوں لابی میں کھڑے تھے۔ ایک نوجوان غیر محسوس انداز میں ان کی جانب بڑھا۔ اس کے نوجوان کے ہاتھ میں اجالا کی تصویر تھی۔ وہ یوں طلحہ کے قریب آ گیا جیسے اس کے لیے اجنبی ہو۔

”وہ اندر ہے، اس کے ساتھ صرف دو لوگ ہیں“ اس

نوجوان نے دوسری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ جب نکلے تو مجھے خبر دینا'' طلحہ نے کہا اور پھر وہ مشرف کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔ وہ دونوں ایک بڑے ہال میں داخل ہوئے۔ مشرف ایک کرسی پر بیٹھ گیا جبکہ طلحہ ایسے کونے میں چلا گیا جو نیم تاریک تھا۔ وہ متلاشی نظروں سے ہال میں موجود ہر فرد کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ آخر کار اس کی نظریں ہال کے دوسرے کونے میں ایک ٹیبل پر ٹھہر گئیں۔ ٹیبل کے گرد قدیر، بدر اور اجالا اپنی مخصوص نشستوں پر براجمان تھے۔ طلحہ بے چینی سے اس لمحے کا انتظار کرنے لگا جب اجالا نے وہاں سے نکلنا تھا جبکہ مشرف دوبارہ ہال سے باہر نکل گیا۔ طویل انتظار کے بعد طلحہ نے اجالا کی بے چینی بھانپ لی۔ اجالا نے قدیر کے کان میں سرگوشی کی اور کرسی سے اٹھ گئی جبکہ طلحہ مسلسل اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اجالا آگے چل رہی تھی جبکہ قدیر اور بدر اس سے پیچھے کچھ فاصلے پر برابر چل رہے تھے۔

اجالا ادھر اودھر دیکھتے ہوئے محتاط انداز میں خارجی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ چند لمحوں بعد خارجی دروازے سے باہر نکل گئی۔ طلحہ جلدی سے اٹھا اور اسی ... طرف بڑھتا ... دروازے سے اجالا، قدیر اور بدر باہر جا چکے تھے۔ وہ تینوں راہداری میں تیزی سے چل رہے تھے جس کے اختتام پر دروازہ تھا۔ دروازے کے قریب پہنچتے ہی طلحہ نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک ہتھوڑی نکالی اور قدیر کے سر کے پچھلے حصے پر ہتھوڑی سے وار کیا تو اس کے منہ سے چیخ بلند ہوئی۔ چیخ کی آواز سنتے ہی بدر طلحہ کی جانب مڑا تو اس نے بدر کی پیشانی پر ہتھوڑی ماری۔ قدیر اور بدر کی چیخیں سنتے ہی اجالا تیز تیز قدموں سے کار کی طرف بڑھنے لگی۔ اجالا نے کار کا عقبی دروازہ کھولا تو کسی نے اجالا کی گردن پر پستول کی نال رکھ دی۔

''... کون ہو تم؟'' اجالا نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

''مار دوں گا اگر کوئی حرکت ہوئی تو، چپ چاپ کار میں بیٹھو۔'' مشرف نے اجالا کی گردن پر پستول کی نال کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا تو اجالا تیزی سے کار کی عقبی نشست پر بیٹھ گئی اور پھر مشرف بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ایک پستول اس نے اس کے پہلو میں لگا دیا جبکہ دوسرے پستول کی نال ڈرائیور کی گردن پر رکھ دی۔

''نکلو باہر'' مشرف نے سرد لہجے میں کہا۔

جب تک ڈرائیور کار سے نکلا تب تک طلحہ بدر اور قدیر کو لہولہان کرنے کے بعد انتہائی تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا تھا۔ اس نے گیئر لگایا اور کار تیزی سے بھگا دی۔ اسے معلوم تھا کہ دو چار منٹ بعد ہر طرف پتہ چل جائے گا۔ یہی دو چار منٹ انتہائی قیمتی تھے اس لیے طلحہ پوری طرح محتاط تھا۔ چند منٹوں تک مین روڈ پر رہنے کے بعد اس نے کار ایک چھوٹی سڑک پر ڈال دی۔ کچھ دیر بعد کار ایک شٹرنگ اسٹور کے سامنے رکی۔ شٹرنگ اسٹور کے آفس کے ساتھ ایک فولادی دروازہ تھا۔

طلحہ کار کو اس دروازے کے قریب لے گیا اور پھر کار سے اتر کر اس نے فولادی دروازہ کھولا تو مشرف اجالا کو گھسیٹتے ہوئے اندر لے گیا۔ یہ طویل راہداری تھی جو رات کے اس وقت اندھیرے کا مسکن بنی ہوئی تھی۔ راہداری کے اختتام پر لکڑی کی ایک کاٹیج تھی۔ طلحہ نے باہر والا پھاٹک کھولا تو مشرف اجالا کو گھسیٹتے ہوئے اندرونی دروازے کی طرف لے گیا جبکہ طلحہ نے پاؤں کی ٹھوکر سے اندرونی دروازہ کھولا اور پھر اجالا کی جانب دیکھا۔ اجالا کے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں تھے۔ کاٹیج کے اندر داخل ہوئے تو اجالا مزید پریشان اور خوفزدہ ہو گئی۔ کاٹیج کا اندرونی ماحول کچھ ایسا تھا جیسے نجانے کب سے کسی کے استعمال میں نہیں تھی۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' اجالا نے ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ارے میری جان! اتنی جلدی بھی کیا ہے، قاسم صاحب آتے ہی ہوں گے۔'' مشرف نے اجالا کی ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

وہ قاسم کا نام سنتے ہی چونک پڑی۔ اس نے جھٹکے سے مشرف کا ہاتھ ہٹایا اور اسے غصیلی نگاہوں سے گھورنے لگی۔ ورنہ چار مسلح افراد کے ہمراہ قاسم اندر داخل ہوا۔ قاسم کو دیکھتے ہی اجالا چونک پڑی۔ مسلح افراد اجالا کے اطراف میں کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اجالا پر بندوقیں تان لیں۔

''صرف قدیر اور بدر کا پتہ بتا دو'' قاسم نے بالکل اس کے سامنے فرش پر گھٹنے ٹکا کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، کبھی نہیں بتاؤں گی'' اجالا نے اپنے خوف کو

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا تو قاسم کا پارہ ہائی ہو گیا۔ اس نے کھڑا ہوتا ہی اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا اور وہ کرسی سے فرش پر گر گئی جبکہ کرسی پہلے کی نسبت زیادہ ٹوٹ گئی۔ اجالا فرش سے اٹھی اور قاسم کے روبرو کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں شدید غصہ اور نفرت واضح دکھائی دے رہی تھی۔

''تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟'' اجالا نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

قاسم نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''میں عزیزہ ہوں جسے آفاقی صاحب نے منہ بولی بیٹی بنایا تھا اور مجھے اجالا کے نام سے مخاطب کیا تھا'' وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بول رہی تھی جبکہ قاسم کی آنکھوں میں تحیر کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔

''لیکن مہر النساء نے مجھے بتایا تھا کہ تم ملک ہشام کی بیٹی ہو'' طلحہ نے متحیر لہجے میں کہا تو اجالا طلحہ کی جانب متوجہ ہوئی۔

''اگر تم وہ اجالا ہو جسے آفاقی صاحب اپنی بیٹی مانتے تھے تو پھر تمہیں آفاقی صاحب کے تمام کارندوں کے ٹھکانے بھی جانتی ہو گی؟'' قاسم نے کہا تو اجالا نے اسے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

''مجھے تھوڑا تھوڑا یاد پڑ رہا ہے کہ تم مجھے پسند بھی کرتی تھی اور تمہاری وجہ سے آفاقی صاحب بھی مجھے پسند کرتے تھے، مافیا کا ڈان بننے میں تم میری مدد کرو، ہو سکتا ہے میں تمہیں بھی پسند کرنے لگوں'' قاسم کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''مجھے چھوڑ دو ورنہ میرے بابا جانی تمہیں برباد کر دیں گے۔'' اجالا نے دوٹوک انداز میں کہا۔

قاسم نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور وہ الٹ کر فرش پر جا پڑی۔ وہ دوبارہ اٹھی اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے قاسم کو دیکھنے لگی۔ اس کے لپ اسٹک لگے لبوں سے خون بہہ نکلا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت۔

''تم ملک ہشام کی بات کر رہی ہو، اسے تو اب میں ایسا برباد کروں گا کہ اس کی روح تک تڑپ جائے گی۔'' قاسم نے غراتے ہوئے کہا۔

''بابا سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟'' اجالا نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

''ملک ہشام نے میرے بابا کو قتل کروایا تھا اور پھر آفاقی صاحب کو میرا ہمدرد بنا کر میرے پاس بھیجا اور آفاقی کے ذریعے میرے لیے ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ میں زرشاد ماموں کو اپنے باپ کا قاتل سمجھ بیٹھا، میں نے غلط فہمی کا شکار ہو کر زرشاد ماموں کو قتل کر دیا اور اب اسی غلطی کی وجہ سے میری مہر النساء مجھ سے روٹھ چکی ہے۔'' قاسم نے رنجیدہ ہوتے ہوئے کہا تو طلحہ نے قاسم کو مخاطب کیا اور اسے بتایا کہ اجالا اسے باتوں میں الجھا رہی ہے۔

''تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو، تم میرے بابا یعنی ملک ہشام کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے لیکن تمہارا جو حشر ہو گا وہ تم نہیں جانتے ہو۔'' اجالا نے دھمکی خیز لہجے میں کہا تو قاسم نے اجالا کو بالوں سے پکڑ کر فرش پر پٹخ دیا۔ اجالا کا سر فرش سے ٹکرایا اور اس کی پیشانی سے خون بہہ نکلا۔

''میں روز مرا ہوں اور روز جیا ہوں، میں کب کا مر چکا ہوتا لیکن مجھے جس چیز نے اب تک زندہ رکھا وہ انتقام ہے، میں ہر صورت ملک ہشام سے انتقام لوں گا، اپنے بابا کے قتل کا انتقام، اپنے ماموں کے ناحق قتل کا انتقام۔'' قاسم دیوانوں کی مانند اجالا کے بال پکڑ کر بول رہا تھا جبکہ اجالا کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔

''چل پھر لگا فون ملک ہشام کو، اسے بتا کہ میں نے تمہیں اغوا کیا ہے۔'' قاسم نے غراتے ہوئے کہا۔

اجالا کی آنکھوں میں شدید حیرت تیرنے لگی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ قاسم اپنی موت کو خود کیسے گلے لگا رہا ہے۔ مشرف نے کار سے اجالا کا سیل فون اٹھا لیا تھا اور قاسم کے اشارے پر وہ سیل فون اجالا کی جانب بڑھا دیا۔

''قاسم! کبھی تم سے مجھے محبت تھی اور اب مجھے تم سے شدید نفرت ہے لیکن پھر بھی مجھے تم سے ہمدردی ہے، میں تمہیں موت کے منہ میں نہیں دھکیل سکتی۔'' اجالا نے تیز تیز بولتے ہوئے کہا۔

''اے کم ذات! فون لگا۔'' قاسم ایک بار پھر غرایا تو اجالا نے پھاڑ کھانے والی نظروں سے قاسم کو دیکھا اور فون لے کر نمبر پنچ کرنے لگی۔

❖❖❖❖❖

ہسپتال میں اپنے بیٹے بہرام کو دیکھنے کے بعد ملک ہشام ایس ایچ او منیر کی رہائشگاہ پر پہنچا تو منیر اسے گیسٹ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

روم میں لے گیا اور ملک ہشام کو خوش آمدید کہا۔

''صابرہ مائی کے مزدوروں نے میرے بیٹے بہرام پر حملہ کر کے اسے کومے میں بھیج دیا اور تم نے ان لوگوں کے خلاف ابھی تک کوئی کارروائی نہیں کی؟'' ملک ہشام نے رسمی گفتگو کیے بغیر ہی گرجدار آواز میں کہا۔

''مجھے اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں، میں کارروائی کیسے کرتا؟'' ایس ایچ او منیر نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''مہر النساء والے معاملے کی کیا خبر ہے؟'' ملک ہشام نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''مجھے آپ کے کسی آدمی نے خبر دی تھی کہ ایک فارم ہاؤس پر مہر النساء تیمور سے ملاقات کرنے آ رہی ہے تو میں نے اپنے کارندوں کو جعلی پولیس اہلکاروں کے روپ میں مہر النساء کو اغوا کرنے فارم ہاؤس بھیجا تھا لیکن ان سب کو قتل کر کے نہر میں پھینک دیا گیا تھا اور اس کے بعد مجھ پر قاتلانہ حملہ بھی کیا گیا۔'' ایس ایچ او منیر نے ملک ہشام کو ساری تفصیل بتا دی۔

ملک ہشام کچھ بولنے لگا تھا کہ اس کا فون بج اٹھا فون اسکرین پر اجالا کا نمبر نمودار تھا۔ ملک ہشام نے فوراً کال اٹینڈ کی۔

''بیٹی! تم دو دنوں سے کہاں ہو؟ میں تمہارے بارے میں فکر مند تھا۔'' ملک ہشام نے کال اٹینڈ کرتے ہی کہا۔

''بابا جانی! مجھے جس نے اغوا کیا ہے وہ آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔'' دوسری جانب سے اجالا نے کہا تو ملک ہشام لمحہ بھر میں پریشان ہو گیا جبکہ اجالا نے فون قاسم کی طرف بڑھا دیا۔

''مجھے بس یہ جاننا ہے کہ میرے والد آفتاب اور ان کے گینگ کو تم نے مروایا تھا؟'' قاسم اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

''اوہ تو تم قاسم ہو۔'' ملک ہشام نے کہا۔

''بالکل صحیح پہنچانا ہے تم نے۔'' دوسری جانب سے قاسم نے کہا۔

''تمہارا باپ میرے راستے کا سب سے بڑا کانٹا تھا اور اسے راستے سے ہٹانے کے لیے پہلے اس کے گینگ کو ختم کرنا ضروری تھا۔'' ملک ہشام نے کہا تو قاسم کا غصہ ایک بار پھر سے بھڑک اٹھا تھا۔

آپ دنیا کے کسی بھی خطے میں مقیم ہوں

ماہنامہ نئے افق ڈائجسٹ

ہم بروقت ہر ماہ آپ کی دہلیز پر فراہم کریں گے

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے ہر کونے میں 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے
6000 روپے

مڈل ایسٹ، ایشیائی، افریقہ، یورپ کے لیے
5000 روپے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر، منی گرام، ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہیں۔

مقامی افراد

ایزی پیسہ اکاؤنٹ نمبر
0316-0128216

موبی کیش اکاؤنٹ نمبر
0300-8264242

رابطہ: طاہر احمد قریشی...... 0300-8264242

نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز

81 ٹمبر بیرکس ہائی کلب آف پاکستان
اسٹیڈیم نزد آنچل پریس کراچی 75510

فون نمبرز: 2/35620771-922+

naeyufaq.com

Info@naeyufaq.com

"اب یہ بھی کنفرم کر دو کہ آفاقی تمہارا ہی کارندہ تھا۔" قاسم اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"ہاں وہ میرا کارندہ تھا لیکن اس نے میرے ساتھ غداری کی اور اس نے تمہیں تربیت دی، تمہیں میرے دوست زرشاد چوہدری کے خلاف ورغلایا اور تیرے ذریعے زرشاد کو قتل کروادیا۔" ملک ہشام نے تمام تر حقیقت قاسم پر آشکار کر دی تو قاسم نے کال منقطع کر دی۔

ملک ہشام اب ایس ایچ او منیر کی طرف متوجہ ہوا۔

"ملک صاحب! کیا ہوا ہے؟ کس کا فون تھا؟" ایس ایچ او منیر نے پوچھا۔

"قاسم کا فون تھا اس نے میری بیٹی اجالا کو اغوا کر لیا ہے اور تم میری بیٹی کو بازیاب کرواؤ گے۔" ملک ہشام نے منیر سے کہا۔

"میرا تو تبادلہ ہو چکا ہے اور میں صبح ہی ملہی پورہ تھانہ کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔" ایس ایچ او منیر نے کہا تو ملک ہشام اس کی بات سن کر سٹپٹا کر رہ گیا۔

❖❖❖❖

"اسے رسی سے باندھ کر یہاں سے لے جاؤ اور اس کا سیل فون یہیں پر چھوڑ دو، سیل فون کال کی وجہ سے بہت جلد اس جگہ کی نشاندہی ہو جائے گی اور کسی کو بھی یہاں پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ لگے گا، یہاں جو بھی اس کی تلاش میں آئے گا ہم اس کا شکار کریں گے۔" قاسم نے اجالا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا مگر وہ مشرف اور طلحہ سے مخاطب تھا جبکہ اجالا سب کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ قاسم اپنے گارڈز کے ہمراہ وہاں سے چلا گیا جبکہ مشرف نے اجالا کا اسکارف لے کر اس کے ہاتھ باندھ دیئے اور پھر اس پر پستول تان لیا جبکہ طلحہ اجالا کو گھسیٹتے ہوئے راہداری کی طرف گیا۔

❖❖❖❖

محمود صاحب نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ ایس ایچ او منیر کا تبادلہ ہو چکا تھا جبکہ کامران کی پروموشن ہو چکی تھی اور وہ نور نگر پور تھانہ کا ایس ایچ او تعینات ہو چکا تھا۔ محمود صاحب نے مہرالنساء کو عشرت کے پاس بھیج دیا تھا۔ اب وعدہ پورا کرنے کی باری تیمور کی تھی۔ محمود صاحب اس وجہ سے بہت خوش تھے کہ تیمور، یاور صاحب کی بیٹی سے نکاح کے لیے بالکل تیار تھا۔ میرج ہال میں نکاح کی تقریب منعقد ہو چکی تھی۔ مولوی صاحب نکاح پڑھانے کے لیے تیمور کے پہلو میں بیٹھے تو تیمور نے علی الاعلان کہا کہ اسے یہ نکاح قبول نہیں ہے۔

❖❖❖❖

آپ کی خواہش کے مطابق ایک چھوٹے اپارٹمنٹ کا بندوبست ہو گیا ہے، اس اپارٹمنٹ میں آٹو الیکٹرک سیکیورٹی سسٹم بھی نصب ہے۔" مشرف نے قاسم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"اس اپارٹمنٹ میں ہم مہرالنساء کو رکھیں گے۔" قاسم نے مسکراتے ہوئے کہا تو مشرف نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اجالا کی نسبت مہرالنساء کو اٹھانا زیادہ آسان ہے۔" قاسم نے کہا تو مشرف کے تجسس میں مزید اضافہ ہو گیا۔

"ہم پہلے تیمور کی کوئی کمزوری تلاش کریں گے اور تیمور ہمیں مہرالنساء کا پتہ بتائے گا۔" قاسم نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا تو مشرف نے اسے یقین دلایا کہ وہ بہت جلد تیمور کی کوئی کمزوری تلاش کر لے گا۔

مشرف کے جانے کے بعد طلحہ قاسم کے پاس آیا اور دونوں کے درمیان رسمی گفتگو ہوئی اور پھر طلحہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"تمہارا اندازہ درست تھا، فون کال کی وجہ سے جگہ کی نشاندہی ہو گئی تھی اور آدھا گھنٹہ بعد ملک ہشام کے چار کارندے اجالا کی تلاش میں وہاں آئے تھے، ان میں سے ایک کارندے کو میں نے یرغمال بنا لیا تھا اور باقی تینوں کو قتل کر دیا تھا۔" طلحہ نے قاسم کو بتاتے ہوئے کہا۔

"یرغمالی سے کسی قسم کی معلومات حاصل ہوئیں؟" قاسم نے پوچھا۔

"ہاں، اس سے کافی معلومات حاصل ہوئی ہے، اس نے بتایا ہے کہ اقراش حیاتی نامی شخص ملک ہشام کے لیے کام کر رہا ہے، ملک ہشام قبضہ گروپ کے بعد ایک گینگ بنانے کی تیاری کر رہا ہے، یرغمالی نے بتایا کہ اگر ہم نے اجالا کو نہ چھوڑا تو ملک ہشام اجالا کی بازیابی کا فریضہ اقراش حیاتی کو سونپ دے گا۔" طلحہ نے قاسم کو ساری تفصیل بتا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

دی۔

"ریغمالی سے مزید معلومات حاصل کرو۔" قاسم نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں اسے زندہ چھوڑ دوں تو وہ اقراش حیاتی تک پہنچنے کا طریقہ بتائے گا۔" طلحہ نے کہا تو قاسم نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"اس نے بتایا تھا کہ عطر رانی کے ذریعے اقراش حیاتی تک پہنچا جاسکتا ہے۔" طلحہ نے کہا۔

"مطلب تم نے ریغمالی کو چھوڑ دیا۔" قاسم نے طلحہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"عطر رانی کون ہے؟" قاسم نے پوچھا۔

"اس کا اصلی نام کچھ اور ہے لیکن وہ زیر زمین دنیا میں عطر رانی کے نام سے مشہور ہے۔" طلحہ نے قاسم سے کہا تو اس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار نمودار ہوگئے۔

❖ ❖ ❖ ❖

آبادی سے آدھا کلومیٹر دور مٹی کے اونچے ٹیلے پر مٹی سے بنے دو کچے مکان تھے۔ یہ مکان اس علاقے میں ویرانی و دہشت کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ دونوں میں سے ایک مکان کے وسط میں ایک ادھیڑ عمر شخص چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ یہ ادھیڑ عمر شخص مافیا اور گینگسٹر کی دنیا میں ارمان تابو کے نام سے مشہور تھا۔ ارمان تابو بہت بڑا گینگسٹر تھا اور پھر آفاقی صاحب نے اس کے گینگ کا خاتمہ کر کے ملہی اور اس کے گرد ونواح کے علاقے میں اپنے گینگ کو کام پر لگا دیا تھا جبکہ ارمان تابو اس گینگ وار میں زندہ بچ گیا لیکن وہ ذہنی مریض بن گیا تھا۔ مٹی کے ٹیلے کے اوپر چڑھنے تک قاسم نے طلحہ کو ارمان تابو کے بارے میں تمام تفصیل بتا دی تھی اور اب وہ دونوں اس مکان میں داخل ہو رہے تھے جس میں ارمان تابو دھوتی اور بنیان میں ملبوس چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ ارمان تابو نے آنکھیں سکیڑ کر قاسم اور طلحہ کو دیکھا تو اس نے خود کو اٹھانے کے لیے پوری قوت لگا دی لیکن وہ چارپائی سے نہ اٹھ سکا اور تب اس نے قاسم کی طرف ہاتھ بڑھایا تو قاسم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دست بوسی کی اور پھر پوری قوت سے ارمان تابو کو سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ اٹھ کر چارپائی کے وسط میں بیٹھ گیا۔ طلحہ چارپائی کی پائنتی جبکہ قاسم ایک پرانی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"میں ملک آفتاب کا بیٹا قاسم ہوں۔" قاسم نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا تو ارمان تابو نے اسے غور سے دیکھا اور پھر یوں ظاہر کیا جیسے اسے ملک آفتاب یاد آگیا تھا۔ اب اس نے قاسم کی آمد کی وجہ دریافت کی۔

"عطر رانی کون ہے؟" قاسم نے ارمان تابو سے پوچھا تو اس نے قاسم کو متحیر نگاہوں سے دیکھا۔

"تمہیں کیسے بتاؤں کہ یہ وہی غدار عورت ہے جس نے آفاقی کو میرے گینگ کا پتہ بتایا تھا۔" ارمان تابو نے قاسم کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

"میں عطر رانی کے بارے میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ ایک خوف کا نام ہے۔" ارمان تابو نے قاسم سے کہا۔

"یہ بوڑھا شخص مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے یا حقیقت بتا رہا ہے۔" قاسم نے ارمان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

"برسوں پہلے وہ عورت میرے گینگ کا حصہ تھی اور پھر اس نے آفاقی سے ہاتھ ملا لیا تھا، اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا شخص اس تک پہنچ سکا۔" ارمان نے قاسم کی مایوسی کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"مطلب عطر رانی تک پہنچنا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔" قاسم نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"ویسے تم عطر رانی سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟" بوڑھے ارمان تابو نے پوچھا۔

"اصل میں اقراش حیاتی مجھے اور میرے ساتھیوں کو ٹارگٹ کرنے والا ہے، اگر عطر رانی سے ملاقات ہوجائے تو ہم اس کے ذریعے اقراش حیاتی تک پہنچ جائیں گے اور اقراش حیاتی کا خاتمہ کردیں گے۔" طلحہ نے ارمان تابو سے کہا تو قاسم نے طلحہ کو گھورتے ہوئے دیکھا۔

"مجھے مافیا کا ڈان بننے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟" قاسم نے ارمان تابو سے پوچھا تو وہ سمجھ گیا کہ قاسم نے گفتگو کا موضوع بدل دیا ہے۔

"بھتہ مافیا ... لینڈ مافیا اور زیر زمین (انڈر ورلڈ) کا بادشاہ بننے کے لیے سب سے بڑا بساط گر بننا ضروری ہے۔" ارمان تابو نے لفظ 'بساط' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"اب مجھے اجازت دیں، میں پھر کسی روز آپ کے مشوروں سے مستفید ہونے کے لیے آؤں گا۔" قاسم نے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ایک نوجوان ہر روز میری دیکھ بھال کے لیے آتا ہے، تم کل شام کو یہاں آ کر اس سے ملاقات کر لینا، وہ نوجوان عطر رانی کو تلاش کرنے میں تمہاری مدد کرے گا۔" ارمان تابو نے قاسم سے کہا تو قاسم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور طلحہ کے ہمراہ وہاں سے چلا گیا۔

❖❖❖❖

ارمان تابو سے ملاقات کے بعد جب قاسم صابی ہاؤس پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ چھوٹے کمرے میں مشرف اس کا منتظر ہے۔ قاسم چھوٹے کمرے میں گیا اور مشرف کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"مجھے اپنے ذرائع سے معلوم ہوا کہ تیمور کا اپنے والد محمود سے کسی معاملے پر سخت جھگڑا ہوا ہے اور محمود نے تیمور کو گھر سے نکال دیا ہے، ہمیں اس صورتحال سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔" مشرف نے رطب اللسان بولتے ہوئے کہا۔

"ہم تیمور کو اغوا کر کے اس سے مہر النساء کا پتہ پوچھ لیں گے۔" مشرف نے کہا۔

"محمود ایک سیاستدان اور حکومتی رکن ہے، اس کے بیٹے کو اغوا کرنا بہت بڑی حماقت ہوگی، محمود نے بھلے ہی تیمور کو خود سے اور گھر سے دور کیا ہے لیکن اس نے خفیہ طور پر اس کی حفاظت کا بندوبست بھی کیا ہوگا۔" قاسم نے مشرف کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر مجھے کوئی دوسرا طریقہ آزمانا پڑے گا۔" مشرف نے کہا جبکہ قاسم کمرے کے دروازے کی طرف متوجہ ہوا۔ طلحہ بھی چھوٹے کمرے میں داخل ہوا تھا۔

"جو عورت اجالا کی نگرانی کر رہی ہے اس نے خبر دی ہے کہ اجالا تم سے کوئی ڈیل کرنا چاہتی ہے۔" طلحہ نے قاسم سے کہا۔

"ہو سکتا ہے وہ تمہارے ساتھ کوئی چال چلنے کا سوچ رہی ہو۔" مشرف نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا

"وہ میرے ساتھ چال چلنے، یا سازش کرنے کی حالت میں نہیں ہے اور رہی بات ڈیل کی تو انڈر ورلڈ میں ہر ڈیل نئی بساط کا پیشہ خیمہ ہوتی ہے۔" قاسم نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"مطلب تم اس سے ڈیل کرنے جاؤ گے؟" طلحہ نے قاسم کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

❖❖❖❖❖

ملک ہشام کو جب یہ خبر ملی کہ اس کا بیٹا بہرام کوما کی حالت سے باہر آ گیا ہے تو وہ خوشی سے نہال ہو گیا اور اس نے ڈرائیور بھیج کر ناہید بیگم کو اپنے پاس بلا لیا اور پھر اپنے محافظوں کے ہمراہ وہ ناہید بیگم کو سفید پینٹ والے ایک فلیٹ میں لے گیا۔ فلیٹ دو منزلہ تھا۔ فلیٹ کی پہلی اسٹوری دو کمروں مع باتھ رومز، کچن اور لاؤنج پر مشتمل تھی جبکہ دوسری اسٹوری ایک بڑے کمرے اور بڑی سی بالکونی پر مشتمل تھی۔

ملک ہشام بالکونی میں ناہید بیگم کے ساتھ صوفے پر جبکہ کچھ فاصلے پر دوسرے صوفے پر ایک شاعرہ براجمان تھی۔

ملک ہشام نے شاعرہ کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور پھر ناہید بیگم کی طرف متوجہ ہوا۔ شاعرہ اپنی غزل شروع کر چکی تھی جبکہ اسی دوران ایک ملازمہ نے مختلف قسم کے پھلوں کی ٹوکری ان کے سامنے پڑی میز پر سجا دی تھی۔

تجھے عشق ہو خدا کرے کوئی اس کو تجھ سے جدا کرے

غزل کا پہلا شعر سنتے ہی ناہید بیگم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ بے اختیار مسکرا پڑی۔

تیرے ہونٹ ہنسنا بھول جائیں، تیری آنکھ پرنم رہا کرے
تو اس کی باتیں کیا کرے، تو اس کی باتیں سنا کرے

ملک ہشام نے انگوروں کا ایک گچھا ناہید بیگم کی طرف بڑھا دیا۔ ناہید نے مسکراتے ہوئے انگوروں کا گچھا پکڑا۔ شاعرہ نے غزل کا ایک اور شعر ملک ہشام اور ناہید بیگم کے گوش گزار کیا تھا۔

تو اس کو دیکھ کر رکا کرے، وہ تجھ کو دیکھ کر چلا کرے

"آپ کو کچھ دینا چاہ رہا تھا۔" ملک ہشام کوٹ کی جیب سے کچھ ڈھونڈ کر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "بہت دنوں سے دینا چاہتا تھا لیکن......" وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔ اس کے ہاتھ میں مخملی ڈبیا تھی۔

تجھے سحر کی وہ چھڑی لگے تو ملن کی ہر پل دعا کرے
تو تڑپے اسی کے عشق میں اسے بھولنے کی دعا کرے

شاعرہ نے مزید ایک شعر پیش کیا تھا۔

"آپ کو غزل کیسی لگ رہی ہے؟" ملک ہشام نے مخملی ڈبیہ کھولتے ہوئے ناہید بیگم سے پوچھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"جب غزل مکمل ہو گی تب ہی کوئی کومنٹ دوں گی۔" ناہید بیگم نے مخملی ڈبیہ کو دیکھتے ہوئے کہا جبکہ ملک ہشام ڈبیہ کھول چکا تھا۔ ڈبیہ میں سونے کی ایک چین تھی اور چین کے ساتھ سونے کی ایک پتری منسلک تھی۔ پتری کے درمیان بہت ہی قیمتی اور چمکدار موتی نصب تھا۔

"اگر آپ اسے قبول فرمائیں گی تو مجھے اچھا لگے گا۔"

ملک ہشام نے ناہید بیگم کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو ناہید بیگم کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی تھی۔ ناہید بیگم نے ڈبیا سے سونے کی چین نکال لی۔ ملک ہشام نم آنکھوں کے ساتھ مسکرایا۔ وہ کچھ دیر تک مبہوت سے اسے دیکھتا رہا۔ ناہید بیگم، ملک ہشام کا دیا ہوا تحفہ اپنی گردن میں سجا چکی تھی۔

"اچھی لگ رہی ہو۔" وہ مدہم آواز میں بولا۔ "آپ کو مجھ سے زیادہ کوئی محبت نہیں کر سکتا۔ مجھ سے زیادہ کوئی خیال نہیں رکھ سکتا۔ میرے پاس آپ ہی واحد قیمتی چیز ہیں۔" وہ مخمور لہجے میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس سے کہہ رہا تھا۔ یاد دہانی کرا رہا تھا یا جتا رہا تھا۔ وہ اب جھک کر ناہید بیگم کی گردن کو چوم رہا تھا۔

"شاعرہ کہاں گئی؟" ناہید نے شرماتے ہوئے کہا۔

"جب آپ لاکٹ پہن رہی تھی تب میں نے اسے جانے کے لیے اشارہ کر دیا تھا۔" ملک ہشام نے کہا۔

❖❖❖❖

شہرناز کی تدفین کے بعد کاشف نے مہرو سے شہرناز کا انتقام لینے کی ٹھان لی۔ اس نے مدثر نامی پولیس اہلکار سے رابطہ کر کے اسے مہرو کے بدلے، ایک لاکھ روپے کی پیشکش کی تو اس نے مزید دو لاکھ روپوں کی ڈیمانڈ کر دی۔ کاشف کے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مہرو کے مدثر کے ساتھ پرانے تعلقات تھے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مہرو بھی پیسوں کے عوض مدثر سے بہت سے کام نکلواتا تھا پس کاشف نے مدثر سے ڈیل پکی کر دی۔ مدثر نے کاشف سے وعدہ کیا کہ وہ سات لاکھ روپے کے عوض صرف کاشف کا مہرو سے سامنا کروائے گا۔

اگلے دن صبح سات بجے ہی مدثر نے اس مکان کی نشاندہی کر دی تھی جہاں پر مہرو مکین تھا۔ یہ اٹیچڈ باتھ روم کمرہ تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں سیڑھیاں تھی جو اسی کمرے کے چھت تک محدود تھیں۔ دروازے پر زوردار دستک ہوئی تو مہرو نیند سے بیدار ہوتے ہی خوفزدہ ہو گیا۔ وہ کمرے کے کونے میں موجود سیڑھیوں سے چڑھتا ہوا چھت پر گیا۔ اس نے چھت کی چاردیوار کا بغور جائزہ لیا اور پھر ایک دیوار کے اوپر کہنیوں کے بل نیچے کی جانب جھانکا۔ مکان کے خارجی دروازے کے سامنے کاشف کھڑا تھا۔

"اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟" مہرو نے کاشف کو دیکھتے ہوئے سوچا اور پھر دیوار سے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے کاشف سے بچنے کا محفوظ طریقہ سوچ رہا تھا جبکہ کاشف دروازے پر مسلسل دستک دے رہا تھا۔ مہرو نے اپنا پستول اور بٹوا لیا اور کاشف کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا۔ کاشف جب دستک دیتے ہوئے تھک گیا تو وہ مکان کے اندر داخل ہونے کا کوئی دوسرا طریقہ سوچنے لگا تھا۔ اگلے لمحے دروازہ کھلا تو مہرو نے کاشف کو گردن سے دبوچ لیا اور اسے دھکیلتے ہوئے مخالف سمت میں لے گیا۔ اس نے کاشف کو دیوار کے ساتھ لگایا تو کاشف نے مہرو کی ناک پر زوردار گھونسا مارا تو وہ ناک سکوڑتے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹا اور کاشف کے پیٹ میں زور سے لات مار دی۔ کاشف کمر کے بل زمین پہ گرا اور جب وہ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا تب تک مہرو بھاگ چکا تھا۔ کاشف بھی مہرو کے تعاقب میں بھاگا۔

مہرو بھاگتے ہوئے ایسی جگہ میں داخل ہوا جہاں پر بڑے بڑے صندوق پڑے تھے۔ صندوقوں کو بوریوں اور چادروں سے ڈھانپا گیا تھا۔ مہرو صندوقوں کی دو قطاروں کے درمیان چھپ کر بیٹھ گیا جبکہ کاشف بھی کچھ دیر بعد اسی جگہ پہنچ چکا تھا۔ کاشف کے قدموں کی آواز سن کر مہرو کو شک پڑ گیا تھا کہ کاشف بھی اس کے آس پاس موجود ہے۔ ہاتھ میں پستول پکڑے کاشف محتاط انداز میں صندوقوں کی قطاروں کے درمیان راہداریوں سے گزر رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ چار صندوق تھے جو ایک دوسرے کے اوپر رکھے گئے تھے۔ مہرو ان صندوقوں پر چڑھ کر دیوار پھلانگنے کی منصوبہ بندی کر چکا تھا۔ کاشف نے مہرو کو دیوار پھلانگتے دیکھا تو اس نے مہرو پر گولی چلا دی۔ کاشف نے سائیلنسر لگے پستول سے گولی فائر کی تھی اس لیے گولی چلنے کی آواز نہیں گونجی تھی۔ کاشف بھی دیوار کے ساتھ پڑے صندوقوں پر

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

چڑھ گیا لیکن اس نے دیوار پھلانگنے کی حماقت نہیں کی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ہوسکتا ہے مہرو دیوار کے پار موجود ہو اور وہ اسے نقصان پہنچا دے، اس لیے کاشف نے چند لمحے انتظار کرنا بہتر سمجھا۔

مہرو ٹیڑھی میڑھی گلی میں گھس گیا۔ گلی کے اختتام پر کافی سارے راستے موجود تھے۔ مہرو الجھ کر رہ گیا۔ کچھ سوچ بچار کے بعد مہرو دائیں جانب ایک گلی میں گھس گیا۔ مہرو جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا یہ گلی تنگ اور تاریک ہوتی جارہی تھی حتی کہ گلی کا ایک حصہ ایسا آیا جہاں بالکل ہی اندھیرا تھا۔ مہرو سوچ رہا تھا کہ دن کے وقت اس گلی میں اتنا اندھیرا کیوں ہے۔ اس نے اپنے اردگرد دیکھا۔ اندھیرا ایسا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے دیکھنے کی صلاحیت بالکل معدوم ہوچکی ہو۔ سکوت رگوں میں خوف بھر رہا تھا۔ مہرو نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی اور اپنے آس پاس ٹٹولنے لگا۔ اسے معلوم ہوا کہ اس کے دائیں بائیں دیواریں ہیں۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اسے آگے بڑھنا چاہیے یا واپس مڑ جانا چاہیے۔

❖❖❖❖

قاسم، اجالا سے ملاقات کرنے کے بعد واپس آچکا تھا۔ طلحہ اسے متجسس نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں تجسس ہو رہا ہے کہ اجالا کے ساتھ میری کیا ڈیل طے پائی ہے تو چلو میں تمہیں بتا ہی دیتا ہوں۔“ قاسم نے طلحہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”اجالا نے مجھ سے کہا کہ وہ اس جگہ کا پتہ بتائے گی جہاں اس نے میرے کزن یعنی مہر النساء کے بھائی دلشاد کو قید کر رکھا ہے، دلشاد کی بازیابی کے بدلے میں بھی اجالا کو چھوڑ دوں گا۔“ قاسم نے اجالا سے ہونے والی ڈیل کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

”اس ڈیل کا ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟“ طلحہ نے پوچھا۔

”دلشاد ہمارے پاس ہوگا تو میں مہر النساء سے ڈیل کروں گا۔“ قاسم نے کہا۔

”مطلب ہم دلشاد کو بازیاب کروائیں گے اور بدلے میں وہ تمہیں اپنے والد کا قتل معاف کرے گی اور تم سے نکاح بھی کرے گی۔“ طلحہ نے کہا تو قاسم نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور پھر وہ مشرف کی جانب متوجہ ہوا جو کہ ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا۔

”میں نے تیمور پر نظر رکھی ہوئی تھی، آج مہر النساء تیمور سے ملاقات کے لیے آئی تھی۔“ مشرف نے کہا۔

”ملاقات کے اختتام پر تم نے مہر النساء کا تعاقب کیا تھا؟“ قاسم نے پوچھا۔

”تعاقب کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔“ مشرف نے افسردہ ہوتے ہوئے کہا۔

”مطلب؟“ قاسم نے پوچھا۔

”میں ان دونوں کو ملاقات کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ کوئی ربڑ نما چیز میری پیشانی سے ٹکراتے ہی پیشانی سے چپک گئی اور اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں، شاید میں بے ہوش ہوگیا تھا۔“ مشرف نے قاسم کو ساری تفصیل بتادی۔

”اگر تیمور کے کسی آدمی نے تمہیں بے ہوش کیا ہوتا تو وہ ضرور تمہیں کسی خفیہ جگہ پر بند کر دیتا۔“ قاسم نے فکر مند ہوتے ہوئے کہا تو مشرف اور طلحہ نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”میرا خیال ہے کہ تمہارے علاوہ وہاں کوئی اور بھی تھا جو تیمور اور مہر النساء کی نگرانی کر رہا تھا اور اسے اندازہ تھا کہ تم مہر النساء کا تعاقب کرنے والے ہو۔“ قاسم نے کہا طلحہ مشرف کی جانب متوجہ ہوا۔

”تمہیں دوبارہ تیمور کی نگرانی کرنا ہوگی۔“ طلحہ نے مشرف سے کہا تو اس نے طلحہ کی بات سے متفق ہوتے ہوئے سر ہلایا۔

❖❖❖❖

مہرو ہمت کر کے تنگ و تاریک گلی میں آگے بڑھتا رہا۔ وہ ایک کھلی سی روشن جگہ پہنچ گیا جس کے چاروں اطراف عمارتیں تھیں۔

تنگ و تاریک گلی کے بعد اتنی صاف ستھری جگہ، عمارتوں درمیان اس جگہ کو کوئی دوسری راستہ بھی لگتا ہو گا۔ مہرو نے چاروں اطراف میں موجود عمارتوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ ”ان عمارتوں میں ضرور کوئی مافیا کا بندہ یا گینگ موجود ہے اور اس نے مشکل وقت میں فرار ہونے کے لیے یہ جگہ اور تنگ و تاریک گلی بنوائی ہوگی۔ مہرو نے سوچا۔ یہاں کوئی چور دروازہ ضرور ہے لیکن مجھے وہ دروازہ کیوں نہیں مل رہا۔ مہرو نے سوچا اور پھر اگلے لمحے اس نے دیکھا کہ تنگ و

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

تاریک گلی کے اختتام پر کاشف کھڑا تھا۔ کاشف نے مہرو کو دیکھتے ہی اس پر گولی فائر کردی۔ مہرو نے قلابازی کھاتے ہوئے خود کو گولی سے بچایا۔ مہرو جست لگا کر کاشف کے پستول سے نکلنے والی دوسری گولی سے بچ گیا اور پھر اگلے ہی لمحے مہرو نے کاشف پر گولی فائر کی لیکن کاشف بھی بڑی پھرتی کے ساتھ گولی سے بچ گیا۔ اب کاشف نے پستول کی نال مہرو کی طرف کی تو مہرو نے اپنا پستول کاشف کو مارنے کے لیے پھینکا۔ پستول کا دستہ کاشف کی پیشانی سے ٹکرایا تو اس کے ہاتھ سے پستول گر گیا۔ مہرو نے جست لگائی اور کاشف کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے کاشف کے پیٹ میں لات ماری تو کاشف کمر کے بل فرش پر گر گیا۔ جس گلی سے مہرو اور کاشف گزر کر یہاں پہنچے تھے اسی گلی سے ذونیا بھی وہاں آگئی تھی۔ ذونیا نے کاشف پر تین گولیاں فائر کیں اور تین میں سے دو گولیاں کاشف کے پیٹ میں لگیں۔

''مہرو! آؤ...... چلیں یہاں سے۔'' ذونیا نے اپنا ہاتھ مہرو کی طرف بڑھایا تو مہرو نے کاشف کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھا جبکہ کاشف خود کو گھسیٹتے ہوئے پستول کی طرف بڑھ رہا تھا جو کہ زمین پر پڑا تھا۔

''مہرو...... آؤ......'' ذونیا چلا کر بولی تو مہرو ذونیا کی طرف بڑھا اور اس نے ذونیا کا ہاتھ تھام لیا اور پھر وہ دونوں تنگ و تاریک گلی میں داخل ہوگئے جبکہ کاشف وہیں پر تڑپ رہا تھا۔

ذونیا نے نئی آبادی والے علاقے میں دو منزلہ فلیٹ کے سامنے کار روکی۔ کار سے نکلتے ہی وہ بڑے گیٹ کے بجائے فلیٹ کے چھوٹے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ مہرو بھی ذونیا کو فالو کرتے ہوئے چھوٹے دروازے سے اندر چلا گیا اور پھر چھوٹی سی راہداری سے گزرتے ہوئے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا تھا کہ کاشف مجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے والا ہے؟'' لکڑی کی سیڑھیوں کے زینوں پر چلتے ہوئے مہرو نے ذونیا سے پوچھا۔

''کاشف نے میرے گودام سے گاڑیوں کے ٹائر چوری کر کے فروخت کر دیئے تھے اور میں کاشف کو تلاش کر رہی تھی اچانک میں نے کاشف کو مدثر کی کار سے اترتے دیکھا تو میں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔'' ذونیا نے مہرو کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا اور مہرو کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئی۔

''مطلب یہ کہ کاشف نے تمہارے گودام سے ٹائر چوری کر کے فروخت کیے اور حاصل ہونے والی رقم مدثر کو دی اور مدثر نے اسے میرا پتہ بتا دیا ہوگا۔'' مہرو نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہارا اور قدیر کا کمرہ ہے۔'' ذونیا نے دروازے کی کنجی مہرو کو دیتے ہوئے کہا۔

''قدیر کہاں ہے؟'' مہرو نے پوچھا۔

''اس کے دوست بدر کی ڈیتھ ہوگئی تھی اور وہ اس کی تدفین کے بعد یہاں آجائے گا۔'' ذونیا نے مہرو سے کہا اور پھر وہاں سے چلی گئی۔

❖❖❖❖

مہرالنساء کو جب ہوش آیا تو اس نے خود کو گھپ اندھیرے میں موجود پایا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دینی چاہی تو اسے لگا جیسے اس کے ہاتھ اس کی پشت کی طرف کر کے کسی نے مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ مہرالنساء نے اپنے آپ کو چھڑوانے کی کوشش کی لیکن گرفت مضبوط تھی۔ اس نے بولنا چاہا لیکن وہ بولنے کی طاقت بھی کھو چکی تھی۔ اس نے اپنے جسم کو حرکت دینی بند کر دی اور غور کرنے لگی۔ اپنے ہاتھوں کی انگلیاں ہلانے لگی اور پھر اپنا منہ کھولنا چاہا تو اس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔

مہرالنساء اندھیری جگہ میں ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ اس کی پشت پر باندھے ہوئے تھے۔ منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کے اوپر ٹیپ لگادی تھی۔ اسی طرح اس کے پیر بھی رسی سے باندھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو حرکت دینے اور بولنے سے محروم تھی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

صراط مستقیم

ریاض بٹ

کہتے ہیں ہر انسان کے اندر ضمیر ہوتا ہے وہ کبھی نہ کبھی ضرور جاگتا ہے اور جب ضمیر جاگتا ہے تو انسان کی ایسی کایا پلٹ ہوتی ہے کہ دنیا یقین کرنے کو تیار نہیں ہوتی۔ ایک ایسی ہی عبرت اثر کہانی کا احوال جس پڑھ کر احساس ہوگا کہ برائی کا انجام ہمیشہ برا ہی ہوتا۔

دولت کی زیادتی نے اسے جنگلی شیر بنا دیا تھا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

سردیوں کی آمد آمد تھی۔ اکتوبر آدھے سے زیادہ گزر چکا تھا۔ آج کل تو موسم آگے پیچھے ہو گئے ہیں۔ ہمارے وقتوں میں موسم اپنے وقت پر آتے تھے۔ چودھری شیر علی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ وہ اپنے علاقے میں مطلق العنان بنا بیٹھا تھا۔ اس کی دہشت دور دور تک تھی وہ لوگوں کی عزتوں کو کھلونا سمجھتا تھا۔ اس کی بیوی مہناز بیگم ایک پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی عورت تھی اس تک چودھری کی غیر نصابی سرگرمیوں کی رپورٹیں پہنچتی رہتی تھیں اور وہ مقدور بھر چودھری کو سمجھاتی رہتی تھی لیکن چودھری تو چکنا گھڑا تھا۔ جس پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ بہرحال ایک دن دوپہر کے وقت تھانے میں اطلاع آئی کہ چودھری کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے۔ اطلاع لے کر قاسم نام کا ایک مزارع آیا تھا۔ قتل اس کے گاؤں بیری والا اور چودھری کے گاؤں جعفر آباد کے درمیان ہوا تھا۔

میں نے مزارع کو اپنے سامنے بٹھا کر تفصیل پوچھی تو یہ کہانی بنی۔

چودھری صبح صبح اپنی جیپ میں گاؤں منیر آباد گیا تھا۔ وہاں بھی اس کی کافی زمین تھی۔ جس پر سفیدے کے درخت لگے ہوئے تھے ایک ہفتہ پہلے اس نے یہ درخت ایک پارٹی

کے ہاتھ فروخت کیے تھے۔ آج انہوں نے پیسے دینے تھے چودھری اسی سلسلے میں منیر آباد گیا تھا۔ منیر آباد چودھری کے گاؤں سے دس کلومیٹر شمال کی طرف واقع تھا۔ درمیان میں گاؤں بیری والا، آصف آباد، ڈھوک بابا آتے تھے باقی تفصیل آگے آئے گی۔

میں نے ضروری تیاری کے بعد کانسٹیبل بشیر خان اور دو سپاہیوں کو ساتھ لیا اور جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ یہ تھوڑی ویران جگہ تھی ٹاہلی کے گھنے درخت بھی تھے اور قریب بارش کا پانی کا ایک جوہڑ بھی تھا چونکہ دو تین دن پہلے بارش ہوچکی تھی اس لیے جوہڑ میں پانی کی اچھی خاصی مقدار موجود تھی۔ تقریباً چار سو کوس کے فاصلے پر قبرستان تھا۔ جائے واردات پر گورکن اور تین چار بندے بھی موجود تھے۔ زمین ڈھول والی تھی۔ کچھ جگہ پانی تھا اور کچھ جگہ بالکل خشک تھی۔ وہاں قدموں کے نشان تو تھے لیکن گڈمڈ تھے۔ گورکن اور دوسرے بندوں کے پاؤں کے نیچے آ کر ہمارے کام کے کھرے خراب ہوگئے تھے۔

بہرحال میں نے چودھری کی لاش کا باریک بینی سے معائنہ شروع کردیا۔ چودھری کو دو گولیاں لگی تھیں، ایک سینے کے اوپر اور دوسری سر میں خون بہہ کر جمنا شروع ہوگیا تھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

میں نے ضروری کاغذی کارروائی کرا کے لاش کانسٹیبل بشیر خان کی معیت میں ڈسٹرکٹ اسپتال بھجوادی۔

گورکن کی آنکھوں میں وحشت کے آثار تھے۔ جیسے اس نے کوئی خوفناک اور اعصاب شکن منظر دیکھا ہو۔

اس کی عمر پچاس پچپن کے درمیان ہوگی۔ بھنوؤں کے بال سفید ہوچکے تھے۔ سر بالوں سے محروم تھا اس نے چھوٹی سی داڑھی رکھی ہوئی تھی اس وقت، وہ سفید رنگ کی شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ سر پر سفید رنگ کی ٹوپی تھی۔ اس نے اپنا نام امانت علی بتایا۔

جب ساری کارروائی مکمل ہوگئی تو اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سرکار ذرا قبرستان تشریف لائیں۔"

"کیوں؟" میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہیں میں آپ کو ساری بات بتا سکوں گا۔"

"ٹھیک ہے چاچا چلو" میں نے خوش دلی سے کہا۔

وہ مجھے قبرستان کے کونے میں بنے ہوئے کچے کوٹھے میں لے گیا۔

وہاں چارپائی پر ایک بندہ لیٹا ہوا تھا۔ بندے کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی لگتا تھا کسی پگڑی سے کپڑا پھاڑ کر اس کے سر پر پٹی کی صورت میں باندھ دیا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

"یہ کون ہے؟" میں نے گورکن کو سوچ میں ڈوبے دیکھ کر کہا۔

"جناب میں چودھری صاحب اور اس شخص کو جانتا ہوں یہ افتخار ہے اور کھارا کہلاتا ہے۔ یہ چودھری صاحب کا دست راست ہے۔ میں آج صبح شہر چلا گیا تھا جب میں واپس آرہا تھا تو ایک خوفناک منظر دیکھا۔ گاؤں بیری والا کی طرف سے چودھری صاحب کی جیپ آرہی تھی اچانک درختوں کی اوٹ سے چار ڈھاٹا پوش جیپ کے سامنے آگئے اور جیپ کے آگے بازو پھیلا کر کھڑے ہوگئے جیپ رک گئی۔" وہ چند لمحے رکا پھر بولا۔

"میں معذرت چاہتا ہوں اس واقعے نے تو میری مت ہی ماردی ہے۔ اب میری نظر اس عمر میں شکرے جیسی تو ہیں نہیں کہ میں نے چودھری صاحب کی جیپ کو دور سے پہچان لیا تھا۔"

دراصل یہ بعد میں پتا چلا تھا۔ بندہ جہاندیدہ تھا۔ اس نے یقیناً میری آنکھوں میں تیرتے سوال کو پڑھ لیا تھا۔ اس لیے آگے سنانے سے پہلے وضاحت کردی۔

"آگے کی کہانی میں اپنی زبان میں سنا دیتا ہوں، ورنہ اس نے جس طرح وضاحتوں اور ٹھہر ٹھہر کر واقع بیان کیا تھا وہ بہت لمبا ہوگیا تھا۔ اس نے ڈھاٹا پوشوں کو دیکھ کر ایک درخت کی اوٹ لے لی تھی۔ اس نے دیکھا کہ انہوں نے اپنے لباسوں میں سے اسلحہ برآمد کیا تھا اور اس کے زور پر جیپ میں سوار دونوں بندوں کو باہر نکلوا لیا تھا۔ جس درخت کی اوٹ میں گورکن کھڑا تھا وہ زیادہ دور نہیں تھا۔ اسے ہر چیز بڑی واضح نظر آرہی تھی۔ دو کے ہاتھوں میں ریوالور تھے اور دو نے کھٹکے سے کھلنے والے چاقو پکڑے ہوئے تھے ایک ریوالور بردار نے ریوالور افتخار عرف کھارا کی کنپٹی کے ساتھ لگایا ہوا تھا ایک نے چودھری کی طرف ریوالور تانا ہوا تھا تیسرے نے چاقو بند کر کے جیب میں رکھا اور چودھری کی جامہ تلاشی لینے لگا۔ چودھری نے اس کا ہاتھ جھٹکا اور مزاحمت

شروع کردی۔
اس نے ایک دو تھپڑ بھی ڈھاٹا پوش کو مارنے کی کوشش کی تھی پھر اڑنگا لگا کر اسے گرا لیا۔ ریوالور بردار نے کچھ کہا۔ آواز واضح نہیں تھی۔ لیکن لگتا تھا کہ چودھری پر جنون طاری ہوگیا ہے یہ تو ظاہر تھا کہ تگڑی رقم چودھری کی جیب میں تھی جسے وہ یقیناً کسی قیمت پر نہیں دینا چاہتا تھا ویسے بھی چودھری کے متعلق مشہور تھا کہ وہ نوجوانی میں کبڈی کا کھلاڑی تھا۔
اچانک فائر کی آواز گورکن کی سماعت سے ٹکرائی اور اس نے چودھری کو گرتے دیکھا۔ پھر ایک مزید فائر ہوا اور ڈھاٹا پوش چودھری کی جیبوں سے سب کچھ نکال کر چلتے بنے۔ گورکن امانت علی کی ساری توجہ اس وقت چودھری پر مرکوز تھی ڈھاٹا پوشوں کے جانے کے بعد اس نے دیکھا کہ افتخار عرف کھارا بھی کچھ فاصلے پر لمبا لمبا لیٹا ہوا ہے۔
وہ چاہتا تو اس سارے واقعے پر مٹی ڈال کر قبرستان میں چلا جاتا اس نے دیکھا کہ چودھری اب اس دنیا میں نہیں ہے اور افتخار عرف کھارا کا سر پھٹا ہوا ہے اور سر سے خون بہہ رہا ہے۔ اس کے خیال میں ڈھاٹا پوش ڈاکوؤں میں سے کسی نے کھارا کے سر پر ریوالور کا دستہ مارا تھا اور ان حالات میں یہی قرین قیاس تھا۔ کھارا ہوش میں تھا اور ہلکے ہلکے کراہ رہا تھا۔ امانت علی ایک ہٹا کٹا بندہ تھا اس عمر میں بھی اس کے قویٰ مضبوط تھے وہ کسی نہ کسی طرح اسے لے کر اپنے کچے کوٹھے میں آ گیا۔ اسے پانی پلایا اپنی پگڑی کو ایک کونے سے پھاڑا، ذرا سے کپڑے کو آگ لگا کر اس کی راکھ بنائی اور زخم پر راکھ رکھ کر باقی پھاڑے ہوئے کپڑے سے سر پر پٹی باندھ دی۔
اس نے کھارے کو چارپائی پر لیٹا دیا اور کہا۔
”تم آرام کرو لیکن ٹھہرو ذرا یہ تو بتاؤ یہ سب کیا تھا۔“
”یہ ڈاکو تھے چودھری صاحب کو قتل کر کے اور مجھے زخمی کر کے رقم لے کر چلتے بنے۔“ کھارے نے کراہتے ہوئے کہا۔
”رقم؟“ امانت علی (گورکن) نے زیر لب دہرایا پھر پوچھا۔
”کیا چودھری صاحب کے پاس کوئی تگڑی رقم تھی۔“
”بالکل چودھری صاحب کے پاس پچیس ہزار روپے تھے دراصل اب تم سے کیا چھپانا؟ چودھری صاحب گاؤں منیر آباد گئے تھے وہاں سے ہم یہ رقم لے کر آ رہے تھے ایک ہفتہ پہلے انہوں نے منیر آباد میں موجود اپنے سفیدے کے درختوں کا سودا کیا تھا۔ یہ درخت ایک وسیع رقبے میں لگے ہوئے تھے۔“
میں نے پٹی کھلوا کر کھارا کے زخموں کا معائنہ کیا تھا۔ زخم زیادہ تشویش ناک نہیں تھا لیکن کھال پھٹ گئی تھی اور کافی مقدار میں خون بھی نکلا تھا۔
میں نے کھارا کو بھی سرکاری گاڑی میں بٹھایا اور ہم گورکن کے تعاون کا شکریہ ادا کر کے تھانے میں آ گئے۔
تھانے میں آ کر میں نے ایک سپاہی کے ساتھ کھارا کو ڈسٹرکٹ اسپتال بھجوا دیا وہاں سے پٹی کروا کے کھارا فارغ تھا۔ میں نے کھارے کا مکمل بیان لے کر اس پر اس کا انگوٹھا لگوا لیا تھا۔ ایک رپورٹ ڈاکٹر کی طرف سے بھی آنی تھی اور اس کیس کی فائل کی زینت بننی تھی۔
خیر یہ تو کاغذی کارروائی ہونی تھی۔ میں آپ کو آگے کی کہانی سناتا ہوں کچھ باتوں کا ذکر آگے آئے گا۔
اگلے دن چودھری کی لاش پوسٹ مارٹم ہو کر آ گئی زخموں کی نوعیت وہی تھی، جو میں بیان کر چکا ہوں۔ موت کا وقت دن دس اور گیارہ بجے کا لکھا تھا۔ یہاں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ چودھری کا ایک چھوٹا بھائی تھا جس کا نام کبیر علی تھا وہ تین بندوں کے ساتھ لاش لینے آیا تھا وہ اکیلا میرے دفتر آ گیا۔ وہ مجھے معقول بندہ لگا تھا ظاہر ہے اس کا بازو ایک قسم کا کٹ گیا تھا یعنی بڑا چودھری قتل ہو گیا تھا۔ وہ بظاہر اندر باہر سے ٹوٹا ہوا لگتا تھا۔ میں نے اسے تسلی دلاسہ دیا۔
”کبیر بھائی۔“ میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔
”میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ قاتلوں کو پکڑ کر قرار واقعی سزا دلواؤں۔“
”تھانیدار صاحب مجھے قوی امید ہے کہ آپ ڈاکوؤں تک ضرور پہنچیں گے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔
”لیکن میری آپ سے ایک گزارش ہے اگر آپ اسے مداخلت یا ڈکٹیشن نہ سمجھیں تو......“ بندہ پڑھا لکھا تھا بعد میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ایف اے پاس ہے۔
”نہیں......نہیں چودھری صاحب آپ کھل کر بات کریں تھانے دار بھی انسان ہوتے ہیں۔ آپ کچھ بتائیں گے، کوئی شک ظاہر کریں گے تو بات آگے بڑھے گی۔“ میں نے لہجے کو حتی الامکان نرم رکھتے ہوئے کہا۔
”مجھے شک ہے کہ بھابی نے چودھری صاحب کو مروایا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"کیا مطلب؟" میں نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں جی میں نے ایک شک ظاہر کیا ہے اس پر تفتیش کے گھوڑے دوڑانا آپ کا کام ہے۔ لیکن ایک گزارش ہے کہ اس سلسلے میں میرا نام نہ آئے۔"

"آپ بے فکر ہو جائیں، میں سمجھتا ہوں کہ میں نے کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ لیکن اگر شک کی وجہ پر روشنی ڈال دیں تو مہربانی ہوگی۔"

"بھابی جی بھائی جان کی سرگرمیوں کی وجہ سے ان سے نالاں رہتی تھیں۔ بات ذرا شرم کی ہے بھابی نے ایک دن بھائی صاحب کو کہا تھا کہ کیا میں مکمل عورت نہیں ہوں، جو آپ باہر جھک مارتے ہیں۔"

"اوہ۔" میں چونک اٹھا اور چھوٹے بھائی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ بات آپ کو کس نے بتائی ہے۔"

"خود بھائی صاحب نے۔"

اس کے بعد میں نے کاغذی کارروائی مکمل کر کے لاش اس کے حوالے کر دی تھی۔

تھانے میں اس کے بڑے بھائی کی لاش پڑی تھی اور وہ سارا زور اپنی بھابی کو چودھری شیر علی کے قتل میں ملوث کرنے کے لیے لگا رہا تھا۔ اس کی بعض باتیں غور طلب تھیں۔ بہر حال میں نے تفتیش تو کرنی تھی۔ کبیر علی دوسرے لفظوں میں یہ کہہ گیا تھا کہ ڈاکو اس کی بھابی مہناز بیگم کے بھیجے ہوئے تھے۔ یہ سب چودھری شیر علی کو قتل کرنے کے لیے ڈراما کیا گیا تھا۔ حقیقت کیا تھی یہ تو ایک دن سامنے آنی ہی تھی۔ یہاں یہ بات بھی بتا دوں کہ چودھری شیر علی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ یعنی وہ لاولد تھا یہ بات بھی میں نے ذہن میں بٹھائی تھی۔

اگلے دن میں شیر علی کی حویلی میں اس کی بیوہ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ مہناز بیگم ایک دبنگ قسم کی عورت تھی عمر کا اندازہ میں نے چالیس سال کے قریب لگایا، رنگ صاف تھا اس وقت اس نے کالا جوڑا پہنا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر مکمل سوگ کی کیفیت طاری تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں غم کے بادل ہیں جو برسنے کو بے تاب ہیں۔

"چودھرانی جی۔" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"یہ صدمہ آپ کے لیے بہت بڑا ہے جسے آپ نے حوصلے اور قوت برداشت کے بل بوتے پر سہنا ہے۔ یہ ایسا وقت تو نہیں کہ میں آپ کے زخم کریدوں لیکن مجبوری ہے میں نے تفتیش کرنی ہے، قاتل پکڑنے ہیں اس لیے......" میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"تھانیدار صاحب آپ اپنی تفتیش کریں جو کچھ پوچھنا ہے پوچھیں، اس نے جواب دیا۔" لیکن مجھے تو یہ بتایا گیا ہے کہ ان کو ڈاکوؤں یا رہزنوں نے مزاحمت پر قتل کیا ہے۔"

"سنا تو میں نے بھی یہی ہے، لیکن......ڈاکوؤں یا رہزنوں کو یہ بات کیسے پتا چلی کہ چودھری صاحب ایک بھاری رقم لے کر آ رہے ہیں۔"

"ہاں یہ بات تو ہے اور یہ سوال توجہ طلب ہے۔"

"اچھا میں آپ سے سیدھا سوال پوچھوں گا کہ ظاہر ہے چودھری صاحب آپ کو یہ بتا کر گئے تھے کہ وہ ایک تگڑی رقم لینے جا رہے ہیں۔ آپ نے یہ بات کس کس کو بتائی تھی۔"

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"سوائے اپنی نوکرانی شمسہ کے کسی کو بھی نہیں۔" وہ پورے یقین کے ساتھ بولی۔

"نوکرانی شمسہ کو کیوں بتائی تھی؟" میں نے بال کی کھال اتارتے ہوئے کہا۔

"اس دن وہ صبح صبح آ گئی تھی چودھری صاحب جیپ میں بیٹھ رہے تھے اس نے پوچھا تھا۔ صبح صبح کہاں جا رہے ہیں۔ میں نے اسے بتانے میں کوئی قباحت نہ سمجھتے ہوئے اصل بات بتا دی۔ کیا میں نے کوئی غلطی کی ہے؟" آخر میں اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں، کیا اس وقت شمسہ حویلی میں موجود ہے۔"

"نہیں آج اس کا بچہ بیمار ہے اس لیے جلدی چلی گئی ہے ویسے وہ چار بجے جاتی ہے۔"

"آپ جائیں اگر ضرورت ہوئی تو دوبارہ آپ کو زحمت دوں گا۔"

لیکن اسے رخصت کرنے سے پہلے میں نے اس سے نوکرانی شمسہ کا پتا لے لیا تھا۔ نوکرانی شمسہ کا گھر مقتول کی حویلی سے تھوڑا ہی دور تھا۔ میں پیدل ہی اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازہ اس کے شوہر نے کھولا وہ سانولی رنگت کا

ایک چالیس بیالیس سال کا مدقوق کا بندہ تھا بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ وہ ٹی بی کا مریض ہے اور اس کی بیوی حویلی میں کام کر کے نہ صرف اس کا اور اپنا پیٹ پال رہی ہے بلکہ اس کی دوائیوں کا خرچہ اٹھا رہی ہے چونکہ میں وردی میں تھا اس لیے تعارف کرانے کی ضرورت نہیں تھی البتہ اپنے آنے کا مقصد میں نے اسے بتایا تو وہ مجھے اندر لے گیا۔ وہ ایک کمرے کے مکان میں رہ رہے تھے۔ جس کی دیواریں پکی اور چھت ذرا نیچی تھی۔ شمسہ اپنے پانچ سالہ بچے کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ گویا وہ اپنے بچے کی کفالت بھی کر رہی تھی۔ بچے کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بخار میں تپ رہا ہے۔ بچہ سو رہا تھا۔

"شمسہ تمہارے بچے کو صحت دے۔ میں ذرا چند سوال کرنے تمہارے پاس آیا ہوں۔" میں نے چارپائی پر بیٹھنے کے بعد کہا۔

"بس جی دعا کریں یہی ہمارا آسرا ہے۔" اس نے بچے کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

"شمسہ ایک بات ذہن میں رکھنا کہ میں جو سوال کروں اس کا سچا اور کھرا جواب دینا ہے۔"

"جی تھانیدار صاحب آپ پوچھیں مجھے کوئی بات چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"یقیناً یہ بات تم تک پہنچ چکی ہوگی کہ چودھری صاحب کو ڈاکوؤں نے قتل کر دیا ہے۔" میں نے سوالوں کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔

"جی بہت دکھ ہوا ہے۔ میرے ساتھ تو وہ بہت اچھے تھے میری مالی مدد کرتے رہتے تھے۔ میرا بچہ بیمار نہ ہوتا تو میں حویلی میں ہی رہتی۔"

"اگر میں یہ کہوں کہ ڈاکوؤں کے بھیس میں قاتل تھے تو اس بارے میں تم کیا کہو گی۔"

"یعنی منصوبہ بندی سے چودھری صاحب کو قتل کیا گیا ہے۔" وہ بولی۔

"بالکل میرا تو یہی خیال ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑھتے ہوئے کہا۔

میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا ہے۔ چند لمحے وہ خاموش رہی پھر بولی۔

"سنا ہے مرنے والی کی بدخوئی نہیں کرنی چاہیے اس لیے... تھانیدار صاحب چودھری صاحب رنگین مزاج تھے۔" پھر وہ نظریں نیچی کیے ہوئے بولی۔ "ہوسکتا ہے کسی غلط جگہ ہاتھ ڈال بیٹھے ہوں۔"

"کیا تم کسی ایسی عورت سے واقف ہو جس نے چودھری کو دھتکار دیا ہو اور اس کے شوہر یا بھائی نے یہ کام کرایا ہو۔"

"تھانیدار صاحب ہم غریب لوگ ہی کسی پھڈے میں الجھنے یا کسی کی دشمنی مول لینے کی استطاعت نہیں رکھتے میں عورت کا نام بتا دیتی ہوں۔ لیکن میرا نام نہ آئے تو میں آپ کو دعائیں دوں گی۔" اس نے اپنی مجبوری اور ذہن کے مطابق کہا۔

"تم نام بتا دو، تمہارا نام نہیں آئے گا۔"

"جی اس عورت کا نام صغراں ہے، کرامت ماچھی کی بیٹی ہے کرامت چاچا تو مرا مٹا سا ہے لیکن اس کا بیٹا بڑا جی دار ہے۔ حیدر علی نام ہے اس کا۔"

"اچھا" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"پوری بات بتاؤ۔"

صغراں پہلے چودھری صاحب کی حویلی میں کام کرتی تھی ایک دن موقع دیکھ کر چودھری صاحب نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا صغراں نے نہ صرف چودھری صاحب کو کھری کھری سنائیں بلکہ کام چھوڑ کر بھی آ گئی۔"

یہ اندازہ میں نے لگا لیا تھا کہ شمسہ آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام وصول کرنے والی عورت تھی۔ شوہر اس کا ٹی بی کا مریض تھا اور شاید اس کے لیے ناکارہ ہو گیا تھا۔

بہرحال وہ یا اس کا شوہر کسی طرح بھی چودھری کے قتل میں ملوث نہیں نظر آئے تھے بہرحال یہ کوئی حتمی رائے نہیں تھی۔ میں نے تھانے میں واپس آ کر ساری صورت حال اے ایس آئی عشرت علی کو بتا دی۔

"سر...... بظاہر لگتا تو یہی ہے کہ چودھری اپنی رنگین مزاجی سے اس انجام تک پہنچا ہے۔ لیکن ہمیں اس پہلو پر بھی ضرور تفتیش کرنی چاہیے کہ ہوسکتا ہے واقعی وہ ڈاکو ہوں اور وہ چودھری کو لوٹنا چاہتے ہو، لیکن مزاحمت کرنے پر چودھری کو قتل کر کے رقم لے کر چلتے بنے ہوں۔"

میں اس پہلو کو بالکل بھی نظرانداز نہیں کر رہا اس کا امکان موجود ہے لیکن مجھے اس تھیوری خیال کو سچ ماننے کے لیے ایک سوال کا جواب نہیں مل رہا۔" میں نے کہا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"کون سا سوال سر؟"

میں نے چند لمحے اے ایس آئی کی طرف دیکھا پھر بولا۔

"اگر وہ واقعی اصلی ڈاکو تھے تو انہیں یہ بات کس نے بتائی تھی کہ فلاں ٹائم چودھری ایک تگڑی سی رقم لے کر آ رہا ہے۔"

"واقعی یہ بات تو ہے، سر۔"

"بس عشرت علی اگر مجھے اس سوال کا جواب مل جائے تو میں تفتیش کے گھوڑے نامعلوم راہزنوں یا ڈاکوؤں کی طرف دوڑا دوں گا۔ ہمارے تھانے کی حدود میں ان دنوں ڈاکوؤں یا رہزنوں کا باقاعدہ کوئی گروہ نہیں تھا۔ جو سرگرم ہو۔"

"سر اب کیا کرنا ہے؟" اے ایس آئی نے پوچھا۔

"فی الحال تو تم صغراں کو اپنی کسی مخبر کے ذریعے ٹٹولو۔"

"ٹھیک ہے اب مجھے اجازت دیں، میں یہ کام کرتا ہوں۔"

وہ اپنا کام سمجھتا تھا اس لیے مجھے اسے راستہ دکھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مخبر عورت خالہ نصرت دو دن بعد خفیہ طریقے سے میرے پاس آئی اور رپورٹ دی اس کی رپورٹ سننے کے بعد میں نے اس سے چند سوال کیے تھے وہ آپ کی نذر کرتا ہوں۔

وہ جگت خالہ تھی ہر چھوٹا بڑا اسے خالہ ہی کہتا تھا۔

"خالہ تمہاری رپورٹ کے مطابق مقتول کے چال چلن کی وجہ سے صغراں نے حویلی کی نوکری چھوڑ دی تھی اور مقتول کو کھری کھری سنائی تھیں جیسی رپورٹ مقتول کے متعلق مجھ تک پہنچی ہے اس سے تو اور ہی کہانی بنتی ہے۔"

"کون سی کہانی جی۔"

"قتل تو صغراں کو ہونا چاہیے تھا لیکن قتل چودھری کا ہو گیا ہے۔"

"بات تو آپ کی ٹھیک ہے، لیکن صغراں کا بھائی بڑا جی دار ہے۔ ہر فرعون کے لیے ہر دور میں موسیٰ ضرور پیدا ہوا ہے۔"

"تو تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ حیدر علی نے کام دکھا دیا ہے۔"

"میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی البتہ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ صغراں کا منگیتر مظہر خان بھی بڑا غصیلا بندہ ہے اور اس کے تعلقات نشہ اور بدمعاشی کرنے والوں کے ساتھ بھی ہیں۔" اس نے ذومعنی بات کی۔

"اوہ یہ بات بڑے کام کی ہے اور اندھیرے میں روشنی کی کرن ہے۔ تم ان نشہ اور بدمعاشی کرنے والوں کے نام بتا سکتی ہو جن کے ساتھ مظہر خان کے تعلقات ہیں۔"

"کیوں نہیں جی، ان کے نام طافو، حنیف اور جمشید ہیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ وہ اکثر قبرستان کے باہر مشرقی دیوار کے ساتھ بیٹھ کر جوا کھیلتے ہیں اور کپی (کچی شراب) پیتے ہیں۔"

"اوہ، کیا وہ دن دیہاڑے یہ سب کچھ کرتے ہیں۔" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں جی وہ یہ کام رات کے اندھیرے کی بکل مار کر کرتے ہیں۔ پھر تو ان کے رنگ میں بھنگ ڈالنی پڑے گی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم بڑے کام کی مخبر ہو، مجھے شمسہ کے متعلق معلومات چاہیے۔"

"شمسہ وہی تو نہیں جو مقتول کی حویلی میں کام کرتی ہے اور جس کا شوہر ٹی بی کا مریض ہے۔" خالہ نصرت نے اپنی ناک کو چٹکی میں پکڑتے ہوئے کہا۔ (وہ اپنے علاقے اور ارد گرد کی انسائیکلوپیڈیا تھی) یہ شاید اس کی عادت تھی۔

"بالکل تم ناک کی سیدھ میں صحیح پہنچی ہو۔" اس نے اپنی ناک کو چھوڑ دیا۔ اور بولی۔

"شمسہ کا شوہر ناکارہ ہو چکا ہے۔ وہ موج میلہ بھی کرتی ہے اور پیسے بھی بٹورتی ہے لیکن آپ نے کیوں اس کے متعلق پوچھا ہے۔"

"مٹی پاؤ، تم صرف یہ پتا کرو کہ اس سے پہلے شمسہ کہاں کام کرتی تھی۔"

"ٹھیک ہے جی آپ مجھے دو دن کی مہلت دے دیں میں کھرا کھوٹا آپ کے سامنا لا کھڑا کروں گی۔"

اس کو رخصت کرنے کے بعد میں تھانے کے دوسرے امور نمٹانے میں لگ گیا۔ شمسہ کے متعلق مجھے ایک شک تھا جس کو میں دور کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسی دن اے ایس آئی کی یہ ڈیوٹی لگائی کہ وہ طافو، حنیف اور جمشید پر نظر رکھنے کے لیے کچھ پولیس اہلکاروں کی ڈیوٹی لگا دے۔

چودھری شیر علی کا قتل کوئی معمولی بات نہیں تھی ہر جگہ اس کے چرچے تھے۔ مجھ تک جو رپورٹیں پہنچی تھی ان کے مطابق ہر کوئی حیران تھا کہ فرعون صفت اور شیطان صفت چودھری پر کون وار کر گیا ہے جب ٹھوس وجہ موجود ہو تو پھر ہر ایک ذہن

اسی طرف جاتا ہے۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ چودھری شیر علی اپنی حرکتوں کی وجہ سے مارا گیا ہے۔ ڈاکوؤں والی بات زیادہ تر لوگ ڈراما ہی سمجھ رہے تھے۔ یعنی قاتلوں نے ڈاکوؤں کا بہروپ بھرا تھا۔ فی الحال میرا اندازہ بھی یہی تھا۔ آگے کی تفتیش کیا کچھ سامنے لانے والی ہے یہ ابھی سات پردوں میں چھپا ہوا تھا۔ اور میں نے ایک ایک پردہ اٹھانا تا۔

مخبر خالہ نصرت کی اگلی رپورٹ آنے سے پہلے ایک واقعہ ہو گیا۔ گورکن گاؤں کے ایک بندے کے ساتھ میرے پاس آیا اور یہ اطلاع دی کہ قبرستان میں طافو کی لاش پڑی ہے اور یہ لاش رات کو کوئی وہاں ڈال گیا ہے۔

میں نے گورکن کو اپنے سامنے بٹھالیا اور گاؤں کے بندے (شادے) کو باہر بھیج دیا۔ میں نے گورکن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"چاچا.... طافو کو تم جانتے ہو؟"

"جی سرکار ماسٹر فیروز کا بگڑا ہوا بیٹا ہے، باپ اتنا شریف ہے گاؤں کے اسکول کا استاد ہے، اور بیٹا جہالت اور بدمعاشی کے گھور اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے اسے کہتے ہیں چراغ تلے اندھیرا۔"

"تم تو پڑھے لکھے لگتے ہو، چاچا۔" میں نے گورکن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے جناب میٹرک کیا ہے کسی دفتر میں کلرکی کرنے کی بجائے باپ دادا کے کام میں لگ گیا ہوں، اسی میں مجھے مزہ آتا ہے اور سکون ملتا ہے۔" میں نے اس کے خیالات پر کسی قسم کا تبصرہ کرنے کی بجائے سوال کیا۔

"تمہیں پتا تھا کہ طافو اپنی منڈلی کے دو اور جوانوں کے ساتھ قبرستان کی مشرقی دیوار کے ساتھ بیٹھ جوا کھیلتا تھا اور کچی (کچی شراب) پیتا تھا۔"

"نہیں جی اگر مجھے پتا ہوتا تو میں پہلے خود ان کی چھترول کرتا پھر آپ کے پاس لے آتا۔"

"چاچا بندے کو اتنا بھی غافل نہیں ہونا چاہیے کہ اپنے اردگرد کی خبر نہ ہو۔"

"بس جی غلطی ہو گئی، آئندہ میں اِدھر اُدھر ضرور نظر رکھوں گا۔"

"تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر اس سے پوچھا "تم لوگ کس سواری پر آئے ہو۔"

"جی بائی سائیکل پر۔ تھانے کے باہر کھڑی ہے۔"

"تم اپنی سائیکل پر جائے وقوعہ پر پہنچو، ہم ضروری تیاری کے بعد آتے ہیں۔"

"کیا میں شادے کو بھی لے جاؤں۔"

"نہیں تم کہاں اس کا وزن سائیکل پر گھسیٹتے پھرو گے۔" میں نے چند لمحے توقف کیا۔ پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "واپسی پر وہ ہمارے ساتھ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے جی جیسی آپ کی مرضی۔" اس کو رخصت کرنے کے بعد میں نے ضروری تیاری کی اور دو سپاہیوں کو ساتھ لے کر قبرستان میں پہنچ گیا۔ میں نے ایک خاص مقصد کے تحت گورکن سے معلومات جائے وقوعہ پر جانے سے پہلے حاصل کی تھیں، انہی معلومات کی روشنی میں، میں نے تھانے سے روانہ ہونے سے پہلے اے ایس آئی کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ حنیف اور جمشید کو تھانے میں لانے کا بندوبست کرے۔ لاش قبرستان کے گیٹ کے ساتھ ہی پڑی تھی طافو کو میں پہلی بار وہ بھی مردہ حالت میں دیکھ رہا تھا۔ وہ شکل سے بدقوق سا جوان لگتا تھا۔ نشے کا مارا ہوا، لاش بالکل چت پڑی تھی۔ سینے کا سوراخ یہ کہانی سنا رہا تھا کہ اسے سینے میں عین دل کے مقام پر گولی مار کر ہلاک کیا گیا ہے لاش کے آس پاس بالکل خون نہیں تھا۔ جس سے ظاہر تھا طافو کو کہیں اور قتل کر کے لاش کو یہاں پھینکا گیا ہے۔

لاش کے آس پاس جو کھرے تھے وہ محفوظ تھے کیونکہ گورکن نے اس بار ذرا عقل مندی کی تھی کہ جب صبح کو اس نے لاش دیکھی تھی تو کھروں سے بچ بچ کر قریبی گھر میں مقیم شادے کے دروازے پر جا کر دستک دی تھی اور اسے لاش کے متعلق بتایا تھا۔ شادا اپنے بڑے بھائی قدیر کے ساتھ رہتا تھا دونوں شادی شدہ تھے۔

دونوں نے قدیر کو لاش کے پاس کھڑا کیا تھا اور خود تھانے میں آ گئے تھے۔

ہمارے وہاں پہنچنے تک درجن بھر کے قریب مرد و زن وہاں اکٹھے ہو گئے تھے۔ عورتیں دور تھیں جبکہ مرد دیوار کے ساتھ کھڑے تھے قدیر نے انہیں ساری بات بتا کر یہ کہا تھا کہ میں کھروں کی حفاظت کے لیے یہاں کھڑا ہوں۔

وہ لوگ اب اتنے بدھو بھی نہیں تھے کہ قدیر کی بات سمجھ نہ سکتے بہرحال میں نے ایک سپاہی کو بھیج کر کھوجی کرم دین کو بلا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

لیا تھا وہ آتے ہی اپنے کام میں لگ گیا تھا۔ سپاہی اس کی مدد کر رہا تھا۔ میں نے شادے کے گھر میں بیٹھ کر لوگوں سے سوال و جواب کیے تھے۔ لیکن وہ بھی کام کی کوئی بات نہ بتا سکے۔ ان میں سے کسی نے بھی لاش قبرستان میں پھینکنے والے یا والوں کو نہیں دیکھا تھا۔

مجرم جتنا بھی ذہین ہو کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرتا ہے لاش کے نیچے سے مجھے ایک چاندی کا لاکٹ ملا تھا۔ جس کی زنجیر بھی سفید رنگ کی تھی۔ لاکٹ کو میں نے جیب میں ڈال لیا تھا۔

ضروری کاغذی کارروائی کرنے کے بعد میں نے لاش کو حسب معمول ڈسٹرکٹ اسپتال سپاہی کی نگرانی میں بھیج دیا تھا۔ کاغذی کارروائی اور لوگوں سے سوال و جواب کرنے کے دوران کھوجی بابا نے سپاہی کے ساتھ مل کر اپنا کام مکمل کر لیا تھا۔ کھروں کے فوٹو بنانا بھی اس میں شامل تھا۔ جب میں تھانے میں واپس آیا تو اے ایس آئی بھی میرے کمرے میں آ گیا۔

"کیا خبریں ہیں بھئی۔"

"سر حنیف اور جمشید قابو آ گئے ہیں ان کو میں نے کانسٹیبل بشیر کی بیرک میں بٹھا دیا ہے۔"

"ان کو ابھی وہیں بیٹھا رہنے دو، تم یہ بتاؤ کہ کبیر علی مقتول کا بھائی کیسا بندہ ہے؟"

"بندہ باقی تو ٹھیک ہے لیکن ریس کا رسیا ہے یعنی گھوڑوں پر شرطیں لگاتا ہے اور اسی سلسلے میں اپنے حصے کی دولت لٹا بیٹھا ہے۔"

"تم اس کو تھانے میں بلانے کا بندوبست کرو، پتا نہیں کیوں یہ بندہ مجھے کھٹک رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے جی۔"

اے ایس آئی کے جانے کے بعد میں ذہن کے گھوڑے دوڑانے لگا۔ یہ سب تو ہو گیا تھا لیکن ابھی تک طافو کا باپ سامنے نہیں آیا تھا۔ یہ بات مجھے کھٹک رہی تھی۔ آگے بڑھنے سے پہلے کھوجی بابا (کرم دین) کی رپورٹ سے آپ کو آگاہ کر دوں۔

کھوجی بابا نے بتایا کہ دو بندوں کے کھرے گاؤں بیری والا سے آئے اور قبرستان میں آ کر رک گئے تھے پھر ان کھروں کی واپسی مقتول کے گاؤں جعفر آباد کی طرف ہوئی تھی۔ یہ بات کھوجی بابا نے زور دے کر کہی تھی کہ جہاں لاش پڑی تھی کھرے وہاں تک ہی تھے پھر وہاں سے ہی واپس چلے گئے تھے۔

اس سے یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ جن بندوں کے وہ کھرے تھے انہوں نے ہی لاش کو لا کر قبرستان میں پھینکا تھا۔ جمشید اور حنیف ہمارے قابو میں تھے وہ نہیں بھاگ نہیں سکتے تھے۔ ان کو جان بوجھ کر میں انتظار کی سولی پر ٹنگا رہنے دینا چاہتا تھا تاکہ ان کے ذہن کو تفتیش کی چکی میں ڈالنے کے لیے تیار کی جا سکے۔ اس دوران میں ایک اور کام کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ماسٹر فیروز دین کو بلانے کے لیے ایک سپاہی کو بھیج دیا۔ ایک گھنٹے بعد سپاہی ماسٹر جی کو لے کر آ گیا۔

ماسٹر فیروز پینتیس چھتیس سالہ ایک دھان پان سا چھے فٹ کے قریب بندہ تھا۔ دھان پان ہونے کی وجہ سے اس کا قد اور بھی بڑا نظر آ رہا تھا میں نے اسے عزت سے بٹھایا اور بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ تو جیسے زمین میں گڑھا جا رہا تھا۔

"ماسٹر جی" میں نے اپنے نرم لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کا لخت جگر قتل ہو گیا ہے لیکن آپ مجھے جائے وقوعہ پر نظر نہیں آئے اب بھی میں نے آپ کو بلایا ہے تو......"

"تھانیدار صاحب جب بیٹا الطاف عرف طافو جیسا ہو تو عزت دار بندہ کس منہ سے لوگوں کے سامنے آ سکتا ہے۔"

"طافو جیسا بھی تھا آپ کا بیٹا تھا اس کے ساتھ آپ کا خون کا رشتہ بھی تھا" اس نے دکھی لہجے میں کہا۔

"تھانیدار صاحب اس کو میں نے گھر سے نکال دیا تھا جسم کا جو اعضا انسان کے لیے ناسور بن جائے اسے کاٹنا یا کٹوانا ہی پڑتا ہے۔"

"تو میں کاغذوں میں یہ لکھ لوں کہ طافو ایک لاوارث جوان تھا۔ لاش پوسٹ مارٹم ہو کر آنے کے بعد اسے کسی فلاحی تنظیم کے سپرد کر دوں وہ اسے لاوارث کے طور پر دفن کر دیں اور اس کے قتل کی فائل داخل دفتر کروں کیونکہ جب کوئی مدعی نہ ہو تو کارروائی آگے کیسے چل سکتی ہے۔"

وہ میری باتیں سن کر رونے لگا، میں نے اسے رونے دیا۔ تاکہ برسوں کا دبالا وا آنسوؤں کے راستے بہہ جائے۔

"تھانیدار صاحب الطاف اپنی ماں کے مرنے کے بعد

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا اچانک میری بیوی کو ہیضہ ہو گیا تھا اور وہ تین دنوں کے اندر اندر اپنے مالک حقیقی کے پاس چلی گئی تھی۔ تھانیدار صاحب یقین کریں میں نے نور جہاں (نوری) کا علاج کرانے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی تھی یقیناً اس کے سانس اس سدنیا میں پورے ہو گئے تھے۔ لیکن......"

ماسٹر فیروز نے چند لمحے توقف کیا پھر بولا۔ "الطاف اپنی ماں کے مرنے کے بعد یہ کہنے لگ گیا تھا کہ میں نے علاج میں کوتاہی کی تھی اس کے بعد وہ مجھ سے کھنچا کھنچا رہنے لگا تھا اور نہ صرف گستاخ ہو گیا تھا بلکہ برے لوگوں کی صحبت میں بھی بیٹھنے لگ گیا تھا۔"

جب ماسٹر فیروز یہاں تک پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر غم کے بادل سے چھا گئے۔

"دیکھیں جی آپ کا بیٹا الطاف عرف طافو جیسا بھی تھا وہ قتل ہو چکا ہے اب آپ کیا چاہتے ہیں۔"

"آپ نے بالکل سولہ آنے یہ بات صحیح کہی۔ آپ میری طرف سے رپورٹ درج کر لیں۔"

"ٹھیک ہے ماسٹر جی، اولاد کے ہاتھوں کبھی کبھی ایسے لمحات آ جاتے ہیں آپ محرر کے پاس چلے جائیں۔"

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ماسٹر فیروز کو رخصت کرنے کے بعد میں نے کانسٹیبل جاوید شاہ کو بلا لیا اور اسے حکم دیا کہ جمشید اور حنیف کو لے کر آؤ۔ چند لمحوں بعد دونوں میرے سامنے تھے۔ کانسٹیبل کو بھی میں نے کمرے میں ہی ٹھہرنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

دونوں کے چہرے یہ بتا رہے تھے کہ دونوں نشے کے عادی ہیں گالوں کی ہڈیاں باہر نکل آئی تھیں۔ آنکھوں میں عجیب سی دحشت تھی اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتا دونوں بیک وقت بولے۔

"تھانیدار صاحب آپ نے شاید کسی غلط فہمی کی بنا پر ہمیں تھانے میں بلایا ہے۔ ہمارا طافو کے قتل سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔"

"اوئے الوؤں کی دموں تھانیدار صاحب نے کب یہ کہا ہے کہ تم طافو کے قتل میں ملوث ہو۔" کانسٹیبل جاوید شاہ نے دونوں کو دبکا مارتے ہوئے کہا۔

"بس جی ہم تو یہی سمجھے تھے۔" حنیف بولا۔

میں اٹھ کر دونوں کے قریب چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے جسم ہولے ہولے کانپنے لگے تھے۔

"طافو تمہارا دوست تھا۔" میں نے باری باری دونوں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی......جی۔" دونوں نے مریل سی آواز میں کہا۔

"مجھے پتا چلا ہے کہ تم قبرستان کی مشرقی دیوار کے ساتھ شراب پی کر شور شرابہ کرتے ہو جس سے مردوں کے آرام میں خلل پڑتا ہے۔"

"وہ......جی......میں سمجھا نہیں۔" جمشید نے کہا۔

"وہاں قبرستان ہے اور ظاہر ہے وہاں صرف مردے دفن ہیں۔" میں نے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔

"نہیں جی، ہم تو بڑی خاموشی سے......" جمشید بولتے بولتے اس طرح چپ ہو گیا جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔

"شاباش تمہارا مطلب ہے تم تو خاموشی سے وہاں جوا کھیلتے ہو اور شراب پیتے ہو کیوں حنیف؟" دونوں نے سر جھکا لیا۔

"جاوید۔" میں نے کانسٹیبل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "انہیں لے جاؤ اور تھانے کے برآمدے میں الٹا لٹکا دو۔"

"او جی جناب مائی باپ رحم، ہم بہت کمزور بندے ہیں ہماری جان ناک کے راستے نکل جائے گی۔" دونوں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"تو تم طافو کے قتل کا اقرار کر لو، دو دن پہلے تمہارا طافو سے لین دین کے معاملے پر جھگڑا ہوا تھا۔ میں نے ہوا میں تیر چلاتے ہوئے کہا۔

"حنیف سچ بول کر اپنی اور میری جان چھڑا لو۔" جمشید نے اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"وہ جی طافو چند دنوں سے بازار حسن کے بدمعاشوں کے ہتھے چڑھا ہوا تھا۔"

"ان کے نام۔"

"ان کے نام بادل، ٹیپو اور فیاض عرف چاند ہیں جی۔"

"اندر خانے کہانی کیا ہے۔" میں نے اس بار نرم لہجے میں پوچھا۔

"اندر خانے کہانی کا تو ہمیں پتا نہیں ہے لیکن......؟"

"لیکن کے آگے والی کہانی بھی سنا دو، حنیف۔" میں نے اس سے کہا۔

''اصل کہانی تو آپ کو (.........) سے پتا چلے گی۔''
حنیف نے کہا۔

قارئین میں نے دانستہ نام چھپالیا ہے۔آپ اندازے لگائیں۔میں نے دونوں کو یہ کہہ کر جانے کی اجازت دے دی کہ وہ تھانے میں بتائے بغیر کہیں نہ جائیں اور آیندہ شراب اور جوئے سے توبہ کرلیں ورنہ سیدھے جیل جائیں گے۔میں نے انہیں لیموں کی طرح نچوڑ لیا تھا اور میرا تجربہ یہ کہتا تھا کہ دونوں کسی طرح بھی طافو کے قتل میں ملوث نہیں ہیں۔

میں نے طافو کی لاش کے نیچے سے نکلنے والے لاکٹ کا بھی ان کو درشن کرادیا تھا لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ لاکٹ کس کا ہے۔

میں بڑے منظم طریقے سے تینوں بدمعاشوں کو گھیرنا چاہتا تھا۔ابھی ایک دو دن میں نے ان کے متعلق معمولات سے آگاہی حاصل کرنی تھی۔

یہ اس شام کی بات ہے کہ مقتول کے چھوٹے بھائی کبیر علی کو کانسٹیبل بشیر خان پکڑ کر لے آیا۔۔کبیر علی دوسری بار میرے سامنے آیا تھا۔

میں نے اسے اپنے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا وہ اس طرح بیٹھ گیا کبھی نہ اٹھنے کیلئے بیٹھا ہو۔میں اس طرح اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا جیسے اس کے بولنے کا منتظر ہوں۔وہ واقعی بول پڑا۔

''تھانیدار صاحب آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے۔''

''کبیر بھائی ذرا دم تو لو۔''میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ جلدی جلدی جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لیں۔میں نے ذرا گاؤں منیر آباد جانا ہے۔''منیر آباد کے نام پر میں چونک اٹھا اور کبیر علی سے پوچھا۔

''خیر تو ہے،چودھری صاحب وہاں ایسا کون سا کام پڑ گیا ہے۔''

''بس جی وہاں کا نمبردار اپنا یار ہے اس کے ساتھ مرغابیوں کے شکار کا پروگرام ہے۔''

''چودھری صاحب دیکھ لیں کہیں تاریخ اپنے آپ کو دہرا نہ دے۔''اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔لیکن بندہ کایاں لگتا تھا۔فوراً اپنی حالت پر قابو پانے کے بعد بولا۔

''جناب اللہ خیر کرے گا پھر میں کوئی رقم لینے تو وہاں جا نہیں رہا۔البتہ واپسی پر آپ کے لیے دو چار مرغابیاں لے آؤں گا۔''

''چودھری تم یہاں سے جاؤ گے واپس آؤ گے نا۔''میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟''پہلی بار مجھے اس کی آنکھوں میں سراسیمگی کے آثار نظر آئے۔

''تم آج کل بازار حسن کے بڑے چکر لگا رہے ہو؟''

''بازار حسن کے......''وہ اس طرح چونکا جیسے اس کے حلق میں کوئی چیز پھنس گئی ہو۔

''دیکھو چودھری تم حقیقت کو جھٹلا کر اپنے لیے مصیبتوں کے پہاڑ کھڑے کرلو گے۔''

''وہ جی کبھی کبھی دل پشوری کرنے وہاں چلا جاتا ہوں۔''

''سچی بات بتائے بغیر تم کہاں سے جانہیں سکو گے۔''

''آپ مجھ سے کیا اگلوانا چاہتے ہیں،میں نے کچھ نہیں کیا۔''وہ بولا تو مجھے پتا چل گیا کہ وہ خوامخواہ دلیر بننے کی کوشش کررہا ہے ورنہ وہ بے بس ہوچکا ہے۔

یہاں اب یہ بات بتانے میں کوئی قباحت نہیں کہ حنیف نے اس شخص کا نام لیا تھا جو اس وقت میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

''تم نے اگر کچھ نہیں کیا تو اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''وہ خاموش رہا اور زمین کو یعنی میرے کمرے کے فرش کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے اس میں سمانے کا ارادہ رکھتا ہو۔

میں نے کانسٹیبل بشیر خان کو بلا کر کہا۔

''اس مشین کو رواں کرنا ہے۔''

''آپ اسے میرے حوالے کردیں اس کا ایک ایک پرزہ رواں ہوجائے گا۔''

''لے جاؤ اسے۔''میں نے کبیر خان کو گھورتے ہوئے کہا۔

بشیر خان چھوٹے چودھری کو اس طرح لے گیا جیسے قصاب بکرے کو ذبح کرنے لے جاتا ہے۔

چند لمحوں بعد واقعی ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کبیر خان کو ذبح کیا جارہا ہو۔

ابھی آدھا گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ ہر طرف خاموشی چھاگئی۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر کبیر علی میرے سامنے تھا۔ لیکن آدھا گھنٹہ پہلے والے کبیر علی سے یکسر مختلف تھا۔ چہرہ پسینے سے شرابور تھا سانس یوں پھولا ہوا تھا جیسے اسے کوئی پہاڑ چڑھنا پڑا ہو۔ گویا اونٹ پہاڑ کے نیچے آ گیا تھا۔ لیجیے اس کا اقرار جرم اس کی زبانی ہی سنیے۔

"تھانے دار صاحب میں بہت برا ہوں، بلکہ تھا۔ شراب پیتا تھا گھوڑوں پر جوا کھیلتا تھا۔ عورت بازی کرتا تھا لیکن کچھ دن پہلے یعنی بھائی صاحب کے قتل سے دو دن پہلے میری کایا پلٹ ہو گئی۔ صغراں مجھے کھیتوں میں مل گئی۔ صغراں مجھ سے چھوٹی ہے ہمیشہ مجھے بھائی جان کہتی ہے۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

"صغراں جو کچھ کہنا چاہتی ہو بلا جھجک کہہ دو، اور جلدی کہہ دو ورنہ اگر کوئی آ گیا تو رسی کا سانپ بن جائے گا۔"

"بھائی جان آپ کا بھائی ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہوا ہے اس نے مجھے پیغام بھجوایا ہے کہ وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ میری عزت سے کھیل کر لے گا۔ میں ایک بے بس لڑکی ہوں میرے منگیتر کو پتا چلا گیا ہے کہ میں حویلی کی نوکری کیوں چھوڑ کر آئی ہوں اگر میں اسے اور بھائی کو چودھری کے ارادوں سے باخبر کر دوں تو ایک ایسا طوفان اٹھے گا جو سب کچھ بہا کر لے جائے گا۔ وہ چودھری کو قتل کر دیں گے اور خود پھانسی لگ جائیں گے پھر میں بھی زندہ نہیں رہوں گی۔ خود کشی کر لوں گی۔ آپ اپنے بھائی جان کو سمجھائیں کہ خدا کے واسطے میرا پیچھا چھوڑ دے غریبوں کے پاس عزت ہی تو ہوتی ہے میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔ تھانیدار صاحب یقین کریں میں اس کی باتیں اور فریاد سن کر اندر باہر سے ہل گیا۔ اس کی فریاد میں بہہ گیا میں اندر باہر سے ایک بھائی بن گیا ایسا بھائی جو اپنی بہن کی عزت کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"آج سے تم میری بہن ہو تم بالکل بے فکر ہو جاؤ، اب میں جانو اور میرا بھائی۔"

میں نے اسی دن بھائی جان کو اکیلے میں لے جا کر کہا۔

"دیکھیں آپ صغراں کا خیال دل سے نکال دیں وہ بہت غریب اور شریف لڑکی ہے۔"

"کبیر علی خیر تو ہے آج کچھ زیادہ نشہ تو نہیں کر لیا۔" بھائی جان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یقین کریں آج میں نے ایک گھونٹ بھی نہیں پیا۔"

"تو صغراں کو اپنی محبوبہ بنا لیا ہے تبھی اس کے سامنے ڈھال بن کر کھڑا ہونا چاہتے ہو۔"

مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں نے اپنے غصے کو پیتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان یقین کریں میں نے اسے بہن بنا لیا ہے اس لیے ہاتھ جوڑ کر آپ سے گزارش ہے کہ اس کے اور میرے حال پر رحم کرتے ہوئے اس کا پیچھا چھوڑ دیں۔"

"اور اگر میں یہ کہوں کہ صغراں نے اس دو ٹکے کی چھوکری نے میری بے عزتی کرائی ہے اور میں اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لوں گا۔ تو......؟"

"تو بھی میں آپ کا ساتھ دینے کی بجائے اس مظلوم کا ساتھ دوں گا۔"

"وہ کس طرح؟"

"یہ تو وقت بتائے گا۔"

"تو گویا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔" بھائی جان نے مجھے خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ جو چاہے سمجھ لیں مجھے ہر قیمت پر صغراں کی عزت بچانی ہے۔"

"تم مجھے پرسوں ذرا امیر آباد سے ہو کر آ لینے دو وہاں میں نے سفیدے کے درختوں کے پیسے لینے ہیں پھر میں صغراں کا گھونٹ بھر لوں گا اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ گے۔"

"دیکھیں میں آخری بار آپ کو کہہ رہا ہوں کہ صغراں کا پیچھا چھوڑ دیں۔"

اپنے بڑے بھائی کی غرور اور زہر میں ڈوبی ہوئی آواز نے میرے غصے کو ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔ لیکن میں نے اس وقت وہاں سے نکل آنا ہی مناسب سمجھا۔ میرے تعلقات بازار حسن کے تین مانے ہوئے غنڈوں کے ساتھ ہیں۔ میں نے اسی شام جا کر ان سے بات کی۔ انہوں نے کہا۔

"دیکھو کبیر علی اس سے پہلے کہ پانی سر سے گزر جائے اس سیلاب کو روک لینا چاہیے۔"

"یعنی۔"

"چودھری شیر علی کا پتا صاف کر دینا چاہیے تا کہ نہ رہے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

بانس اور نہ بجے بانسری۔" بادل نے بائیں آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"لیکن پتا ایسے صاف ہونا چاہیے کہ کسی کو شک نہ ہو۔" میں نے کہا۔

"تم بالکل فکر نہ کرو، پرسوں ہمارے پاس سنہری موقع ہوگا۔ چودھری یقیناً ایک تگڑی رقم لے کر آئے گا۔ ہم تینوں ڈاکوؤں کے بھیس میں اس کے استقبال کے لیے کھڑے ہوں گے۔" فیاض عرف چاند نے کہا۔ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

طافو بھی ہمارا یار ہے کئی دفعہ اسے بازار حسن میں عیاشی کرائی ہے۔ اس علاقے کی مکمل رہنمائی کے لیے اسے بھی ساتھ رکھ لیں گے۔ اور کچھ رقم اسے بھی دیدے دیں گے اس طرح تمہارے اوپر بوجھ نہیں بنے گا۔ آخر تم ہمارے یار ہو، اور یاروں کی خاطر یار اپنی جانیں بھی قربان کر دیا کرتے ہیں اس میں تو زیادہ رسک نہیں ہے۔ پھر ہماری معلومات کے مطابق چودھری کی کلائی پر ایک قیمتی گھڑی بندھی ہوئی ہے جس کے ساتھ سونے کی زنجیر منسلک ہے۔"

"خیر یہ سب کچھ تو تمہارا ہوگا، میرے حالات آج کل ذرا پتلے ہیں ورنہ....."

"چھوڑو بھی اب تم بالکل بے فکر ہو جاؤ آؤ بادل کے ڈیرے پر موج میلہ کرتے ہیں۔"

"نہیں یار میں نے آج سے برے کاموں سے توبہ کر لی ہے۔"

"خیر لیکن یہ بات ذہن سے بھی نہ نکالنا کہ یہ دنیا بڑی ظالم ہے یہاں شریف انسان کو لوگ فٹ بال بنا دیتے ہیں۔"

میں نے ان کی باتوں کا جواب دینے کے بجائے وہاں سے نکل آنا ہی مناسب سمجھا۔ یہ ہے ساری کہانی تھانے دار صاحب آگے آپ خود سمجھدار ہیں۔

"لیکن ایک بات کا جواب اس ساری کہانی میں نہیں ہے۔" میں نے کبیر علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون سی بات تھانیدار صاحب۔"

"طافو کو کس نے قتل کیا ہے۔"

"اس کے متعلق یقین کریں مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔"

"اچھا اس لاکٹ کو پہچانتے ہو؟" میں نے اپنی میز کی دراز سے طافو کی لاش کے نیچے سے نکلنے والے لاکٹ کو اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

"جہاں سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے وہاں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ یہ لاکٹ بادل کا ہے۔"

"اوہ طافو کے قتل کا عقدہ بھی حل ہو گیا" ہم نے اس رات خفیہ نگرانی کے بل بوتے پر بادل، ٹیپو، فیاض عرف چاند کو گرفتار کر لیا تھا۔ انہوں نے جب تھانے میں کبیر علی کو دیکھا تو بغیر ڈرائنگ روم کی سیر کیے سب کچھ اگل دیا۔ سب کچھ اس طرح ہوا تھا جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں۔

طافو کے متعلق انہوں نے بتایا کہ انہوں نے اسے تین ہزار روپے دیے تھے لیکن وہ لالچ میں آ گیا تھا اور مطالبہ کیا تھا کہ اسے تین ہزار روپے نہیں چاہیے بلکہ اسے سونے کی زنجیر والی گھڑی چاہیے ساتھ کچھ تڑی وغیرہ بھی لگائی تھی۔ اگر وہ لالچ نہ کرتا اور انہیں دھمکی نہ لگاتا تو زندہ رہتا۔ تینوں نے اسے بادل کے ڈیرے پر بلایا اور وہاں قتل کر کے لاش کو قبرستان میں لا کر پھینک دیا تاکہ یہ قتل اس کی منڈلی کے ساتھیوں حنیف اور جمشید کے کھاتے میں ڈالا جا سکے۔ لیکن اپنے گھر والوں کو وہ کیسے جھٹلا سکتے تھے اگر وہ طافو کے قتل کا اقرار نہ کرتے تو میں ان کے سامنے ان کے گھر والے رکھ دیتا۔

قارئین آگے سنانے والی بات آپ کے لیے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگی۔ میں نے تو چاروں کے اوپر مقدمہ بنا کر حوالہ عدالت کر دیا تھا لیکن عدالت میں جا کر بادل، ٹیپو اور فیاض عرف چاند اس بات سے منحرف ہو گئے تھے کہ انہیں چودھری شیر علی کو قتل کرنے کے لیے چھوٹے چودھری کبیر علی نے کہا تھا بلکہ قتل کا سارا ملبہ انہوں نے اپنے سر لے لیا تھا اور وجہ یہ بتائی تھی کہ چودھری کے ساتھ ان کی پرانی دشمنی تھی۔ تین ماہ بعد ہی عدالت نے کبیر علی کو رہا کر دیا تھا۔ قدرت نے اسے نیک بننے اور صراط مستقیم پر چلنے کا موقع فراہم کر دیا تھا بے شک خدا نیتوں کے حال بہتر جانتا ہے۔ اب مجھے یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں تھی کہ شمسہ چودھری شیر علی کی حویلی میں کام کرنے سے پہلے کہاں کام کرتی تھی اس وقت میرے دل سے دعا نکلی تھی کہ اللہ تعالیٰ اسے بھی صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

آپریشن نومبر

مونا شہزاد

کرونا وائرس نے ایک وبا کی شکل اختیار کرکے لاکھوں جانوں کو نگل لیا ہے۔ ابھی بھی اس کی تباہ کاریاں عروج پر ہیں۔ اس وائرس کو لے کر سب کے اپنے اپنے خیالات ہیں۔ کوئی اسے اللہ کی طرف سے آزمائش کہہ رہا ہے تو کوئی اسے انسانوں کی سازش مگر ان سب باتوں کے باوجود اس وبا نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔

یہ کہانی بھی ایک سازشی پہلو کو نمایاں کرتی نظر آئے گی۔ مگر ہم اس سے پہلو تہی نہیں کرسکتے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کرووناوائرس پر مونا شہزاد کی ایک چشم کشا تحریر

(کرونا نامی وبا کی اصلیت)

۳۰ اکتوبر ۲۰۱۹ کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی شام تھی۔ ملٹی اسٹوری بلڈنگ خالی ہوچکی تھی۔ سکیورٹی گارڈز بھی جانے کی تیاریوں میں تھے۔ اچانک اسٹیو کے فون پر ایک میسج آیا۔ اس نے باقی سکیورٹی گارڈز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"چھ بڑوں کے استقبال کی تیاری کرو۔"

اس کے نیچے متعین چار سکیورٹی گارڈز نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اسمتھ نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اتنے طویل عرصے کے بعد آج بڑوں کو ملنے کا خیال کیسے آگیا؟"

اسٹیو نے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورا۔ وہ سب تیزی سے پروٹوکول کے مطابق تیاری میں مصروف ہوگئے۔ اسمتھ نے زبان دانتوں تلے دبالی وہ جانتا تھا کہ یہاں مزید سوال کرنے پر جواب میں ایک بلٹ کھوپڑی میں اتار دیا جاتا تھا۔

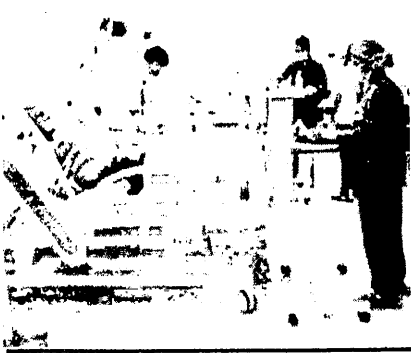

ایک دوسرے سے پوشیدہ تھی۔ وہ ایک دوسرے کے لئے یکسر انجان تھے مگر درحقیقت ایک ہی مقصد کے حصول کے لئے کوشاں تھے۔ اجلاس اپنے اختتام کو پہنچنے والا تھا۔ وہ پچھلے ایک گھنٹے سے ایک دوسرے کو بریفنگ دے رہے تھے۔

”جینٹل مین! کیا آپ سب میری تجویز سے متفق ہیں؟“ امریکن لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے ایک بڑے سیاہ نقاب پوش نے کہا۔

”نیو ورلڈ آرڈر کے لئے ضروری ہے کہ تمام مناسب اقدامات اٹھائے جائیں۔“ دوسرے بڑے سرخ نقاب پوش نے برطانوی لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے کہا۔

”کیا اتنی جانوں کا ضیاع اس نئے ورلڈ آرڈر کے قیام کے لئے ضروری ہے؟“ تیسرے، بڑے نے سر اٹھایا اور دبی زبان میں بولا۔

ایک لمحے کے لئے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ سب نے جواب طلب نظروں سے میز کے اختتام پر بیٹھے بڑے کی جانب دیکھا، جو سب کا سرغنہ محسوس ہوتا تھا۔

”ایک اعلیٰ وارفع مقصد کے حصول کے لئے چند لاکھ جانوں کا نذرانہ کچھ بھی نہیں ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہر جنگ اپنے سپاہیوں کے خون پر ہی جیتی جاتی ہے۔ وہی قومیں سرفراز رہتی ہیں جو جانوں کا نذرانہ دینے سے نہیں گھبراتی نہیں ہیں۔“ وہ دبنگ لہجے میں بولا۔

”مگر جنگ کے اصول وقوانین کا اطلاق ہم عام لوگو پر کیسے کرسکتے ہیں؟“ چوتھے سفید نقاب پوش بڑے نے دبی آواز میں کہا۔ ”اس نئی جنگی حرب، سے بے شمار بوڑھے، بچے، عورتیں، مرد اس کی زد میں آئیں گے۔ بے شمار بے گناہ لوگ مارے جائیں گے۔“

”تمہیں ہماری کمیٹی کے فیصلوں پر شک ہے؟“ سرغنہ نے غراتے ہوئے بولا۔

”ہرگز نہیں۔ مجھے کسی بات پر شک نہیں۔“ چوتھا نقاب پوش دبک سا گیا۔ وہ دبی آواز میں بولا۔

”ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم کے حملے سے ہی جنگی قواعد وضوابط بدل گئے تھے۔ ابھی تک جاپانیوں کی نسلیں اپاہج پیدا ہو رہی ہیں۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ چین کو مفلوج کر دیا جائے۔ مجھے دنیا بھر کے بوڑھوں سے نفرت ہے۔ یہ بوڑھے اپنی بھرپور زندگیاں بسر کر بیٹھے ہیں مگر ابھی تک مرنے پر تیار نہیں۔ ہمارے ملکوں میں لوگوں کی عمریں نوے سال تک پہنچ گئی ہے جس کے نتیجے میں یہ بوڑھے جونکیں بن کر ہمارے وسائل کو چوس رہے ہیں۔ ہماری حکومتوں کو فلاحی ریاستیں ہونے کے باعث اپنے وسائل کا بڑا حصہ ان پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ لگے ہاتھوں ان خون چوسنے والی جونکوں سے پیچھا چھڑوا لیا جائے۔“ سرغنہ نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا اور بولا۔

کمرے میں خاموشی سی چھا گئی۔ سیاہ نقاب پوش نے پھر ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔

”تو طے پایا کہ ہم یکم نومبر سے آپریشن نومبر کا آغاز کریں گے۔“

”نیو ورلڈ آرڈر کے نام“ سب نے مل کر ایک قہقہہ لگایا اور یک زبان ہو کر بولے۔

کمرے میں موجود نادیدہ ابلیس میز پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اس نے بہت فخر سے اپنے نقاب پوش حواریوں کو دیکھا اور زور و شور سے تالیاں پیٹنے لگا۔ اس نے اپنے فربہ پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

”میرے بچو! تم جیسے انسانوں کی موجودگی میں مجھے محنت نہیں کرنی پڑتی۔ آرام کر کر میری فٹنس متاثر ہونے لگی ہے۔ میں نے تو صرف تم لوگوں کو ایک راستہ دکھایا تھا تم لوگ کس قدر عمدگی سے راستہ اختیار کر چکے ہو۔“

نقاب پوش مختلف دروازوں سے میٹنگ روم سے نکل چکے تھے۔ صرف ابلیس اکیلا میز پر تھرکنے میں مصروف تھا۔ اسٹیو نے میٹنگ کے اختتام کے بعد میٹنگ روم میں جھانکا، اسے میٹنگ روم کا سناٹا بہت کچھ بولتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی روح پر خوف نے پنجے گاڑ لیے۔ اس نے تیزی سے دروازہ بند کیا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

❖❖❖❖❖

وہ ہوائی جہاز میں بیٹھا دزدیدہ نظروں سے اپنے ہم سفروں کو دیکھ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا ہر ہم سفر اسے ملامتی نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ اس نے اپنی پیشانی پر آئے پسینے کو رومال سے صاف کیا۔ اچانک چینی فضائی میزبان اس کے قریب آئی اور کچھ کہنے لگی۔ اسے لگا جیسے اس نے اس کے دل کے چور کو بھانپ لیا تھا۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اس کی رنگت زرد ہو گئی۔ اس کے رونگٹے کھڑے

ہو گئے۔فضائی میزبان نے مسکراتے ہوئے اسے پیپسی پکڑائی تو اس کے تن بدن میں جان آئی۔اس نے پیپسی کا ٹن لیا اور چسکیاں بھرنے لگا۔اس نے سوچا۔

"اس وقت میرے جیسے جیتے جاگتے کئی ٹائم بم کتنے ہوائی جہازوں میں سفر کر رہے ہوں گے اور کتنے ایئر پورٹوں پر بیٹھے ہوں گے۔اسے وہ تمام احتیاطی تدابیر یاد آئیں جو اسے چھوٹی سی نیلے رنگ کی وائل دیتے ہوئے اس کے باس نے اسے بتائی تھیں۔وہ جانتا تھا کہ اگر وہ وائل چینی حکام نے پکڑ لی تو اسے سرعام پھانسی لگا دی جائے گی۔"

اس نے جیب سے دو ویلیم کی گولیاں نکال کر پھانکیں اور کھڑکی سے سر ٹکا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔جلد ہی وہ نیند کی آغوش میں کھو گیا۔جہاں وہ ہر فکر سے بے بہرہ تھا۔

اس کی آنکھ پائلٹ کی اناؤنسمنٹ سے کھلی کہ جہاز جلد ہی بیجنگ ائیر پورٹ اترنے والا تھا۔اس کے ساتھی اس کی واردات سے بے خبر ایک دوسرے سے ہنسی مذاق میں مصروف تھے۔اس نے لمبا سانس لیا وہ جانتا تھا کہ بیجنگ سے اگلی فلائیٹ کہاں کی تھی۔وہ جانتا تھا کہ اسے چین تک پہنچانے کے لئے یہ ڈرامہ رچایا گیا تھا۔اس نے مصمم ارادہ کیا کہ وہ اپنے جذبات کو فرض کی راہ میں ہرگز حائل نہیں ہونے دے گا۔اس کے ضمیر نے ایک آخری کوشش کرتے ہوئے اسے جھنجھوڑا۔

"کیا ایسی چیز اس نیلی وائل میں بند ہے جو چین جیسے ملک کو اس کے نادیدہ آقاؤں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دے گی؟"

اس کی آنکھوں کے سامنے نیلی آنکھوں والی اپنی خوبصورت بیوی اور معصوم بچی کی شبیہہ لہرا گئی۔جنھیں وہ تسلی دے کر آیا تھا کہ دورہ مکمل ہوتے ہی وہ واپس ان کے پاس آ پہنچے گا۔اس نے ہونٹ چباتے ہوئے اپنے سر کو جھٹکا اور جہاز کی لینڈنگ کا انتظار کرنے لگا۔اس کا فرض اس کے ضمیر پر بھاری تھا۔اس نے اپنی نوکری قبول کرتے وقت عہد کیا تھا کہ وہ اپنے ملک وقوم کے مفادات کی راہ میں ہر چیز قربان کر دے گا۔پھر یہ تو صرف اس کا ضمیر تھا جس کا قتل آج اس نے کند چھری سے کر دیا تھا۔اس نے اپنے ذہن میں لائحہ عمل تیار کرنا شروع کر دیا کہ وہاں میں اس نے اپنے کام کی ابتدا کہاں سے کرنی تھی۔اچانک اس کے ساتھی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"میں چین کی wet markets میں ضرور جا کر تازہ مچھلی اور lobsters خریدوں گا۔سنا ہے کہ ان کی مچھلی اور lobsters بہت تازہ اور عمدہ ہوتے ہیں۔"

اس کے باریک ہونٹوں پر ایک سفاک سی مسکراہٹ آ گئی۔

اس نے اپنے ساتھی کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"فکر مت کرو۔ہم اکٹھے ہی جائیں گے۔میں تمہارا گائیڈ بن کر جاؤں گا۔میں کئی دفعہ وہاں آیا ہوا ہوں۔"

اس نے اپنے منصوبے پر عملدرآمد کے لئے مفصل لائحہ عمل طے کر لیا تھا۔اب وہ خوشگوار موڈ میں سیٹی بجا رہا تھا۔

❖❖❖❖❖

25 نومبر 2019 کی ایک سرد شام تھی۔فین لی نے اپنی کشتی واپس وہاں کی گودی کی طرف موڑتے ہوئے سوچا۔

"طبیعت کبھی پہلے تو ایسی مضمحل نہیں ہوئی تھی۔"

اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔درد کی لہریں اسے بے حال کر رہی تھیں۔وہ مشکل سے گودی تک پہنچی۔اس کا سانس اب دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے تیز بخار چڑھ چکا تھا۔اس کا جسم کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔اس نے مشکل سے اپنی کشتی کو باندھا۔وہ کشتی سے نکلتے ہی تیورا کر گری اور بے ہوش ہوئی۔گودی میں ہلچل مچ گئی۔آج صبح سے یہ تیسرا کیس تھا۔مچھیرے ساحل کی طرف بیمار ہو کر آ رہے تھے۔ان کی بیماری کی وجہ نا معلوم تھی۔اس کے ساتھی اسے اٹھا کر قریبی ہیلتھ سینٹر لے گئے۔ڈاکٹر لوئی چن ابھی بھی ڈیوٹی پر تھا۔اس نے تشویش سے فین لی کی جانب دیکھا۔صبح سے یہ تیسرا کیس تھا جو گودی سے اس کے پاس لایا گیا تھا۔تمام کیسز کی علامات ملتی جلتی تھیں۔اس نے تیسرا کیس آتے ہی اسے فوراً ہائی اتھارٹی کو رپورٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے خود بھی ماسک اور گلووز پہن لیے اور اپنے عملے کو بھی ہدایات جاری کر دیں۔اس کے ذہن میں وبا کا خوف منڈلا رہا تھا۔وہ جانتا تھا کہ یہ انفلوئنزا نظر آنے والا مرض اس سے کچھ مختلف تھا۔اسے اسپینش فلو سے ہونے والی تباہی یاد تھی۔اس نے تمام مریضوں کے خون کے نمونے لیے اور اپنے ماتحت زنگ چن لی کو اس کے خواص معلوم کرنے کو کہا۔شام تک تین مریضوں میں سے ایک کی حالت بگڑ گئی۔اس کے پھیپھڑے جواب دے گئے۔ڈاکٹر لوئی چن کی کشادہ پیشانی پر سلوٹیں آ گئیں۔اس نے کبھی انفلوئنزا کے مریض کو اس تیزی سے گرتے نہیں دیکھا تھا۔اس نے مریض کو وینٹی لیٹر پر ڈال دیا۔وہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ایک لائق فائق ڈاکٹر اور ریسرچر تھا۔ اس کے پیٹ میں خوف سے گرہیں پڑ رہی تھیں۔ اس نے شفٹ ختم کی، نئے آنے والے ڈاکٹر کو سختی سے PPE استعمال کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے وہ بھاری دل سے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی رات بھی بہت بے چین گزری۔ اس کی بیوی بھی ایک نرس تھی۔ وہ دونوں ایک ہی ہیلتھ سینٹر میں خدمات انجام دیتے تھے۔ رات بھر وہ اس کی بے چینی محسوس کرتی رہی صبح تیار ہوتے ہوئے وہ اس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"شینگ لی! دعا کرو کہ میرے تفکرات غلط ہوں اور واقعی میں سب کچھ ٹھیک ہو۔ مجھے یہ مریض کسی بڑے طوفان کی آمد کے نقیب محسوس ہو رہے ہیں۔" وہ متفکرانہ انداز میں بولا۔

وہ دونوں ہی جلد تیار ہو کر ناشتہ کر کے گھر سے رخصت ہو گئے۔ ہیلتھ سینٹر پہنچ کر ایک عجیب و غریب صورتحال دیکھنے کو ملی۔ بے شمار مریض ملتی جلتی علامات کے ساتھ ہیلتھ سینٹر میں موجود تھے۔ ہر طرف کھانستے، الٹیاں کرتے بیمار لوگوں کا جم غفیر تھا۔ ایک ہی رات میں یکا یک مریضوں کی تعداد بڑھ جانا کسی بڑے خطرے کا پیش خیمہ تھی۔ ڈاکٹر لوئی چن کی پیشانی پر تفکرات کی لکیریں مزید گہری ہو گئیں۔ اس نے اپنی ڈیوٹی شروع کرنے سے بجائے ہیلتھ سینٹر کے ایڈمنسٹریٹر سے ملاقات کا فیصلہ کیا۔ وہ جب اس کے کمرے میں پہنچا تو وہاں بھی اسے ایک افراتفری کا سا منظر دکھائی دیا۔ تمام مددگار عملہ تیزی سے مصروف عمل تھا۔ اس نے ڈائریکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اجازت دیجیے کہ میں مریضوں کو دیکھنے کے بجائے کچھ مریضوں کے خون کے سیمپل پر تحقیق کر سکوں۔"

ڈائریکٹر ماؤ چینگ لی جانتا تھا کہ ڈاکٹر لوئی ایک بہترین ریسرچر تھا۔ وہ آگے تعلیم بھی جینیٹک وائرسز میں حاصل کر رہا تھا۔ ڈائریکٹر کو اندازہ تھا کہ یہ قابل ڈاکٹر اگر اس سے اجازت طلب کر رہا ہے تو ضرور اس کے پس پشت کوئی بات ضرور تھی جو اسے پریشان کر رہی تھی۔ اس نے اسے فوراً تحریری اجازت نامہ لکھ کر دے دیا۔ ڈاکٹر لوئی چن تیزی سے اپنی لیبارٹری کی طرف چل پڑا۔ اس نے دیکھا اس کا ماتحت زنگ چن لی سر پکڑ کر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا لیب کوٹ، دستانے اور ماسک پہنتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"کچھ کامیابی ہوئی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور کہا۔

"یہ طے ہے کہ یہ وائرس ہے مگر اس کی مماثلت انفلوئنزا یا اسپینش فلو سے نہیں ہے۔"

اس نے اسے گھر جا کر چند گھنٹے آرام کرنے کی ہدایت کی اور خود مائیکرواسکوپ پر جھک گیا۔

زنگ چن لی جب رات کو واپس ڈیوٹی پر آیا تو اس نے دیکھا ڈاکٹر لوئی چن کے چہرے پر تفکرات کی شکنیں بہت گہری تھیں۔ وہ آرام کرسی پر ساکت و صامد بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت غیر معمولی طور پر زرد تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے سامنے پڑی تفصیلی رپورٹ اس بات کا ثبوت تھی کہ اس کا باس نادیدہ بیماری کا کیس حل کر چکا تھا۔ اس نے رپورٹ اٹھا کر پڑھنی شروع کی اور اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔

"ڈاکٹر لوئی چن آپ جانتے ہیں کہ آپ کیا لکھ رہے ہیں؟ یہ بیماری کی تشخیص نہیں سزائے موت ہے۔ کیا ہم سب اس عفریت کا لقمہ بننے والے ہیں؟" اس کے ہاتھوں میں لرزش بڑھ گئی۔ اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کرونا نامی یہ وائرس 1930 کے عشرے میں مرغیوں میں پھوٹا تھا۔ 1940 میں چوہے اس کا نشانہ بنے۔ 1960 میں انسانوں میں یہ وائرس نمودار ہوا۔ 2001 میں یہ وائرس SARS کی شکل میں نمودار ہوا۔ مگر اس بار یہ وائرس بالکل مختلف میوٹیشن کے ساتھ نمودار ہوا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اگر اس پر قابو نہیں پایا گیا تو دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ اس سے متاثر ہو جائے گا۔ لاشوں کے ڈھیر لگ جائیں گے۔" ڈاکٹر لوئی چن نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

"آپ نے رپورٹ اعلیٰ حکام کو بھیج دی ہے؟" زنگ چن لی نے جھرجھری سی لی اور پوچھا۔

لوئی چن نے تھکے تھکے انداز میں سر ہلایا اور زنگ چن لی کو کہا۔

"تم اب وائرس کو جان چکے ہو۔ وقت ضائع کیے بغیر اب اس پر کام شروع کرو کہ ہم کوئی ویکسین بنا سکیں۔ کل رات سے اب تک میں تین اموات کی خبر سن چکا ہوں۔ ووہان وبا کی لپیٹ میں آ چکا ہے۔ کل پرسوں تک حکومت ووہان کو مکمل طور پر بند کر دے گی۔ میں نے حکومت کو Isolation اور Quarantine کرنے کی ہی ہدایات بھیجیں۔ اس وقت ہمارا دنیا سے کٹ جانے میں فلاح ہے۔ ہمارا ملک بہت زیادہ گنجان آباد ہے اگر یہ وبا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

پھیل گئی تو لاشوں کو جلانے والا بھی کوئی نہیں رہے گا۔"

زنگ چن لی بے اختیار ہی اس کے گلے لگ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا باس ایک عظیم سائنسدان اور ڈاکٹر تھا۔ اس نے بے اختیار ہی اسے سیلوٹ کیا۔ ڈاکٹر لوئی چن نے مسکرا کر سر ہلایا اور کہا۔

"مادر وطن اور وطن کے باسیوں کی خدمت ہی ہمارا نصب العین ہے۔ میں کل سے ہیلتھ سینٹر کے وارڈ میں اور باقی وقت تحقیق میں صرف کروں گا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ڈٹ کر اس عفریت کا مقابلہ کریں۔"

❖❖❖❖

وہ پتھرایا ہوا ICU کے باہر بیٹھا تھا۔ اس کا ضمیر اس کے سامنے مجسم گھائل کھڑا اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس کی محبوب بیوی جو چھ ماہ کے حمل سے تھی چند گھنٹے قبل اس کے سامنے دم توڑ گئی تھی۔ وہ چیختا چلاتا رہا مگر اسے ICU کے اندر جانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ وہ حسرت بھرے انداز میں اسے سسک سسک کر رخصت ہوتے دیکھتا رہا۔ اسی ICU وارڈ میں اس کی چھ سالہ بیٹی بھی وینٹی لیٹر پر تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کسی کے دامن میں لگائی آگ اس کے ملک تک کیسے پہنچ گئی تھی۔ وہ پشیمانی سے صرف ہاتھ مل رہا تھا۔ اچانک ایک ڈاکٹر نے اسے خبر سنائی کہ اس کی بیٹی بھی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ وہ برستی آنکھوں سے اٹھا اور شیشے کی دیوار کے پار کھڑا ہو گیا۔ اس کی ننھی اس پار سانس لینے کے لئے تڑپ رہی تھی۔ اس کی چہرے کی رنگت نیلگوں ہو چکی تھی۔ اس کی معصوم خوبصورت آنکھیں ایک ہی سوال کر رہی تھیں۔

"ڈیڈی! تم کیسے قاتل ہو سکتے ہو؟"

اس کے سامنے سامنے اس کی بیٹی نے بھی دم توڑ دیا۔ وہ لرزتے قدموں سے گھر آ گیا۔ اس کے دماغ پر دھند سی طاری تھی۔ ڈاکٹر اسے بتا چکے تھے کہ اس کی محبوب بیوی اور بیٹی کی لاش جلا دی جائے گی کیونکہ وائرس کے مزید پھیلنے کا خطرہ تھا۔ وہ گھر میں داخل ہوا، گھر کی خاموشی نوحہ خواں تھی۔ وہ صوفے پر گر سا گیا۔ ابھی تین ماہ پہلے ہی تو وہ ووہان سے شاداں و فرحاں واپس آیا تھا۔ اس کے فرض کی تکمیل ہی اس کے لئے سب سے بڑی کامرانی تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں والی معصوم چھ سالہ بیٹی اس سے وہاں کے متعلق سوالات پوچھتی رہی تھی۔ وہ اس کی معصومیت پر فدا ہوتا جاتا تھا۔ اس کی بیوی ٹریسا مقامی اسپتال میں نرس تھی۔ وہ واپس آ کر اپنی زندگی میں مگن تھا کہ اچانک جنوری 2020 کے اختتام پر اس کی بیوی نے ایک وبا کا ذکر کیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا شہر بلکہ پورا ملک اس وبا کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ پورے ملک میں لاک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ ہر گھر سے لاشیں اٹھ رہی تھیں۔ آج وہی وبا اس سے اپنا خراج وصول کر کے لے گئی تھی۔ اچانک کمرہ ان تمام لوگوں سے بھر گیا جو اس وبا کے ہاتھوں مرے تھے۔ سب سے آگے اس کی مرحوم بیوی اور بیٹی کھڑی تھیں۔ وہ دونوں اس کا گریبان پکڑ کر چلائیں۔

"قاتل...... آخر کیوں...... تم نے ایسے کیا؟"

تمام مردوں کی بے نور آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنا ریوالور لوڈ کیا اور اپنی کنپٹی پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ گولی کی آواز کے بعد کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔

❖❖❖❖

چھ بڑے آج پھر میٹنگ روم میں اکٹھے تھے۔ ان سب کی توجہ ٹی وی کی طرف تھی۔ جہاں چینی حکومت کا ترجمان ایک اہم اعلان کر رہا تھا۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

چینی حکومت کے ترجمان نے ووہان میں کرونا نامی وائرس کی موجودگی کی اطلاع دیتے ہوئے یہ اطلاع دی کہ ووہان کو مکمل طور پر سیل کر دیا گیا تھا۔ وہاں مدد کے لئے پورے چین سے دس ہزار ڈاکٹرز، نرسز اور پیرامیڈیکل اسٹاف بھیج دیا گیا تھا۔

"نیو ورلڈ آرڈر کے نام۔" بڑوں کے سرغنہ نے ہنستے ہوئے نعرہ لگایا۔

"نیو ورلڈ آرڈر کے نام۔" باقیوں نے اس کے پیچھے پیچھے نعرہ لگایا۔

"آپ کا سرمایہ اب حرکت میں رہے گا۔ بہت جلد یہ کیڑے مکوڑے اپنے گھٹنوں پر گر جائیں گے۔ آپ سے مدد کی بھیک مانگیں گے۔" سرغنہ نے سیاہ نقاب پوش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"چین، ایران، روس اور بھارت کے بلاک پر تو یہ ہتھیار موثر اثر کرے گا۔ مگر اس کا رخ جلد یورپ، امریکا اور آسٹریلیا کے براعظموں کی جانب بھی ہو جائے گا۔" زرد نقاب پوش نے ہولے سے کہا۔

"یہ تیسری جنگ عظیم کا آغاز ہے۔ ہم نے شہد کی مکھیوں

کے چھتے کو چھیڑ دیا ہے۔ جب مکھیاں غضب ناک ہوتی ہیں تو سب راہی بغیر کسی تخصیص کے ان کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔" سفید نقاب پوش نے ہولے سے کہا۔

"ہم امر ہیں۔ ہم حاکم ہیں۔ ہمارے لئے صرف بادشاہت ہی لکھی ہے۔ ہم جہاں اُنگلی کا اشارہ کریں گے۔ وہیں مکھیاں محدود رہیں گی۔" سرغنہ نے بے پروائی سے کہا۔

شیطان میز کے وسط پر شیطانیت کی تال پر عریاں ناچ رہا تھا۔ اس کی باچھوں سے لعاب نکل رہا تھا۔ اس کے پورے وجود پر ایک جذب اور مستی طاری تھی۔ اس کے چیلے اس کی ذہانت کو بھی مات دے رہے تھے۔

"بہت جلد دنیا بھر کی حکومتیں گھٹنے ٹیک دیں گی۔ ملکوں کی معیشتیں تباہ ہوجائیں گی۔ غریب مزید غریب ہوجائے گا۔ امیر بھی فقیر ہوجائے گا۔" سرخ نقاب پوش نے برطانوی لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے کہا۔

"یہ خوف کی جنگ ہے۔ ہم نے خوف کے ذریعے مکمل دنیا کو معذور کردینا ہے۔ جہاز اڑنے بند ہوجائیں گے۔ تجارت رک جائے گی۔ ہر ملک کے ارباب اختیار صرف کرونا نامی وظیفہ جپتے نظر آئیں گے۔ ہر طرف الاماں، الاماں کا شور بلند ہوجائے گا۔ ایسے میں ہم ویکسین مارکیٹ میں لائیں گے۔ دنیا بھر کا پیسہ ہم کمائیں گے۔" سفید نقاب پوش نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہمارے دیئے گئے سرمائے، کا سود اتارتے اتارتے ان غلاموں کی نسلیں ختم ہوجائیں گی۔" سیاہ نقاب پوش نے کہا۔

"میں نے کہا تھا نہ کہ جنگی حکمت عملی دماغ سے طے کی جاتی ہے۔ اب نیوکلیئر ہتھیاروں کی ضرورت کس کو ہے؟ ہم جب چاہیں حیاتیاتی ہتھیاروں سے دنیا کو تہہ و بالا کرسکتے ہیں۔" سرغنہ نے شیطانی انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"وہ مریخ پر آبادکاری کا منصوبہ کہاں تک پہنچا؟ سفید نقاب پوش نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہم تو زندگی کی لافانیت پر کام کررہے ہیں۔ ہم کبھی مرنا نہیں چاہتے۔ تم صرف ابھی تک مریخ کی آبادکاری پر رکے ہوئے ہو...... اونچا سوچنا سیکھو۔" سرغنہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

شیطان کا رقص تیز ہوگیا، اسے یقین ہوچکا تھا کہ خاکی اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود توڑنے پر تل چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جلد ہی عذاب الٰہی ان کا مقدر بن جائے گا۔ اچانک سرغنہ کو کھانسی کا ٹھسکا سا لگا۔ تمام دیگر نقاب پوش بجلی کی سرعت سے پیچھے ہوگئے۔ اس نے سانس لینے کی جدوجہد کرتے ہوئے پانی کے لئے پکارا۔ مگر تمام زندگی سے پیار کرنے والے تاجر اس کے نام نہاد پاپی ساتھی اپنی جانیں بچاتے اسے تنہا چھوڑ کر کمرے سے باہر جاچکے تھے۔ وہ اکھڑتی سانسوں سے اچانک اپنے سامنے ظاہر ہونے والے عزرائیل کو حیرت و دہشت سے دیکھنے لگا۔ عزرائیل کے ساتھ تنومند سیاہ پوشوں کی ایک جماعت تھی۔ ان کے ہاتھوں میں آگ کے گرز تھے۔ اس نے دیکھا میز پر شیطان بھی موجود تھا۔ اس نے آنی والی جماعت کو دیکھا تو ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولا۔

"میں تو رب کریم سے ڈرتا ہوں۔ بھگت اپنے گناہوں کی سزا...... میں تو چلا۔"

"تو...... تو میرا سہارا تھا۔ تو ہی میرے کانوں میں سرگوشیوں میں خیالات ڈالتا تھا۔ مجھے تنہا مت چھوڑ۔ مجھے بچا لے۔ میں تیرے بہت کام آؤں گا۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

"میرے گماشتے! تیری خدمت مجھے یہیں تک درکار تھی، تیرا کام پورا ہوا۔" مگر شیطان ایک مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"ہم امر ہیں۔ ہمارے لئے موت نہیں۔ کرونا میرے لئے نہیں ہے۔" سرغنہ ہانپتے ہوئے بولا۔

"غلط! تم امر نہیں ہو۔ ورنہ آج تجھے میرا سامنا نہ کرنا پڑتا۔" عزرائیل نے اس کے گلے پر گرفت قائم کرتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ دور سے جہنم دہکتی ہوئی آگ کی تپش وہ صاف محسوس کررہا تھا۔ اس نے ایک جھرجھری لے کر دم توڑ دیا اسے معلوم ہوچکا تھا کہ اس کا ٹھکانہ کہاں ہونے والا تھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

سایہ

عبداللہ احمد حسن

جس طرح انسان ایک حقیقت ہے اسی طرح اللہ ایک اور مخلوق جنات کی شکل میں ہمارے آس پاس رہتی ہے۔ جس انسانوں میں اچھے بُرے لوگ ہوتے ہیں اسی طرح جنات میں بھی ہوتے ہیں۔

یہ کہانی بھی ایک ایسے ہی موضوع پر ہے جس سے ہمیں اکثر واسطہ رہتا ہے۔ شر کے ساتھ ہمیشہ خیر موجود ہوتا ہے۔

ایک شیطان جن کا احوال جس نے طوفان برپا کیا ہوا تھا

عثمان گزشتہ کئی سال سے عمان میں مقیم تھا وہ ایک کمپنی میں اچھی ملازمت کر رہا تھا۔ اس کی بیگم رابعہ دو بیٹیاں چودہ سالہ سارا اور سولہ سالہ زارا اور ایک بیٹا بارہ سالہ عمیر بھی اس کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ بچے ابھی پڑھ رہے تھے۔ اس نے وادی کبیر میں ایک فلیٹ کرائے پر لیا ہوا تھا جو دو خواب گاہوں اور ایک نشست گاہ پر مشتمل تھا۔ ایک خواب گاہ ان میاں بیوی کے استعمال میں تھی دوسری میں دونوں بیٹیاں رہتی تھیں اور بیٹا نشست گاہ میں سوتا تھا۔ وہ لوگ اکثر چھٹی کے دن گھومنے نکل جاتے تھے کبھی کبھی لانگ ڈرائیو کا پروگرام بھی بن جاتا تھا۔ اس روز بھی چھٹی تھی انہوں نے مصنعہ جانے کا پروگرام بنایا، جو تقریباً ایک سو پندرہ کلومیٹر دور تھا۔ وہ صبح دس بجے نکلے اور آرام سے گاڑی چلاتے ہوئے ساڑھے گیارہ بجے تک مصنعہ پہنچ گئے۔ پہلے بیچ کی طرف گئے وہاں پانی میں پاؤں ڈال کر گھومتے رہے سیپیاں جمع کیں مگر ستمبر کا مہینہ تھا گرمی اب بھی شباب پر تھی، اس لیے وہ لوگ ایک بجے تک وہاں سے نکل آئے اور ایک ریسٹوران سے کھانا کھا کر پارک میں جا بیٹھے۔ پارک پہنچ کر عثمان صاحب اور رابعہ تو

ایک درخت کی چھاؤں میں لیٹ گئے۔ جبکہ تینوں بچے پارک میں گھومتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد زارا بولی ''مجھے بھی تھکن سی محسوس ہو رہی ہے میں بھی لیٹ رہی ہوں۔ عمیر اور سارا نے سر ہلا دیا اور باتوں میں مصروف رہے۔ زارا ایک اور درخت کے نیچے لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے آنکھیں کھول کر ارد گرد دیکھا تو وہاں ان کے علاوہ اور کوئی دکھائی نہیں دیا۔ اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔ مگر وہ احساس پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر آس پاس دیکھا پھر اس کی نظریں اوپر درخت کی طرف اٹھیں تو ایسا لگا کوئی پتوں کی آڑ سے دیکھ رہا ہو مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

اچانک اسی وقت پارک میں چند بکریاں داخل ہوئیں۔ وہ گھومتی گھامتی زارا کے قریب آ پہنچیں ان میں سے ایک نیلی آنکھوں والا سفید میمنا زارا کو بہت اچھا لگا اس نے ہاتھ بڑھایا تو میمنا اس کے قریب چلا آیا۔ زارا اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ میمنا کچھ دیر خاموش کھڑا رہا پھر اچانک ممیانے لگا، مگر یہ کیا اس کے منہ سے میں میں کے بجائے ایسی آواز برآمد ہوئی جیسے وہ کہہ رہا ہو..... زاراااا..... زاراااا..... زارا مارے خوف کے اٹھ بیٹھی اور چلانے لگی۔ اس کی چیخ سن کر سب دوڑے ہوئے آئے۔

''کیا ہوا زارا......؟'' سب ایک ساتھ پوچھنے لگے۔ اسی وقت ان سب نے بھی میمنے کی آواز سنی اور ان سب پر بھی وہی اثر ہوا۔

رابعہ نے جلدی سے جھپٹ کر زارا کو اٹھا لیا اور خود سے لپٹا کر آیت الکرسی پڑھ کر دم کرنے لگیں۔ اسی دوران بکریاں واپس چلی گئیں۔ ان لوگوں نے سب سامان سمیٹ کر گاڑی میں رکھا اور واپس گھر کی طرف بھاگنے لگے۔ اس دوران زارا پر غشی سی طاری رہی۔ عثمان نے راستے میں السیب پہنچ کر گاڑی ایک پرائیویٹ ہسپتال کے سامنے روکی اور وہ لوگ زارا کو سہارا دے کر ایمرجنسی وارڈ میں لے گئے۔ وہاں ڈاکٹرز نے اس کو چیک کیا، کچھ ٹیسٹ بھی لیے پھر کہا یہ بالکل ٹھیک ہے، سارے ٹیسٹ کلیئر ہیں، اب اتنی دیر بعد ویسے بھی اس کی حالت کافی بہتر ہو گئی تھی اور وہ بغیر سہارے کے چل سکتی تھی، اس لیے انہوں نے گھر کا رخ کیا۔

رابعہ نے رات کا کھانا بنایا، اس رات وہ لوگ جلدی اپنے اپنے کمروں میں سونے چلے گئے۔ رات کسی وقت اچانک سارا کی آنکھ کھل گئی کمرے میں عجیب سی ٹھک ٹھک کی آواز گونج رہی تھی شاید اسی کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ سارا نے سائیڈ لیمپ جلا کر دیکھا تو زارا دیوار کے قریب اس کی طرف پشت کیے کھڑی تھی اس کے ہاتھ میں عمیر کا کرکٹ بیٹ تھا جسے وہ دیوار پر مار رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے ہوش میں نہ ہو۔ سارا نے لرزتی سی آواز میں پکارا۔

''آپی...... آپی یہ...... یہ تم کیا کر رہی ہو؟''

اچانک زارا نے سارا کی طرف چہرہ گھمایا، مگر اف کیا وہ زارا کا چہرہ تھا اتنا بھیانک پھٹی پھٹی سرخ آنکھیں جن میں شعلے سے دہک رہے تھے، لپلپاتی ہوئی سرخ زبان، بکھرے ہوئے بال، کھلے ہونٹوں سے جھانکتے دانت۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

سارا کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ چیخ کی آواز اتنی بلند تھی کہ دوسرے کمرے اور نشست گاہ میں سویا عمیر بھی جاگ گیا۔ عثمان اور رابعہ دوڑتے ہوئے اپنے کمرے سے برآمد ہوئے۔ وہ تینوں سارا اور زارا کے کمرے میں داخل ہوئے دیکھا تو سارا آدھی بستر پر آدھی زمین پر بے ہوش پڑی تھی، جبکہ دوسرے بستر پر زارا بے خبر سو رہی تھی۔ انہوں نے سارا کو سنبھالا اسے بستر پر ٹھیک سے لٹایا، عمیر اس دوران پانی لے آیا۔ عثمان نے سارا کے منہ پر پانی چھڑکا، رابعہ نے آیات پڑھ پڑھ کر دم کیا کافی دیر کوشش کے بعد سارا نے آنکھیں کھولیں۔ چند لمحے وہ خالی خالی نگاہوں سے آس پاس دیکھتی رہی، پھر اس کی نظر برابر والے بستر پر سوئی زارا پر پڑی تو اس کے چہرے پر خوف زدگی کے آثار چھا گئے اور وہ ایک بار پھر چیخ پڑی وہ زارا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''آپی...... آپی...... دیکھیں آپی کو کیا ہو گیا۔''

''کیا بات ہے بیٹا تمہیں کیا ہوا تھا آپی تو سو رہی ہے۔'' عثمان نے کہا۔

''نہیں بابا ابھی وہ جاگ رہی تھیں انہوں نے پوری

گردن موڑ کر مجھے دیکھا تھا، ان کا چہرہ ...... چہرہ اتنا خوفناک ہو رہا تھا۔''''

''''بیٹا دیکھ لیں وہ تو سو رہی ہے تم نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہوگا۔'' عثمان نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

''''نہیں بابا میں نے یہ سب جاگتے میں دیکھا ہے، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے میں یہاں نہیں سوؤں گی۔''

''''یوں کرو تم اس کے ساتھ سو جاؤ یہ یقیناً خواب میں ڈر گئی ہے۔'' عثمان نے رابعہ سے کہا۔

''''ٹھیک ہے آپ جا کر سو جائیں۔'' رابعہ نے کہا۔

عثمان اور عمیر اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔

کمرے میں پہنچ کر اچانک عثمان کو خیال آیا کہ اتنا ہنگامہ ہوا مگر زارا کی آنکھ نہیں کھلی؟ وہ کچھ پریشان ہو کر یہ سوچنے لگا، مگر پھر دل کو تسلی دی کہ ممکن ہے اسے جو دوائیں دی گئی ہیں ان میں نیند لانے والی کوئی دوا بھی شامل ہو اس لیے وہ اس ہنگامے سے بے خبر سوتی رہی اور یہ اچھا ہی ہوا ورنہ وہ جس حادثے سے گزری تھی اور پریشان ہو جاتی۔

صبح سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ آج بھی چھٹی تھی، انہوں نے خریداری کا پروگرام بنا لیا کیوں کہ وہ ایک ہفتے بعد ایک مہینے کے لیے پاکستان جا رہے تھے۔

خریداری کے بعد رات کا کھانا انہوں نے ایک ریسٹوران میں کھایا اور ہنستے مسکراتے واپس آئے۔ ان کے ذہن سے کل کے واقعات خاصی حد تک معدوم ہو چکے تھے۔ کچھ دیر ٹی وی دیکھ کر وہ سب سونے چلے گئے۔

رات ڈھائی بجے کے قریب کسی کھٹکے کے سبب عمیر کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا زارا کچن میں داخل ہو رہی تھی۔ اسے بھی پیاس محسوس ہوئی تو وہ بھی اٹھ کر اس کے پیچھے کچن میں داخل ہوا۔ زارا فریزر کھولے کھڑی تھی۔

''''آپی مجھے بھی ایک گلاس پانی دینا۔'' اس نے آواز دی۔

زارا اس کی طرف مڑی تو عمیر نے دیکھا، کہ اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں ان میں سے گویا شعلوں کی سی لپک نکل رہی تھی۔ کھلے دہانے سے دانت جھانک رہے تھے، یہ سب سے بہت بھیانک منظر تھا۔ زارا فریزر سے نکال کر کچی مرغی کی ٹانگ بھنبھوڑ رہی تھی۔ جیسے ہی اس کی نظر عمیر پر پڑی تو وہ بڑے بھیانک انداز میں مسکرائی اور اس کی طرف بڑھی۔

عمیر خوف زدہ ہو کر چیختا چلاتا کچن سے باہر بھاگا اور ماں باپ کے کمرے کا دروازہ پیٹنے لگا۔ عثمان اور رابعہ گھبرا کر باہر نکلے۔

''''کیا ہوا کیا ہوا......؟'''' عثمان نے اس کے پیچھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ بابا وہ آپی......''''

''کیا ہوا آپی کو......؟'''' انہوں نے پوچھا۔

دونوں نے لڑکیوں کے کمرے کی طرف دوڑ لگائی تو دونوں لڑکیاں اپنے اپنے بستر پر بے خبر سو رہی تھیں۔

عثمان نے مڑ کر عمیر کی طرف دیکھا۔

''''کیا ہوا یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے یہ دونوں تو سو رہی ہیں۔'' دونوں نے عمیر کی جانب دیکھ کر کہا۔

''نہیں بابا ابھی ابھی آپی کچن میں تھی اور اس کا حلیہ ویسا ہی تھا جیسا کل سارا نے بتایا تھا، اور وہ کچی مرغی کھا رہی تھی۔''

''کیا بک رہے ہو ہوش میں تو ہو۔ ایسا کیسے ممکن ہے، چلو میرے ساتھ۔''

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

وہ کچن میں گئے تو فریزر کا دروازہ بند تھا مگر جب اسے کھولا تو وہاں مرغیوں کا ایک پیکٹ کھلا ہوا تھا اور ادھ کھائی ٹانگ بھی وہیں رکھی تھی۔ اب تو وہ بھی گھبرا گیا اور سوچ میں ڈوبا ہوا واپس لڑکیوں کے کمرے میں آیا اور غور سے زارا کا جائزہ لیا تو اس کے ہونٹوں کے اطراف اور ایک گال پر خون کے ہلکے سے نشانات نظر آ گئے۔ اب تو عثمان بھی پریشان ہو گیا، مگر اس نے اپنی پریشانی کسی پر ظاہر نہیں کی اور رابعہ سے کہا۔

''''بہتر ہے تم آج بھی یہاں سو جاؤ۔''

اگلی صبح عثمان اپنے آفس پہنچا تو پریشانی اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔ مگر سب کے پوچھنے پر اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا دیا۔ چھٹی سے ذرا پہلے اس نے اپنے ایک دوست انعام کو فون کیا۔ انعام بھی طویل عرصے سے مسقط میں مقیم تھا اور ہونڈا روڈ پر الیکٹریشن کی دکان چلا رہا تھا۔ بہت ہی نیک اور پابند صوم و صلوٰۃ تھا۔ انعام نے اسے اپنی دکان پر ہی بلا لیا۔ کچھ دیر رسمی گفتگو ہوتی رہی۔

""""عثمان، کیا بات ہے آج میں تمہارے چہرے پر روز کی طرح بشاشت کے بجائے پریشانی دیکھ رہا ہوں۔ کیا بات ہے، اگر مجھے بتانے میں کوئی حرج نہ ہو تو بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟ اگر میرے بس میں ہوا تو انشاء اللہ پیچھے نہیں ہٹوں گا۔" انعام نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

""""انعام میرے بھائی، میں ایک مشکل میں پھنس گیا ہوں اور وہ بھی ایسی کہ ہر ایک سے ذکر بھی نہیں کر سکتا۔" عثمان نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

""اگر مجھے بتا سکو تو بتاؤ کہ کیا مسئلہ ہے۔"

اب عثمان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، اور اس نے رندھے ہوئے لہجے میں ساری کہانی اول تا آخر سنا دی۔ سب کچھ سن کر انعام بھی دنگ رہ گیا اور کچھ دیر تک اس کے منہ سے بھی کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

""""انعام! اگر تمہارے پاس اس مسئلے کا کوئی حل ہے تو بتاؤ میں کیا کروں۔ بیٹی کا معاملہ ہے اس لیے میں ہر کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا۔"

""میں ایک صاحب کو جانتا ہوں جو اس شعبے سے متعلق لوگوں کو جانتے ہیں میں ان سے بات کر کے معلوم کرتا ہوں کہ کیا ہو سکتا ہے۔"

""ٹھیک ہے میرے بھائی، جیسا تم کہو۔"

انعام نے اپنے فون پر کوئی نمبر ملا کر بات شروع کی۔

""""السلام علیکم...... "ہاشمی صاحب ہیں۔"

""""وعلیکم السلام۔" دوسری طرف سے سلام کا جواب دیا گیا۔

""""ہاشمی صاحب انعام عرض کر رہا ہوں" میرے ایک دوست ہیں ان کے ساتھ کچھ پراسرار واقعات پیش آ رہے ہیں، آپ ایسے لوگوں سے واقف ہیں کسی کا پتا دے دیجیے، یہ کوئی اثرات جیسے جن وغیرہ والا معاملہ لگتا ہے" جی، جی ٹھیک ہے واٹس ایپ کر دیجیے، بہت بہت شکریہ اور جزاک اللہ خیرا" "ان شاء اللہ ضرور۔ اللہ حافظ۔"

""""لیجیے عثمان بھائی امید ہے تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا، یہ ہاشمی صاحب ایسے لوگوں سے واقف ہیں۔"

""ان شاء اللہ، اللہ تمہیں اور ان کو جزا خیر دے۔"

اس دوران فون پر اشارہ ملا تو دیکھا ایک نام اور نمبر موجود تھا۔ مبروک بن خدا بخش۔ انعام نے خود ہی نمبر ملا لیا۔ ایک بھاری سی آواز سنائی دی۔

""""آلو، السلام علیکم۔" مبروک بن خدا بخش سلام کیا۔

""""وعلیکم السلام، مبروک صاحب مجھے ایک دوست سے آپ کا نمبر ملا ہے۔" انعام نے عربی میں ہی گفتگو شروع کی۔

""""جی، کیا مسئلہ ہے آپ کا؟""""

""ہم آپ سے ملنا چاہتے ہیں، اسی وقت مسئلہ بھی آپ کے گوش گزار کر دیں گے۔"

""ٹھیک ہے آپ لوگ کل شام چار سے پانچ بجے تک السیب میں واقع مسجد میں مجھ سے مل سکتے ہیں۔"

""بہت شکریہ ہم ان شاء اللہ وقت پر پہنچ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" اور اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے کال کاٹ دی گئی۔

""""تم کل ساڑھے تین بجے تک میرے پاس آ جاؤ، میں تیار ہی ملوں گا ہم فوراً ہی نکل جائیں گے۔" انعام نے عثمان کی طرف دیکھا اور کہا۔

""""اللہ تمہیں جزائے خیر دے۔ تم نے میرا بہت بڑا مسئلہ حل کروا دیا ہے۔" عثمان صاحب نے ممنونیت سے انعام کو دیکھا اور کہا۔

""آج رات تم گھر میں سورہ بقرہ کی تلاوت خود کرنا یا ریکارڈر میں لگا دینا۔"

""ان شاء اللہ میں ایسا ہی کرتا ہوں، تو کل ملتے ہیں۔ اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ۔"

عثمان نے گھر آ کر اس بارے میں کسی سے کوئی ذکر نہ کیا۔ رات کے کھانے کے بعد اس نے ریکارڈر میں تلاوت کی سی ڈی لگا دی۔ تھوڑی دیر تک قاری کی خوب صورت آواز میں اللہ کا کلام گونجتا رہا۔ سب سکون و اطمینان سے اپنی اپنی جگہ پر سن رہے تھے۔ اچانک ایک خوفناک چیخ بلند ہوئی۔ سب اٹھ کر لڑکیوں کے کمرے کی

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

طرف دوڑے تو وہاں زارا کو عجیب حال میں پایا اس کے بال بکھرے ہوئے تھے آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے چہرہ بگڑ کر رہ گیا تھا اس کی طرف دیکھنے سے بھی خوف آرہا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی وہ چیخی بند کرو۔

''اس آواز کو بند کرو، بند کرو اسے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ عثمان نے ہمت کر کے کہا

''کون ہو تم کیوں ہمیں پریشان کر رہے ہو؟''

''اسے بند کرو، یہ آواز بند کرو۔'' وہ اور زور سے چیخی۔

''نہیں یہ بند نہیں ہوگا تمہیں سننا پڑے گا۔''

''اگر یہ بند نہیں کیا تو ہم تم سب کو ختم کر دیں گے، سب کو مار ڈالیں گے۔''

اس دوران زارا بری طرح تڑپ رہی تھی جیسے بکرے کو چھری پھیر کر چھوڑ دیا گیا ہو۔

اچانک اس نے سائیڈ لیمپ اٹھا کر پھینکا جو عمیر کے کندھے کو چھوتا ہوا گرا۔ پھر اس نے وہاں رکھی کرسی اٹھا کر پھینکی جو بچنے کے باوجود عثمان کو لگ گئی۔ اسی وقت ریکارڈر بند ہو گیا۔ اور زارا کی حالت آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگی پھر وہ چکرا کر اپنے بستر پر گری اور بے ہوش ہو گئی۔

''کیا ہوا اسے؟'' رابعہ نے کمرے میں داخل ہو کر زارا کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''کچھ نہیں بے ہوش ہو گئی ہے، ذرا دیکھنا تو ریکارڈر کیسے بند ہو گیا؟''

''وہ میں نے بند کیا ہے ورنہ یہ ہم سب کو مار دیتی۔ آخر اسے کیا ہوا ہے، تم بتاتے کیوں نہیں؟''

عثمان نے خوف زدہ سارا کو باہر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کمرہ بند کر دیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے رابعہ کو سب کچھ بتا دیا۔ رابعہ رونے لگی۔

''کل ان صاحب سے مل کر اس کا کچھ حل نکالیے، نہیں وہ میری بیٹی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔''

''بے فکر رہو میں کل اس سے مل لوں گا۔''

اگلا دن عثمان نے بہت بے چینی سے گزارا اور وقت سے پہلے چھٹی لے کر تین بجے ہی انعام کی دکان پر پہنچ گیا۔ انعام نے چائے منگوائی اس دوران وہ گفتگو بھی کرتے رہے ساڑھے تین بجتے ہی انعام اٹھ کھڑا ہوا، وہ دونوں انعام کی کار میں روانہ ہوئے اور سوا چار بجے تک مطلوبہ مقام تک پہنچ گئے۔

مسجد میں کچھ لوگ جمع تھے ایک جانب دیوار سے ٹیک لگائے ایک شخص عربی لباس سر پر مقامی لوگوں کی طرح عمامہ باندھے بیٹھا تھا۔ بڑی بڑی سرخ آنکھیں چھوٹی سی کھچڑی داڑھی۔ عمامے سے نکلی ہوئی زلفیں بھی کھچڑی تھیں۔ لوگ اس کی دست بوسی کر رہے تھے اور وہ ایک ادائے بے نیاز سے ان کی طرف دیکھتا تھا۔ کسی کی کوئی ضرورت ہوتی تو وہ قریب جا کر بات کر لیتا تھا، کوئی کوئی چھوٹے بڑے لفافے بھی دے رہا تھا جو عامل کی جیبوں میں غائب ہو جاتے تھے۔ جب ان کا نمبر آیا تو وہ اس کے قریب پہنچے۔ انہوں نے قریب آ کر مصافحہ کیا اور اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ عامل کے بشرے پر ایک لمحے کے لیے ناگواری کے تاثرات ابھرے مگر فوراً ہی غائب بھی ہو گئے۔ اس نے بھاری آواز میں اردو میں پوچھا۔

''کہو، کیا مسئلہ لائے ہو؟''

''یہ میرے دوست ہیں ان کی بیٹی کے ساتھ کچھ مسائل پیش آ رہے ہیں ان کے حل کے لیے ہم آپ کے پاس آئے ہیں۔'' انعام نے بات شروع کی۔

''ہمم، کہو، ہم سن رہے ہیں۔''

اب عثمان صاحب نے انہیں ساری بات سنا دی۔ پھر پوچھا۔

''اگر برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں آپ اتنی اچھی اردو کیسے بول رہے ہیں۔''

''ہمارا تعلق پاکستان کے صوبے بلوچستان سے ہے اس لیے اردو جانتے ہیں۔ یہاں ہم اکثر سائلین کی درخواست پر آتے رہتے ہیں۔ ہماری مدد سے کسی کا کوئی مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو اور کیا چاہیے ہم لوگوں کی خدمت کرتے ہیں اور دیکھ لو یہ سب ہماری کتنی عزت کرتے ہیں۔'' وہ ہلکا سا مسکرایا اور بولا۔

''اپنے ہاتھ دکھاؤ۔'' اس کے بعد وہ چند لمحے تک کسی سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر کہا۔

عثمان نے اپنے ہاتھ پھیلا دیے پھر اس نے الٹ کر

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

دیکھنے پھر پاؤں دکھانے کو کہا۔ تھوڑی دیر آنکھیں بند کر کے گویا کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر آنکھیں کھولیں تو وہ اب کبوتر کے خون کی مانند لال ہو رہی تھیں ان سے ایسی چمک نکل رہی تھی کہ اس سے نظر ملانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"بہت خطرناک جن کے چکر میں پھنس گئے ہو۔ اس کا علاج بہت مشکل ہے۔"

"مگر کوئی تو راستہ ہوگا نہ اس کا۔" عثمان پریشان ہو گیا۔

"ہے مگر بہت مشکل ہماری جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔"

"ہم تو بہت آس لے کر آپ کے پاس آئے تھے اب ہم کیا کریں۔"

"ہمم...... پریشان مت ہو، ہم کچھ کرتے ہیں، مگر جیسا ہم کہیں تمہیں ویسا ہی کرنا ہوگا۔"

"جی ہم آپ کے کہے پر پورا عمل کریں گے۔"

"چونکہ معاملہ خطرناک ہے اس لیے خرچہ بھی اسی حساب سے ہوگا۔"

"میں کوشش کروں گا جیسا آپ کہیں ویسا ہو۔ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کتنا خرچا ہوگا؟"

"پہلے لڑکی اور اس کی والدہ کا نام؟" اس نے ایک کاغذ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"زارا، اس کی والدہ کا نام رابعہ۔" انعام کے ہاتھ دبانے کے باوجود کچھ نہ سمجھتے ہوئے عثمان نے کہا۔

"تمہارا نام اور تمہاری والدہ کا نام؟"

"عثمان۔ والدہ شاہینہ۔"

انعام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اس نے ایک جھٹکے سے سارے تعویذ عثمان کے ہاتھ سے چھینے اور عامل کی گود میں پھینکتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ عثمان بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گیا۔ وہ عامل اور اس کے مرید حیرت زدہ سے ان کو دیکھ رہے تھے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ انعام پیسوں کی مانگ اور اس کے طریقے سے یک دم بھڑک اٹھا۔ کیونکہ اس کی عادات کافی مشکوک تھیں اور اس کے مرید بھی کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ اس لیے انعام نے اگلے دن پیسے لانے کا وعدہ کر کے اس عامل کو ٹالا اور

وہاں سے دونوں نکل آئے۔ واپس دکان پر پہنچ کر انعام نے عثمان کی طرف دیکھا اور کہا۔

"عثمان، میرے بھائی، کہیں تمہیں میری وہ حرکت بری تو نہیں لگی؟ کہیں تم نے اس سے علاج کروانے کا فیصلہ تو نہیں کر لیا تھا؟"

"نہیں میرے بھائی، دراصل میں اس وقت اپنی پریشانی کی وجہ سے تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے مجھے بچا لیا۔"

انعام نے اسی وقت ہاشمی صاحب کو کال کر کے سب کچھ بتا دیا۔ ہاشمی صاحب نے ان سے معذرت کی کہ انہیں یہ تفصیل معلوم نہیں تھی ورنہ وہ انہیں وہاں نہ بھیجتے۔ انعام نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

"اب ہاشمی صاحب کسی اور کے بارے میں معلوم کریں گے، ہم بھی کوشش کرتے ہیں۔"

عثمان جب گھر میں داخل ہوئے تو رابعہ نے فوراً انہیں کمرے میں بلایا اور پوچھا۔

"کیا ہوا؟ ان صاحب سے ملاقات ہوئی۔"

"ہاں ہوگئی مگر وہ آدمی ٹھیک نہیں تھا اس لیے ہم واپس آ گئے، اب کسی اور کو دیکھیں گے۔"

"آج زارا نے بہت شور شرابا کیا ہے۔ وہ کمرے میں کسی کو آنے نہیں دے رہی میں نے کوشش کی تو مجھے بھی ایک ہاتھ مار دیا۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ کھڑکیوں میں سلاخیں ہیں ورنہ وہ کہہ رہی تھی کہ میں یہاں سے کود جاؤں گی۔ نہ جانے یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اس کی صورت آپ دیکھتے اتنی خوفناک ہو رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے آ کر ہمارا خون پی جائے گی۔ اس کی گردن پوری گھوم جاتی ہے۔ اللہ کے لیے کچھ کریں میری بچی مجھے واپس لا دیں۔"

اس رات عثمان کو نیند نہیں آ رہی تھی، رابعہ بچیوں کے کمرے میں ہی تھی۔ سونے سے پہلے عثمان کو اپنے ایک اور دوست اکبر خان کا خیال آیا تو اس نے فوراً ہی اس کا نمبر ملا یا۔ اکبر خان کو اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ اکبر خان بھی یہ سب سن کر پریشان ہو گیا۔ وہ کچھ دیر کے لیے سوچ میں ڈوب گیا۔

"میں نے کسی سے ایک عامل کے بارے میں سنا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ہے مگر مجھے اس بارے میں زیادہ تفصیلات کا علم نہیں، مجھے تم کل دو پہر تک کا وقت دو میں سب معلوم کر کے بتاؤں گا ان شاء اللہ۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے خان میرا مسئلہ حل ہو جائے تو یہ ہم پر تمہارا بہت بڑا احسان ہوگا۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو عثمان، اس میں احسان کہاں سے آ گیا، زارا جیسے تمہاری بیٹی ہے ویسے ہی میری بھی بیٹی ہے۔''

''ٹھیک ہے پھر میں کل تمہاری کال کا منتظر رہوں گا۔''

''ان شاء اللہ، اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ۔''

فون بند کر کے عثمان سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ابھی وہ کچی نیند میں تھا کہ ایک زوردار چیخ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اچانک چیخ اور کچی نیند نے اس کے اعصاب پر برا اثر ڈالا اور وہ کھڑا نہ ہو سکا بلکہ ڈگمگا کر بستر پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے بعد پھر چیخیں سنائی دینے لگیں۔ اس نے کوشش کر کے خود کو سنبھالا اور لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل گیا۔ سارا، رابعہ اور عمیر نشست گاہ میں خوفزدہ سے کھڑے تھے اور لڑکیوں کے کمرے سے زارا کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔

عثمان نے قریب جا کر دیکھا، تو زارا کمرے کے درمیان لیٹی تھی اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ وہ بار بار جسم کو توڑ مروڑ رہی تھی کسی کسی وقت ہوا میں بلند ہو جاتی پھر لگتا جیسے کوئی اسے ٹانگوں اور گردن سے پکڑ کر کمان کی طرح موڑ رہا ہو۔ پھر اچانک وہ اچھل کر بستر یا قالین پر گرتی اور عجیب عجیب زاویوں سے جسم کو توڑتی مروڑتی۔ پھر ہوا میں بلند ہو جاتی۔ اس دوران اس کے حلق سے چیخیں برابر بلند ہوتی رہیں۔ عثمان نے زور زور سے آیت الکرسی پڑھنی شروع کر دی اس کی دیکھا دیکھی رابعہ نے بھی اس کی آواز میں آواز ملانی شروع کر دی۔ اس پر زارا کی حرکات اور تیز ہو گئیں۔ اب اس کے حلق سے عجیب سی غیر انسانی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے کئی بد روحیں مل کر چیخ رہی ہوں۔ کچھ دیر بعد وہ نڈھال سی ہو کر گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی۔ عثمان اور رابعہ نے جلدی سے اسے اٹھا کر بستر پر لٹایا۔ سارا نے تو اب کمرے میں سونے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے نشست گاہ میں ہی اپنا بستر لگا لیا۔ رابعہ ڈرتے ڈرتے اس کے بستر پر سو گئی۔ اس رات گھر پر خوف و دہشت کی فضا طاری رہی سب لوگ بار بار نیند سے چونک چونک کر بیدار ہو جاتے تھے اور خوف زدہ نظروں سے آس پاس دیکھنے لگتے۔ اسی عالم میں صبح ہو گئی۔

عثمان نہا کر نکلا تو رابعہ پریشان سی بستر پر بیٹھی تھی۔ عثمان سنگھار میز کے آئینے کے سامنے کھڑا بال بنانے لگا اس کی پشت رابعہ کی طرف تھی رابعہ نے اس کی طرف دیکھا پھر اس سے بات کرنے کے لیے آئینے میں اس کا چہرہ دیکھنا چاہا مگر یہ کیا جیسے اسے یہاں سے عثمان کی پشت نظر آ رہی تھی ویسے ہی آئینے میں بھی ایسا ہی منظر نظر آ رہا تھا یعنی وہاں بھی عثمان کی پشت ہی نظر آ رہی تھی، حالانکہ وہاں اس کا چہرہ نظر آنا چاہیے تھا۔ رابعہ چیخ کر کھڑی ہو گئی

''کیا ہوا'' اسی وقت عثمان اس کی طرف پلٹا اور پوچھا۔

مگر رابعہ کی نظر آئینے پر تھی جہاں وہ پشت والا منظر گویا رک گیا تھا اس نے آئینے کی طرف انگلی اٹھا کر کپکپاتی آواز میں کہا۔ ''یہ...... یہ...... دیکھیں یہ...... کیا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی وہ بے ہوش ہو کر بستر پر گر پڑی۔

عثمان نے پریشان ہو کر آئینے کی طرف دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے پانی منگوا کر رابعہ کے منہ پر چھڑکا اور اسے آوازیں دیں کچھ دیر بعد وہ ہوش میں آ گئی۔ اس کی خوف بھری نظریں آئینے کی طرف اٹھیں مگر اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ اس نے عثمان کو بتایا کہ اس نے کیا دیکھا تھا مگر عثمان نے کہا ممکن ہے اتنے دن سے اس ماحول میں رہنے کی وجہ سے ایسا نظر آیا ہو، یہ نظر کا دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔

دو پہر کو ڈیڑھ بجے کے قریب اکبر خان کی کال آئی۔

''عثمان میں نے معلوم کیا ہے کہ وہ عامل اپنے ایک مرید کے ہاں الخویر میں ٹھہرا ہوا ہے۔ میں نے اس سے بات کی تو وہ کہنے لگا۔'' ''اگر تم چاہو تو میں عامل صاحب کو آج رات لا سکتا ہوں۔ اگر تم اجازت دو تو میں اس سے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

بات کرلوں۔''

''ٹھیک ہے اکبر بھائی انہیں آنے کا کہہ دیں۔''

''ایسا کرتے ہیں میں بھی نو بجے تک فارغ ہو جاتا ہوں تو انہیں ساڑھے آٹھ بجے کا کہہ دیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں منتظر رہوں گا۔''

فون بند کر کے اکبر خان نے اپنے دوست سے بات کی اور اسے آنے کا وقت دے دیا۔

دوپہر کو عمیر اپنے ایک دوست کے ہاں اس سے ملنے چلا گیا۔ اس نے وادی کبیر سپس پکڑی اور اج ہوٹل کی طرف چل پڑا جہاں اس کا دوست قریب ہی ایک فلیٹ میں اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ کھڑکی والی نشست پر بیٹھا تھا۔ اچانک اس کی نظر اٹھی تو دیکھا کہ بند کھڑکی کے کانچ پر ایک نسوانی ہاتھ نظر آرہا ہے جیسے کوئی عورت چھت پر بیٹھی ہو اور نیچے ہاتھ لٹکا رکھا ہو۔ یہ ناممکن ہے کہ عمان میں کوئی چھت پر بیٹھ کر سفر کر سکے اور ہاتھ گہرے سانولے رنگ کا تھا جس پر کالی مہندی سے عجیب سی خوفناک شکلیں بنی ہوئی تھیں۔ ناخن خاصے لمبے اور کراہت آمیز تھے۔ عمیر کچھ بھی سہی تھا تو بارہ سال کا ہی وہ یہ دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔ اب اس ہاتھ نے آہستہ آہستہ شیشے پر سرکنا شروع کر دیا تھا۔ دفعتاً ہاتھ تھوڑا اوپر اٹھ کر شیشے سے ٹکرایا مگر کوئی آواز آئی نہ شیشہ ٹوٹا مگر حیرت انگیز طور پر اس کے ہاتھ کی انگلیاں اندر کی طرف آگئیں اب جیسے اس ہاتھ نے شیشے کا اوپری حصہ تھاما ہوا تھا، ہاتھ کی پشت باہر تھی اور مکروہ انگلیاں اندر تھیں۔ عمیر کی نظریں وہیں ٹکی ہوئی تھیں۔ ایک بار پھر ہاتھ میں حرکت ہوئی اور وہ پورا اندر داخل ہو گیا اب ایسا لگا جیسے وہ عمیر کی طرف بڑھا ہو۔ عمیر کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی اور وہ بے اختیار نشست سے اٹھ کر نشستوں کے درمیانی حصے میں گر گیا۔ دوسرے مسافر بھی پریشان ہو کر اٹھ گئے ایک مدراسی جو قریب بیٹھا تھا اس سے پوچھنے لگا کیا ہوا۔ ادھر ڈرائیور نے بھی جو اگلے اسٹاپ پر پہنچ چکا تھا گاڑی روک دی اور پیچھے آ کر دیکھنے لگا کہ کیا معاملہ ہے۔ اتنی دیر میں عمیر سنبھل چکا تھا وہ ہاتھ بھی اب غائب ہو چکا تھا۔ مگر عمیر اس نشست پر بیٹھنے کو تیار نہیں تھا وہ آگے ایک اور نشست پر بیٹھ گیا۔

دن گزرا شام پھیلی تو رابعہ نے رات کے کھانے کی تیاری کر لی۔ پونے نو بجے اکبر خان اس کا دوست شفقت اور عامل آن پہنچے۔ عامل ایک دراز قد اور تنومند شخص تھا۔ بڑی سی سیاہ داڑھی اور لمبی زلفیں تھیں۔ مگر چہرے پر ایک خشونت سی برس رہی تھی۔ آنکھیں دیکھ کر ایک عجیب سا احساس ہوتا تھا۔ اسی وقت انعام بھی پہنچ گیا، اسے عثمان نے بلایا تھا۔ سب بیٹھ گئے تو پہلے کھانا لگایا گیا۔ کھانے کے دوران خاموشی طاری رہی۔ اس کے بعد چائے پینے لگے۔

''کیا ماجرا ہے۔'' عامل نے پوچھا۔

عثمان نے اسے پوری بات بتا دی۔ عامل تھوڑی دیر تک آنکھیں بند کر کے مراقبے کی سی حالت میں رہا پھر آنکھیں کھولتے ہوئے بولا۔

''اپنی بیٹی کو بلاؤ۔''

عثمان نے زارا کو بلایا وہ آ کر عثمان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ عامل نے چند لمحے غور سے اسے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی جو انعام کی نظر سے نہ چھپ سکی۔ عامل ایک بار پھر آنکھیں بند کر کے مراقبے میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولی تو وہ گہری سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے عثمان کو اشارہ کیا تو اس نے زارا کو وہاں سے جانے کا کہہ دیا۔

''معاملہ بہت گمبھیر ہے۔ یہ بہت خطرناک شیطان جن ہے۔ اس سے باقاعدہ مقابلہ کرنا پڑے گا۔ کیا آپ کی طرف سے اجازت ہے۔'' زارا کے جانے کے بعد عامل بولا۔

''عامل صاحب ہم بہت پریشان ہیں آپ بتائیں یہ سب کیسے ہوگا اور کیا آپ اس شیطان پر قابو پا لیں گے؟'' عثمان نے جواب دیا۔

''بالکل کیوں نہیں۔ مگر محنت بہت ہے اس لیے خرچہ بھی زیادہ ہوگا۔ آپ کو ایک سو پچاس ریال روزانہ کے حساب سے جتنے دن مقابلہ ہو دینا ہوگا اور اس میں غالباً تین سے چار دن لگیں گے، اس کے بعد آخری مقابلے میں میں اس کو بھسم کر دوں گا اس کے پانچ سو ریال الگ ہوں گے۔'' (ایک عمانی ریال تقریباً چار سو روپے ہوتے ہیں)

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

عثمان نے انعام کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار تھے مگر وہ خاموشی سے سب دیکھ رہا تھا اس وقت تک اس نے کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔ عثمان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں کوشش کر کے اتنے پیسوں کا انتظام کر لوں گا۔ مگر میری بیٹی بالکل پہلے جیسی ہو جائے۔"

"ہو جائے گی۔ اب سنو جیسا ہم نے کہا اس پر من و عن عمل ہونا چاہیے، اگر ذرا سی بھی غلطی ہوئی تو لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔"

"جی بتائیں ہم کو کیا کرنا ہے۔"

"تم سب لوگ اس برابر والے کمرے میں یا یہیں نشست گاہ میں رہو گے۔ لڑکی کے کمرے کی طرف کوئی نہیں آئے گا۔ صرف ہم اس کے کمرے میں جائیں گے۔ چونکہ جن بہت زور آور ہے تو اس کے ساتھ مار پیٹ بھی کرنی پڑے گی میں جن کو ماروں گا مگر وہ آپ کی بیٹی کے جسم میں ہے اس لیے یہ چیخے گی۔ آپ سب اپنے کان بند کر لیں گے اس کی چیخیں سن کر بھی کوئی اس طرف نہیں آئے گا ورنہ سارا عمل الٹا ہو جائے گا۔"

عثمان کے چہرے پر الجھن نمودار ہوئی۔ انعام سب کچھ غور سے دیکھ اور سن رہا تھا۔ اس نے عامل سے پوچھا۔

"عامل صاحب آپ ماشاءاللہ سے کافی پڑھے لکھے آدمی لگتے ہیں۔"

"کیوں کیا تمہیں کوئی شک ہے؟" عامل نے کچھ حیرت اور غصے سے انعام کی طرف دیکھا اور جھومتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں جناب آپ جیسے بڑے اور مشہور عامل پر شک کر کے ہمیں کیا اپنی آخرت بگاڑنی ہے؟"

"تو ایسا بے تکا سوال کیوں کیا تم نے۔"

"جناب سوال بے تکا نہیں ہے۔ اگر آپ نے قرآن و حدیث پڑھا ہے تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایک نامحرم لڑکی کے ساتھ آپ کو اکیلے کمرے میں نہیں رہنا چاہیے۔"

"کیا بکواس ہے یہ۔ ہم اس کا علاج کر رہے ہیں۔"

عامل کی آنکھیں غصے سے ابل پڑیں۔

"تو علاج سب کے سامنے کریں یا کم از کم کمرے میں لڑکی کے والد کو لے جائیں۔"

"نہیں یہ ممکن نہیں ہے۔"

"تو جناب یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ہم آپ کو ایک نامحرم لڑکی کے ساتھ کمرے میں اکیلا چھوڑ دیں۔"

"کیا ہمیں یہاں بے عزت کرنے کے لیے بلایا گیا ہے؟ تم ہمیں جانتے نہیں ہو ہم کیا کچھ کر سکتے ہیں۔"

"جناب من مجھے آپ پر کوئی شک نہیں ہے۔ مگر اسلام کا اتنا معمولی سا حکم یقیناً آپ کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگا۔"

"بے وقوف انسان، ہم اس بچی کا علاج کر رہے ہیں اور یہ علاج کی شرط ہے۔ ہم عامل ہی نہیں عالم بھی ہیں اس لیے یہ ہمارے لیے نامحرم نہیں ہے۔"

اب انعام نے بھی تہذیب کو ایک جانب رکھتے ہوئے کہا۔ "او جعلی عامل کیا بکواس کر رہا ہے؟ یہ کہاں لکھا ہے کہ عالم کے لیے کوئی لڑکی نامحرم نہیں ہوتی۔ میں تجھ جیسے رنگے سیاروں کو خوب جانتا ہوں جو ایسے چکر چلا کر معصوم لڑکیوں کی زندگی برباد کر دیتے ہیں۔"

"اب اور کیا سننا باقی ہے اٹھو چلو یہاں سے اب دیکھنا ان لوگوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔ چلو۔" عامل غصے سے اٹھا اور شفقت کی طرف دیکھ کر دھاڑا۔

شفقت پریشان سا اٹھا اور عامل کے پیچھے نکل گیا۔ انعام نے عثمان کی طرف دیکھا تو اس کے بشرے پر سکون اور طمانیت پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے انعام کو اپنی طرف متوجہ پایا تو مسکرا کر کہا

"شکریہ انعام جب اس مردود نے زارا کے ساتھ کمرے میں اکیلے جانے اور اس کی چیخوں کو نظر انداز کرنے کا کہا تب ہی میں کھٹک گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں کہ تم نے سارا مسئلہ ہی حل کر دیا۔ شکریہ میرے دوست تمہارا بہت شکریہ۔"

"عثمان بھائی مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا بس شفقت نے اس کی بہت تعریفیں کی تھیں اس لیے میں نے سوچا شاید یہ مسئلہ حل کر دے۔" اکبر شرمندگی سے بولا۔

"کوئی بات نہیں اکبر بھائی میں آپ کو اچھی طرح

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

جانتا ہوں، آپ کوئی فکر نہ کریں اللہ بہتر کرے گا۔"

"مگر عثمان، میرے بھائی اصل مسئلہ تو اب تک جوں کا توں ہے اس کا کیا ہوگا۔"

"ان دو تجربات کے بعد اب میں ہمت ہار چکا ہوں، مگر اب بھی اللہ کے در سے نا امید نہیں ہوں، مجھے اسی کے در سے امید ہے کہ جب ہم نے اس سے لو لگائی ہے تو وہی ہمارے مسئلے کو حل کرنے کی کوئی صورت نکال دے گا۔"

"ان شاء اللہ، ایسا ہی ہوگا اب مجھے بھی اجازت دو میں چلتا ہوں۔"

اکبر اور انعام دونوں ساتھ ہی رخصت ہو گئے۔

اس رات سوتے میں سب کی نیند ایک ساتھ ہی اچٹ ہوگئی گھر میں کسی بلی کے رونے کی آواز گونج رہی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ آواز بلند ہوتے ہوتے اچانک دھیمی پڑی اور پھر جب بلند ہوئی تو کسی عورت کے رونے اور بین کرنے کی آواز تھی۔ سب لوگ نشست گاہ میں جمع تھے زارا کمرے میں اکیلی تھی اور یہ آواز وہیں سے آرہی تھی۔ اچانک یہ آواز بھی بند ہوگئی تو ان لوگوں نے ڈرتے ڈرتے کمرے میں جھانکا تو زارا خوفناک حلیے میں ان کی طرف ہی دیکھ رہی تھی انہیں دیکھ کر وہ بھیانک انداز میں دانت نکوستے ہوئے ہنسنے لگی۔ اس کے ہنسنے سے ایسی آواز نکل رہی تھی کہ لگتا تھا ابھی دیواریں اور چھت ٹوٹ کر ان پر آرہیں گی۔ آخر فجر کی اذان بلند ہوئی تو زارا بے ہوش کر بستر پر گر پڑی۔

اگلے دن دوپہر کو عثمان کو ایک کام کے سلسلے میں مطرح جانا پڑا۔ وہاں اس نے ظہر کی نماز جبرو میں واقع ایک مسجد میں پڑھی نماز کے بعد دعا مانگتے وقت اسے اپنی بے بسی کا خیال آیا اور بے اختیار اس کا دل بھر آیا۔ وہ بلک بلک کر رو پڑا اور دعا مانگنے لگا۔

"اے اللہ اے رب کریم ایک تیری ذات ہے جو حاجت روا ہے نوازنے والی ہے سننے والی اور مدد کرنے والی ہے، تیرے سوا کوئی نہیں جو میری مدد کر سکے۔ ہمارے حال پر رحم فرما میرے مالک میری بچی کو اس آسیب سے نجات دے۔" کچھ دیر اس طرح رونے اور گڑگڑانے سے اس کے دل کو قرار آ گیا۔ اس نے آنکھیں پونچھیں اور اٹھنے لگا اسی وقت اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ عثمان نے مڑ کر دیکھا تو مسجد کے امام صاحب تھے جنہوں نے ابھی نماز پڑھائی تھی۔ حالانکہ جوان العمر تھے مگر لمبی سی سیاہ داڑھی میں ان کا نورانی چہرہ چمک رہا تھا۔ وہ بلوچ تھے۔ انہوں نے ہمدردی سے عثمان کی طرف دیکھا اور اردو میں پوچھا۔

"کیا بات ہے بھائی، تم کیوں رو رہے تھے۔ سب خیر تو ہے نا۔"

ان کی آواز اور پوچھنے کے انداز میں ایسا اثر تھا کہ عثمان نے رندھی ہوئی آواز میں سب کچھ بتا دیا یہاں تک کہ دو عاملوں کو مسترد کرنے والی بات بھی بتا دی۔ ان کی شخصیت میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ وہ ان سے کچھ بھی نہ چھپا سکے۔ امام صاحب نے سب کچھ سن کر پوچھا۔

"تم کہاں رہتے ہو؟"

"میں وادی کبیر میں رہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، یوں کرو تم عشاء کے بعد مجھے اپنے گھر لے چلو۔ جو مجھ سے ہو سکتا ہے، ان شاء اللہ میں کروں گا۔"

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

عثمان ان کا شکریہ ادا کر کے اٹھا اور پہلی فرصت میں انعام کے پاس پہنچ کر اسے یہ ماجرا سنایا۔ انعام نے بھی کہا کہ ہو سکتا ہے یہ غیبی امداد ہو۔ رات کو دونوں دوستوں نے عشاء کی نماز جبرو میں پڑھی اور نماز کے بعد امام صاحب کو لے کر گھر کی طرف چلے۔ جب انہوں نے گھر میں قدم رکھا تو اسی وقت زارا چیخ سنائی دی۔

"یہ کیوں یہاں آیا ہے نکالو اسے بھگاؤ اسے۔ یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ نکالو۔"

امام صاحب نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر عثمان اور انعام کے ساتھ زارا کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ زارا اپنے بستر پر بیٹھی تھی بکھرے بال سرخ آنکھیں کھلے دہانے سے سرخ زبان اور دانت جھانک رہے تھے، چہرے پر انتہائی غصے کے آثار، انہیں دیکھتے ہی وہ ایک بار پھر بدلی ہوئی بھاری آواز میں چلائی۔

"کیوں آیا ہے یہاں، تو کیوں آیا ہے۔"

"تو کون ہے، ادھر کیوں آیا ہے۔ اس معصوم کو کیوں تنگ کر رہا ہے۔" امام صاحب نے اسے گھور کر جواب

دیا۔

"بھاگ جا ورنہ تو ہم سے واقف نہیں ہے، ہم تجھے اور ان سب کو بھسم کر دیں گے۔"

"بکواس مت کرو، اللہ پاک نہ چاہے تو تُو کچھ نہیں کر سکتا۔ اب بھی میری بات مان لے اور اس معصوم کو چھوڑ دے ورنہ۔"

"ورنہ کیا کر لے گا تو کیا کرے گا۔ اب ہم تجھے سبق سکھائیں گے۔" زارا زور سے چلائی۔

زارا ہوا میں اچھلی اور گویا ہوا میں تیرتے ہوئے قریب آئی اور اس نے امام صاحب کے چہرے پر مکا مارنے کی کوشش کی۔ مگر وہ زیر لب کچھ پڑھ رہے تھے عین وقت پر انہوں نے اس پر پھونک مار دی۔ زارا کے حلق سے ایک بھیانک چیخ آزاد ہوئی اور وہ الٹ کر بستر پر جا گری۔ چند لمحے چیخنے اور لوٹ پوٹ ہونے کے بعد وہ اٹھی اور ایک بار پھر ان پر جھپٹی مگر اس بار امام صاحب کا اشارہ پا کر عثمان نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے مگر اس میں اتنی طاقت آگئی تھی کہ وہ اس کے آگے بے بس سے ہو گئے۔ عین اسی وقت امام صاحب نے اپنا رومال میں لپٹا ہاتھ اٹھا کر زارا کے سر کو پکڑ لیا ایسے کہ ان کا انگوٹھا مضبوطی سے اس کی پیشانی پر چپک گیا اور انگلیوں نے سر کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ زارا دانت کچکچاتے ہوئے زور زور سے سر جھٹکنے لگی مگر یوں محسوس ہو رہا تھا کہ امام صاحب کا ہاتھ اس کے سر سے چپک گیا ہے لاکھ کوشش کرنے پر بھی وہ سر چھڑانے میں کامیاب نہ ہو سکی اس دوران عثمان نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھوں میں جو وحشیانہ قوت تھی وہ بھی اب کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بے ہوش ہو گئی۔

"اسے بستر پر لٹا دو۔" امام صاحب نے عثمان سے کہا۔

عثمان نے ہدایت پر عمل کیا پھر یہ لوگ نشست گاہ میں آ کر بیٹھ گئے۔ امام صاحب کچھ دیر تک سوچتے رہے پھر کہا۔

"یہ بہت خطرناک عفریت ہے۔ اور ابھی تک اس سے جان نہیں چھوٹی ہے۔ آپ کے پاس زمزم ہے؟"

"میرے پاس ہے۔ ابھی لاتا ہوں۔" انعام نے کہا۔

"بس دو گلاس کے برابر لاؤ۔"

انعام فوراً چلا گیا۔ امام صاحب نے عثمان سے پوچھا۔ "جب تم لوگوں نے قرآن کریم کا تلاوت کی تو بچی نے کیا کیا تھا؟"

"اس نے بہت شدت سے چیخنا شروع کر دیا تھا، اور تڑپ رہی تھی اس لیے میری بیوی نے گھبرا کر بند کر دی تھی۔"

"تم لوگوں کو چاہیے تھا کہ اسے پوری سورۃ چلنے دیتے تھوڑی دیر یہ ہنگامہ کرتی پھر پرسکون ہو جاتی۔ تم کو انٹرنیٹ پر رقیا کی ریکارڈنگ بھی مل جائے گی۔ اسے سنا کرو تقریباً ایک گھنٹے کی ریکارڈنگ ہے اس سے جن، جادو، نظر کا علاج تو ہوتا ہی ہے ساتھ ہی اگر تم کو کوئی بیماری ہے آرام نہیں آ رہا ہے سر میں یا جسم میں درد ہے تو بھی رقیا سننے سے سکون مل جاتا ہے اور اللہ کے حکم سے شفاء بھی نصیب ہوتی ہے۔ سب سے بہترین چیز ہے اور اس میں اور کچھ بھی نہیں ہے صرف قرآن کریم کی سورتیں اور آیات وغیرہ ہیں۔"

"جی امام صاحب ضرور ان شاء اللہ میں اس سے کام لوں گا۔"

اتنے میں انعام واپس آ گیا اس کا سانس پھولا ہوا تھا شاید وہ بھاگتا ہوا گیا تھا اور اسی طرح واپس آیا تھا۔ زمزم ایک اسپرے بوتل میں ڈالا گیا۔ امام صاحب نے قریب ایک گھنٹے تک کچھ پڑھا پھر زارا کے کمرے کی طرف بڑھے ساتھ ہی انہوں نے عثمان اور انعام کو بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ زارا اب ہوش میں تھی اور نارمل نظر آ رہی تھی انہیں دیکھتے ہی دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے اٹھ گئی۔

امام صاحب نے اسے سامنے بیٹھنے کا کہا۔ وہ کچھ سہمی ہوئی سی ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ امام صاحب نے کچھ پڑھا پھر بلند آواز میں اذان کے الفاظ دہرانے لگے اس کے ساتھ ہی اچانک زارا کی حالت تبدیل ہو گئی وہ بری طرح چیخنے لگی۔ امام صاحب نے اس کے چہرے پر زمزم کی پھوار ماری اور کچھ پڑھ کر دم کیا۔ زارا الٹ کر پیچھے گری اور ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخنے لگی امام صاحب نے زور سے ڈپٹ کر پوچھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"تو کون ہے بتا تو کون ہے؟"
"آہ.....نہیں بتائیں گے.....نہیں بتائیں گے۔"
امام صاحب نے ایک بار پھر اس پر دم کرتے ساتھ ہی زمزم کی پھوار ماری۔ اب تو اس کی حالت ایسی ہوگئی کہ عثمان کا دل کٹنے لگا مگر ضبط کیے کھڑا رہا۔
"اگر نہیں بتائے گا تو مارا جائے گا۔ بتا۔"
"آہ، بتاتے ہیں ظالم بتاتے ہیں ہمارا نام قرتوش ہے ہم قوم اجناء سے ہیں۔"
"تو اس بچی کو کیوں پریشان کر رہا ہے۔ اس نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟"
"کچھ نہیں یہ اس درخت کے نیچے بیٹھی تھی جس پر ہم رہتے ہیں۔ اسے سوتے ہوئے دیکھا تو اس کی معصوم اور بھولی بھالی صورت ہمارے دل میں گھر کر گئی۔ بس اتنی سی بات ہے۔"
"تو نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ اب تو اسے چھوڑ دے اور وعدہ کر کہ آئندہ زندگی میں کبھی اس کو پریشان نہیں کرے گا۔ چل وعدہ کر۔"
یہ کہتے کہتے امام صاحب نے ایک اور ذرا لمبی پھوار ماری۔
"ہم وعدہ کرتے ہیں ظالم ہم وعدہ کرتے ہیں یہ بند کرو ورنہ ہم جل جائیں گے۔"
"ٹھیک ہے اب تم توبہ کرو اور قسم کھاؤ کہ آئندہ ان کو کبھی پریشان نہیں کرو گے۔"
قرتوش نے ان کی ہدایت کے مطابق ان کے سامنے توبہ کی اور قسم کھائی کہ آئندہ وہ زارا کو پریشان نہیں کرے گا۔ تب امام صاحب نے کہا۔
"ٹھیک ہے اب تو جا اور انسانوں سے دور ہی رہنا۔"
"جی جی ہم آپ کی ہدایات یاد رکھیں گے، شکریہ۔"
اس کے ساتھ ہی زارا بے ہوش ہو کر بستر پر گر پڑی۔
امام صاحب نے عثمان سے کہا۔ "ہم نشست گاہ میں بیٹھتے ہیں آپ اسے اچھی طرح سے سیدھا کر کے سلا دیں۔ اس کی نیند ممکن ہے صبح تک رہے، آپ لوگ اسے مت جگانا۔ یہ خود ہی جاگے گی تب ان شاء اللہ یہ بالکل ٹھیک ہو گی۔"
"امام صاحب آپ نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے بتائیں ہم آپ کی کیا خدمت کریں۔"
"آپ مجھے غلط سمجھے میں ان میں سے نہیں جو خدمت کرواتے ہیں، میں تو خود کوشش کرتا ہوں کہ کسی کی خدمت کر سکوں کسی کے کام آ سکوں تو میرا مالک شاید میرے کسی عمل سے خوش ہو کر مجھے بخش دے۔ میرے نزدیک تو یہ آپ کا احسان ہے مجھ پر کہ آپ نے مجھے اپنی خدمت کا موقع دیا۔ جزاک اللہ خیراً۔" امام صاحب نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔
عثمان اور انعام نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے انہیں وہ عامل یاد آ رہے تھے جن سے وہ پہلے ملے تھے۔ امام صاحب نے ان سے اجازت طلب کی تو انعام نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔
"آیئے امام صاحب میں آپ کو جہاں آپ کہیں چھوڑ دیتا ہوں۔"
"ارے نہیں بھائی میں ٹیکسی سے چلا جاؤں گا۔"
"نہیں امام صاحب یہ ناممکن ہے کہ میرے ہوتے آپ ٹیکسی میں جائیں۔"
"اچھا میرے بھائی ناراض نہ ہو میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ اچھا عثمان بھائی اللہ حافظ۔"
عثمان نے اٹھ کر امام صاحب کو گلے لگا لیا۔ اور نم آنکھوں سے انہیں رخصت کیا۔
صبح زارا اٹھی تو بالکل نارمل تھی۔ اسے اپنی حالت کا پورا ادراک نہیں تھا کچھ باتیں اسے یاد تھیں جبکہ کچھ وہ بھول گئی تھی۔
ان کی زندگی سے رخصت ہونے والی خوشیاں دوبارہ آ گئیں اور وہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے پاکستان جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

راز سربستہ

ثناء اللہ خان احسن

سانپ یا ناگ کا نام ہی ایک دہشت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں سانپ کو بدی اور شیطانیت کے نشان کے طور پر جانا جاتا ہے، اس جانور سے انسان کی ناپسندیدگی کی وجہ اس کا زہر ہے، نہ صرف انسان بلکہ جانور بھی اس سے ڈرتے ہیں۔ اس خوف اور دہشت میں ہندو دیومالائی داستانیں مزید پراسراریت کا تڑکا لگاتی ہیں اور سانپ کو ایک خطرناک و پراسرار مخلوق سمجھا جاتا ہے جبکہ درحقیقت سانپ بھی ایک زمینی مخلوق ہے جو انسانوں سے دور بھاگتی ہے اور اپنے دفاع کے لئے ہی حملہ کرتی یا ڈستی ہے۔

اسرار کی دنیا سے انوکھی اور دلچسپ تحقیق،
ایک اور راز۔ بے پردہ

پاکستان میں پائے جانے والے سانپ:۔
سنگچور کوبرا، جلیبیہ اور کوڑیالہ:۔
مکلی کی وجہ شہرت سانپ اور قبرستان:۔
سات کلو وزنی سانپ کی قیمت پچاس لاکھ!
سانپ کاٹے کی ویکسین سانپ کے زہر سے تیار!
قومی ادارہ صحت میں گھوڑوں کو سانپ کے زہر کے انجکشن کیوں لگائے جاتے ہیں؟
سانپ کا تیل برائے گھٹیا و گنج:۔
سانپ سے تیار شدہ ہومیو پیتھی دوا:۔
سانپ کی کینچلی اور عملیات:۔

سانپ کے کیونکہ ہاتھ پاؤں یا دوسرا کوئی ایسا عضو نہیں ہوتا کہ جس کی مدد سے اپنی خوراک کے لیے شکار کو پکڑے یا دبوچے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو زہریلا بنایا تا کہ یہ اس کی مدد سے اپنے شکار کو مفلوج کر کے ثابت نگل جائے کہ اس کے منہ میں چبانے والے دانت بھی نہیں ہوتے۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق دنیا بھر میں تین ہزار سے زائد سانپوں کی نسلیں ہیں، جبکہ پاکستان میں دو سو پچاس سے تین سو کے قریب سانپوں کی قسمیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے صرف پندرہ فیصد سانپ زہریلے ہوتے ہیں جن میں ایک سو ستر 170 مختلف اقسام کے سانپ شامل ہیں۔ جبکہ دیگر سانپ زہریلے نہیں ہوتے یا یہ کہیے کہ ان کا زہر اتنا ہلکا ہوتا ہے کہ وہ انسان کے لئے مہلک نہیں ہوتا۔ سانپ کے جبڑے میں ایک چھوٹی تھیلی ہوتی ہے اور جبڑے میں انجکشن کی سوئی کی طرح دانت ہوتے ہیں۔ جب سانپ کاٹتا ہے تو جبڑے کی تھیلی پر ایک قسم کا دباؤ پڑتا ہے جس کی وجہ سے سرنج نما دانتوں میں سے زہر انسان کے جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ مختلف سانپوں کا زہر انسانی خون اور اعصاب پر مختلف اثر ڈالتا ہے۔ کچھ سانپوں کا زہر خون کو جما کر کلیجی کی شکل کا کر دیتا ہے یا کچھ کا زہر خون کو انتہائی پتلا کر دیتا ہے اور مارگزیدہ کے منہ ناک اور جسم کے مسامات سے خون بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ سانپوں کا زہر اعصاب کو مفلوج کر دیتا ہے۔

پاکستان میں صحرا، خشکی، پہاڑی اور میدانی علاقوں میں زیادہ تر چار اقسام کے سانپ پائے جاتے ہیں۔ جن میں کوڑیالہ، سنگچور، کالا ناگ (کوبرا) اور جلیبیہ شامل ہیں۔ یہ چاروں زہریلے سانپ ہیں اور اکثر ان میں سے ہی کسی ایک کے کاٹنے سے انسان مر بھی سکتا ہے۔ پاکستان میں پائے جانے والے سانپوں پر ایک انتہائی تفصیلی کتاب جناب شریف محمد خان نے The Snakes of Pakstan کے نام سے تحریر کی ہے جو انگریزی زبان میں ہے۔ اس کو اردو ترجمہ بھی شائع ہونا چاہیے تاکہ عام عوام بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

پاکستان میں پائے جانے والے عام سانپ:۔
سانپوں کی مختلف اقسام پاکستان کے طول و عرض میں پائی جاتی ہیں، جن میں کچھ زہریلی اور باقی غیر یا معمولی زہریلی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ہوتی ہیں۔ پاکستان میں صحرا، میدان، پتھریلی، پہاڑی، نمی والی جگہ، دریا اور سمندر میں بھی سانپوں کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے، سمندری سانپ نہایت زہریلے ہوتے ہیں، جو اکثر کراچی کے ساحلوں پر بھی آجاتے ہیں۔ بلوچستان میں سانپوں کی کچھ منفرد اقسام پائی جاتی ہیں، کراچی میں ملیر کے علاقے میں سانپ بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ مجھے آج تک صرف 5 دفعہ ہی سانپ ملیں ہیں۔ جن میں دو سمندر کے تھے، اور تین دریا کے پانی اور دریا کے پانی والا سانپ غیر زہریلا ہوتا ہے۔

رفنی رسل (Vipers'Russel):۔ پورے پاکستان میں یہ سانپ زیادہ تر میدانی علاقوں میں ملتا ہے۔ اس کی کچھ اقسام پہاڑوں پر بھی رہتی ہے، پنجاب میں یہ سانپ، کوڑیوں والا سانپ اور سندھ میں کرار کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔ یہ اپنے جسم کی نمایاں بناوٹ کے باعث پہچانا جاتا ہے۔ اس کے کاٹنے سے انسان چند گھنٹوں یا چند دنوں میں مرجاتا ہے۔

منشار سفنوں والا سانپ (ایکس کاری نیٹس):۔ یہ بھی تقریباً پورے ملک میں ہی پایا جاتا ہے، لیکن خاص طور پر سندھ اور پنجاب کے صحرائی اور میدانی علاقوں میں بکثرت ملتا ہے۔ سندھ میں اس کو کھپرا اور پنجاب میں جلیبی سانپ یا پشتی سانپ کے نام سے پکارا جاتا ہے، اس کی لمبائی دو فٹ تک ہوتی ہے، براؤن رنگ کی پشت پر اطراف سے ہلکے رنگ کی دھاریاں، سر پر پرندے کے پاؤں کی طرح کے نشان ہوتے ہیں اور یہ اکثر دن کے اجالے میں نظر آتے ہیں۔ اس کا ڈسا ہوا انسان چوبیس گھنٹوں میں یا زیادہ سے زیادہ دو دن میں مرجاتا ہے۔

ناگ راج (ناجا ہنگیرس) کوبرا:۔ یہ سانپ ہمارے ملک میں بہت کم تعداد میں ہوتا ہے۔ ہمالیہ کا شمالی پہاڑی علاقہ اس کا مسکن ہے۔ یہ میدانی اور پہاڑی جنگلوں میں کثرت سے ملتا ہے۔ سپیرے اس کو شیش ناگ کہتے ہیں۔ یہ تقریباً آٹھ سے سولہ فٹ تک لمبا ہوتا ہی اس کے کاٹنے سے انسان چند گھنٹوں کے اندر اندر ختم ہوجاتا ہے۔

ہندوستانی ناگ یا کالا ناگ (ناجاناجا):۔ یہ سانپ پاکستان کے جنگلوں اور دیگر سرسبز جگہوں پر بکثرت پایا جاتا ہے۔ خصوصاً پنجاب کی تحصیل چیچہ وطنی اور دریائے سندھ کے کنارے گھنی سبز جھاڑیوں میں ملتا ہے۔ یہ دیکھنے میں ایک خوبصورت رنگوں والا سانپ ہے۔ عام طور پر اسے ناگ پھنئر اور کالا ناگ کہتے ہیں۔

عام کریٹ یا سنگ چور (Krait):۔ یہ نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ پورے برصغیر میں عام پایا جاتا ہے۔ پنجاب میں یہ چت کوریا اور سندھ میں پی ان کہلاتا ہے۔ یہ چمکدار سیاہ رنگ کا ہوتا ہے اور اس کی پیٹھ پر سفید رنگ کی دھاریاں ہوتی ہیں۔ اس کی لمبائی تین سے چار فٹ تک ہوتی ہے۔ اکثر اوقات یہ پانچ فٹ تک لمبے بھی دیکھے گئے ہیں۔ یہ سانپ اکثر انسانی آبادیوں کے قریب ہی ملتا ہے۔ اس کے کاٹنے سے مریض چھ سے آٹھ گھنٹہ میں ختم ہوجاتا ہے۔

اژدھا (Python):۔ بڑی جسامت والا ناگ آٹھ سے بیس فٹ تک لمبا اور تین سو پچاس پونڈ تک وزنی ہوتا ہے۔ اس کی عمومی خوراک پرندے، ہرن اور دودھ دینے والے جانور ہوتے ہیں۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ڈھمن سانپ یا چوہا سانپ:۔ یہ سانپ کافی موٹا اور مضبوط ہوتا ہے۔ اکثر کھیتوں اور جھاڑیوں میں ملتا ہے۔ جسم کا اوپری حصہ سنہری اور بھورا اور نیچے کا حصہ پیلے رنگ کا ہوتا ہے۔ اس کی پسندیدہ غذا تو چوہے ہیں لیکن یہ مینڈک اور پرندے بھی شوق سے کھالیتا ہے۔

رسل مینی سانپ:۔ یہ موٹا اور گول سانپ ایک سے تین فٹ لمبا ہوتا ہے۔ سب سے نمایاں اس کی دم ہوتی ہے۔ جو سوا انچ لمبی اور تکونی شکل کی ہوتی ہے۔ جس کا سرا نوکدار ہوتا ہے۔ اس کی خوراک دودھ دینے والے چھوٹے جانور، گلہریاں اور چوہے ہیں۔ یہ مکمل طور پر ایک بے ضرر جانور ہے۔

دومنہ والا سانپ:۔ یہ ایک عام سانپ ہے لیکن اس کی خاص اور انوکھی بات یہ ہے کہ اس کا منہ اور دم ایک جیسی ہوتی ہیں مگر دم کا حصہ نوکدار ہونے کے بجائے کند ہوتا ہے۔ پنجاب میں عام طور پر یہ دوموہی کہلاتا ہے۔

پشاور سے تقریباً" 3025 کلومیٹر جنوب کی طرف درہ آدم خیل اور اس کے آس پاس بیابان علاقوں میں ایک سانپ پایا جاتا ہے جس کی لمبائی چھ سے آٹھ انچ ہوتی زہریلا اتنا کہ اس کا ڈسا سچ مچ پانی نہیں مانگ سکتا۔ یہ

رینگتا نہیں بلکہ دم کی طرف آٹھ دس فٹ الٹی چھلانگ لگاتا ہے۔

سانپوں کی اسمگلنگ:۔ ٹھٹھہ میں سانپوں کی اسمگلنگ کا دھندہ عروج پر ہے۔ سانپوں کے شکاری روزانہ بڑی تعداد میں سانپ پکڑ کر ملک اور بیرون ملک اسمگل کرنے میں مصروف ہیں جبکہ محکمہ جنگلی حیات خاموش ہے۔ مکلی ملک بھر میں دو حوالوں سے معروف ہے۔ پہلا تاریخی قبرستان اور دوسرا سانپوں کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔ مکلی اور ٹھٹھہ کی پہاڑی اور ساحلی پٹی میں بڑی تعداد میں نایاب اقسام کے سانپ پائے جاتے ہیں۔ جن میں کوبرا، واسینگ، کوبرا، وائپر، ریسلی، کھپرا، لنڈی، سنگچور اور دیگر اقسام شامل ہیں۔ مکلی کے جوگی شکاری ہر مہینے ایک ہزار سے لیکر پندرہ سو سانپ پکڑ کر ملک اور بیرون ملک اسمگل کر رہے ہیں۔ سانپ سے نکالا گیا زہر زیادہ تر سانپ کے کاٹے کے علاج یا تریاق کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ سانپ کا زہر چند کاسمیٹکس میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ سات کلو وزن کے سانپ کی قیمت پچاس لاکھ روپے تک ہوتی ہے۔ سرد موسم میں ان کی اسمگلنگ میں تیزی آجاتی ہے۔

سانپ کا طبی استعمال:۔ روایتی چینی طریقہ علاج میں سانپ کا تیل (Oil Snake) صدیوں سے مستعمل ہے اور انتہائی مہنگا فروخت ہوتا ہے۔ سانپ کا تیل گٹھیا اور جوڑوں کے درد کے لئے اکسیر خیال کیا جاتا ہے۔ دیسی طب میں حکیم حضرات سانپ کی چربی اک مردانہ طاقت کے طلاؤں میں بھی استعمال کرتے ہیں بلکہ اب تو سنیک آئل بالوں کی بڑھوتری اور گنج پن کے خاتمے کے لئے بھی بلند و بانگ دعوؤں کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ کشتہ جات بھی کالے ناگ کے منہ میں دوائی رکھ کر اس کو ایک خاص طریقے سے جلا کر بنائے جاتے ہیں۔ کالے جادو میں بھی سانپ کا استعمال کیا جاتا ہے۔

ہومیو پیتھی میں کوبرا سانپ کے زہر سے ناجا ٹرپ tripudiansnaja نامی دوا بنائی جاتی ہے جو سانپ کے کاٹے کے علاوہ دیگر بیماریوں کے لئے بھی استعمال کی جاتی ہے۔ مزید تفصیلات کے لئے میٹریا میڈیکا میں تفصیل دیکھیے۔

ہومیو پیتھک کی ایک دوا Vipra بھی وائپر سانپ کے زہر سے بنتی ہے۔ جو خون میں بننے والے clots کو ختم کرنے کے کام آتی ہے۔ ہومیو پیتھی میں سانپ کے زہر بنائی گئی سب سے بڑی دوا لیکسس ہے، یہ برازیل میں پائے جانے والے ایک نہایت خطرناک سانپ سے تیار ہوتی ہے۔ اس دوا زیر اثر مرد و خواتین کی بہت سی بیماریاں آتی ہیں۔

سانپ اور عملیات:۔ سانپ کو کئی عملیات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ان میں نوری یعنی اچھے عملیات بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ جن میں کالا جادو شامل ہے۔ ازل سے اچھائی اور برائی کی جنگ ہوتی آئی ہے۔ اسی طرح جنات سانپ کو عملیات یا تعویذات سے تسخیر کر کے ان سے کام لینے کا طریقہ بھی صدیوں سے استعمال ہوتا آیا ہے۔ عربی کی کافی قدیم کتابوں میں ایسے عملیات لکھتے ہوئے ہیں۔ عاملین کے مطابق عربی کی ایسی قدیم کتابوں کا کافی بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ جن میں جنات سانپ کو تسخیر کر کے ان کو اپنے مقصد کیلئے استعمال کرنے کے طریقے لکھتے ہیں۔ سانپ کو عملیات میں کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق کچھ معلومات میں یہاں پیش کر رہا ہوں۔ جنات سانپ کے عملیات میں جو چیز سب سے زیادہ استعمال ہوتی ہے۔ وہ سانپ کی کینچلی ہے جو ایک طرح سے مردہ کھال ہوتی ہے۔ اسے بعض سانپ سال میں ایک بار اور بعض سانپ کئی بار اپنے جسم پر نئی کھال آنے کے بعد اتار کر جسم سے الگ کر دیتے ہیں۔ اسے انگریزی میں سنیک شیڈ کہا جاتا ہے۔ سانپ کی کینچلی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک، وہ جو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سانپ کے جسم سے اترتی رہتی ہے۔ دوسری قسم وہ جو بالکل صحیح سالم حالت میں سانپ اپنے جسم سے اتارتا ہے۔ ٹکڑوں کی شکل میں اترنے والی سانپ کی کینچلی کسی کام کی نہیں ہوتی۔ البتہ سالم بہت کارآمد ہوتی ہے۔ اپنی کینچلی اتارتے ہوئے سانپ بہت سست اور اندھا ہو جاتا ہے۔ کینچلی اتارتے وقت وہ کسی نوکیلی چیز یا کانٹے وغیرہ میں مردہ کھال اڑا کر گردن پیچھے کو ہٹاتا جاتا ہے۔ جس سے رفتہ رفتہ تمام کینچلی غلاف کی طرح اترتی جاتی ہے اور سانپ میں پہلے جیسی چستی اور پھرتی آجاتی ہے۔ سانپ کی کینچلی کے کافی فائدے ہیں۔ اسے اگر تعویذ کی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

طرح گلے میں پہنا جائے تو نظر بد سے انسان محفوظ رہتا ہے اوراس پر جادو کے اثرات بھی کارگر نہیں ہوتے۔ بلکہ کچھ عامل حضرات تو سانپ کی کینچلی کو کالے جادو کے خلاف موثر ترین ہتھیار بھی قرار دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ حکمت میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ اگر کوئی زخم ہوجائے اورٹھیک نہ ہوتا ہو یا کوئی زخم ناسور بن جائے تو سانپ کی کینچلی کوجلا کراس کی راکھ زخم پر ڈالنے سے پرانا زخم بھی ٹھیک ہوجاتا ہے۔ زمانہ جہالت میں یہودی سانپ کی کینچلی سے مسلمان پر جادو کیا کرتے تھے کیونکہ سانپ کی کینچلی والا جادو بہت اثر رکھتا ہے۔ سانپ کی کینچلی کا عمل بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اس کے برے اثرات میں کوئی آجائے تو وہ ہرطرح سے تباہ برباد ہوجاتا ہے۔ آج بھی یہودی اس عمل کو بہت معتبر مانتے ہیں۔ یہودی سانپ کو اس لئے بھی زیادہ مانتے ہیں کیونکہ حضرت موسیٰ ؟ کے عصا نے سانپ کی شکل اختیار کرلی تھی۔ مغربی ممالک میں آج بھی کچھ دکانوں پر سانپ کی کینچلی فروخت کی جاتی ہے اور ساتھ میں عملیات کا طریقہ بھی لکھا ہوتا ہے۔ واللہ اعلم!

یہ تمام معلومات عامل حضرات کی فراہم کردہ ہیں اور قارئین کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سانپ سے بچاؤ کا عمل: سانپ یا کھجورہ یا کوئی زہریلی ایسی چیز سامنے آجائے تو ایک آیت ہے (الصافات۔79)

چندمرتبہ پڑھ کردم کردیں یا سانپ کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کردیں۔ وہیں رک جائے گا سست ہوجائے گا۔ پھر جو کرنا ہے کیجیے۔ ماریں یا دور پھینک دیں۔ آزمودہ ہے۔ اور کئی افراد نے اس کو مجرب بتایا ہے۔

سانپ کاٹے کی ویکسین: آپ میں سے اکثر کو یہ جان کر شاید حیرت ہو کہ سانپ کے کاٹے کی ویکسین بھی ان سانپوں کے زہر سے ہی بنائی جاتی ہے۔ پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں واقع قومی ادارہ صحت میں سانپ کے کاٹے کی ویکسین تیار کی جاتی ہے جس کے لئے باقاعدہ سانپوں کو خریدنے کے لئے ٹینڈر جاری کیا جاتا ہے۔ مناسب تعداد میں اوپر بیان کردہ چاروں سانپوں کے حصول کے بعد ان کا زہر نکال کر اس کو مختلف مراحل سے گزارا جاتا ہے۔ پھر ان چاروں سانپوں کا زہر پتلا اور خشک کرنے کے بعد اس کے ٹیکے گھوڑوں کی گردن میں لگائے جاتے ہیں۔ یہ ٹیکے لگتے ہی گھوڑے کا مدافعتی نظام اس زہر کے اثرات ختم کرنے کے لئے اینٹی باڈیز پیدا کرتا ہے جو گھوڑے کے خون میں شامل ہوجاتی ہیں۔ ایک مقررہ حد تک اینٹی باڈیز پیدا ہونے کے بعد گھوڑے کے جسم سے خون نکالا جاتا ہے۔ عام طور پر ایک گھوڑے سے دس سے پندرہ لٹر خون نکالا جاتا ہے۔ اس خون سے پلازما علیحدہ کرکے اس سے اینٹی وینم سیرم بنائی جاتی ہے جو انجکشنز کی صورت میں ہسپتالوں اور دیگر طبی اداروں کو فراہم کی جاتی ہے۔ اس میں وہ ویکسین بھی شامل ہے جو حفاظتی ٹیکوں کی طرح لگائی جاتی ہے۔ اس کے بطور حفظ ما تقدم لگانے سے سانپ کاٹنے کی صورت میں زہر کا اثر نہیں ہوتا۔ عالمی ادارہ صحت نے قومی ادارہ صحت میں بنائی گئی سانپ کاٹنے سے بچاؤ کی ویکسین اور اینٹی وینم سیرم کو عالمی معیار کی دوائی قرار دیتے ہوئے سانپ کاٹے کی 99.9 فیصد مؤثر دوائی بھی قرار دیا ہے۔ جن سانپوں سے زہر نکالا جاتا ہے ان میں بیس سے تیس دن کے دوران زہر دوبارہ پیدا ہوجاتا ہے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ماہرین کے مطابق اگر سانپ کاٹنے کی جگہ پر دو یا تین باریک نوکدار نشان ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ کسی زہریلے سانپ نے کاٹا ہے۔ اگر کوئی سانپ کاٹے اور نوکدار نشان نہ ہوں تو پھر گھبرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ سانپ زہریلا نہیں ہوتا۔ اگر کوبرا اور سنگچور کاٹے تو انسان کا اعصابی نظام متاثر ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں مریض کو سونے نہیں دینا چاہیے۔

قومی ادارہ صحت میں سانپ کی ویکسین بنانے کے لئے باقاعدہ گھوڑے پالے جاتے ہیں جن کی بہترین نگہداشت کی جاتی ہے۔ ان کی صحت بہتر رکھنے کے لئے ان کو باقاعدہ مربے اور پھل وڈرائی فروٹس وغیرہ کھلائے جاتے ہیں۔ کچھ گھوڑے سانپ کے زہر کے انجکشن کے بعد مر بھی جاتے ہیں جبکہ اکثر گھوڑوں سے دس دس مرتبہ بھی خون نکالا جاتا ہے۔

⌘

ذوقِ آگہی

عثمان عبداللہ

بدلنے میں

موسم کے بدلتے رنگوں میں کہیں نہ کہیں خوشگوار سی دھنک دکھائی دے جاتی ہے۔ مگر انسان کے بدلنے میں سوائے اذیت کے کوئی احساس نہیں ملتا۔

عبدالجبار رومی انصاری...... بورے والا

نور

اماں نے ایک دن مجھے بتایا کہ انہوں نے میرے لیے لڑکی تلاش کرلی ہے اور وہ لڑکی کے حسن اور سادگی کی تعریف کرنے لگیں۔ میں سر جھکائے اماں کی باتیں سنتا رہا۔ اماں نہ جانے کیا سمجھیں، کچھ دیر خاموشی کے بعد پھر گویا ہوئیں۔

"میں نے تو یر منگوائی ہے تصویر دیکھ کر بتانا تمہیں پسند ہوگی تو بات آگے بڑھاؤں گی۔"

اماں کے لہجے نے مجھے تڑپا دیا۔ اماں جو خوشی خوشی مجھے خوشخبری سنا رہی تھیں یک دم افسردہ ہوگئی تھیں۔

میں نے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تصویر کی ضرورت نہیں۔ ہے آپ کو پسند ہے تو مجھے بھی پسند ہے۔ آپ کا جو دل چاہے کیجیے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اماں نے خوش ہوکر دونوں ہاتھوں سے مراسر تھام لیا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔

مجھے ایسا لگا کہ ایک نور ہے جو جسم و جاں میں اترتا جارہا ہے۔

نیئر رضوی...... لیاقت آباد، کراچی

زندگی

جب من آنگن میں ویرانیاں ڈیرے ڈال لے اور آنکھوں کی تاک میں سچی امید کی قندیلیں بھی ماند پڑنے لگیں تو سرزمین جان کے کینوس کو گلوں اور تتلیوں کے شوخ وچنچل رنگوں ہی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یقین جانیں ایسا کرکے جہاں آپ زندگی گزارنے کا گر جان جائیں گے وہیں من نگری میں ہولے ہولے بادِنوبہار بھی چلنے لگیں گی۔ جلتی بجھتی محبت کی کہانی سدا سہاگن کی ردا اوڑھے ان مٹ ہوجائے گی پھر تو ہر بام و در سے یہی صدائیں آئیں گی۔

اک پیار کا نغمہ ہے موجوں کی روانی ہے
زندگی اور کچھ بھی نہیں تیری میری کہانی ہے

پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر

حضرت سلیمان فارسیؓ فرماتے ہیں

☐ جو گناہ کو چھپائے گا، ناکام رہے گا۔ جو گناہ پر پشیمان ہوکر اسے چھوڑ دے گا، کامیاب ہوکر رہے گا۔

☐ خدا کے نزدیک راستی اور انصاف قربانی سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

☐ صادق بار بار گرتا ہے اور پھر سنبھلتا ہے لیکن سرکش بلا میں مبتلا ہوجاتا ہے تو پھر چھٹکارہ نہیں پاتا۔

☐ جو ایک بے وقوف کے ہاتھ پیغام بھیجتا ہے اپنے پاؤں آپ کاٹتا ہے۔

☐ وہ جس کے دل میں برائی ہے بھلائی نہ پائے گا اور جس کی زبان میں نکتہ چینی ہے۔ آفت میں گرے گا۔ اللہ تعالیٰ کو زبان میں سختی پسند نہیں ہے۔

☐ جھگڑے کو پیشتر اس کے تیز ہوجائے چھوڑ دو۔

☐ میٹھے بول غصے کو رفع کرتے ہیں۔

☐ خداوند تعالیٰ کا خوف عمر کو دراز کرتا ہے، لیکن شریروں کی زندگی گھٹائی جائے گی۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال

فرمان شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کا فرمان عالی شان ہے۔

"محبت الٰہی کا تقاضا ہے کہ تو اپنی نگاہوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی طرف لگادے اور کسی کی طرف نگاہ نہ ہو۔ یوں کہ اندھوں کی مانند ہوجائے۔ جب تک تو غیر کی طرف دیکھتا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

رہے گا اللہ کا فضل نہیں دیکھ پائے گا۔ پس تو اپنے نفس کو مٹا کر اللہ ہی کی طرف متوجہ ہو جا اس طرح تیرے دل کی آنکھ فضل عظیم کی جانب کھل جائے گی اور تو اس کی روشنی اپنے سر کی آنکھوں سے محسوس کرے گا اور پھر تیرے اندر کا نور باہر کو بھی منور کردے گا۔ عطائے الٰہی سے تو راحت و سکون پائے گا۔

اگر تو نے نفس پر ظلم کیا اور مخلوق کی طرف نگاہ کی تو پھر اللہ کے فضل عظیم کی طرف سے تیری نگاہ بند ہو جائے گی اور تجھ سے فضل خداوندی رک جائے گا۔

تو دنیا کی ہر چیز سے آنکھیں بند کرلے اور کسی چیز کی طرف نہ دیکھ جب تک تو چیز کی طرف متوجہ رہے گا تو اللہ تعالیٰ کا فضل اور قرب کی راہ تجھ پر نہیں کھلے گی۔ توحید، قضائے نفس اور محویت ذات کے ذریعے دوسرے راستے بند کردے تو تیرے دل میں اللہ تعالیٰ کے فضل کا عظیم دروازہ کھل جائے گا۔ چنانچہ ظاہری آنکھوں سے دل، ایمان اور یقین کے نور سے مشاہدہ کرے گا۔

ماخوذ از کتاب ''فتوح الغیب مع قلائد الجواہر''

اکرام الحق......جہلم

کلونجی کے فوائد

❖ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''سیاہ دانہ (کلونجی) میں موت کے سوا ہر بیماری کے لیے شفاء ہے۔''

❖ پیشاب کی جلن کو دور کرنے کے لیے روغن کلونجی مفید ہے۔

❖ سر درد اور چکر کی صورت میں 7 قطرے روغن کلونجی دہی میں مکس کر کے دن میں 3 مرتبہ استعمال کرنے سے فائدہ ہوتا ہے۔

❖ سرطان کے لیے گاجر کے جوس میں نصف چمچ روغن کلونجی ملا کر دن میں دو مرتبہ پئیں یہ عمل تین ماہ مسلسل جاری رکھیں۔

ربیہ اکرام اعوان......دینہ

انبیاء علیہ السلام کے القابات

۞ ابوالبشر حضرت آدمؑ کو کہا جاتا ہے۔

۞ شیخ الانبیاء حضرت نوح علیہ السلام کو کہا جاتا ہے۔

۞ ابوالانبیاء حضرت ابراھیم علیہ السلام کو کہا جاتا ہے۔

۞ خطیب الانبیا حضرت شعیب علیہ السلام کو کہا جاتا ہے۔

۞ خلیفہ الارض حضرت داوٗدؑ کا لقب ہے۔

۞ ابوالعرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کو کہا جاتا ہے۔

۞ ذوالنون حضرت یونس علیہ السلام کو کہا جاتا ہے۔

۞ کلیم اللہ حضرت موسیٰؑ کا لقب ہے۔

۞ ذبیح اللہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا لقب ہے۔

۞ خلیل اللہ حضرت ابراھیم علیہ السلام کا لقب ہے۔

انتخاب: مہرین آصف بٹ......کشمیر

لفظ لفظ خوشبو

• اگر زندگی میں سکون چاہتے ہو تو کبھی کسی سے توقع مت رکھو کیونکہ توقع کا پیالہ ہمیشہ ٹھوکروں کی زد میں رہتا ہے۔

• جتنا کسی کا ساتھ پرانا ہوا اتنا ہی اس کی بے وفائی کے لیے تیار رہنا چاہیے کیونکہ تبدیلی کائنات کا خمیر ہے۔

• رشتے اپنائیت کے ہوں یا خلوص کے اتنے ہی نازک ہوتے ہیں جیسے آبگینے کہ ذرا سی ٹھیس لگے تو ٹوٹ گئے، بدگمانی نے سر اٹھایا تو چکنا چور ہو گئے پھر ان پر فخر کیسا۔

• عورتیں مردوں پر بالکل اعتبار نہیں کرتیں لیکن کسی خاص مرد کے لیے اپنے اس اصول کو بھول جاتی ہیں۔

• قبرستان ایسے لوگوں سے بھرے پڑے ہیں جو یہ سمجھتے تھے کہ ان کے بغیر دنیا اجڑ جائے گی۔

• دکھ کی دراڑیں چہروں سے تو رخصت ہو جاتی ہیں لیکن وہ انسان کے اندر اتر کر اس گوشے کو ویران کر دیتی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ہیں جو کسی ایک شخص کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔
نادیہ عباس دیا اینڈ آرش نایاب......موسیٰ خیل

امت محمدیہ کے بد ترین افراد
شوقین مزاج اور فیشن کے دلدادہ لوگ اللہ کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کو امت کے بدترین افراد میں شمار کیا ہے ارشاد نبوی ﷺ ہے۔
''میری امت کے بدترین لوگ وہ ہیں جو ناز و نعم میں پیدا ہوئے اور اسی میں پلے اور بڑھے، جن کو ہر وقت بس انواع و اقسام کے کھانوں اور طرح طرح کے لباس زیب تن کرنے کی فکر دامن گیر رہتی ہے اور جو (تکبر کی وجہ سے) مٹھار مٹھار (چبا چبا کر) بات چیت کرتے ہیں۔
سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ تم (زیب و زینت کے لیے) بار بار غسل خانوں کے چکر لگانے اور بالوں کی بار بار صفائی سے بچتے رہو اور عمدہ عمدہ قالینوں کے استعمال سے بھی بچو، اس لیے کہ اللہ کے خاص بندے عیش و عشرت کے دلدادہ نہیں ہوتے۔
(کتاب الزہد: ۲۶۳)
نور سحر شاہ......مانسہرہ

باتوں سے خوشبو آئے
● پرندہ زندہ ہو تو چیونٹیاں کھاتا ہے مگر جب پرندہ مر جاتا ہے تو وہی چیونٹیاں اسے کھاتی ہیں۔
● ایک درخت ایک لاکھ ماچس کی تیلی بنا سکتا ہے مگر ماچس کی ایک تیلی ایک لاکھ درخت جلا سکتی ہے۔
● زندگی میں کبھی کسی کو مت ستانا اس وقت شاید آپ طاقت ور ہوں مگر وقت آپ سے زیادہ طاقتور ہے۔
● زمین انسان کو رزق دیتی ہے لیکن جب انسان مرتا ہے تو پھر وہی زمین اسے اپنا رزق بنا لیتی ہے۔
زویا خان......راولپنڈی

سنہری باتیں
۞ ہمارے زندہ رہنے کا فائدہ ہی کیا ہے کہ اگر ہم ایک دوسرے کے حالات کی تلخی کم نہ کر سکیں۔
۞ جب انسان کے دل میں روشنی نہ ہو تو وہ چراغوں کے میلے میں کیا حاصل کرے گا۔
۞ لوگ چاند پر پہنچنے کے لیے ہزاروں جتن کر لیں گے مگر دل تک پہنچنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔
۞ جو محبتیں وقت پر ادا نہ ہو سکیں وہ قرض کی طرح سود در سود چڑھتی چلی جاتی ہیں۔
۞ انتظار مرتا نہیں آنکھوں میں جم جاتا ہے ہاں بس آنکھیں مر جاتی ہیں۔
صنم ناز......گوجرانوالہ

محبتیں
یہ ضروری تو نہیں کہ ہم محبتوں کو پالتو پرندوں کی طرح پنجروں میں بند کر رکھیں یا قید کر لیں۔ وہ قید ہو ہی نہیں سکتیں رہنا ہوگا تو پرواز کی تمام صلاحیتوں کے باوجود کہیں اور نہیں جائیں گی اور نہیں رہنا ہوگا تو پنجرے کمزور ہوتے ہیں۔
شبانہ امین راجپوت......کوٹ رادھا کشن

اقوال زریں
✠ اگر کوئی تم سے جلتا ہے تو بجائے غصہ ہونے کے اس کی جلن کی قدر کرو کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو تمہیں خود سے بہتر سمجھتے ہیں۔
✠ اگر کوئی تم سے روٹھ جائے اور پھر خود ہی تم سے ملنے کو ترسے تو اسے کبھی کھونا مت کیونکہ وہ تم سے بہت پیار کرتا ہے۔
✠ غلطی تسلیم کرنے اور گناہ چھوڑنے میں کبھی دیر مت کرنا کیونکہ سفر جتنا طویل ہوگا واپسی اتنی ہی مشکل ہو جائے گی۔
✠ اچھے رشتے اور زندگی کے ہمسفر جب بھی روٹھ جائیں تو ان کو منا لینا چاہیے کیونکہ تسبیح جب بھی ٹوٹتی ہے اس کے دانے چن لیے جاتے ہیں۔
ثناء ریاض......منڈی بہاؤالدین

اچھی باتیں
◆ طنز اور بحث سے رشتے کمزور ہو جاتے ہیں

♦ کبھی بھی اپنوں سے ایسی لڑائی نہ لڑنا کہ لڑائی تو جیت جاؤ لیکن اپنوں کو ہار جاؤ۔

♦ بہترین انسان اپنی میٹھی زبان سے جانا جاتا ہے ورنہ اچھی باتیں تو دیواروں پر بھی لکھی ہوتی ہیں۔

♦ رشتے اور رستے زندگی کے دو پہلو ہیں۔

♦ کبھی کبھی رشتے نبھاتے نبھاتے رستے کھو جاتے ہیں اور کبھی کبھی راستوں پر چلتے چلتے رشتے بن جاتے ہیں۔

فریحہ شبیر......شاہ نکڈر

دعا سے بدل جاتی ہے تقدیر

دعا کا موضوع کوئی نیا اور اچھوتا نہیں ہے۔ یہ موضوع اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود انسان قدیم ہے۔ حضرت آدم کو جو رب کریم نے جو دعا سکھائی قرآن میں موجود ہے۔ اس طرح پے درپے باقی انبیاء کی بھی دعا موجود ہے۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ کے ذریعے ہمیں یہ پیغام پہنچایا ہے کہ دنیا کے آخر تک کس طرح سے ہم اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ شریع اصطلاح میں دعا کا مفہوم مدد طلب کرنا ہے۔ دعا بذات خود عبادت کا مقام رکھتی ہے۔ رب کریم نے قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ ”اور تمہارے رب نے فرمایا ہے کہ تم مجھ سے دعا طلب کرتے رہو میں تمہاری دعاؤں کو بقول کرتا رہوں گا۔ یقیناً جو لوگ میری عبادت سے خود سری کرتے ہیں وہ ابھی ابھی ہو کے جہنم میں پہنچ جائیں گے۔“ سورہ المومن۔

یعنی دعا ہمیں اس یقین کے ساتھ مانگنی چاہئے کہ قبول ہوگی اور ہمارا پروردگار ہمیں 80 ماؤں سے بڑھ کر ہم سے محبت کرتا ہے۔ ہم اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہمارا رب ہماری ماضی حال مستقبل سے خوب واقف ہے۔ بعض دعائیں قبول نہیں ہوتی اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ ہمیں پسند نہیں کرتا بلکہ وہ ہمیں ہمارے طلب سے زیادہ بہتر دینا چاہتا ہے۔ ایک مومن کے تمام طاقتوں وسائل کا حاصل توکل اللہ ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے کہ ”آپ فرمادیجئے مجھے اللہ کافی ہے۔ توکل کرنے والے اس پر توکل کرتے ہیں۔ الزمر۔37۔
انسان اپنی نادانی کی وجہ سے جلد بازی کرنے لگتا ہے۔ اور اپنا وجود کو سوچ سمجھ سے خالی کرنے لگتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے توبہ کا دروازہ کھول رکھا ہے اور جس سے بندہ توبہ کرکے اپنا نام نیک لوگوں میں شامل کرسکتا ہے۔ دعا کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان تدبیر بھی کریں مثال کے وطر پر اگر کوئی شخص بیمار ہے تو وہ علاج و معالجہ اختیار نہیں کرتا تو یہ غلط ہے۔ صحت کے ممکنہ اسباب اختیار کرے اور دعا کرے۔ انسان کو دعا ہمیشہ پورے دل کے ساتھ مانگنی چاہئے۔ ایسا نہ ہو زبان سے دعا مانگ رہے ہوں اور دل کسی اور طرف متوجہ ہو۔ حدیث پاک ہے کہ ”غافل اور بے پرور دل والے بندے کی دعا قبول نہیں فرماتا۔“ یعنی ہمیں دعا اس یقین اور اطمینان کے ساتھ مانگنی چاہئے کہ قبول ہوگی اور اگر ہماری مانگی ہوئی دعائیں قبول نہیں ہوتی ہمیں دل برداشتہ شکستہ دل ہونے کے بجائے ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ اللہ ہمیں ہم سے بہتر جانتا ہے اور ہمارے یقین کا تقاضا بھی یہی ہونا چاہئے کہ ہم اللہ کی رضا میں پورے دل سے راضی ہوں۔ بقول علامہ اقبال۔

تقدیر کے پابند جماط و نباتات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

تابندہ جبیں۔کراچی

اچھی باتیں

۞ جس رشتے کو تم نبھا نہ سکو اسے اچھا موڑ دے کر چھوڑ دو۔

۞ دوست جتنا بھی برا ہو اسے نہ چھوڑو کیونکہ گندہ پانی بھی آگ بجا سکتا ہے

۞ آسمان پر نظر ضرور رکھو مگر یاد رہے کہ پاؤں زمین پر ہی رہے۔

سمیرا جمیل۔دولتالہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

خوشبوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

غزل

بول اک سالار کے ملکہ کی آنکھیں بھر چلے
آپ اپنی راہ ناپیں ہم تو اپنے گھر چلے
چاندشب ہے مہ جبینوں کی گلی میں بیٹھا ہوں
آئے کوئی رنجبی جو دستاں سن کر چلے
تیرے ہاتھوں پر ہمیں بیعت بہت مہنگی پڑی
قتل تیرے نام کا ہم سر پہ اپنے دھر چلے
کیا بنے گا اے مرے رب ان غریب اولادوں کا
ورثے میں دے کر یتیمی باپ جن کے مر چلے
چلمنوں کی اوٹ میں تھیں ہیولوں کی گردنیں
سر بریدہ خواب میرے، دیکھ کر اندر چلے
منحصر اب نسل نو پر کارواں کے خواب ہیں
رہبرِ کوئی نہ اب ہموار رستوں پر چلے
ہم رقابوں، ہم نشینوں، مخلصوں کی خیر ہو
دوستی کے نام پر جو ہاتھ ہم سے کر چلے

سیف خان سیف

غزل

میں اپنا آپ کہیں چھوڑ کر چلا جاؤں
مجھے تو لگنے لگا خود سے ڈر، چلا جاؤں
عجیب وہم و گماں میں، ہے زندگی میری
مجھے بتاؤ میں ٹھہروں یا گھر چلا جاؤں
تو کیا سفر مرا ٹھہرا ہے رائیگاں تم تک؟
تو کیا بنو گے نہیں ہمسفر، چلا جاؤں؟
تمام لوگ ہی مصروف. آ رہے ہیں نظر
کوئی تو مجھ کو بتائے، کدھر چلا جاؤں؟
قضا کی ہوتی نہیں اور منتیں مجھ سے
سو آ بھی جاؤ تمہیں دیکھ کر چلا جاؤں

زبیر قیصر......

غزل

بادشاہوں نہ گداؤں کا حوالہ دے کر
رزق ملتا ہے مجھے ہاتھ کا چھالا دے کر
شعبدہ گر کو تماشہ کے عوض حیرت دی
اور حیرت کو بھی عبرت کا ابالا دے کر
یہ عجب سوداگری ہے کہ خریداروں کو
تیرگی ملتی ہے بدلے میں اجالا دے کر
یار غدار نہیں ہوں مری تذلیل نہ کر
یار ہنستے ہو مجھے دیس نکالا دے کر
وقتِ ہجرت کہا بابا نے پلٹنا ہے مجھے
جیب میں چابیاں اور ہاتھ میں تالا دے کر
یوں تو گندم کی کٹائی کے ہیں ایام مگر
آسماں ہنستا ہے دہقان کو ژالہ دے کر

وقاص اکمل جام......

نظم

کشمیر جل رہا ہے
مسلم دنیا سو رہی ہے
ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے
مودی اور ٹرمپ
دیکھ رہے ہیں ہم
کون ہے ثالث؟
پاکستان کیا کر رہا ہے
کشمیر میں 80 لاکھ
بھوک اور بیماریاں
انسان کھا رہی ہیں
عزتیں لٹ رہی ہیں
بوڑھے تڑپ رہے ہیں
کون لائے دوا ان کی
فیڈر میں دودھ نہیں
بچے سسک رہے ہیں
موت کی وادی میں جا رہے ہیں
اب خاموش رہنے کے
آرام کرنے کے دن نہیں
تو ہی بتا ہمیں مسلمان
ہم کیا کر رہے ہیں آخر
مسلم امہ سو رہی ہے
پاکستان کیا کر رہا ہے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کشمیر جل رہا ہے

شاعرہ: سعیدہ

انتخاب: محمد اکرام الحق گتر...... جہلم

غزل

غبار راہ کی طرح گرد کارواں کی طرح
بہت ہمراہوں کسی شخص بے اماں کی طرح
اندھیری رات کے صحرا سے ہم گزر آئے
تمہاری یاد کی کرنیں تھیں کہکشاں کی طرح
کھلا نہ ایک بھی گل شاخ آرزو پہ مری
بہار کا بھی زمانہ رہا خزاں کی طرح
چمن فروش اسے تم کہو جمال مگر
سمیٹے پھول وہ بیٹھا ہے باغباں کی طرح

شاعر: سمیع جمال

انتخاب: پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر

غزل

جہاں میں جس سے تھی زندگانی میری
بھولے سے اس نے قدر نہ جانی میری
یوں جل کے راکھ ہو گئے آخر ہم
آ کے گزر گئی پھر شام سہانی میری
کسی نے توڑ دیے پیار کے بندھن سارے
واپس کردی تو نے پھر نشانی میری
گزرے دنوں کی بات نہ کر میرے ہمسفر
اداس دل کی تھی پھر یہ کہانی میری
جا کے کوئی پلٹ کے آتا نہیں کبھی
اندھیروں میں لٹ گئی، جیسے جوانی میری
بیت گیا جیون تو احساس ہوا جاوید
دل سے میرے اب جاتی نہیں پریشانی میری

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد

غزل

جیسے پابند سلاسل کسی زنجیر کے ساتھ
کچھ مٹے لفظ بھی آئے تیری تحریر کے ساتھ
چھو لیا جب کسی مہکی سی ہتھیلی نے اسے
رقص ہونٹوں نے کیا تھا تیری تصویر کے ساتھ
کیا ہوا شہر جو سارا تھا مخالف مخالف اس کا
دل فتح ہوتا ہے کب طاقت شمشیر کے ساتھ

میری غزلوں میں جو یہ کرب چھپا بیٹھا ہے
گویا نسبت ہے میری میر تقی میر کے ساتھ
میرے مولا نے جو مجھے فن کی نعمت بخشی
مجھ کو ہے پیار ہما میری اسی جاگیر کے ساتھ

شاعرہ: ہما شاہ

انتخاب: افضل شاہ...... بہاولنگر

بغاوت

میں خود پریشان ہوں
کہ میرے ہاتھ کی لکھی کہانی
مجھ سے باغی ہے
میں ہی تھا جو غم کے
دور افتادہ جزیروں پر
یونہی بکھرے ہوئے
بے نام چہروں کو اٹھا لایا
انہیں سوز دردوں کی آنچ دے کر
زندگی بخش
انہیں اپنی کہانی کے
سبھی کردار دے ڈالے
تراشیدہ یہ پیکر بھی میرے ہیں
مگر کیسا تعجب ہے
کہ یہ بے جان سے پتلے
یہ ناشکرے
وفا کی ریت کے منکر
مجھ سے باغی ہیں
میں نے انہیں کچھ راستوں پر
گامزن رہنا سکھایا تھا
بنایا تھا
کہاں کس موڑ پر ان کو
قدم کیسے اٹھانا ہے
کہاں پر بولنا ہے
اور کہاں خاموش رہنا ہے
کہاں سر کو جھکانا ہے
کہاں گردن اٹھانی ہے
میں خود بھی حیران ہوں
کہ اب کردار میرے ہیں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

نہ اب میری کہانی ہے
مناظر میں تعبیر ہے
خونخوار آنکھیں ہیں
گلی کوچوں میں سناٹا
جہاں میں نے لکھا تھا وہاں
ہجوم سرکشاں بڑھتا ہی جاتا ہے
میں ششدر رہوں
کہ جن ذہنوں کو
میں نے بانجھ لکھا تھا
اب ان میں خواب پلتے ہیں
جنہیں خاموش رہنا تھا
وہ اب آتش اگلتے ہیں
جو بے آواز سے لہجے
کہانی میں پروئے تھے
کڑکتی بجلیاں ان میں
اچانک جاگ اٹھی
میں اب ہراساں ہوں
کہ سب کردار باغی ہیں
کہانی بھی
کہانی کا نتیجہ بھی
اب میرے بس سے باہر ہے
مجھے ڈر ہے
یہ سب کردار مل کر
اس کہانی کو
کہیں وہ موڑ نہ دے دیں
کہ جس کے ایک تصور سے ہی
میرا دل لرزتا ہے

دستگیر شہزاد......ٹوبہ ٹیک سنگھ

غزل

سفرِ فرقت مزید ہے سائیں
پھر بھی قائم امید ہے سائیں
درد تو روز کا تماشہ ہے
آج لیکن شدید ہے سائیں
چاند مجھ کو نظر نہیں آیا
کیسے کہہ دوں کہ عید ہے سائیں
مجھ کو تو ہی مایوس کرتا ہے
تو ہی میری امید ہے سائیں
اب نہ بیعت کسی کا ہو گا یہ
دل تمہارا مرید ہے سائیں
تم نہیں ہو تو پھر محرم ہے
تم اگر ہو تو عید ہے سائیں
یہ جو لوگ ہر روز مرتے ہیں
ان میں کوئی شہید ہے سائیں؟
مجھ کو فرقوں سے کچھ نہیں مطلب
میرا مسلک توحید ہے سائیں
رابطے خود ہی تم نے توڑ دیے
ورنہ دورِ جدید ہے سائیں

تفسیر بابر......

غزل

دیواروں کے کان ہوتے ہیں
صورت میں انسان ہوتے ہیں
بعض عمل میں انساں کے
روپ میں بھی شیطان ہوتے ہیں
پیر پڑوسی، دل اور پنڈت
ملا کیوں بے ایمان ہوتے ہیں
چپ کی کوکھ میں پلنے والے
فطرت میں طوفان ہوتے ہیں
رہبر، رستے اور ارادے
منزل کی پہچان ہوتے ہیں
وقت کڑے میں کام ہیں آتے
دوست وہی انسان ہوتے ہیں

مختار حسین......

نظم

پیاسے موسم میں
اب کی خواہش بن کر
تیرے دل میں اتروں
تم کو سیراب کر جاؤں
تمہاری ویران راتوں میں مہکوں
تمہاری نیندوں کو مہتاب کر جاؤں
اپنا آپ پانے سے پہلے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

جند تمہارے نام کر جاؤں
صرف تتلیاں میری قبر پر
پکڑنے کے لیے وقت تیرے نام کر جاؤں
ناہید غفور......گنگا پور

غزل

کوئی چراغ سرِ راہ گزر نہیں ملتا
عجیب سفر ہے کوئی ہمسفر نہیں ملتا
کڑکتی دھوپ ہے چاروں طرف میرے سر پر
کہیں بھی راہ میں کوئی شجر نہیں ملتا
تمام عمر مشقت اٹھانا پڑتی ہے
کسی کو بیٹھے بٹھائے ہنر نہیں ملتا!
وہ جس کے خون سے ہوتا ہے گلستاں سیراب
کسی شجر کا بھی اس کو ثمر نہیں ملتا
کسی کو دیتی ہے دنیا ہر ایک آسائش
کسی کو جینے کا حق بھی مگر نہیں ملتا
دیارِ شعروادب ہے حکیم سلجھا ہوا
کوئی بھی شخص یہاں بے ہنر نہیں ملتا
حکیم خان حکیم

غزل

اپنے دکھ درد محبت کے حوالے ہوتے
اس نے ملنے کے اگر رستے نکالے ہوتے
وہ اگر غم کے حصاروں سے بچاتا خود کو
پھر یہ کمروں میں کہاں درد کے جالے ہوتے
اس کی قسمت میں اندھیرے ہی اگر لکھے تھے
اس کے زخموں سے کہیں کچھ تو اجالے ہوتے
اپنی اولاد کی خاطر ہی اگر جینا تھا
پھر محبت میں نئے روپ نہ پالے ہوتے
وہ اذیت میں مجھے چھوڑ گیا تھا راشد
ورنہ اس در پہ کبھی آج نہ تالے ہوتے
راشد ترین......مظفر گڑھ

امریکہ کوئی شاہکار نہیں......!

زمین ہموار نہیں
موسم کا اعتبار نہیں
آسان روزگار نہیں
ستا بازار نہیں
لوگ وضع دار نہیں
خرافات سے بیزار نہیں
اولاد پر اختیار نہیں
خلوص سے ہمکنار نہیں
عورت وفادار نہیں
مذہب سے سروکار نہیں
بدلنے کو تیار نہیں
خدا کے شکر گزار نہیں
غذا مزے دار نہیں
قورمے میں تار نہیں
حسن پردہ دار نہیں
لیڈروں کی بھرمار نہیں
غرض یہ کہ امریکہ کوئی شاہکار نہیں
عقیلہ بتول......چیچہ وطنی

غزل

اس نیلے آکاش کی گہرائی میں کھو جاؤں میں
تپ کر ہجر میں تیرے، ساجن کندن ہو جاؤں میں
میرے اپنے لوگ بھلا کیوں دور ہوئے جاتے ہیں
دل تو چاہے ان سب کو مالا میں پرو جاؤں میں
دکھ میں غم میں، تھکی ہوئی ہوں، پاؤں میں چھالے ہیں
ماں! کچھ دیر تیری گود میں سر رکھ کر سو جاؤں میں
جب بھی ساون کے بادل برسائیں، ڈھیروں اداسی
اتنا برسیں آنکھیں کہ ساون کو بھگو جاؤں میں
برسوں سے میں قید ہوں تیرے ہجر کے زندانوں میں
روشانے اب چاہوں غم سے پاک ہی ہو جاؤں میں
روشانے سبعین......فیصل آباد

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

عشق پیچاں

قرۃ العین سکندر

سحر و جادو، روحانی طاقت، سنسنی خیز واقعات، دلوں کی دھڑکن بے کیف کر دینے والی ایک اچھوتی کہانی

خیر و شر کے مابین ایک انمٹ لکیر کھینچتی ہوئی ایک تحریر، جس میں خونی رشتوں اور تعلقات و روابطِ عامہ کو ایک منفرد لڑی میں پرو کر باہم جانچا و پرکھا گیا ہے۔ "خیر" پر یہ احسان و انعام رہا ہے کہ ازل سے لے کر آج تلک وہ ایک ایک شر پر فوقیت لے جاتا رہا ہے اور یہ بھی طے ہے کہ تا قیامِ حشر، شر کی تمام ترشر انگیزیوں کے باوجود آخرش فقط خیر ہی کے پھول کھلیں گے۔ یہ ایک جنگ ہے جو انسان کو سونے کی مانند تپا کر کندن بنا دیتی ہے۔

یہ کہانی درحقیقت متجسس پیرایہ، مافوق الفطرت کرداروں، بالائے فہم محسوسات، جادوئی واقعات اور ماورائے عقل قصائص کی ایک مضبوط کڑی ہے جو کھرے ترین مشاہدات و بیانات کے ذریعہ سے ہمارے عمومی معاشرتی روّیہ جات کا احاطہ کرتی ہے۔ کہیں اس میں سوالیہ نشان بھی ہے لیکن اختتام میں ہر ہر سوال کا تشفی بخش جواب ملے گا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

رشتوں کی بنتی ٹوٹتی زنجیر، دو بہنوں کی کہانی، عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کا سفر طے کرتی ایک منفرد کہانی

"کہاں سے آرہے ہو۔ شادی میں دن کم رہ گئے ہیں۔ کب سے کہہ رہی ہوں شادی کی تیاری میں مدد کرواؤ۔ ایک وہ دری ہے وہ آج بھی کالج گئی ہے اتنا نہ ہوسکا کہ میرے ساتھ شاپنگ کرنے ہی چلی جائے۔"

آصفہ بیگم نے نروٹھے پن سے کہا تو حسن سر کھجا کر رہ گیا تھا۔

"امی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مگر میرا ایک دوست امریکہ سے آیا ہوا ہے۔ سب دوستوں نے اس سے ٹریٹ مانگی تھی۔ اب کل سے آپ جہاں کہیں گی میں ساتھ چلنے کو تیار ہوں بلکہ ساتھ میں ڈرائیوری کے فرائض بھی مابدولت خود تندہی سے ادا کریں گے۔ اب خوش نا۔"

حسن نے مسکراتے ہوئے ماں کے دونوں ہاتھوں کو چہرے سے لگا کر بوسہ دیا تھا۔

اس کے اس انداز پر آصفہ بیگم مسرور ہوئی تھیں۔ کوئی بھی ماں کہاں اپنے بچوں سے خفا رہ سکتی ہے۔ جب بچے اس قدر محبت کا اظہار اپنی ماں سے کریں۔ اس وقت وہی کیفیت آصفہ بیگم کی بھی تھی۔ تبھی عقب سے دری تھکی ہوئی کالج سے لوٹی تھی۔ تمازت سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ گلاب چہرے پر سرخی سی چھائی ہوئی تھی۔

"السلام علیکم امی جان۔" وہ بیگ ایک جانب صوفے پر اچھالتے ہوئے بیڈ پر ڈھے سی گئی تھی۔

"بھوک لگ رہی ہوگی۔ نوری سے بولو کھانا لگا دے میں نے بھی ابھی تک تمہارے انتظار میں کھانا نہیں کھایا ہے۔ ایک تو خیر سے کھا کر آ گیا ہے۔ اب تم بھی نہ کہنا کہ کھانا نہیں کھانا۔" آصفہ بیگم نے خشمگیں نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی تھی۔ آصفہ بیگم کے لہجے میں واضح خفگی جھلک رہی تھی۔

"اوہ میری پیاری امی آپ نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟" وہ ایک دم سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

صبح ہلکا سا ناشتہ کرنے کی وجہ سے اسے بھوک لگ

رہی تھی۔ اور اس نے کالج میں ہما کے ساتھ کھانا کھالیا تھا۔ کینٹین سے کڑاہی گوشت کے ساتھ نان سے لطف اٹھایا تھا۔ اب بھوک کا نام ونشان تک نہ تھا۔ مگر آصفہ بیگم کی تولتی نگاہیں دیکھ کر وہ سنبھل چکی تھی۔

"چلیں امی جلدی سے کھانا کھاتے ہیں۔ واقعی بہت بھوک لگ رہی ہے۔"

اور پھر تھوڑی دیر بعد نور ہی خانساماں نے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا چن دیا تھا۔ بریانی دیکھ کر اب دری کی بھوک بھی چمک اٹھی تھی۔ وہ بول زیادہ رہی تھی اور کھا کم رہی تھی اور اس کا مقصد صرف اتنا سا تھا کہ آصفہ بیگم پیٹ بھر کر کھانا کھالیں۔ اور واقعی دن بھر کی روداد سناتے ہوئے اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب بھی رہی تھی۔ آصفہ بیگم نے جیسے ہی کھانا کھایا وہ اتنی دیر بیٹھی جو صرف چمچ ہلا رہی تھی۔ اس نے خاموشی سے چمچ پلیٹ میں دھر دیا تو آصفہ بیگم نے اسے ٹوک دیا تھا۔

"اب میں اتنی بھی ناسمجھ نہیں ہوں۔ خوب سمجھتی ہوں، کیا کھایا تھا یونیورسٹی میں صاف، صاف بتاؤ۔"

آصفہ بیگم کے ٹوکنے پر اس کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

"کڑاہی گوشت۔" اس نے مسکینی صورت بنا کر کہا تو ماں بیٹی دونوں ہنس دی تھیں۔

"بھائی صاحب میں تو کہتی ہوں کہ حسن کی عین شادی کے دن ہم باقاعدہ دری اور زریاب کی منگنی کی رسم کر دیتے ہیں یوں بھی چند مہینوں بعد دری پڑھائی سے فارغ ہوجائے گی۔ پھر رخصتی کے لیے دن رکھ دیں گے کوئی اچھا سا۔"

ریحانہ بیگم نے بلال صاحب کو کہا تو بلال صاحب نے ایک گہری نگاہ اپنے دائیں جانب بیٹھی آصفہ بیگم پر ڈالی تھی۔ پھر ہنکارا ابھرا تھا۔

"دیکھو ریحانہ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ زریاب اور دری کا رشتہ ہم نے برسوں پہلے ہی طے کرلیا تھا۔ اور مجھے اس سے انکار بھی نہیں ہے۔ مگر اچھا ہوگا کہ اس تقریب کا انعقاد ہم شادی کے بعد رکھ لیں کیونکہ ہم دو، دو ذمہ داریوں میں بٹ جائیں گے۔ پہلے بیٹے کی شادی ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہیں کوئی کمی بیشی نہ رہ جائے۔ پھر دری بھی جی کھول کر ساری رسموں میں شرکت کرسکے۔ تم سمجھ رہی ہوناں۔" بلال صاحب نے ٹھنڈے لہجہ میں کہا۔

آصفہ بیگم کو بھی ان کی رائے سے اتفاق کی وجہ سے مطمئن سی ہوگئی تھیں۔ ورنہ حسن کے ساتھ ساتھ ان کو دری کے لیے بھی سب انتظامات کرنے پڑتے۔ اور پھر وہ دری کو اتنی جلدی رخصت کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار بھی نہ تھے۔ منگنی کے لیے آمادگی کا واضح مطلب یہ ہوتا کہ جلد ہی رخصتی کا بھی تقاضا کردیا جاتا۔ زریاب اور دری بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھ نام کی حد تک منسوب تھے۔ مگر یہ بات صرف بڑوں کے درمیان تھی زریاب اگرچہ گاہے بہ گاہے اپنی چاہت کا اظہار بھی کرتا رہا تھا مگر اس کے باوجود یہ بات صرف زبانی کلامی تھی۔ کوئی حتمی طور پر بات طے نہ ہوسکی تھی۔

"ٹھیک ہے بھائی صاحب آپ مجھ سے بڑے ہیں۔ میرے لیے آپ کی رائے بے حد معتبر ہے۔ جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ مگر شادی کے فوراً بعد میں زیادہ دن تک انتظار نہیں کروں گی۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ میرے اپنے بیٹے کی شادی کے ارمان بھی جلد پورے ہوں گے۔"

ریحانہ بیگم نے بھی دھیمے لہجہ میں بلال صاحب کی بات سے اتفاق رائے کیا تھا۔ تبھی ہنستی کھلکھلاتی ہوئی دری اور گل افشاں آئی تھیں۔ گل افشاں اور دری کسی بات پر ہنس رہی تھیں۔ ریحانہ بیگم نے ایک محبت بھری نگاہ اپنی بیٹی اور بھتیجی پر ڈالی تھی۔ دری ان کی بھتیجی تھی اور گل افشاں ان کے اپنے آنگن کا مہکتا گلاب تھی۔

"امی دیکھیں ناں گل افشاں کہہ رہی ہے کہ وہ عین مہندی پر ہی گھر آئے گی۔ جبکہ ہم نے تو ابھی تک اچھے اچھے گانوں کی پریکٹس بھی کرنی ہے۔"

دری کا انداز التجی سا تھا۔ آصفہ بیگم نے محبت پاش نگاہوں سے اپنی بے حد خوبصورت بیٹی کو دیکھا تھا۔

دودھ یا موم مجسمے جیسی جو چھونے سے بھی میلا ہوجائے۔ ہونٹوں کا کٹاؤ بے حد دلکش تھا۔ سادہ بھنورا آنکھیں شرارت لیے تھیں۔ اس کا فسوں خیز حسن ہر دوسری نگاہ میں سمٹ جاتا تھا۔ وہ انتہائی شفاف خیالات اور نہایت ہمدرد دل کی مالک لڑکی تھی۔ انتہائی قابل اور

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اعلیٰ تعلیم یافتہ کہ سارے خاندان میں اس کی ان خوبیوں کا متعارف تھا۔ سب کی ہی یہی خواہش تھی کہ درشہوار ان کی ہے۔ مگر درشہوار کو بچپن میں ہی زریاب کے نام سے منسوب کر دیا گیا تھا۔ کچھ ان کہی سی باتیں زریاب اور دری کے درمیان تھیں جو صرف، نگاہوں کی زبان سے ادا ہوتی تھیں۔

"آجائے گی گل افشاں تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔ میں کل ہی بھجوادوں گی۔ اب خوش.....تم آؤ ادھر میرے پاس بیٹھو۔"

ریحانہ بیگم نے محبت سے درشہوار کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ خاندان بھر میں دری کے طلبگار تھے۔ بلکہ اس کے علاوہ بھی اس کے بے شمار رشتے عزیز و اقارب ملنے جلنے والوں کی جانب سے مسلسل آرہے تھے۔ اس کی خبر اور بھنک اب ریحانہ بیگم کے کانوں میں بھی پڑ چکی تھی۔ اس لیے انہوں نے فوری طور پر اپنے بڑے بھائی کو اپنا سابقہ وعدہ یاد دلایا تھا۔ اور جتلا بھی دیا تھا۔ اور کیا خوبی سے معاملہ فہمی سے بات بھی ہوگئی تھی۔ صرف یہی نہیں تھا۔ درشہوار بے پناہ دولت کی بھی مالک تھی۔ حسن اور درشہوار دو ہی تو بھائی بہن تھے۔ اس لیے اس کے حصے میں جائیداد کا ایک وسیع حصہ آنا بھی ایک یقینی امر تھا۔ وہ ایک بے حد معزز اور اعلیٰ خاندان کی سحر انگیز شخصیت کی مالک لڑکی تھی۔ اس کا مغرور ہونا بھی بنتا تھا۔ مگر وہ اتنی ہی انکسار پسند تھی بلکہ جب بھی اسکول کالج میں اس کے حسن جاوداں کے چرچے ہوتے تھے، تو وہ باقاعدہ زچ ہوجاتی تھی۔ وہ زندگی سے اس قدر بھرپور لڑکی تھی کہ اسے رنگوں سے کھیلنا پسند تھا۔ وہ فائن آرٹس جیسے سبجیکٹ پڑھ رہی تھی۔ وہ بے حد خوبصورت تصاویر اس مہارت سے پینٹ کیا کرتی تھی کہ سب دنگ رہ جاتے تھے۔ یہ اس کا واحد شوق تھا جسے وہ جنون کی حد تک لے گئی تھی۔

☆☆☆☆

"ارسل بیٹا یہ کیسی ضد ہے بعد میں بھی تو کسی مناسب وقت میں اس لڑکی سے اس کے گھر والوں سے ملاقات کی جاسکتی ہے۔ یوں عین شادی کے موقع پر میں یوں بھی ان سے کیا بھلا بات چیت کرتی پھروں گی۔" روشنی بیگم نے سخت بروختہ ہوتے ہوئے کہا تھا۔ ان کا موڈ بے حد آف تھا۔ کیونکہ ارسل کا تقاضا تھا کہ وہ عروش اور اس کے اہل خانہ کو اپنی بہن شنزاء کی شادی میں انوائیٹ کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ روشنی بیگم ایک مرتبہ عروش اور اس کی فیملی سے ملاقات کرلیں۔ روشنی بیگم اس کے اس اصرار سے سخت نالاں تھیں۔ مگر کیا کرتیں کہ جوان اکلوتے بیٹے کی خوشی کو بھی قبول کرنا پڑتا تھا۔

"امی دراصل میری ملاقات وقار صاحب سے ہو چکی ہے ان کے آفس میں انہوں نے مجھے ملاقات کے لیے بلایا تھا۔ پھر اس طرح باتوں ہی باتوں میں میرے منہ سے نکل گیا کہ میری بہن شنزاء کی عنقریب شادی ہے۔ اس کے بعد امی کو باقاعدہ رشتہ کی غرض سے بھیجوں گا۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا کہ پھر ہمیں بھی تو مدعو کرو اس شادی میں۔ اس لیے امی مجھے ان کو ہاں کرتے ہی بنی۔ یوں بھی امی عروش اس گھر میں آئے گی تو میں بھی اس دن اس کو دیکھ لوں گا۔ وہ بھی آپ کو شنزاء کو ہمارے ماموں کو جانچ لے گی۔ پھر اب تو میں دعوت دے چکا ہوں۔"

آخری جملہ اس نے سر کھجاتے ہوئے ادا کیا تھا۔

پہلی مرتبہ روشنی بیگم کے چہرے پر نرمی کے تاثرات در آئے تھے۔ ابھی تو روشنی بیگم کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ساری کھچڑی پکائی ہوئی ان کی اپنی ہی بیٹی شنزاء کی تھی۔ شنزاء اور عروش کلاس فیلو اور گہری دوست تھیں۔ کالج سے واپسی پر جب ارسل شنزاء کو لینے جاتا تھا وہیں عروش کے رعب حسن کا بھی دیوانہ ہوگیا تھا۔

ارسل کے والد بیرون ملک مقیم تھے۔ اور انہوں نے کافی مالیت کی یہاں اراضی خرید لی تھی۔ یہی نہیں یہاں ارسل کو باقاعدہ طور پر بزنس سیٹ کر کے دیا تھا۔ اور اس وجہ سے ہی عروش نے شنزاء سے کچھ عرصے میں ہی گہری دوستی گانٹھ لی تھی۔ کیونکہ اسے دولت مرعوب کرتی تھی۔ پھر جب ارسل کی نگاہوں میں محبت کے دیپ جلتے ہوئے دیکھے تو پھر وہ مزید متاثر ہوگئی تھی۔ پھر ارسل کی محبت پر لبیک کہہ کر اس نے محبت کے راستے از خود کھول دیئے تھے۔

اب ارسل بھی عروش کے لیے باقاعدہ سنجیدہ سا ہوگیا تھا۔ اس لیے ماں کے سامنے اصرار کر رہا تھا۔ روشنی بیگم نے بالآخر اس کے حق میں فیصلہ کر دیا تھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

”ٹھیک ہے ارسل تم بلالو۔ لیکن اس ملاقات کو صرف آغاز ہی سمجھنا کوئی حتمی رائے قرار نہ دے دینا۔ میں بعد میں مکمل تسلی کروں گی۔ ان کے گھر بھی جاؤں گی۔ اور اپنے گھر بلا کر بھی تفصیلی ملاقات کرنا چاہوں گی۔ یوں رشتے ہواؤں میں طے نہیں کیے جاتے یہ زندگی بھر کا معاملہ ہوا کرتا ہے۔ نہ ہی زندگی بھر کا ناطہ یوں سرراہ اچانک ہی طے ہوجایا کرتا ہے۔ سوچا جاتا ہے پرکھا جاتا ہے اس کے بعد ہی میں اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے کوئی فیصلہ لوں گی۔“

یوں روشنی بیگم کی ہاں سے رسل کے دل میں محبت کی کلی مزید پروان چڑھنے لگی تھی۔ اس کا باقاعدہ عروش سے ٹیلی فونک سلسلہ جاری وساری تھا۔

اس نے اس وقت عروش کا نمبر ملایا اور سیدھا اپنے کمرے میں بیڈ پر نیم دراز ہوکر اس کی کال کے جواب کا انتظار کرنے لگا تھا۔ بیل مسلسل جارہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی عروش کی مہکتی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

”کیا بات ہے بہت یاد ستا رہی ہے؟“

ارسل نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا تھا۔

”بالکل یہی سمجھ لو۔ دراصل میں نے تمہیں یہ بتانے کے لئے کال کی ہے کہ شادی پر اچھا سا تیار ہوکر آنا۔ ایسا نہ ہو کہ امی اپنا ارادہ بدل لیں۔“ وہ اسے سراسر چھیڑتے ہوئے بولا تھا۔

”اوہ تو فائنلی تمہاری مام نے حامی بھر ہی لی۔ ٹھیک ہے اور تم فکر مت کرو۔ عروش کو ہزاروں میں منفرد نظر آنے کا ہنر معلوم ہے۔“ عروش کی فخر میں ڈوبی آواز سنائی دی تھی۔

ارسل مسکرا دیا تھا۔ اسے عروش کا یہی انداز تو اپنی جانب مائل کرتا تھا۔

”اچھا ایسا ہے کہ میں تم سے کچھ دیر بعد میں بات کرتی ہوں۔ اس وقت میں مام کے ساتھ شاپنگ پر جارہی ہوں۔“ عروش نے تیز لہجہ میں کہہ کر کھٹاک سے جواب سنے بنا ہی فون رکھ دیا تھا۔

❖❖❖❖❖

اونچی حویلی کی بلند قامت دیواریں منقش شدہ پروسیع وعریض حویلی اپنی روحانیت کی بدولت نہ صرف تمام قریبی گھروں میں مقبول تھی بلکہ اس کے علاوہ بھی قرب وجوار تک اس کی شہرت تھی۔ شام کے ملگجے سائے میں اس وقت حویلی کے مردان خانے میں سوالیوں کا ایک جم غفیر جمع تھا۔ سب اپنی اپنی مشکلات کے حل کے لیے یہاں تانتا باندھے بیٹھے تھے۔ بھانت بھانت کے چہروں والے لوگ اپنی اپنی زندگیوں کے دکھوں میں مبتلا ان کے حل کے لیے ایک آس لگائے بیٹھے تھے۔

پیر شاہ کمال بخت صاحب نماز عصر کے بعد سے اس وقت اپنے کمرہ خاص میں سب کی عرضیاں سن رہے تھے۔ اپنی دانست میں جس قدر ممکن تھا سب کی بہتری کے لیے وظائف لکھ کر دے رہے تھے۔ اسی وقت ایک شخص اپنی بیوی کے ہمراہ حاضر ہوا تھا۔ اس شخص نے عقیدت سے قدرے سر جھکا کر تعظیمی سلام کیا تھا۔ جسے پیر کمال شاہ بخت نے قدرے ناگواری سے دیکھا تھا۔

”اے ذی نفس۔ رب العالمین کے سوا کسی کے سامنے کبھی تیرا سر نہ جھکے وہی سب سے بلند و برتر ہستی ہے۔ اس کی وحدانیت اس بات کی متقاضی ہے کہ صرف اس کے سامنے ہی سربسجود رہو یہ سر کبھی کسی انسان کے سامنے نہ جھکنے پائے۔“ ان کا لہجہ جلالی تھا۔ وہ شخص گھبرا کر مؤدب سا ہوکر دوزانو بیٹھ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بیوی بھی بیٹھ گئی تھی۔

پیر کمال شاہ نے ہاتھ کے اشارے سے بولنے کا عندیہ دیا تھا۔ اور وہ شخص اپنا گلا کھنکار کر بولا تھا۔

”شاہ بابا میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری اولاد نہیں ہوتی ہے۔ میری شادی کو دس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ یہ نمانی ضد کررہی تھی کہ چل شاہ بابا کے آستانے پر حاضری دیتے ہیں۔ وہاں جاکر سب کے درد دور ہوجاتے ہیں۔ یہ بھی بڑی آس لاکر یہاں آئی بیٹھی ہے۔“

وہ شخص عقیدت مندی سے بولا تھا۔ پیر کمال شاہ نے ایک گہری نگاہ اس شخص کے چہرے پر ڈالی تھی۔ اس سے قبل ان کی توجہ ایک پل کے لیے بھی اس شخص کے چہرے پر مرکوز نہ تھی۔ بلکہ ان کی ساری توجہ تسبیح کے دانوں پر تھی۔ بس وہ ایک نظر کی بات تھی جب ان کی ایک گہری نگاہ اس شخص کے آر پار اترنے لگی تھی۔ تسبیح کے مسلسل گردش کرتے دانے ان کے ہاتھوں میں لمحہ بھر کے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

لیے تھم سے گئے تھے۔ چہرہ پر جلال سا ہو گیا تھا۔ سرخی چھا گئی تھی۔ ناگواریت ان کے چہرے سے واضح طور پر عیاں تھی۔ حالانکہ وہ ایک نہایت شفیق اور مہربان ہستی تھی۔ ان کی نرمی و شفقت کی مثال لوگ دیتے تھے۔ مگر اس وقت وہ نرمی مفقود تھی۔ اس کی جگہ غیض و غضب نے لے لی تھی۔ وہ ایک دم گہری بھاری آواز میں گویا ہوئے تھے۔

''سنو خاور حیات۔ وہ رب بے پناہ رحم کرنے والا ہے۔ تم نے دن رات رو کر گڑگڑا کر اس کے حضور سجدے کیے۔ تمہاری بیوی نے منتیں مرادیں مانگیں۔ نفلی روزے بھی رکھے۔ مگر تمہاری بیوی کی گود ہنوز سونی رہی ہری نہ ہو سکی۔ خاور حیات تم نے کیسے ایک ننھے لڑکے پر ظلم ڈھائے تمہیں یہ سب کیوں دکھائی نہ دیا۔ وہ ننھا سا لڑکا جو کوئی غیر نہیں تمہارا ہی خون ہے۔ تمہارے مرحوم بھائی کا بیٹا ہے۔ تمہاری شفقت توجہ اور محبت کا طلبگار ہے۔ مگر تم نے اپنے بھائی کی اولاد کی ساری جائیداد ہتھیالی۔ اور یہ ظالم عورت جسے تو اپنی بیوی کہتا ہے اس ننھے بچے سے جلاد کی طرح کام لیتی ہے۔ مارتی ہے۔ پیٹتی ہے۔ جا خاور حیات پہلے تو بخشش طلب کر۔ اپنے رب کے سامنے سربسجود ہو کر اپنے گناہوں کا اعتراف کر۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ یتیم کے سر کی چادر چھین کر تو سائے میں رہے گا۔ ارے جھلستی دھوپ تجھے کملا کر رکھ دے گی۔ نادم ہو اور اس بچے سے معافی مانگ۔ اپنی اصلاح کر۔ اس کے بعد رب راضی ہوا تو اس کی عنایت ہوگی۔ اس کے کرم کی بارش برسے گی۔ ورنہ تیرا انجام بہت برا ہوگا۔''

پیر کمال شاہ بخت کی آواز میں شدید اشتعال اور غم و غصہ تھا۔ اور خاور حیات دم بخود منہ کھولے بیٹھا تھا۔ اس نے سنا تو تھا کہ وہ ایک پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ ایک ہی نظر میں دل کا سارا احوال بیان کر دیتے ہیں۔ مگر اس کے دل کے اندر باہر کا سارا عالم انہوں نے کیونکر جانا یہ اس کے لیے ایک معمہ ہی تھا۔

وہ بے حد تفکر زدہ سا پیر کمال کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ چہرے پر تشویش تھی۔ بیوی بھی تھر تھر کانپنے لگی تھی۔ اسے یاد آرہا تھا کہ کیسے اس نے اپنے شوہر کو مرحوم بھائی کی اولاد پر ظلم ڈھائے اور ساری جائیداد ہتھیانے کا کہا تھا۔

وہ دن رات اس لڑکے کو پیٹتی تھی۔ ٹھٹھرتی راتوں میں خود نرم گرم لحاف میں سوتی تھی۔ جبکہ اس لڑکے کو دالان میں چارپائی پر ٹھنڈ میں سلایا جاتا تھا۔ ایک ایک کر کے ظلم و ستم کے سارے مناظر اس کی اپنی نگاہوں میں گھوم کر رہ گئے تھے۔ وہ لہرا کر پیر کمال شاہ کے پیروں میں گر گئی تھی۔

''بی بی جاؤ یہاں سے اپنے ساتھ ساتھ میرے پاؤں میں گر کر چھو کر مجھے بھی گناہ گار کر رہی ہو۔ جو کہا ہے جاؤ اپنے میلے دل کو اجلا کرو۔ اس بچے پر ممتا لٹاؤ۔ اس سے راضی ہو کر رب تیری سونی گود بھی بھر دے گا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ جا اب۔'' ان کا انداز قطعیت بھرا تھا۔

پھر وہ دونوں میاں بیوی روتے دھوتے پرعزم انداز میں وہاں سے رخصت ہو گئے تھے۔ ان کو اپنے گناہوں کا ادراک ہو گیا تھا۔ اور اس کے بعد اصلاح کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے۔ اس کے بعد بھی گاہے بگاہے لوگ اپنے مسائل اپنی پریشانی لے کر حاضر ہوتے رہے تھے۔ حتیٰ کہ مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا تھا اور وہ نماز کی ادائیگی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

انہوں نے جیسے ہی زنان خانے میں قدم رکھا۔ ہاجرہ بیگم نے لپک کر ان کے کندھے پر سے سفید ململ کا کپڑا تھاما تھا۔

''وضو کر لیجیے۔'' وہ بے حد دھیمے لہجے میں بولی تھیں۔ یہ ان کی زندگی کی ساتھی ان کی بیگم تھیں۔ ہاجرہ جن کے بطن سے ان کے دو اولادیں تھیں۔ ایک فریدوں بخت اور اس سے چھوٹی ہما۔ دونوں بچے ابھی زیر تعلیم تھے۔ فریدوں بھی کبھی کبھار اپنے بابا کے پاس بیٹھتا تھا۔ مگر عملاً اس کا دھیان اس طرف نہ جاتا تھا۔ نہ ہی پیر کمال شاہ بخت نے بھی فریدوں بخت پر کبھی زبردستی کی تھی۔ انہوں نے فریدوں کو اس کے فیصلے میں آزاد چھوڑ دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ وہ ان ہی کا خون ہے۔ ان کی طرح مثبت سوچ رکھنے والا انسان ہے۔ مگر شاید ابھی قدرت کی طرف سے فریدوں بخت کے لیے احکام مقرر نہ ہوئے تھے۔ ابھی اسے اپنے اندر موجود خوابیدہ صلاحیتوں کا ادراک ہی نہ تھا۔

اگرچہ یہ سچ تھا کہ اس کی مناجات بھی مقبول تھیں۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اوراس کی ہر دعا قبولیت کا درجہ پالیتی تھی۔ نماز مغرب کی ادائیگی کے وقت پیر صاحب نے دیکھا کہ فریدوں بخت بھی قطار میں موجود تھا۔

مختلف صفوں میں موجود افراد ان سے سلام کرتے اپنی اپنی صف سیدھی کر رہے تھے۔ فریدوں بخت دوسری صف میں موجود تھا۔ وہ مدھم سا اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ پھر نماز کی ادائیگی ہوئی اور اس کے بعد انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے تھے۔ گھر کا ایک وسیع حصہ نماز کے لیے وقف تھا۔ جو حجرے کے اندر موجود لوگوں کے لیے ہی وقف نہ تھا بلکہ قرب و جوار میں موجود تمام لوگوں کے لیے تھا۔ جو یہاں آ کر باجماعت نماز کی ادائیگی کے لیے آیا کرتے تھے۔ یہ بہت بختوں والی مرادوں والی جگہ تھی۔ جہاں نمازی بھی کھچا کھچ صفوں میں ہاتھ باندھے رب کے سامنے کھڑے ہوتے اور دعا کرتے اور اپنی مرادیں اور حاجات پوری پاتے تھے۔

❖❖❖❖

"سنیے میں سوچ رہی تھی کہ اب اس خوشی کے موقع پہ اپنی بہن ساشا کو بھی مدعو کرلوں۔ میں جانتی ہوں کہ ساشا نے شادی کے بعد عملاً ہم سے کوئی ناطہ نہیں رکھا ہے کوئی تعلق واسطہ۔ مگر میرا دل اس کی محبت میں گداز ہے۔ میں بڑی بہن ہوں۔ اس لیے چاہتی ہوں کہ میرا ظرف بھی وسیع تر ہو۔"

آصفہ بیگم نے اپنے مجازی خدا بلال صاحب سے کہا تو وہ ہنکارا بھر کر رہ گئے تھے۔

"دیکھو آصفہ اگرچہ میں نے کبھی تم پر کسی بھی قسم کی پابندی عائد نہیں کی ہے۔ مگر حالات تمہارے سامنے ہی ہیں ساشا نے ہی نہیں اس کے شوہر وقار نے بھی ہمیشہ ناروا سلوک روا رکھا ہے۔ وہ پرلے درجے کا بدتمیز انسان ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ میں کوئی روایتی شوہر ہوں۔ جو اپنی بیوی کو ان کے عزیز داروں سے ملنے ہی نہ دوں۔ یا اس کی خوشیوں کی راہ میں حائل ہوگا۔ ایسا نہیں ہے۔ مگر آخری مرتبہ جب تم نے اس کو گھر بلایا تھا۔ اور حسن کی سالگرہ تھی۔ تو اس کا رویہ بھی تم کو بخوبی یاد ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ اب عین شادی کے خوشگوار موقع پر وہ دوبارہ کوئی بدمزگی پیدا کرے۔ باقی تم چاہو تو بلا سکتی ہو۔ مگر مجھ سے کم از کم وقار کی جھوٹی شان و شوکت امارت کے قصے نہیں سنے جا سکتے ہیں۔"

بلال صاحب نے دوٹوک انداز میں کہا تو وہ سر جھکا کر رہ گئی تھی۔ اس کے شوہر بلال کی بات اپنی جگہ بالکل درست تھی۔ کیونکہ اس نے جب جب بھی مروت و محبت میں مبتلا ہو کر چھوٹی بہن کو مدعو کیا تھا۔ اس نے ہر لحاظ بالائے طاق رکھ کر اپنی زبان کے نشتر چلائے تھے۔ اس کا دل چھلنی کیا تھا۔ درحقیقت ایک انسان دوسرے انسان کو یہی کچھ دیتا ہے جو اس کے پاس ہوتا ہے۔ بعض کے دامن میں پھول ہوتے ہیں جو دوسرے کے لیے بھی خوش دامنی کا سبب بن جاتے ہیں۔ جبکہ بعض لوگوں کے پاس محض کانٹے ہوتے ہیں وہ کسی ببول کے کانٹے دار درخت کی مانند دوسرے کو ضرر پہنچا کر تسکین حاصل کرتے ہیں۔ ساشا کے دامن میں بھی نفرت اور کینہ تھا۔ دل نفرت سے لبریز تھا۔ اور یہ نفرت یہ حسد کینہ پروری اس نے اپنی ماں ساحرہ سے لی تھی۔ اگرچہ ساحرہ بھی آصفہ کی سوتیلی ماں تھی اور ساشا آصفہ بیگم کی چھوٹی بہن تھی۔ مگر ان دونوں نے دو مختلف عورتوں کے بطن سے جنم لیا تھا۔

آصفہ چھ سال کی تھی جب اس کی ماں چل بسی تھی۔ اس کے بعد وہ بھری دنیا میں جیسے تنہا رہ گئی تھی۔ ماں کی ممتا شفقت محبت سب ناپید تھا۔ تنہائی کے آسیب تھے، غم تھے۔ شکستہ پا وجود تھا۔ مگر والد کی محبت نے مرہم کا کام کیا تھا۔ مگر اس سانحے کے بعد وہ بہت ہی سمجھدار ہوگئی تھی۔ معمولی باتوں کو شدت سے محسوس کرنے لگی تھی اور اس لیے اس نے کچھ عرصہ سے اپنے والد آفاق احمد کا رویہ تبدیل ہوتے محسوس کیا تھا۔ اگرچہ پہلے بھی سارا کام کاج اور اس کی مکمل دیکھ بھال اس کی پھوپھو اریبہ ہی کیا کرتی تھیں۔ جو اس سے والہانہ محبت کرتی تھیں۔ ان کے نصیب میں لفظ شادی اور بیوگی کی دونوں درج تھے۔ اس کے بعد ان کو جب معصوم سی آصفہ کے سر سے ماں کی شفقت چھن جانے کا گہرا ملال تھا۔ تو انہوں نے اپنی تمام تر محبت، محویت اور شفقت محض آصفہ تک ہی محدود کردی تھی۔ مگر رات کے کھانے کے اوقات میں آفاق احمد گھر پر ہی ہوا کرتے تھے۔ مگر چند دنوں سے ان کے معمولات زندگی میں واضح طور پر تبدیلی آئی تھی۔ اور یہ تبدیلی محض

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

ان کے معمولات میں ہی نہیں بلکہ ان کے خیالات میں بھی رونما ہوئی تھی۔ پھر بہت جلد یہ خبر گردش کرنے لگی کہ آفاق صاحب کی اپنی سیکرٹری ساحرہ کے ساتھ گہری وابستگی ہے۔ بدنامی کے خوف میں مبتلا آفاق احمد نے ساحرہ کو اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس معاملے میں وہ آزاد تھے۔ بہن جو بیوہ تھی خود ان کے گھر میں مجبوری کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اگرچہ اریبہ کو کسی بھی قسم کی کوئی تکلیف نہ تھی۔ مگر اس گھر میں اس کا وہ مقام و مرتبہ ہرگز نہ تھا کہ وہ آفاق کی زندگی کے اس اہم ترین فیصلے میں کوئی رائے زنی کرتی۔ اس لیے آفاق احمد نے خاموشی سے ساحرہ سے نکاح کرلیا تھا۔

کورٹ میرج کے بعد جب وہ ساحرہ کو گھر لائے تھے اس وقت آصفہ لاؤنج میں ہی بیٹھی ہوئی ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہی تھی۔ اور ساتھ اپنے کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔ باپ کے ساتھ پہلو میں کھڑی ایک بے حد حسین عورت کو نک سک سے تیار دیکھ کر وہ کچھ حیران سی اور کچھ پریشان سی تھی۔ اس نے باپ کے ہمراہ اس قدر قریب محض اپنی ماں کو دیکھا تھا اور اپنی ماں کی جگہ کسی اور عورت کو دیکھنا اس قدر آسان نہیں تھا۔ وہ بھی ایک ننھی سی بچی کے لیے بھی اس نے دیکھا کہ اس کا باپ اس کو سلام کرنے کو کہہ رہا ہے۔

”ادھر آؤ آصفہ بیٹا ان سے ملو۔ یہ تمہاری نئی امی ہیں ساحرہ۔ یہ اب آج سے اسی گھر میں رہیں گی۔ تم نے ان کا ہر حکم ماننا ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ میری سیانی بیٹی مجھے یا اپنی مام کو کسی بھی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دے گی۔“

آفاق احمد کا انداز محض پچکارنے والا ضرور تھا۔ مگر اس میں پوشیدہ دھمکی کو آصفہ نے بے حد شدت سے محسوس کیا تھا۔ دل کے اندر کچھ چھناکے سے ٹوٹ سا گیا تھا۔

اس نے محبت سے نہ سہی مگر ادب سے ضرور اس اجنبی عورت کو سلام کیا تھا۔ جو اب اس کی ماں کے مرتبے پر فائز ہو چکی تھی۔ مگر ساحرہ کی نگاہوں میں گہری چمک عود کر آئی تھی۔ اور اس چمک میں کہیں بھی پسندیدگی شامل نہ تھی۔ بلکہ ایک ایسی چمک تھی جیسے کسی بھی دشمن کو دیکھ کر نگاہوں میں آن رکتی ہے۔ وہ ان نگاہوں سے سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹی تھی۔ وہ ننھی سی سہمی ہوئی بچی اس وقت ساحرہ کے لیے ایک ناگوار اضافی بوجھ کی مانند تھی۔ اسے آصفہ سے یا آفاق سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ اگر اسے کسی شے سے دلچسپی تھی تو اس گھر پر قابض ہونے پر تھی۔ پھر اس کے بابا ساحرہ کو لے کر اس کی امی کے بیڈروم کی طرف چل دیئے تھے۔ اس کی امی کی یادوں کا ایک بے بہا خزانہ تھا۔ وہاں اس کمرے میں امی کی یادیں تھیں۔

وہاں امی کی قد آدم تصاویر آویزاں تھیں الماری میں اب تک اس کی امی کے ملبوسات جوں کے توں رکھے ہوئے تھے۔ اب وہاں کسی اور ہی عورت کا رہنا اس کے لیے اذیت کا سبب بن رہا تھا۔ ذہن میں مسلسل اٹھتے ہوئے سوالات اور دل میں اٹھتی ہوئی خلش کو اس نے پھوپھو کے سامنے زبان دی تھی۔ یوں بھی اس کا یہاں پھوپھو کے علاوہ تھا ہی کون؟

”پھوپھو بابا نے ایسا کیوں کیا؟ کیا بابا کو ایک بار بھی امی کا خیال نہیں آیا، پھوپھو امی کہیں نہیں گئی ہیں۔ یہی ہیں۔ میرے آس پاس۔ جانتی ہیں۔ جب میں رات کو سوتی ہوں تو اکثر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے امی میرے بالوں میں ہولے سے پیار سے اپنی انگلیاں سہلا رہی ہیں۔ امی کی خوشبو میرے چہار سو پھیلی ہے امی کی جگہ میں کیسے ان نئی آنٹی کو دے دوں۔ وہ آنٹی جو مجھے بہت غور سے عجیب سی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ پھوپھو یہ کیا ہو گیا ہے۔ آہ میرے بابا بٹ گئے ہیں۔“

آصفہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ اریبہ نے اسے اپنی آغوش میں چھپا لیا تھا۔

اریبہ بیگم نے دیکھا کہ آصفہ کا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ وہ بے حد ہراساں تھی۔ اس ننھی سی بچی پر اس وقت اریبہ کو بے انتہا ترس آیا تھا۔ اس سب کا ذمہ دار کوئی اور نہیں ان کا اپنا ہی بھائی تھا۔ یہ جو حسن کا جادو جگا کر ساحرہ ان کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ یہ اچھا نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے بارہا آفاق احمد کو بتانا چاہا تھا کہ یہ جو حسن کا جادو جگا کر زندگی میں رعنائی بھرنے آئی ہیں وہ محض چار دن کی چاندنی کی مانند ہوا کرتی ہیں۔ جس کے بعد گہری تاریک رات ہوتی تھی۔

مگر آفاق پر ساحرہ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اور

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اس نے اپنی بہن کی رائے اور نصیحت کو درخوراعتناء نہ سمجھا تھا۔

اور اب عملاً اس عورت کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیا تھا۔

ساحرہ نے آتے ساتھ ہی سب سے پہلے وہاں سے آصفہ کی ماں کی ہر نشانی ہر یاد مٹادی تھی۔ اس کی جگہ اپنی ہر شے آویزاں کردی تھی۔ نوکر تبدیل کردیئے گئے تھے۔ حالانکہ یہ ملازم برسوں سے وفاشعار تھے۔ اور کبھی بھی انہوں نے کسی وقت بھی شکایت کا موقع نہ دیا تھا۔ مگر ساحرہ کو یہاں ہر شخص اپنی پسند کا منتخب کرنا تھا۔ جو آصفہ کی ماں کا گن نہ گاتا ہو۔ بلکہ اس کا نمک خوار ہو۔ اریبہ کو اٹھتے بیٹھتے، پڑنے مفت کی روٹیاں توڑنے کے طعنے ملنے لگے تھے۔

اور اریبہ انا کو کچل کر سب سنتی رہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بھائی سے اس وقت کچھ بھی کہنا سننا فضول سا تھا۔ کیونکہ بھائی کے سر پر اس وقت ساحرہ کا جادو سر پر چڑھ کر بول رہا تھا۔ مگر ان سب کے درمیان آصفہ پس کر رہ گئی تھی۔ پھر انہی دنوں میں ساحرہ امید سے تھی۔ آفاق احمد کی خوشی قابل دید تھی۔

”آصفہ بیٹا ادھر آؤ میرے پاس۔“

بہت دنوں بعد پہلی مرتبہ آج آفاق احمد نے اسے اس طرح محبت سے اپنے پاس گود میں بٹھایا تھا۔ وہ آٹھ سالہ بچی اپنی وقت اور عمر کے حساب سے زیادہ حساس اور معاملہ فہم تھی۔

اس وقت بھی اس نے باپ کی گود میں بیٹھنے کی بجائے ان کے پاس پڑے ہوئے صوفہ پر ٹکنا زیادہ مناسب خیال کیا تھا۔ وہ پہلے کی مانند باپ کے اوپر حق ملکیت نہیں جتاتی تھی۔ بلکہ اب اس نے خود ہی سمجھداری سے اپنے آپ کو پس پشت ڈال پس منظر کا ایک حصہ بنا ڈالا تھا۔

”بیٹا کچھ دنوں میں آپ کا کوئی بھائی یا بہن آنے والی ہے۔ آپ اب اداس نہ رہا کرو۔ اس سے خوب جی بھر کر کھیلنا اس سے باتیں کرنا۔ وہ صرف آپ کے لیے ہی ہوگا بے بی۔“

آفاق احمد کا لہجہ پرجوش سا تھا۔ آصفہ بری طرح چونکی تھی۔ آصفہ کئی دنوں سے نوٹ تو کررہی تھی کہ ساحرہ اپنے کمرے میں ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ مگر سب کو ہی معلوم تھا کہ سبب عارضی تھا۔ اور وقتی تھا۔ ساحرہ کے موڈ کے مرہون منت تھا یہ سب جب چاہتی وہ کسی کو بھی منتوں میں بھی ارزاں کرسکتی تھی۔ اس لیے سب کا رویہ ہی محتاط ہوا کرتا تھا۔ اور اب اس کو بابا ایک نئے مہمان کی نوید سنا رہے تھے۔ وہ تحیرزدہ سی تھی۔ نہ کوئی خوشی تھی اور نہ ہی کوئی ملال تھا۔ دراصل ماں کے بچھڑنے کے بعد کوئی بھی حادثہ اب اس پر اس طرح سے اثرانداز نہ ہوتا تھا۔

اس کے نزدیک ماں سے بچھڑ جانا ہی سب سے زیادہ تکلیف دہ امر تھا۔ پھر ایک شام ساحرہ ہاسپٹل سے ایک ننھی منی گلابی سی گول مٹول سی بچی کو گھر لائی تھی۔ اس کو دیکھ کر ایک عرصے کے بعد آصفہ کی وحشت میں جیسے ارتعاش برپا ہوا تھا۔ وہ اس کو دیکھ کر دم بخود سی رہ گئی تھی۔ وہ بچی اس کے بابا کا پرتو تھی۔ اس کا ہر نین نقش اس کے بابا جیسا تھا۔ صرف اس کی بے تحاشا سرخ وسفید رنگت اس نے اپنی ماں کی چرائی تھی۔ وہ باپ کے پکارنے پر سہمی ہوئی سی اس ننھی سی گڑیا تک چل کر پہنچی تھی۔

”یہ ساشا ہے آپ کی چھوٹی بہن۔ آپ نے اس کا خوب خیال رکھنا ہے۔“

باپ کی اس نصیحت کی عملاً آصفہ کو ضرورت ہی نہ تھی۔ احساس مروت ہمدرد دل اسے اس کی ماں سے وراثت میں ملا تھا۔ اس نے اس نوزائیدہ بچی کو اپنی گود میں بھر لیا تھا۔ اس بچی نے کسمسا کر اپنی گول آنکھیں کھول کھول کر آصفہ کو دیکھا تھا۔ وہی ایک لمحہ تھا جب آصفہ کے دل میں محبت نے آنکھ کھولی تھی۔ اس کے دل کے سارے زنگ دھل گئے تھے۔ اس کے دل میں جینے کی جیسے ایک نئی امنگ پروان چڑھی تھی۔ اس نے اس بچی کو چوما تھا۔ اس کے اس عمل کو آفاق احمد نے سرخوشی سے جبکہ ساحرہ نے سخت ناگواری سے دیکھا تھا۔ ساحرہ نے آصفہ کو کبھی اپنی اولاد کا درجہ نہیں دیا تھا۔ بلکہ آصفہ کا وجود اسے ایک خار کی طرح چبھتا تھا۔ اس کا وجود اس کی آنکھ میں خار بن کر کھٹکتا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ آصفہ کو یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غائب کردے۔ آصفہ ابھی مزید ساشا کو پیار کرنا چاہتی تھی جب ساحرہ نے ٹوک دیا تھا۔

”کیا تم نے ہاتھ دھوئے ہوئے تھے۔ ننھی سی بچی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ہے۔ اس کو جراثیم لگ جائیں گے۔ ابھی جاؤ۔ اس کے سونے کا وقت ہو رہا ہے۔'' ساحرہ کا لہجہ بے حد تضحیک آمیز سا تھا۔ آفاق احمد نے تو سرے سے اس بات کا نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔ مگر وہ خود اتنی حساس دل تھی کہ اس عزت افزائی پر ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔

مگر پھر جیسے جیسے ساشا بڑی ہوتی چلی گئی وہ اس کی محبت میں پور پور ڈوبتی چلی گئی تھی۔ مگر ساشا کو ساحرہ نے قدم قدم پر یہی باور کروایا تھا کہ آصفہ اس کی حریف ہے۔ اس کی اولین دشمن ہے۔ جبکہ شروع میں تو ساشا کا ننھا سا دماغ اس ایک نقطہ کو سمجھ بھی نہ پایا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ شعور کی منزل پر قدم رکھتے ساتھ ہی اس کو اس بات کا گہرا ادراک ہو گیا تھا۔

پھر وہ آصفہ سے خار کھانے لگی تھی۔ ایک شام آفاق صاحب اریبہ کو ان کے مرحوم شوہر کی قبر پر لے جا رہے تھے۔ جب کار کا حادثہ ہوا اور یوں اس سے دو مضبوط سائبان ہمیشہ کے لیے چھن گئے تھے۔

تب وہ کوئی بچی نہ رہی تھی۔ بلکہ بیس سال کی ایک سمجھدار لڑکی تھی۔ نجانے کیوں آصفہ کو لگتا تھا کہ ساحرہ کے رونے میں محض اداکاری کا عمل دخل ہے۔ ان کے آنسوؤں کا ان کے غموں سے ان کے چہرے پر رقم دکھوں سے کوئی میل نہ تھا۔ کیونکہ آنسو تو تھے۔ مگر چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ ٹھہراؤ تھا۔ وہ سمجھ کر بھی سمجھنا نہ چاہتی تھی۔ مگر جب عدت کے دوران ہی انہوں نے جائیداد کے حوالے سے وکیل صاحب کو بلوا لیا تو ان کی نیت کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ وکیل صاحب ان کے برسوں پرانے وکیل تھے۔ وفا شعار اور زمانہ شناس بھی تھے۔ انہوں نے آصفہ کے بوسیدہ لباس اور متورم نگاہوں کو بغور ملاحظہ کیا تھا۔ اور پھر یہی نہیں بلکہ ساحرہ کا اس عدت میں بھی گہرا میک اپ ان کے لیے سخت اچنبھے کا سبب بن رہا تھا۔ وکیل نے وصیت نامہ کھول کر پڑھنا شروع کیا تو ساحرہ کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ وہ چیخ پڑی تھی۔

''نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا ہے۔ ساری عمر میرے حسین قصیدے پڑھنے والا شخص اس گھر کو میرے نام کر گیا ہے۔ اور پراپرٹی میں آدھے شیئرز اس منحوس لڑکی کو دے گیا ہے۔ اس لڑکی کو جس کو اب وہ کبھی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ آہ اگر میرے پاس بچے نہ ہوتے تو کیا میرے نام کچھ بھی نہ کر کے جاتا۔ میری بچی کو نظر انداز کر گیا۔ اور ساری جائیداد میں بڑا حصہ اس کے نام کر گیا۔ وہ بے حد برو ختہ سی تھی۔ کیونکہ ساشا کی وجہ سے اس کو بھی جائیداد میں حصہ ملا تھا۔ جو عملاً ساشا کے ہی نام تھا۔ ساحرہ کے لب و لہجہ میں نفرت تھی حقارت تھی۔ جبکہ آصفہ کو مزید روانی سے رونا آ رہا تھا۔ اس کے شفیق باپ نے جاتے جاتے بھی اس کے سر پر دست شفقت رکھ دیا تھا جیسے۔

''جی وصیت کے مطابق آدھی پراپرٹی کی مالک آصفہ ہی ہیں جبکہ باقی آدھی پراپرٹی آپ کی اور ساشا بیٹی کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے مکمل انصاف سے کام لیا ہے اس کے علاوہ ان کی منشاء سے ایک خطیر رقم رفاعی اداروں کو دے دی گئی ہے۔ اور ہاں آصفہ بیٹی اب آپ کو میرے ساتھ ہی چلنا ہوگا۔ یہی آپ کے بابا کی رضا ہے۔ انہوں نے اپنی وصیت میں صاف صاف لکھا ہوا ہے کہ جس دن بھی یہ وصیت نامہ پڑھا جائے اس دن ہی اس لمحے سے آصفہ کو وکیل صاحب کی امانت میں سونپ دیا جائے۔ جب تک جائیداد عملی طور پر منتقل نہیں ہو جاتی ہے۔ آصفہ بیٹی آپ ابھی جائیں اور اپنی ضروری چیزیں سمیٹ کر لے آئیں۔ میں یہاں ہی آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ بیٹا اپنی اسناد وغیرہ لے آیئے گا۔'' وکیل کا لہجہ بے حد مضبوط اور دو ٹوک تھا۔

''اوہ وہ شخص کس قدر شاطر مکار نکلا۔ مجھ پر شک ہے کیا کہ میں اس لڑکی کو مار ڈالوں گی۔ مارنا ہی ہوتا تو اتنے سال کیوں گزار دیتی۔ اس کو تب ہی مار دیتی۔ اب اتنے سال اس کو پال پوس کر جوان کیا اور یہ انعام مل رہا ہے کہ میں اس کی خون کی پیاسی ہوں۔ وہ شخص کس قدر مکار تھا۔ میں ہی سمجھ نہ پائی اس کی گہری سوچ کو۔ آہ۔''

ساحرہ نے ہر لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ مزید بھی بولتی رہی تھی۔ مگر وکیل صاحب کے کہنے پر آصفہ نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ وکیل صاحب کے ساتھ ہی چل پڑے۔ یوں بھی اسے اب یہاں خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ کتنی ہی راتوں سے سو نہیں پائی تھی۔ اس قدر بڑے سانحے کے بعد اسے ساحرہ کی نگاہوں کی بڑھتی ہوئی چمک مزید ہراساں کرتی تھی۔ اور

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اسے اپنے ہی کمرے میں رات کو سوتے ہوئے خوف سا محسوس ہونے لگتا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں آصفہ اپنی ساری ضروری اشیاء ایک بیگ میں ڈالے بالکل تیار کھڑی تھی۔

ساحرہ اب کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ آصفہ کا گلا ہی دبا دے۔

وہ وکیل صاحب کے ساتھ کار میں بیٹھی مسلسل رو رہی تھی۔ وکیل صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی تھی۔ مگر آنسوؤں میں تو جیسے روانی سی آچکی تھی۔ اس نے کب سوچا تھا کہ جس گھر میں پیدا ہوئی۔ پروان چڑھی اور اس کے باپ اور ماں کی یادوں کا مسکن تھا۔ وہ اس سے اس طرح اچانک ہی چھن جانے والا تھا۔ اسے ایک موہوم سی امید بھی نہ رہی تھی کہ اب وہ کبھی اس گھر کو دوبارہ دیکھ بھی سکے گی۔ کیونکہ اس کے باپ نے نجانے کیا سوچ کر اس گھر کو اس کی سوتیلی ماں کے نام کر دیا تھا۔ اور یوں وہ اس گھر سے بالکل ہی دست بردار ہو گئی تھی۔

وکیل صاحب اس کو سیدھا اپنے گھر لے گئے تھے۔

”بیٹا تم مجھے انکل کہہ سکتی ہو۔ تمہیں یہاں لانے کا مقصد تمہاری حفاظت ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو یہ اپنے بابا کا آخری خط پڑھ لو۔ جو تمہارے نام ہے۔ اگرچہ اس طرح کا ملتا جلتا خط وہ وصیت نامے میں بھی چھوڑ گئے ہیں۔ مگر وہ ایک شام خود میرے پاس آئے تھے۔ بے حد فکرمند سے تھے۔ انہوں نے اس وقت مجھے تمہارے حوالے سے بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ انہیں تمہاری حفاظت کا بہت خیال تھا۔ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں تمہارے راستے سے ہٹانے کے لیے کوئی گھناؤنی چال نہ چلی جائے۔“

وہ ہمہ تن گوش سن رہی تھی۔ وکیل صاحب نے ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔

”یہ تمہارا آج سے کمرہ ہے۔ تم آرام سے یہاں رہ سکتی ہو۔ گریجویشن کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ہو تو میں حاضر ہوں۔ مگر جو بھی فیصلہ کرنا سوچ سمجھ کر کرنا۔ میں تمہارے ہر فیصلے میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

اس نے درانی انکل کے جانے کے بعد اس لفافے کو کھولا تھا۔ اس ایک خط میں تمام سوالات کے جوابات رقم تھے۔ اس کے بابا اس کے تحفظات کے حوالے سے ہراساں تھے۔ ایسا بابا نے کبھی اپنے کسی بھی عمل سے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس خط کو چاک کیا تھا۔ سطر سطر اس کے بابا کی خوشبو میں لپٹی ہوئی اس سے محو کلام تھی۔

پیاری بیٹی آصفہ!

جس وقت تم یہ خط پڑھو گی اس وقت میں اس دنیا سے جا چکا ہوں گا۔ آصفہ بیٹا ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تمہاری پھوپھو کا تمہارا بہت دل دکھایا ہے۔ لیکن اگر تم ٹھنڈے دل سے میرا یہ خط پڑھو گی تو شاید میں اتنا زیادہ قصوروار نہ لگوں۔ آصفہ میں بہت خوش تھا۔ ساحرہ کی محبت نے میری زندگی میں در آنے والی خلش کو بھر دیا تھا۔ پھر ساشا کی پیدائش کے بعد میری خوشی جیسے مکمل ہو گئی تھی۔ مگر یہیں سے میری خوشی کو جیسے نظر لگ گئی تھی۔ میں نے اکثر ساحرہ کو رات کو پچھلے پہر بالکل خاموشی سے گھر سے نکلتا دیکھا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ اس سے باز پرس کروں۔ اس سے پوچھوں مگر ساحرہ کی نگاہوں میں ایسی کشش تھی کہ میرے لب پر جیسے از خود قفل لگ جاتے تھے۔ ایک رات میں نے دل میں مصمم ارادہ باندھ لیا تھا کہ اگر ساحرہ آج گھر سے نکلی تو میں بھی اس کے تعاقب میں جاؤں گا۔ شروع شروع میں ساحرہ کا تمام ملازماؤں کو رخصت کر کے اپنے نئے لوگ بھرتی کرنا مجھے عجیب سا لگا تھا۔ مگر ساحرہ کی خوشی کی خاطر میں چپ رہا تھا۔ مگر ساحرہ کی سرگرمیوں کی مجھے خبر نہ ہو سکے اس لیے ساحرہ نے بالکل خاموشی سے اپنے پراعتماد بندے رکھے تھے۔

ایسا ہی ایک شخص راشد تھا۔ جو رات کے وقت ساحرہ کو کار میں کہیں چھوڑتا تھا اور پھر واپس بھی لے آتا تھا۔ میں ایک مرد ہوں۔ شک کا بیج میری گھٹی میں ہے۔ مگر اس شک نے ہی مجھے اس کا تعاقب کرنے کا حوصلہ دیا تھا۔ میں نے دیکھا ساحرہ کسی آشنا سے ملنے تو نہیں جاتی ہے۔ بلکہ وہ ایک بے حد پراسرار اور ویران کھنڈر میں رات کے پہر گئی تھی۔ میں بھی کار کو بہت ہی پیچھے چھوڑ کر پیدل ہی اس کے قدموں کی پیروی میں آگے بڑھتا چلا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اچانک ہی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ اس کا ڈرائیور راشد تو کار میں ہی بہت ہی پیچھے رہ گیا تھا۔ شاید اسے اس مخصوص مقام سے آگے آنے کا حکم ہی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

نہیں تھا۔ میں چونکہ ساحرہ کی لاعلمی میں آگے بڑھا تھا۔ اس لیے بنا کسی خوف وخطر کے، اس کے تعاقب میں تھا۔ وہ مسلسل نہیں بلکہ ہر دس دن بعد یہاں ہی آیا کرتی تھی۔ ایسا میں نے گنتی کے حساب سے یاد کر رکھا تھا۔ اس وقت ساحرہ میری نظر سے اوجھل ہوئی تو میں نے اپنے اطراف کا طائرانہ نظروں سے جائزہ لینا شروع کیا تھا۔ گہری سانپ جیسی کالی رات کنڈل مارے بیٹھی تھی۔ مگر اس سیاہ رات میں ہر شے بالکل نگاہوں کے سامنے تھی۔ میں نے اندازے سے سرعت سے اپنے قدموں کا رخ ایک جانب کیا تھا۔ اور پھر مجھے اپنے اندازے کے درست ہونے کا ثبوت بھی مل گیا تھا۔ میں نے کان لگا کر سنا تو ساحرہ اور کسی انجان مرد کے دھیمے دھیمے سرگوشیوں میں بات کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں مزید آگے بڑھا اور ایک پتھر کی اوٹ میں بیٹھ گیا تھا۔ سامنے کا منظر بے حد واضح تھا۔ مگر بے حد بھیانک اور رروح پر لرزا طاری کرتا ہوا تھا۔

ایک گنجا آدمی محض لنگوٹ میں آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے عین سامنے آگ میں کھوپڑی جل رہی تھی۔ ساحرہ اس کے سامنے بے حد عقیدت سے مؤدب انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ فضا میں پراسراری سی خاموشی کا راج تھا۔ دور کہیں الوؤں کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اور پھر گھمبیر خاموشی چھا گئی تھی۔ اس خاموشی کو ساحرہ کی آواز کی لہر نے توڑا تھا۔

''جگن بابا۔ میں نے اسے اپنی باتوں کا ہی نہیں اپنا بھی اسیر کر لیا ہے۔ میں اپنی منزل کے بہت ہی قریب ہوں۔ دولت مند گھرانے میں تو بیاہی گئی ہوں۔ نہ اسے میرا پس منظر معلوم ہے۔ مگر سوچتی ہوں مجھے کیا حاصل ہوا ہے؟ ہر ماہ ملنے والی رقم کا حساب کتاب لیتا ہے۔ میں جب بھی اس کے آفس میں جاتی ہوں وہ سب کے سامنے سبکی محسوس کرتا ہے جیسے سب کی نگاہوں میں طنزیہ سوال دیکھ کر گھبرا سا گیا ہو۔ مجھے اپنی عزت بنا لینے کے بعد بھی اس کے دل میں میری عزت نہیں ہے۔ اور وہ لڑکی آصفہ۔ اس کو میں اب مزید برداشت نہیں کر سکتی ہوں۔ کیا جواز رہ گیا ہے کہ اب اسے مزید برداشت کیا جائے۔ میں اب جلد از جلد ساری جائیداد کی منتقلی اپنے نام پر دیکھنے کی خواہش مند ہوں۔ اب میں خود مختار ہونا چاہتی ہوں۔ اور اس لڑکی آصفہ کو اپنے گھر اور اپنی زندگی سے دور کرنا چاہتی ہوں۔ اتنا دور کہ ان کو چھوتی ہوئی ہوا بھی ہم تک نہ پہنچے۔ بس اب بہت ہو گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں اس ساری جائیداد کی وارث میری بیٹی قرار پائے۔ اور اس لڑکی آصفہ کا تو یوں بھی شاید وراثت میں کوئی حصہ نہ ہو۔ مگر اس کا وجود مجھے اب گوارا ہی نہیں ہے۔''

بہت جلد میں اپنا جاب مکمل کر لینا چاہتی ہوں۔ جس کے لیے میں نے اس شخص کو بھی گوارا کیا ہے۔ جس کے بعد میں اور میری بیٹی ایک سہل پسند زندگی گزاریں گی۔ اور وہ آفاق میری راہ کھوٹی کرنے پر تلا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اب اس نے مجھ پر گہری نگاہ رکھنا شروع کر دیا ہے۔ اور اب جو بھی میرے مقصد کے درمیان حائل ہوگا وہ نیست و نابود ہو جائے گا۔ میں اس سے محض خودغرضی کا رشتہ نبھا رہی ہوں۔ مگر اب میں اس سے چھٹکارہ چاہتی ہوں۔ مکمل چھٹکارہ۔'' ساحرہ کا لب ولہجہ پختہ تھا۔ مضبوط ارادے والا۔ اس کے لہجہ اور لفظوں دونوں میں میرے لیے نفرت پنہاں تھی۔ یہ جان کر میرا دل ہی بیٹھ گیا تھا۔ اتنے برسوں سے میں اس عورت کی محبت بھری باتوں کے دام میں آ گیا تھا۔

آج میری یک طرفہ محبت کا بت پاش پاش ہو گیا تھا۔ وجود ہچکولوں کی زد میں تھا۔

تب ہی اس شخص نے اچانک اپنی لال انگارہ آنکھیں کھول کر اس کا رخ میری طرف کیا تھا۔ وہ چبھتی نگاہیں جیسے میرے آر پار اتر گئی تھیں۔ گندی، مکروہ، غلیظ نگاہیں۔ میں سرتاپا کانپ گیا تھا۔ وہ شخص اچانک ہی نگاہیں پھیر گیا تھا۔ دوسرے ہی پل مجھے ایسا محسوس ہوا جیسا کہ یہ سراسر میرا واہمہ ہو۔ کیونکہ اس نے اس ایک نگاہ کے بعد پلٹ کر میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ اب وہ پوری طرح ساحرہ کی طرف متوجہ تھا۔

''جیسا تو چاہتی ہے ویسا ہی ہوگا۔ مگر ابھی سے احتیاط نہیں ہے۔ وہ تیرے پیچھے پیچھے چل کر یہاں تک آ گیا ہے۔ لے آئی ہے تو۔ اس کا یہاں آنا ہمارے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔'' وہ شخص پر جلال انداز میں بولا تھا۔ اس کا لہجہ غیظ وغضب سے پر تھا۔ جبکہ اس کی اس بات پر

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ساحرہ گھبرا گئی تھی اور پلٹ پلٹ کر اطراف میں دیکھنے لگ گئی تھی۔

جبکہ میں اس انکشاف کے بعد کہ اس جگن بابا کو میری یہاں موجودگی کا مکمل طور پر علم ہے۔ میں باقاعدہ کانپتے ہوئے الٹے قدموں گرتا پڑتا ڈرائیور کی نظروں سے چھپتا چھپاتا گھر آ گیا تھا۔ اس کے بعد بستر پر ڈھے سا گیا تھا۔ مجھے شدید بخار نے آلیا تھا۔ میرا وجود بری طرح لرز رہا تھا۔ اور میں تپ رہا تھا۔ سوچوں کے بھنور میں الجھا میں دروازے کی آہٹ پر چوکنا بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔

گھنٹے کے بعد ساحرہ کی آمد ہوئی تھی۔ مگر میں ساکن وجود لیے پڑا رہا۔ ساحرہ کی نگاہیں اس کی آمد کے بعد میرے جسم پر مسلسل آر پار چبھ رہی تھیں۔ مجھے احساس تھا کہ ساحرہ جان گئی ہے کہ میں اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ مگر ساحرہ نے مجھے نہیں بلایا اور نہ ہی مخاطب کیا۔ اور میں بھی بند آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مگر بہ ظاہر سوتا بن گیا۔ مجھے ساحرہ سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ میرا ساحرہ کے ساتھ دن رات کا ساتھ تھا۔ مگر اب اعتبار اٹھ چکا تھا۔ بخار نے کئی دنوں تک میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ حتیٰ کہ ساحرہ بہ ظاہر محبت سے میرا احوال دریافت کرنے لگی۔

مگر میں بخوبی جانتا تھا کہ وہ مکر کر رہی ہے۔ اسے میری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر اسے کوئی دلچسپی ہے تو میری اس جائیداد سے ہے۔ میں نے صحت مند ہوتے ساتھ ہی طے کر لیا تھا کہ پہلی فرصت میں جائیداد کی تبدیلی کرواؤں گا۔ وکیل صاحب کو میں نے سب کچھ حرف بہ حرف بتا دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر ساری جائیداد تمہارے نام کر لی جاتی ہے تو تمہاری زندگی کو شدید خطرہ لاحق ہے۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ آدھی کی بقیہ جائیداد ساشا کے نام منتقل کر دی جائے۔ یوں بھی ساشا بے قصور ہے اور میرا خون بھی ہے۔ لیکن آصفہ بیٹی میں اس کے بعد بھی بے حد خوفزدہ ہوں۔ ساحرہ اس کے بعد بھی آج گئی ہوئی ہے۔ آج شب اس کے جانے کے بعد میں بہت بے چین ہوں۔ بے حد اضطراب محسوس کر رہا ہوں۔ اس لیے خط لکھ رہا ہوں۔ اب ساحرہ مجھے دیکھتی ہے تو اس کی نگاہوں میں کھلا چیلنج ہوتا ہے۔ مجھے نجانے کیوں گھٹن سی محسوس ہونے لگی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ جیسے میری زندگی کے دن گنے جا چکے ہیں۔ میری بیٹی تم اپنا خیال رکھنا۔ وکیل صاحب میرے بے حد دیرینہ دوست ہیں۔ ان کا ہر حکم ماننا۔ تم نہیں جانتی مگر وکیل صاحب کا پیر کمال شاہ بخت صاحب کے گھرانے سے گہرا میل جول ہے۔ انہی کی منشاء اور نصیحت پر میں تمہیں وکیل صاحب کی سرپرستی میں چھوڑے جا رہا ہوں۔ کاش مجھے بھی ان کے قدموں میں بیٹھ کر اعتراف گناہ نصیب ہوتا۔ مگر شاید یہ وقت نہ ملے۔ بہرحال درانی صاحب جیسا کہیں تم ویسا ویسا ہی کرنا۔ یہ میری آخری نصیحت بھی ہے اور وصیت بھی۔ ہوسکے تو بیٹی اپنے باپ کو معاف کر دینا۔

تمہارا باپ......آفاق احمد

آصفہ بیگم ماضی کے دھندلکوں میں گم تھیں جب وہ بلال صاحب کی بات پر بری طرح سے چونکی تھیں۔

''اب کس سوچ میں گم ہو گئی ہو۔ تم بے شک اپنی بہن کو بلا لو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بلکہ ابھی فون کر لو۔ اس خوشی کے موقع پر میں تمہیں بالکل بھی اداس نہیں دیکھ سکتا ہوں۔''

بلال صاحب نے آصفہ کو گہری سوچ میں گم دیکھ کر کہا تھا۔ وہ ہنس دی تھیں۔ بہت ہی آزردگی تھی اس مسکان میں۔ تھکن زدہ سی مسکان جس میں کسی بھی سمت قدم بڑھانے سے قبل ہی انسان اپنی ناکامی کے نشان پہچان لیتا ہے۔ ایسا ہی اسے بھی محسوس ہو رہا تھا۔

''میں جانتی ہوں بلال مجھے آپ کی محبت پر فخر ہے۔ میں جو بالکل تہی داماں تھی۔ اسے جس طرح سے آپ نے اپنایا مجھے سہارا دیا اپنا نام دیا، وہ سب ناقابل فراموش ہے۔ درانی انکل نے مجھے ہمیشہ اپنی بیٹی کی طرح سمجھا اور اس پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے لخت جگر کو میرا جیون ساتھی بنا دیا جو ہر پل میرا سایہ بنا رہا۔ درانی انکل نے آپ کا نام میرے نام کے ساتھ منسوب کر کے مجھ پر بے پناہ احسان کیا ہے۔ میں تو کب کی مر چکی ہوتی، ختم ہو چکی ہوتی اگر آپ کا سایہ نہ ہوتا۔'' آصفہ کے لہجہ میں فخر تھا۔

بلال نے مسکرا کر اپنی شریک حیات کو دیکھا تھا۔

آصفہ نے واقعی ماضی کے اوراق کھنگال ڈالے تھے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اور ڈائری سے اپنی چھوٹی بہن ساشا کا نمبر نکالا تھا۔ کیونکہ ان دونوں کی بات چیت کو مدتوں گزر چکے تھے۔

"بیگم آپ کا جوش قابل دید ہے۔ مگر حوصلے سے بیٹھ تو جائیں پھر کال کریں۔ اور یہ کیا کہہ رہی تھی ابھی کہ میں نے احسان کیا وغیرہ وغیرہ ارے رب العالمین کے شکر گزار تو ہم ہیں کہ ہمیں آپ جیسی شریک حیات ملی ہے۔ جس نے میرے اس گھر کو واقعی اپنی محبت سے خلوص سے چاہت سے مہکا دیا ہے۔ بابا جان نے یہ احسان ہم پر بھی کیا ہے۔ خوش نصیب تو ہم بھی ہیں ناں۔" بلال صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا تو آصفہ بیگم نے بیٹھ کر صوفے پر اپنی سانس بحال کی تھی۔

آصفہ نے بے حد محبت سے اپنے بیٹے کی شادی کی اس خوشی میں شریک ہونے کے لیے اپنی چھوٹی بہن ساشا کو سندیسہ دیا تھا۔ دل میں ایک خوف بھی پنپ رہا تھا۔ بہت سالوں پہلے جب درانی انکل نے پیر صاحب کے ساتھ یہاں کا چکر لگوایا تھا اور جوانی میں بھی پیر صاحب کو وہ کمال و مرتبہ حاصل تھا۔ جس کی مثال بہت کم ملتی تھی۔ انہوں نے گھر آ کر کہا تھا۔

"بلال بھائی۔ بہتر ہوگا کہ بھابی صاحبہ اب اپنی بہن زیادہ میل جول نہ ہی رکھیں تو بہتر ہے۔ سبب لکھا ہوا اس قدرت الٰہی کا ہے۔ مگر مجھے دکھائی دے رہا ہے کہ ساشا اپنی ماں کے مطابق ہی سوچ رکھنے والی ایک متعصب خاتون ہے۔ اس کے دل میں آصفہ بھابی کے لیے اس قدر کینہ نفرت اور عناد ہے جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ اس کا سفلی علوم کی روش پر گامزن ہونا بالکل سامنے کی بات ہے۔ اپنی ماں کی طرح وہ بھی اس روش پر گامزن ہے۔ اس لیے بسا اوقات دوری میں بھی مصلحت پوشیدہ ہوا کرتی ہے۔ بہتر تو یہی ہے کہ زیادہ میل جول سے احتیاط برتی جائے۔ ورنہ آنے والی نسل کو بھی نقصان بھگتنا پڑ جائے گا۔ بہر حال میں صریحاً ملنے سے منع نہیں کرتا مگر ایک فاصلہ رکھ کر۔"

یہی وجہ تھی کہ اتنے برسوں میں اس کے بعد آصفہ بیگم نے دل پر جبر کر کے پتھر کی سل رکھ لی تھی۔ دل ساشا کے لیے بے پناہ اداسی میں گھرا رہتا تھا۔ جو بھی تھا وہ ان کے لیے ان کا اپنا خون تھی۔ ان کی بہن تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ ساشا کو ان کا انداز تفکر ایک ڈھکوسلہ دکھائی دیتا تھا۔ ایک دکھاوا لگتی تھی۔

وہ فون کرنے کے بعد بالکل پرسکون ہو گئی تھیں انہوں نے اپنے تئیں فرض ادا کر لیا تھا۔ اور اس کے بعد وہ ہلکی پھلکی سی ہو گئی تھیں۔

شادی کے سارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ مایوں مہندی کے فنکشن قریب تھے۔ پھر عین مہندی کی شام ساشا کی آمد ہوئی تھی۔ ساشا کے ہمراہ ان کی بیٹی عروش اور بیٹا سہراب بھی تھے۔ ساشا کے شوہر اور بیٹا سہراب مردانے میں بیٹھے تھے۔ مگر ساشا نے ملاقات کی غرض سے سہراب کو زنان خانے میں بلوا بھیجا تھا۔ وہ آصفہ سے سہراب کو بھی ملوانا چاہتی تھی۔ آصفہ اتنے برسوں بعد اپنی بہن کو یہاں دیکھ کر خوش ہو گئی تھی۔ اس نے بھرپور طریقے سے اپنی چھوٹی بہن کا والہانہ استقبال کیا تھا۔ آصفہ جب سے درانی انکل کے گھر رہنے لگی تھی اس کے کچھ عرصہ بعد ہی اطلاع ملی تھی کہ آصفہ بیگم کی سوتیلی والدہ یعنی ساحرہ بیگم کسی خاص عمل کے دوران ہی اس جہان فانی سے کوچ کر گئی ہیں۔ اور اس دنیا میں ساشا بالکل ہی اکیلی رہ گئی ہے۔ مگر ساشا کو اس دکھ بھرے موقع پر بھی آصفہ کی آمد اور اس کی ہمدردی سخت گراں گزری تھی۔ جو زہر اتنے سالوں میں ساحرہ بیگم نے ساشا کے دل میں بو دیا تھا۔ وہ اب ایک ننھے سے بیج سے قد آور تناور درخت کی صورت اختیار کر چکا تھا۔

ساشا ایک مغرور سی نگاہ اطراف میں بکھرے ہوئے بھانت بھانت کے چہروں پر پھیلی حسرت کو دیکھ کر تنفر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے ایک نخوت بھری نگاہ خوش باش چہرے والے حسن پر ڈالی تھی۔ جو اب ایک بھرپور مرد بن چکا تھا۔ خوش باش دکھائی دے رہا تھا۔ اور حسن کی سرخوشی وہ کہاں دیکھ سکتی تھی۔

"ادھر آؤ دری خالہ جان سے سلام کرو۔"

آصفہ بیگم نے درشہوار کو بلایا تھا۔ پکار پڑنے پر لڑکیوں کے جھرمٹ میں سے ایک بے حد حسین دلکش سی نازک اندام لڑکی مؤدب انداز میں اٹھ کر ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ساشا دم بخود اس لڑکی کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ وہ تھی ہی اتنی پیاری کہ ایک نگاہ میں ہی مدمقابل شخص کو اپنا اسیر کر لیتی تھی۔ اور ساشا سے اس وقت دری کے چہرے سے نگاہیں پھیرنا ہی دنیا کا دشوار ترین کام لگنے لگا تھا۔ جبکہ عقب میں کھڑے ہوئے سہراب کا تو گویا دل ہی دھڑکنا بھول گیا تھا۔ وہ دری کے دو آتشہ حسن پر فریفتہ ہو چکا تھا۔ ایک نظر کی محبت کا ذکر تو سنا تھا مگر اب اس پر پہلی نگاہ دل کے آر پار اتر چکی تھی۔

''کیسی ہیں آپ خالہ جانی۔'' دری کی آواز میں بھی جھرنوں جیسی خوبصورتی پنہاں تھی۔ وہ سحر زدہ سی اس لڑکی کو دیکھتی چلی گئی تھیں۔

''ماشاء اللہ کیا قد کاٹھ نکالا ہے دری تو کہیں سے بھی آپ کی بیٹی نہیں لگ رہی اس قدر خوبصورت ہے کہ نگاہ ٹھہرتی ہی نہیں۔'' ساشا کے لہجہ میں کاٹ تھی۔ اور اس کی نگاہوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ جو درشہوار کو ہراساں کر گئی تھی۔

''یہ عروش ہے سہراب سے چھوٹی ہے میرے رب نے سالوں بعد مجھے اولاد سے نوازا تھا۔ میں تو مایوس ہی ہو گئی تھی مگر شادی کے چھ سال بعد سہراب اور پھر عروش نے آ کر میری زندگی مکمل کر دی تھی۔ کوئی بندش سی تھی۔ کھلنے کی دیر تھی۔ پھر میری گود بھی ہری ہو گئی۔ سہراب حسن سے دو سال ہی چھوٹا ہو گا۔'' ساشا کا انداز ہر ہر بات جیسے طنز سا تھا۔

دراصل آصفہ کی شادی بعد میں ہوئی تھی۔ مگر اس کی فوراً ہی سنوائی ہو گئی تھی۔ اور گود بھر گئی تھی۔ مگر اس سے پہلے چار سال بیاہی بہن کی گود ہنوز سونی تھی۔ مگر اس میں بھلا اس کا کیا قصور تھا۔ پھر حسن کی پیدائش کے دو سال بعد سہراب کی پیدائش ہوئی تھی۔ اور ادھر آصفہ کے یہاں درشہوار نے اپنی روشنی بکھرائی تھی۔

مگر آصفہ بیگم نے ان باتوں کو بالکل بھی محسوس نہ کیا تھا۔ بلکہ وہ اپنی بہن کی آمد پر ہی اس قدر خوشی محسوس کر رہی تھی کہ وہ محاورتاً ہی نہیں بلکہ عملاً اس کے قدموں میں جیسے بچھی جا رہی تھی۔ بار بار اس کی خاطر مدارت اور تواضع میں لگی ہوئی تھی۔ ساشا کے ہی پاس چپکی بیٹھی تھی۔ جبکہ اس خاص دن میں اس اہم موقع پر سب ہی مہمان اس کی توجہ کے متقاضی تھے۔ اس بات کو سب نے ہی شدت سے محسوس کیا تھا۔ خاص طور پر سسرالی تو محسوس کرتے ہی ہیں اس لیے ریحانہ بیگم کا موڈ بے حد خراب تھا۔ ان سے یوں بھی دوہرا رشتہ استوار تھا۔ ایک تو نند کا دوسرے بیٹی کی ہونے والی سسرال کا مگر اس وقت تو جیسے آصفہ سارے ہی رشتے بھلا کر اپنی بہن پر ہی نثار ہو رہی تھی۔ واری صدقے جا رہی تھی۔ مگر ساشا کے نخرے کم نہ ہو رہے تھے۔ عروش اور دری جلد ہی گھل مل سے گئے تھے۔ ڈھولک کی تھاپ پر وہ دونوں سر اور لے بکھیر رہی تھیں جبکہ سہراب کی نگاہیں تو جیسے دری پر ہی جم سی گئی تھیں۔

ایک دو مرتبہ سرسری لہجہ میں آصفہ بیگم نے سہراب سے کہا بھی تھا کہ اب وہ مردان خانے میں جا کر بیٹھے۔ مگر وہ سنی ان سنی کر گیا تھا۔ ٹس سے مس ہی نہ ہوا تھا۔ اخلاق و اطوار وہ اپنی ماں سے چرالایا تھا۔ سہراب دیوانہ وار محض دری کو ہی تکتا جا رہا تھا۔ اپنے بیٹے کی پسند ناپسند ساشا بخوبی سمجھتی تھی۔ اس وقت وہ بھی دری کی خوبصورتی سے بے حد مرعوب ہوئی تھی مگر اس کی سوچ الگ تھی۔ سہراب تو پوری طرح محبت میں ڈوبا محبت پاش نگاہوں سے دری کو دیکھ رہا تھا۔ دیکھ تو ساشا بھی رہی تھی مگر اس کی گہری سوچ کا نکتہ اصل کہیں اور ہی پہنچا ہوا تھا۔ وہ صرف یک ٹک سپاٹ چہرہ لیے دری کو ہی تکے جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ سہراب کے پکارنے پر وہ بری طرح سے چونک گئی تھی۔

''مام آئی وانٹ ہر ان اینی کاسٹ۔'' (ماں مجھے یہ ہر قیمت پر چاہیے) سہراب کے لہجہ میں شعلہ سا لپکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ ساشا نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اپنے جوان سال بیٹے کو دیکھا تھا۔

وہ فخریہ انداز میں مسکرادی تھیں۔ یوں بھی ضد، انا، اکڑ میں وہ اپنی ماں کا ہی پرتو تھا۔

''میں کچھ کہہ رہا ہوں اور آپ فقط مسکرا رہی ہیں۔ یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔'' وہ زور دے کر بولا تھا۔

ساشا نے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا تھا۔ گویا مزید بولنے سے منع کر رہی ہو۔

''تم نے کہا سہراب اور میں ساری بات سمجھ گئی ہوں۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ماہنامہ حجاب کراچی

مرگِ تمنا

کے قارئین کے لئے ایک خاص تحفہ
دلکش و دلفریب انداز تحریر

ماورا طلحہ

نئی سلسلے وار کہانی

کی ایک ناقابل فراموش کہانی جو آپ کو اپنے سحر میں جکڑ لے گی

اپنی خواہشوں، آرزوؤں اور خوابوں کے بے دام غلامی میں
ہر رشتہ احساس اور جذبہ روندنے والوں کا قصہ

ان لوگوں کی کہانی ہے جو اپنی انا کے محل میں سود و زیاں سے بے نیاز مقید رہے

ان رویوں کے ازالے کا احوال جہاں آبلہ
پائی کے سوا کچھ حاصل نہ تھا

جب تمناؤں کے محل مسمار ہوتے ہیں تو احساسات بنا شور کیے سفید کفن اوڑھ لیتے ہیں
گرتے ہیں تو اٹھانے والے ہاتھ آپ کے ارد گرد موجود ہیں بس فرق اس نگاہ کا ہے
نفرتوں کی بھیڑ میں محبت کیسے تلاش کر سکتے ہیں یہ آپ کو اس ناول میں معلوم ہوگا

اس کہانی میں محبت کی کہانی محبت کی زبانی سنائی جائے گی

بہت جلد حجاب کراچی کے صفحات پر ملاحظہ کیجیے

کہانی پڑھنے کیلئے آج ہی اپنی کاپی بک کرا لیں کہیں دیر نہ ہو جائے

81 نمبر بیرکس ہاکی
کلب آف پاکستان
اسٹیڈیم نزد آنچل پریس
کراچی 75510

03008264242

Pakistanipoint.com

تم نے بال میری طرف پھینکی ہے۔ دیکھو اب کہاں جا کر رکتی ہے۔ فکر نہ کرو۔ تمہاری ہاں وہی کرے گی جو میرا شہزادہ چاہتا ہے۔'' ساشا کی آواز میں محبت چھلک رہی تھی۔

سہراب مسکرا دیا تھا۔ تو گویا اس کی ماں اب اس ساری صورتحال کو سنبھال لینے والی تھی۔ اور اس مسئلے کا حل بھی اس کی ماں نے نکالنا تھا۔ سو وہ اب قدرے پرسکون سا ہو گیا تھا۔ اور مطمئن سا بھی۔

ساشا کی نگاہیں آصفہ بیگم پر مرکوز تھیں۔ جو سب کو کھانا لگ جانے کی خبر دیتی ہوئی مصروف سی تھیں۔ پھر وہ ساشا کی جانب ہی بڑھی تھیں۔ ساشا اپنی کامدار ساڑھی کا پہلو تھامے ایک ادائے بے نیازی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ کھانا بے حد خوشگوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ مردان خانے میں الگ نظام تھا۔ جبکہ زنان خانے میں الگ انتظام تھا۔ زریاب گہری نگاہوں سے دری کو دیکھ رہا تھا۔ پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے پاس چلا آیا تھا۔

''دھان پان سی لڑکی تم بھی کچھ کھالو۔'' زریاب نے مسکرا کر کہا تو دری نے سر جھکا لیا تھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ میری فکر چھوڑیں اور آپ تسلی سے کھائیں۔ میں بعد میں کھالوں گی۔ میں مہمانوں کو دیکھ رہی ہوں۔'' دری نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

اس کے موتیوں جیسے سفید دانت جگمگ کر رہے تھے۔ قدرے فاصلے پر بیٹھی ساشا نے اس منظر کو بے حد گہری نگاہوں سے دیکھا تھا۔ اور سہراب بھی جو اس جانب ہی متوجہ تھا اس نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔ وہ تو پہلی ہی نگاہ میں دری کو سند قبولیت بخش کر اس کے ساتھ جینے مرنے کے تمام مناظر سے لے کر دور تلک کسی اور ہی جہان کی سیر کر چکا تھا۔ اور یہاں کوئی انجان شخص اس وقت دری کے اس قدر قریب کھڑا ہوا التفات کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ پھر دری آگے بڑھ گئی تھی۔ شاید آصفہ بیگم نے اسے کسی کام سے پکارا تھا۔ مگر زریاب کی محبت پاش نگاہوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔ اور ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا تھا۔

کھانے کے بعد رسمیں شروع ہو گئی تھیں۔ سب باری باری حسن کو مہندی لگا رہے تھے۔ منہ میٹھا کروا رہے تھے۔

رسموں کے بعد ساشا نے موقع ملتے ہی آصفہ کو گھیر گھار لیا تھا۔ ایک جانب اسے لے گئی تھی۔

''میں اب اتنے برسوں کے بعد آئی ہوں تو مجھے احساس ہوا ہے کہ دلوں میں کوئی بھی گرہ نہیں رکھنی چاہیے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ ہمارا آپسی تعلق مضبوط ہو جائے۔ میں چاہتی ہوں کہ دری کو اپنے سہراب کے لیے بطور بہو اپنا لوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کا جواب بھی صرف ہاں میں ہی ہوگا۔ کل جب میں بارات میں آؤں گی تو ایک رسم کر لیتے ہیں۔ سارا خاندان آپ کی جانب سے بھی مدعو ہوگا۔ تو سب کو علم بھی ہو جائے گا کہ دری اب میری بہو بنے گی۔''

ساشا اپنی دانست میں ساری صورتحال نبٹائے مطمئن سی تھی۔ مگر اس کی ایک کے بعد ایک فرمائش سن کر خود آصفہ کا منہ ہونق سا کھل کر رہ گیا تھا۔ دری کے حوالے سے اس کا اس قدر استحقاق جتانا بے حد اچنبھے کا سبب تھا۔

''ساشا! دری کے حوالے سے حتمی فیصلہ صرف بلال صاحب اس کے بابا کریں گے۔ میں نے اپنے اور اپنے بچوں کے تمام تر اختیارات ان کو سونپ دیئے ہیں۔''

آصفہ بیگم نے نجانے کیوں واشگاف لفظوں میں انکار نہیں کیا تھا۔ اسے ایک خوف سا تھا کہ وہ یہاں کوئی تماشا نہ کھڑا کر دے۔ وہ اپنی چھوٹی بہن کی فطرت سے آگاہ تھی۔

''ارے چھوڑیں بھی۔ کون نہیں جانتا کہ آپ کی ساری جائیداد کو کس خوبی سے بلال صاحب نے ہتھیایا ہے۔ اور درانی انکل نے محبت کا خوب ناٹک رچا کر ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا ہے۔ ہم ماں اور بیٹی سے بھی آپ کو بری طرح سے متنفر کر دیا۔ یہ ساری چال کس قدر خوبصورتی سے رچائی ہے۔ ان باپ بیٹے نے، اور پھر جائیداد کہیں اور نہ چلی جائے اس خوف میں دونوں کے اندر آپ کا رشتہ اپنے بیٹے سے جوڑ دیا۔ اس کے بعد تو کوئی خوف بھی باقی نہ رہا۔ ہمارے سے میل جول ہی منقطع کروا کر دم لیا۔'' ساشا کا لہجہ بے حد گونجیلا سا تھا۔

آصفہ بیگم نے ہراساں ہو کر اطراف میں دیکھا تھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اسے شرمندگی اور خفت سی ہو رہی تھی۔ کیونکہ ساشا کا اونچا اونچا بولنا سب کو ہی اپنی جانب متوجہ کر گیا تھا۔ بالخصوص ریحانہ اور خود بلال صاحب ادھر بھی سن رہے تھے۔ اس وقت ساشا کی فضول گوئی نہ صرف بلال بلکہ حاضرین محفل میں موجود سب ہی سن چکے تھے۔ آصفہ بیگم تو اپنی جگہ جم سی گئی تھیں۔ انہوں نے ہی ضد کر کے اس بہن کو دعوت دی تھی۔ اور وہی ہوا تھا۔ جس کا خدشہ بلال نے کیا تھا۔ وہ آج بھی اپنی فطرت سے باز نہ آئی تھی۔ آصفہ بیگم اپنی جگہ پر مجرم سی بن گئی تھی۔

''یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ کیا یہ موقع مناسب ہے ان باتوں کے لیے، پھر رشتے ناطے یوں کھڑے ہو کر برسوں کے بعد اچانک طے ہونے والی ملاقات میں زیر بحث نہیں لائے جاتے ہیں۔ تم مہمان ہو۔ قابل احترام ہو۔ مگر اس سے زیادہ کی توقع تم ہرگز مت رکھنا۔ مجھے ان کی عزت و توقیر اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ جب سب نے مجھے بے سہارا کر دیا تھا۔ اس وقت یہ بلال ہی تھے جنہوں نے مجھے سہارا دیا تھا۔ اپنا نام اپنا پیار دیا تھا۔'' آصفہ بیگم بھی اطراف سے اٹھتی ہوئی نگاہوں کے سوالوں کے جواب دینے کے لیے اپنے لہجہ کو قدرے بلند کرتے ہوئے صاف الفاظ میں دوٹوک بات میں جواب دے گئی تھی۔

''بس رہنے دیں آپا۔ جب لڑکی کے ساتھ دولت کے انبار بھی مل رہے ہوں تو محبت و احترام بھی مل ہی جاتا ہے۔ سہارا تو تب بنتا جب آپ خالی ہاتھ ہوتیں۔ دولت کے ڈھیر تھے۔ جن پر چل کر یہ صاحب آپ کو اپنانے کے لیے دوڑے چلے آئے تھے۔ اور ہاں دری تو میری ہی بہو بنے گی۔ یہ تو ایک طے شدہ بات ہے۔ یہ تو میں نے ٹھان لی ہے۔''

ساشا کے لہجہ ایک کھلا چیلنج تھا ریحانہ بیگم جو ایک تو اپنے والد اور پھر اپنے بھائی کے خلاف سن کر پہلے ہی غیظ و غضب میں مبتلا تھی۔ اس وقت دری کے حوالے سے سن کر بری طرح سے چونک گئی تھی۔ اور یوں بھی ریحانہ بیگم کو تو لگتا تھا کہ دری پر صرف ان کا ہی حق ہے۔ اور اس لیے فوراً ہی میدان میں کود پڑی تھیں۔

''اے بہن اپنا راستہ ناپو، بہت سن لیا تمہارا فضول نامہ۔ تم کیا سمجھتی ہو سب لوگ تمہاری ماں جیسے ہوتے ہیں۔ جس نے راتوں رات اپنے شوہر کو مروا دیا۔ محض اس کی جائیداد ہتھیانے کے لیے اور پھر اس کے بعد بھی اس کا چلن ٹھیک نہ تھا۔ جبکہ شوہر اس پر جان نثار کرتا تھا۔ ایسی راہ چلتی ہوئی عورتوں میں ہم اپنی بچی کا رشتہ نہیں کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے ماں کا خون دوڑ رہا ہے تمہاری رگوں میں۔ وہی بے وفائی بے اعتنائی ہوگی خون میں رچی بسی اور ماں کے نقش قدم پر چل رہی ہو وہ تو تمہاری گفتگو سے ہی ظاہر ہو گیا ہے۔ بہر حال میری طرف سے انکار ہے۔ اور اب ہماری خوشیوں کو ملیامیٹ نہ کرو۔ یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔ یوں بھی وہ میرے بیٹے سے منسوب ہے۔ برسوں سے زریاب اور دری کا ناطہ استوار ہے۔'' ریحانہ بیگم نے شعلہ بار نگاہوں سے ساشا کو دیکھا تھا۔

ساشا کا چہرہ اس وقت غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اور آنکھوں میں واضح طور پر انتقام کی پرچھائی تھی۔ اور اس وقت سہراب اور عروش بھی ماں کے دائیں بائیں آن کھڑے ہوئے تھے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

صورتحال بے حد گھمبیر ہو رہی تھی۔ دری تو اس وقت بے حد پریشان حال تھی۔ کہ یہ سب اس کی ذات کو لے کر بحث چل رہی تھی۔ جبکہ گل افشاں، دری کے دونوں ہاتھوں کو تھامے ایک جانب لے گئی تھی۔

''پریشان نہ ہو تم۔'' گل افشاں نے اسے ہمت و حوصلہ دیا تھا۔ مگر اس نے دیکھا تھا کہ اس وقت بلال صاحب کے چہرے پر شدید تناؤ اور اشتعال کے تاثرات تھے۔

''ارے جا رہی ہوں میں۔ مگر جاتے جاتے یہ بتا دوں کہ اب یہ لڑکی صرف میرے بیٹے سہراب کی عزت بنے گی۔ ورنہ برباد ہو جائے گی، میرے بیٹے نے اس پر انگلی رکھ دی ہے۔ اب میں بھی دیکھتی ہوں کہ کون مائی کا لال اس کو اپناتا ہے۔ کس کا اتنا جگرا ہے۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں؟'' ساشا کا لہجہ بے حد جنونی ہو گیا تھا۔

''ساشا اب تم یہاں سے جا سکتی ہو۔ میری غلطی تھی کہ میں نے اپنے مجازی خدا کی بات نہیں مانی۔ تمہیں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہاں بلا لیا۔ انہوں نے تو پہلے ہی

کہا تھا کہ تمہاری بہن کبھی بھی تمہاری اور تمہاری اولاد کی خوشیوں میں خوشی محسوس نہیں کر سکتی ہے۔ مگر میں بھی کیا کروں، عناد کا جو بیج تمہاری ماں نے تمہارے دل میں بو دیا ہے۔ تم نے ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی آبیاری کی ہے۔ اسے تناور درخت بنا دیا ہے۔ کیا میری بیٹی کوئی شوپیس ہے جس پر انگلی رکھ دی اور وہ اس کی ملکیت ہو گی۔ ایسا نہیں ہوتا۔ تم اپنے طرز عمل اپنی طرز گفتگو پر غور کرو۔ پھر تمہیں ندامت محسوس ہو گی۔ اور میری بیٹی کو بددعا مت دو۔ اگر دعا دینا تمہاری سرشت میں شامل نہیں ہے۔'' آصفہ ایک تسلسل سے بولتی چلی گئی تھی۔ اتنے سالوں میں دل کا سارا غبار تھا لفظوں میں ڈھلتا چلا گیا تھا۔

ساشا نے اس کی کسی بھی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی، اور دندناتی ہوئی ایک قہر آلود نگاہ سب پر ڈالتی ہوئی وہاں سے رفو چکر ہو گئی تھی۔ مگر اس کی نگاہ میں ایک کاٹ تھی۔ ایک گہرے طوفان کی دستک تھی۔ اس کی زخمی نگاہ میں ایک غصہ پنپ رہا تھا۔

اس کے جاتے ہی جیسے سارے اپنے حواس میں لوٹ آئے تھے۔ خوشی میں عجیب سی یاسیت گھل گئی تھی۔ مہمان جانے لگے تھے۔ گھر میں صرف اہل خانہ اور ریحانہ ہی رہ گئے تھے۔ آصفہ اپنی بہن کے جانے کے بعد دل شکستگی لیے رونے لگی تھی۔ دل بوجھل اور کچھ افسوس بھی تھا۔ ان کی ایک آرزو نے ماحول کو کبیدہ کر دیا تھا۔ بلال صاحب کی بات بھی اپنی جگہ بالکل درست تھی مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتی جو اپنوں کی نارسائی پر اندر ہی اندر کٹ رہا تھا۔ اپنوں نے صرف آنسو دیئے تھے۔ واقعی اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب تو انہیں تمام عمر کے لئے اپنی بہن کو خیر باد کہنا ہی تھا۔

''مجھے دکھ ہو رہا ہے۔ اور آنسوؤں کی وجہ بھی یہی ہے مگر اس سے زیادہ مجھے فکر ہے میرا دل ہول رہا ہے۔ اس نے جاتے جاتے دری کو برباد کر دینے کی دھمکی دی ہے۔ اس کی آنکھوں میں پنہاں چیلنج بہت ہی واضح تھا۔ اس کا یوں اتنا خود اعتمادی سے بات کرنا مجھے دہلا رہا تھا۔'' آصفہ بیگم کسی اور کے سامنے تو اپنے دل کا مدعا نہ رکھ سکی تھی۔ مگر اپنے مجازی خدا کے سامنے وہ اپنی پریشانی کا اظہار کرنا نہ بھولی تھیں۔

''خیر اور شر دو قوتیں ہیں۔ ان میں برسوں سے ایک جنگ چلتی آ رہی ہے۔ اور اب اس کے لفظوں کو سر پر سوار نہ کریں۔ وہ عام انسان ہے گوشت پوست سے بنی ایک عام انسان ہے اس نے کیا بگاڑ لینا ہے ہماری بیٹی کا۔ جب تک رب کی رضا نہ ہو۔'' بلال صاحب اسے تسلی دلاسے دے رہے تھے مگر دل میں کہیں کسی کونے میں وہ خود بھی افسردہ سے تھے۔ ان کو علم تھا کہ ساشا اپنی ماں ساحرہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سفلی علوم کا سہارا لیتی ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی اپنی انا کے پرچم کو بلند و بالا رکھنے کے لیے کسی حد تک بھی جا سکتی ہے۔ اور پھر یہ تو بھرے پرے خاندان میں اس کی انا کا مسئلہ بن چکا تھا۔ اس کے ردعمل کے طور پر اس کا کوئی نہ کوئی کارروائی کرنا بھی بنتا ہی تھا۔ رات جیسے تیسے کٹ گئی تھی۔ اور صبح شزاء کی گھر میں آمد کا پہلا دن تھا۔ اور گھر سے حسن کی بارات روانہ ہونا تھی۔

❖❖❖❖

''مام اب کیا کریں گی آپ؟ انہوں نے تو بھری محفل میں ہماری بے انتہا انسلٹ کی ہے۔ اور اس کا چہرہ محو ہی نہیں ہو رہا ہے۔ اب لگتا ہے جیسے وہ لڑکی میرے قلب، میرے ذہن میرے اندر تک تحلیل ہو کر رہ گئی ہے۔ اوہ مام مجھے تو لگتا ہے جیسے میں پاگل ہو جاؤں گا۔'' سحر اب گھر آنے کے بعد بھی مسلسل دری کا ہی ذکر کر رہا تھا۔

ساشا مسلسل خاموش تھی۔ یک ٹک خلا میں جیسے کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں مرکوز کیے بیٹھی تھی۔

''اوہو بھائی آپ کو تو اپنی ہی فکر ہے۔ کل کا فنکشن ہے اور مام میں نے تو بہت سارے دن پہلے آپ کو بتا دیا تھا کہ یہی نہیں بلکہ ارسل نے تو باقاعدہ شادی کا کارڈ بھی دیا تھا۔ آفس جا کر اب پتا نہیں کل ہم جا رہے ہیں ناں؟'' عروش نے ایک ہی تکرار سے عاجز آ کر کہا تھا۔

''ذرا کارڈ تو لانا عروش شادی کا۔'' ساشا ایک دم ہی چونکی تھی۔

ساشا کسی گہری سوچ۔ عروش کو ان کے اس انداز سے اب عجیب سی بے زاری ہوتی تھی۔ مگر وہ ماں کی ہر بات کو جیسے ماننے پابند ہی تھی۔ پھر ماں کی بات ماننے کے علاوہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اس کے پاس کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ اس نے اٹھ کر بے دلی سے کارڈ ماں کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ ساشا نے دیکھا۔ اس نے کارڈ کھولا اور زیرلب مسکرا دی تھی۔ پھر با آواز بلند اس نے کارڈ پڑھا تھا۔

''شزاء اور حسن، آہاں مجھے شک تو خیر کل ہی ہو گیا تھا، جب میں نے حسن کی دلہن کا نام پوچھا تھا تو مجھے آصفہ نے بتایا تھا کہ وہ لڑکی جس سے حسن کی شادی ہو گی اس کا نام شزاء ہے۔ یہ تو تمہاری دوست نکلی عروش۔ گہری دوست۔'' ساشا کے لہجہ میں دبا دبا سا جوش تھا۔

''واؤ۔ مام، رئیلی۔'' عروش بھی ایک دم جیسے پرجوش سی ہو گئی تھی۔ ''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔'' عروش خوش دلی سے بولی تھی۔

''ہاں یہ بہت ہی اچھی بات ہے۔ پہلے تو میں شاید اس رشتے میں دیر سویر کرتی مگر اب میں ارسل سے جلد از جلد ملنا چاہتی ہوں۔ ہم سب ہی جائیں گے۔ اس شادی میں شرکت کے لیے کیوں سہراب تم کیا کہتے ہو؟'' اب کے ساشا نے براہ راست سہراب سے پوچھا تھا۔

سہراب نے بھی ماں کی بات کا اثبات میں جواب دیا تھا۔ درحقیقت اب ساشا کسی قیمت پر بھی پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہ تھی۔ دوسری طرف سہراب کا بھی دری میں اتنا زیادہ دلچسپی لینا اس کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ سہراب ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اور وہ اس کی اب تک بچپن سے لے کر جوانی کی دہلیز تک ہر خواہش خواہ بڑی ہو یا چھوٹی پوری کرتی چلی آئی تھی۔ تو پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ جسے اپنی زندگی کا جیون ساتھی منتخب کرے اس کو وہ یکسر نظر انداز کر دیتیں۔ یوں بھی درشہوار خود ساشا کو بھی بے حد بھائی تھی۔ اس لیے انہوں نے کل شادی کے فنکشن میں شرکت کی ٹھان لی تھی۔ پختہ عزم کر لیا تھا۔ لیکن اپنی بہن کی جانب سے نہیں بلکہ شزاء کی جانب سے۔

☆☆☆☆

''بعض لوگ مکافات عمل کی زد میں آ کر بھی اکڑفوں نہیں چھوڑتے ہیں نہ ہی اس شخص سے معافی کے طلبگار ہوتے ہیں جس کی ذات کی دن رات دھجیاں اڑاتے رہے ہوں۔ مضحکہ میں ذات کو رکھ دیتے ہوں۔ اور اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ یونہی دوسروں کی تذلیل و تضحیک میں گزار دیتے ہیں۔ یہ لوگ دراصل ناعاقبت اندیش بے حس لوگ ہیں جو اپنی نگاہوں کے سامنے بھی سب ہوتے دیکھ کر انجان بن جاتے ہیں۔ اور پھر ایک دن مکافات عمل ان کو پکڑ لیتی ہے۔''

پیر کمال شاہ بخت صاحب کے سامنے اس وقت جو عورت دوزانو بیٹھی ہوئی زاروقطار رو رہی تھی۔ اس کو شاہ صاحب کے الفاظ تقویت دینے کی بجائے سخت رنج و غم میں مبتلا کر رہے تھے۔ وہ عورت ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اس نے عمر کا ایک طویل حصہ اپنی بھابھی کو رلانے اور اس کی تضحیک میں گنوا دیا تھا۔ حتیٰ کہ اپنے بھائی کو اس کی منکوحہ بیوی سے متنفر کر دیا تھا۔ جھوٹے الزامات عائد کر کے شوہر کے دل سے گرانے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی بیوی کی معمولی سی کوتاہی کو نند نے بڑا کر کے پیش کیا تھا۔ نتیجتاً آئے دن میاں بیوی میں رہنے والے جھگڑے بڑھنے لگے تھے۔ جو ان میں فاصلوں اور دوریوں کا سبب بنتے چلے گئے تھے۔ مگر ان سب سے اس عورت جس کا نام ثریا تھا۔ اس وقت خوشی محسوس کر رہی تھی۔ اور اپنی فاتحانہ مسکراہٹ سے بھابی کے دل کو تار تار کر دیا کرتی تھی۔ وقت نے پانسہ پلٹ دیا تھا۔ یہ ایک ایسا خاندان تھا جہاں برادری سے باہر رشتہ ناطہ کو بے حد معیوب سمجھا اور گردانا جاتا تھا۔ اور جب ثریا کی اپنی ہی بیٹی نے اپنی ماں کے سامنے ہی نہیں اپنے باپ کے سامنے بھی ڈٹ کر کھڑی ہو کر اپنے ساتھ پڑھنے والے ایک لڑکے سے محبت کا اعتراف کیا۔ اور اس سے شادی کرنے کا عندیہ دیا تب اس کی عزت مٹی ہو گئی تھی۔ مکافات عمل نگاہوں کے سامنے گردش کر رہا تھا۔ مگر وہ آج بھی یہ ماننے کو تیار نہ تھی کہ یہ سب اس کی اپنی بھابی کی دی گئی بددعاؤں کا شاخسانہ ہے۔ بھابی کی بددعاؤں کے حصار میں وہ اور اس کی بیٹی آ گئی تھی۔ وہ اب یہاں سکون کے لیے سکون قلب کے لیے یہاں آستانے پر حاضری دینے آئی تھی۔ مگر یہاں تو اس کو اس کا اصل چہرہ دکھا دیا گیا تھا۔ پیر صاحب نے اس کا مکروہ چہرہ اس کے سامنے عیاں کر دیا تھا۔

ثریا کا سر جھکا ہوا تھام۔ ندامت سے اس کا چہرہ اوپر نہیں اٹھ رہا تھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"آہ میں نے اس پر بدکاری کا الزام لگایا تھا۔ اور آج میری ہی بیٹی میرا چہرہ کالا کرگئی۔" ثریا رو رہی تھی۔ اس کا وجود ہچکولے لے رہا تھا۔ آنسوؤں سے تر تھا۔

"جاؤ اس لڑکی سے معافی طلب کرو۔ جانتی ہو جب تک خدا کے بندے راضی نہ ہو جائیں رب راضی نہیں ہوتا ہے تجھے تبھی معافی ملے گی جب وہ تجھے دل سے معاف کر دے گا۔ اور سکون قلب بھی مل جائیگا۔" پیر صاحب نے قطعیت بھرے انداز میں کہا تھا۔

پیر کمال صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے اسے وہاں سے رخصت ہونے کا اشارہ کر دیا تھا۔ اور وہ اپنی ذات میں بکھرے تمام دکھوں کی پوٹلی اٹھائے وہاں سے چل دی تھی۔ نجانے کیوں پیر کمال صاحب بھی اس وقت تھکن سی محسوس کرنے لگے تھے۔ یوں بھی سر شام یہ آخری عرض گزار لانے والی دکھیاری عورت تھی۔ وہ اٹھ کر زنان خانے میں آگئے تھے۔ جہاں ہما اپنی اماں کے ساتھ بیٹھی پالک کے پتے چن کر کاٹ رہی تھی۔ پیر صاحب کو دیکھ کر ہما نے سر پہ مزید اچھے طریقے سے دوپٹہ اوڑھ کر بال بھی ڈھک لیے تھے۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ انہوں نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا تھا۔ فریدوں جو اس وقت درخت کے تنے سے ٹیک لگائے اپنی کتابوں میں سر دیئے ورق گردانی میں منہمک تھا۔ بابا سے پہلے ہی لپک کر دروازے تک جا پہنچا تھا۔ دروازے پر بلال صاحب کا خاص ملازم کھڑا ہوا تھا۔

"صاحب نے درخواست بھیجی ہے کہ آپ اور اہل خانہ ان کے بیٹے کی خوشی میں شریک ہو کر ان کی خوشی کو سرخرو کر دیں۔" ملازم کا سر مؤدب انداز میں جھکا ہوا تھا۔ شاہ صاحب چونک سے گئے تھے۔ جو عقب سے ساری بات سن چکے تھے۔

"ہمیں تو بھول ہی گئے تھے کہ بلال صاحب کے بیٹے کی آج شادی ہے۔ فریدوں بیٹا آپ تیار ہو کر چلے جائیں۔ مناسب سمجھیں تو بیگم صاحبہ آپ بھی ساتھ چلی جائیں۔ ہما بیٹی ہمارے ساتھ رہے گی۔"

ان کا کہنا ہی کسی حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ نہ صرف اہل خانہ کے لیے بلکہ تمام لوگ ان کی بات کو من وعن اسی طرح تسلیم کرتے تھے۔ پھر ڈرائیور کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

"صاحب سے میری جانب سے معذرت کر لینا۔ دراصل آج طبیعت کچھ بوجھل سی ہے۔ دل ہمک رہا ہے کہ رب العزت کی بارگاہ اقدس میں چند وظائف پیش کیے جائیں یہ وقت ہمارا اور رب کا ملاقات کا وقت ہوا کرتا ہے۔ اس میں دنیاداری کو شامل کرنا ہمارے جی کو آمادگی نہیں ہو رہی ہے۔ بہرحال ان سے کہہ دینا میرے اہل خانہ شریک ہیں اور میری دعائیں شامل حال ہیں۔ یہ لیں۔"

کچھ سوچ کر لمحہ بھر کے لیے وہ رک سے گئے تھے۔

پھر انہوں نے اپنی تسبیح ملازم کی جانب بڑھا دی تھی۔

"یہ متبرک نایاب تحفہ ہے۔ حسن بیٹے کے لیے ہے۔"

ملازم نے بے حد عقیدت مندی سے تسبیح ان کے ہاتھ سے لے لی تھی۔ اسے عقیدت سے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔

"آپ باہر انتظار کریں۔ ہم ابھی آتے ہیں۔"

فریدوں نے ڈرائیور کو کہا تو وہ سر اثبات میں ہلاتا ہوا تابعداری سے رخصت ہو گیا تھا۔

"بیٹا جی انتظار طویل نہ ہو، مناسب نہیں لگتا۔ ہما بیٹا چائے پانی بھجوا دیں۔" پیر صاحب نے فریدوں سے کہا تھا۔

ان کی بات سنتے ہی ان کی زوجہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے تیار ہی کیا ہونا تھا۔ اندر کمرے کی جانب چل دی تھیں۔ سادگی اس گھر کا شعار تھی۔ ہر ہر شے سے نفاست اور صفائی عیاں تھی۔ ایسا بھی نہ تھا کہ دولت تھی ہی نہیں۔ مگر وہ سائل پر لٹا دی جاتی تھی۔ خاندانی طور پر مال و متاع تو ان کے قدموں میں رل رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے لٹاتے تھے۔ اور پھر اس سے دوگنا ہی رب العالمین عطا کر دیتے تھے۔

ان کی بہت سی اراضی تھی۔ جہاں سے حساب کتاب باقاعدگی سے آیا کرتا تھا۔ یہ گدی نشین تھے اور ان کے لیے مال و دولت ہرگز بھی دلچسپی کا سبب نہ تھا۔ اس لیے ہر شے میں ہی سادگی کا عنصر بے حد نمایاں اور غالب تھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ان کے بچوں کی تربیت بھی اس روش پر ہوئی تھی۔ ہما ماں کا پرتو تھی۔ وہی سلیقہ مندی، کفایت شعاری اور تابعداری اس کا خاصہ تھی۔ ماں کے اٹھتے بیٹھتے وہ ان کا سایہ بنی رہتی تھی۔ ابھی بھی ماں کے جاتے ہی اس نے چائے اور بسکٹ باہر بھجوا دیئے تھے۔ بوا زہرہ برسوں کی ملازمہ تھی۔ مگر وہ سب ان کو بی اماں ہی کہا کرتے تھے۔ بوا زہرہ نے اس کے ہاتھ سے ٹرے تھام کر باہر بھجوادی تھی۔ گھر کے تمام کھانے خواتین خود بناتی تھیں۔ بوا زہرہ اوراوپر تلے کے کاموں کے لیے رکھی گئی تھی۔ اس نے جھٹ پٹ پالک کا سالن تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ عشاء کے وقت کھانا دسترخوان پر چن دیا جاتا تھا۔ وہ بے حد سگھڑ اور سلیقہ شعار بچی تھی۔ اگرچہ دل کے کسی کونے میں لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کے جی میں بھی اپنی دوست دری سے ملنے کا ارمان جاگا تھا۔ مگر اسے اس نے دل میں دبا لیا تھا کہ بابا کا حکم ہر بات سے افضل گردانا جاتا تھا۔

ہاجرہ بیگم دس منٹ بعد ہی ایک سادہ سے لباس میں اپنی دانست میں مکمل تیار باہر آ گئی تھیں۔ لبادے سے اپنے آپ کو پوری طرح ڈھانپنے کے بعد وہ روانگی کے لیے بالکل تیار کھڑی تھیں۔ فریدوں بھی قدرے توقف سے لباس تبدیل کر آیا تھا۔ وہ دونوں چل کر باہر گاڑی میں آن بیٹھے تھے۔ جہاں شوفر ان کی آمد کا ہی منتظر تھا۔ فریدوں کی نگاہوں میں ماضی کے چند خوبصورت مناظر آن رکے تھے۔

وہ ایک سیدھا سادہ نوجوان تھا۔ جس کو اپنی کتابوں کی دنیا میں مست رہنا پسند تھا۔ اگرچہ دونوں گھرانوں میں میل ملاقات تھی۔ مگر وہ چونکہ ایک مذہبی پس منظر رکھتا تھا۔ اس لیے اپنی حدود و قیود کا وہ بطور خاص خیال رکھا کرتا تھا۔ جب بھی وہ ہما کو کالج سے واپس لینے آتا تھا۔ تب اس کو اکثر دری دکھائی دیتی تھی۔ در شہوار اور ہما کلاس فیلو تھیں۔ دری اپنی دلکشی صناعی میں مکمل پیکر تھی۔ اس کی دل موہ لینے والی شرارتی مسکان صرف فریدوں کو دیکھ کر ہی لبوں کا احاطہ کیا کرتی تھی۔ اسے فریدوں کا نظریں جھکا کر ہما کے انتظار میں کھڑے رہنا ایک انوکھا سا احساس دلاتا تھا۔

ایک روز ہما کے ساتھ دری بھی تھی۔ اس لئے فریدوں کی نہ چاہتے ہوئے بھی دری کے خوبصورت چہرے پر نگاہ ٹک سی گئی تھی۔ دری پردہ نہیں کرتی تھی۔ صرف سر کو اسکارف سے لپیٹ لیتی تھی۔ جبکہ اس کے برعکس ہما مکمل طور پر اپنا چہرہ ڈھانپے ہوئے ہوتی تھی۔

"کیا آپ ہمیشہ ہی نگاہیں یوں ہی جھکا کر رکھتے ہیں۔ یا کبھی اطراف میں دیکھ بھی لیتے ہیں۔ اگر آپ یونہی نگاہیں جھکائے رکھیں گے تو مجھے خطرہ ہے کہ آپ کسی روز میری اکلوتی دیرینہ دوست کا ایکسیڈنٹ نہ کر دیں۔"

فریدوں نے دیکھا وہ اسے سراسر چھیڑ رہی تھی۔ اس کے اندر کچھ گدگدایا تھا۔ وہ ایک دلکش لڑکی تھی۔ جو اس وقت اس کے بے حد قریب کھڑی اس سے باز پرس کر رہی تھی۔ وہ بھی نہایت شریر انداز میں جس میں اپنائیت گھلی ہوئی تھی۔ فریدوں کو تو یوں بھی دری بہت بھاتی تھی۔ بہت پہلے بچپن میں جب وہ ایک ننھی سی بچی تھی۔ تب بھی وہ جب بھی اپنے بابا کے ساتھ ان کے دالان میں آ کر بھاگتی پھرتی تھی۔ بے حد اشتیاق سے ہر ہر شے کا مشاہدہ کیا کرتی تھی۔ ہاجرہ بیگم اسے اکثر گڑ والے چاول اپنی گود میں بٹھا کر کھلایا کرتی تھیں کہ اسے ہاجرہ بیگم کے ہاتھ کے چاول بے حد پسند تھے۔

فریدوں نے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں جواب دیا تھا۔

"رب العالمین نے جہاں عورت کو پردے کا حکم دیا ہے وہاں مرد کو بھی پردے سے آزاد نہیں کیا۔ سب سے پہلے مرد کو اپنی نظریں جھکانے کا حکم دے کر اس پر ایک حد بندی مقرر ہے۔ رہی بات ہما کی تو میں اپنی ہمشیرہ کی حفاظت کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہوں۔ راستوں پر نگاہ ٹکائے منزل پر گامزن رکھتا ہوں اپنی مسافت کو۔"

فریدوں نے بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا تھا اور اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ دری بھی بہت غور سے اس کی بات سن رہی تھی۔

"آپ کا لہجہ کس قدر گداز اور ناصح والا ہے نا۔ بالکل آپ کے بابا جیسا۔" دری کی بات پر فریدوں کے چہرے پر ایک مدھم سی شکستہ سی مسکان ابھر آئی تھی۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں تھی کہ وہ اپنے بابا جان سے والہانہ محبت کرتا تھا۔ یہ محبت فقط باپ بیٹے کی محبت نہ تھی بلکہ اس میں تعظیم اور تفاخر بھی تھا۔ ہر بچہ جب پروان

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

چڑھتا ہے اور شعور کی منزل پر قدم رکھتا ہے تو وہ اپنے والدین کو ہی اپنے لیے مثال سمجھتا ہے۔ مگر فریدوں کو فخر تھا کہ اس نے اپنے والد کو اپنے لیے مثال سمجھا۔ واقعی ایک ایسی ہستی تھی کہ ان کی تعظیم و توقیر جتنی بھی کی جاتی کم تھی۔ انہوں نے اپنی خواہشات نفسانی کو ترک کر کے پس پشت ڈال کر محض رب العزت کے راستے پر چلایا تھا۔ نہ صرف خود اس راستے پر ہو لیے تھے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اوروں کو بھی اس راستے پر مشعل راہ بن کر دکھایا اور چلایا تھا۔ اور یہی روشنی کافی تھی۔

اس لیے فریدوں بخت کو اپنے بابا سے بہت محبت تھی۔

”جزاک اللہ اگر آپ ایسا سمجھتی ہیں تو بہر حال بابا جیسا تو نہیں ہو سکتا ہوں۔ بلکہ میں تو آج تک بابا کی مسند پر غلطی سے بھی نہیں بیٹھا۔ اوّل تو ان کے تعظیم کے اعتبار سے دوسرا میں خود بھی اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا ہوں۔“

درشہوار کے چہرے پر اس وقت بے حد عقیدت پھیل گئی تھی۔ اسے ہما گاہے بہ گاہے فریدوں کے بارے میں بتاتی رہتی تھی۔ ہما کی ہی بابت اسے معلوم تھا کہ فریدوں جب سجدے میں گریہ وزاری کرتے ہیں تو دعائیں اور مناجات قبولیت حاصل کر لیتی ہیں۔ یہی نہیں اپنے بابا کی طرح اس کا زیادہ وقت یا تو پڑھائی میں یا ذکر واذکار میں گزرتا تھا۔ مگر وہ کس قدر سادگی سے عاجزی و انکساری خود کو ایک عام انسان کہہ رہا تھا۔ یہی تو اس خاندان کا وصف تھا پہچان تھی۔ انہیں اپنی عبادات کا زعم نہ تھا۔ اپنے اندر پنپتے ہوئے افکار و خیالات کا ادراک تو تھا مگر اس کا غرور نہ تھا۔ بلکہ اس کو پھیلانے اور اس کے پرچار کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتے تھے۔ یہی ان کی زیست کا کل تھا۔

”اچھا بھائی اب چلتے ہیں گرمی نے حالت دگرگوں کر دی ہے۔“ جبکہ ہما اور فریدوں کے جاتے ہی حسن بھی دری کو لینے آپہنچا تھا۔

ماضی کے دھندلکوں میں کچھ حسین یادیں تھیں۔ درحقیقت جس دن فریدوں کو علم ہوا تھا کہ اپنے کزن زریاب سے اس کا نام منسلک ہے۔ اس دن سے فریدوں نے مزید محتاط رویہ اپنا لیا تھا۔ دری سے بات چیت بالکل ہی ترک کر دی تھی۔ اس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ اس کی نگاہ کسی صورت اس کے چہرے پر نہ پڑے۔ وہ جانتا تھا کہ بعض اوقات انسان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہوتا ہے۔ اور کوئی ایک چہرہ انسان کے قلب میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اسی میں محو ہو کر ہر چہرے میں اسی ایک چہرے کو تلاشتا رہتا ہے۔ فریدوں کو احساس تھا کہ اس کے دل میں اس لڑکی کے لیے خاص جذبات پنپ رہے تھے۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس کی منزل تو کچھ اور تھی۔

ہما کے ذریعے اسے حسن کی شادی کی اطلاع ملی تھی۔ تب بھی اس نے کچھ نہ کہا تھا۔ اب بھی وہ محض اپنے بابا کے حکم کی تعمیل میں جا رہا تھا۔ ورنہ دری سے سامنا اس کے لیے اندرونی خلفشار کا سبب بن رہا تھا۔ مگر اس نے دل کو کٹھور کر لیا تھا۔ پرپیچ راستوں پر چلنے سے بہت بہتر تھا کہ وہ اپنے دل پر پتھر کی سل رکھ لیتا، یہ کٹھن مرحلہ تو تھا مگر اسے یہ کرنا ہی تھا۔

❖❖❖❖

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

حسن اور شزاء ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھے ہوئے بے حد مسرور لگ رہے تھے۔ اگرچہ یہ رشتہ سراسر بزرگوں کی منشاء کے مطابق ہی طے پایا تھا۔ مگر شزاء اور حسن دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی بھی تھی۔ مہمان آ رہے تھے اور شزاء کی والدہ سب کو خوش دلی سے ویلکم کر رہی تھی۔ نکاح کے بعد باقاعدہ سب کا منہ میٹھا کروایا گیا تھا۔ تب ہی مین گیٹ سے تمکنت سے چلتی ہوئی ساشا دکھائی دی تھی۔ ان کو آتا دیکھ کر ارسل تیزی سے ان کی جانب لپکا تھا۔ وہ تو نجانے کب سے ان کی آمد کا ہی منتظر تھا۔ شزاء کی والدہ بھی ساشا سے بہت ہی محبت سے ملی تھیں۔ اور اس کے بعد عروش کا ماتھا چوم رہی تھیں۔ گلے لگا رہی تھیں سامنے کا منظر بے حد صاف تھا کہ ساشا اور اس کے اہل خانہ شزاء کی والدہ کے لیے خاص اہمیت کے حامل تھے۔ موقع کی مناسبت سے یہ سارا منظر دیکھ کر آصفہ بیگم نے فی الفور خاموشی ،،بہتر سمجھا تھا۔ ریحانہ بیگم نے آصفہ کا بازو تھاما تھا اور اسے ایک جانب لے گئی تھی۔

”یہ یہاں کیا کر رہی ہے اس دن اتنی منہ زوری کے

بعد یہ عورت دوبارہ یہاں کیوں نظر آ رہی ہے؟'' ریحانہ بیگم کے لب و لہجہ میں واضح غصہ کی جھلک تھی۔

''مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ یہاں کیا کر رہی ہے۔ جبکہ آپ کے سامنے ہی بات اس وقت اس دن ختم ہو گئی تھی۔'' آصفہ بیگم کے لہجہ میں بے بسی چھلک رہی تھی۔ دونوں جانب رشتے اس کی ذات سے جڑے ہوئے تھے۔ وہ چاہ کر بھی اپنا دامن نہیں چھڑا پا رہی تھی۔

''ٹھیک ہے اگر تم نہیں جانتی تو اب تم پر یہ لازم ہے کہ اس محفل میں تم اعلان کرو کہ ٹھیک ایک ہفتے بعد اگلے جمعہ کو دری اور زریاب کا سادگی سے نکاح یا منگنی ہوگی۔ یہ ایک سادہ سی گھریلو تقریب ہوگی۔ مگر اس تقریب میں اس لیے بتایا جا رہا ہے تاکہ یہ خوشی دوچند ہو سکے۔'' ریحانہ بیگم نے پینترا بدلتے ہوئے دبا دباؤ ڈالا تھا۔

بلال صاحب جو کافی دیر سے اپنی بیوی اور بہن کو آپس میں چہ میگوئیاں کرتے دیکھ رہے تھے۔ اور آصفہ کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ اس لیے وہ بخوبی صورتحال کو بھانپ گئے تھے کہ آصفہ کسی کشمکش کا شکار ہے۔ یوں بھی ساشا کو وہ بھی دیکھ چکے تھے۔ اس لیے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے وہ قریب آ گئے تھے۔ ساری بات جان کر انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ بیٹی ذات یوں بھی پرائی ہی ہوتی ہے۔ آج نہیں تو کل اسے پرائے گھر جانا ہی ہوتا ہے۔ سو انہوں نے آصفہ کا ہاتھ دبا کر انہیں اس فعل کے لیے ذہنی طور پر آمادہ کرنا چاہا تھا۔ برسوں کی رفاقت تھی کہ اب ایک دوسرے کے اشارے بھی بخوبی سمجھے جانے لگے تھے۔ وہ بلال صاحب کی منشاء کو سمجھ گئی تھی۔

سہراب اپنی ماں کے پہلو سے لگا بیٹھا پر اشتیاق نگاہوں سے دری کو دیکھ رہا تھا۔ یہ سب اس کے علم سے کوسوں دور تھا۔ تبھی ریحانہ بیگم نے آصفہ اور بلال صاحب کو بلا کر ایک اہم اعلان کیا تھا۔ جس کے مطابق اگلے جمعہ کو زریاب اور دری کی باقاعدہ منگنی کی تقریب ہوگی۔ اور اس کے ٹھیک ایک ماہ بعد شادی ہوگی۔ زریاب یہ سن کر کھل اٹھا تھا۔ اس نے فاتحانہ نگاہوں سے سہراب کو دیکھا تھا۔ سہراب کی نگاہوں میں خون اتر آیا تھا۔ مگر وہ ساشا کے کہنے کے مطابق بالکل چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔

تبھی اس اعلان کے بعد مٹھائی بٹنے لگی تھی۔ ریحانہ بیگم نے ایک پلیٹ میں رنگا رنگ مٹھائی بھری تھی۔ اٹھا کر ساشا کے پاس سیدھی چلی آئی تھی۔

''یہ لیں آپ بھی منہ میٹھا کریں۔ آپ کے لیے تو شاید یہ میٹھا بھی آج زہر بن گیا ہے۔'' ریحانہ بیگم نے شوخ لہجہ میں فاتح عالم بن کر کہا تھا۔

ساشا بے حد سنجیدہ سی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر پلیٹ تھام لی اور وہ ریحانہ بیگم کے منہ پر الٹ دی تھی۔ مٹھائی زمین بوس ہو چکی تھی۔

''تم ایک احمق عورت ہو اپنے ہی بیٹے کو موت کے منہ میں دھکیل رہی ہو۔ اس لڑکی کی وقعت ہی کیا ہے۔ صرف میرے بیٹے کی پسند کی اہمیت ہے۔ تم دیکھنا اب اور اب دیکھنا ہی ہوگا تمہیں۔ سر پکڑ کر روؤ گی تم۔'' ساشا غیظ و غضب میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ جوالہ مکھی بنی ہوئی تھی۔ ماں کو اٹھتا دیکھ کر سہراب اور عروش بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ شکر ہے یہ ایک کونے میں بیٹھے تھے تو سب کی توجہ اس جانب بالکل بھی نہ تھی۔ اگر کسی نے دیکھا بھی تھا تو یہی سمجھا کہ مٹھائی گر گئی ہے۔

''آنٹی میرا خیال ہے اب ہم چلتے ہیں۔'' عروش کو جاتے جاتے بھی اپنا معاملہ سیدھا رکھنا یاد رہا تھا۔ سیدھی شہزاء کی ماں کی طرف گئی تھی۔

فریدوں نے البتہ اس سارے منظر کو شروع سے اختتام تک دیکھا تھا۔ ساشا کا غصیلا انداز اور اس میں خفگی کی جھلک بھی محسوس کی تھی۔

فریدوں نے ساشا کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر دیکھا تھا۔ اور اپنے قلب میں سخت بے چینی محسوس کی تھی۔ جسے وہ کوئی سا بھی نام دینے سے قاصر تھا۔ مگر ساشا کے چہرے کی چمک اور آنکھوں میں جو ایک خاص تاثر تھا۔ وہ بے حد خطرناک سا لگا تھا۔ وہ دھمکی ہی نہیں دے رہی تھی اس کے ارادے بھی برے ہی لگ رہے تھے۔ پھر وہ ان سب کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔

''اماں اب ہم بھی چلتے ہیں۔'' فریدوں نے بھی ہاجرہ بیگم کو چلنے کا کہا تو وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک تو دل میں بے پناہ اداسی نے ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ دری اس کی نہیں کسی کی امانت تھی اور یوں دل بوجھل سا ہونے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

لگا تھا۔ سو واپسی کی راہ لی تھی۔

❁❁❁❁❁

وہ ایک پر آشوب سی رات تھی۔ بارش مسلسل برس رہی تھی۔ گھن گرج کے ساتھ، کبھی کبھار بجلی بھی چمک رہی تھی۔ ایسے میں تاریکی کا سینہ چیر دیتی تھی۔ ساشا اس وقت ہر شے بھلائے ہوئے تیزی سے پرانے قبرستان میں مخصوص سمت میں چلتی چلی جا رہی تھی۔ اس کا رخ ایک طرف دائیں جانب تھا۔ اسے، اطراف میں بکھری ہوئی ان قبروں اور کتبوں سے کوئی بھی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی لفظ منجمد ہو کر رک سا گیا تھا۔

انتقام

برسوں پہلے اس کی ماں بھی اسے یہاں لایا کرتی تھی۔ جب بھی معاملہ اپنے ہاتھوں سے سرکتا ہوا محسوس ہوتا تو وہ بلا جھجک یہاں جگن بابا کے پاس آجاتی تھی۔ اتنے برسوں میں اس کا یہاں بہت بار آنا ہوا تھا۔

وقار نے جب اس پر شادی کے بعد اس کی ماں پر بدچلنی کا طعنہ دیا تھا۔ تب ساشا نے خود کو بے حد کمزور محسوس کیا تھا۔ وقار کے ساتھ اس کی مکمل لو میرج تھی۔ دراصل والدہ کے انتقال کے فوری بعد جائیداد کی منتقلی اس کے حصے میں آ گئی تھی۔ وہیں یونیورسٹی میں وہ اور وقار ایک دوسرے کے بے حد قریب آتے چلے گئے تھے۔ اس کے پاس دولت تھی۔ خوبصورتی تھی۔ مگر خاندانی عصمت نہ تھی۔ اس کی رگوں میں اگرچہ اس کے شریف النفس باپ کا خون دوڑ رہا تھا۔ مگر ماں کا مشکوک کردار سب کی زبان زد عام پر رہا تھا۔

یہی کہانی سب کی زبان پر تھی کہ اس کی ماں نے محض دولت کی حرص میں اس کے باپ سے شادی رچالی تھی۔ یہی نہیں مزید طاقت کے حصول کے لیے اس کا جگن نامی بابا سے میل جول اور ایک مخصوص جاپ کے دوران اس کا لقمہ اجل بن جانا کسی سے بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ رہی تھی۔ وہ کس لیے جاپ کر رہی تھی۔ اس کا خاص مقصد کیا تھا۔ یہ بہر حال پھر بھی ایک بند کہانی تھی۔ مگر ساشا تو اپنی ماں کے ہی نقش قدم پر چلتی تھی۔ پھر وقار کی اندھی محبت نے ان دونوں کو رشتہ ازدواج میں باندھ دیا تھا۔ وقار کے گھر والوں نے بھی مصلحتاً اس کو قبول کر ہی لیا تھا۔

جگن بابا کا رویہ اس کے ساتھ یوں بھی ہمیشہ ہی بے حد نرم ہوا کرتا تھا۔ اس کی ماں کا حوالہ ہی ایسا تھا۔ جو اس کی شاگرد تھی۔ وہ منزل پر پہنچ چکی تھی۔ جگن بابا اپنی مخصوص نشست پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔ اس کے سامنے الاؤ جل رہا تھا۔ جس میں نجانے کیا پک رہا تھا۔ اور سڑے ہوئے جسم کی جلنے کی سرانڈ چہار سو پھیلی ہوئی تھی۔ مگر وہ بالکل آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت بھی وہ بے حد خاموشی سے ادب سے اس الاؤ کے دوسری جانب عین جگن بابا کے سامنے مؤدب سی بیٹھ گئی تھی۔ جگن بابا نے زیر لب مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔ آنکھوں میں نرم سا تاثر در آیا تھا۔ جیسے اسی کا انتظار ہو۔

"آ ہی گئی ہو تو اب بتا کیا چاہتی ہے تو؟ مگر یاد رکھ وہ لڑکی اب تیرے بیٹے کے کسی کام کی نہیں رہی ہے وہ آ بھی گئی تو یوں جیسے روح کے بنا جسم۔ جس کی اپنی کوئی سوچ نہیں ہوتی۔ وہ محض کٹھ پتلی کی مانند جی لے گی۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں وہ پھر بھی ایک دن پلٹ جائے گی۔ اب بتا تو کیا چاہتی ہے؟" جگن بابا نے گھمبیر خاموشی کو اپنی گونج دار آواز سے توڑا تھا۔ اس آواز کے ارتعاش میں گہرائی تھی۔ عمیق گہرائی۔

"میرے دل میں آگ لگی ہوئی ہے بابا۔ اس عورت نے جو میری سوتیلی بہن ہے سب کے سامنے میری اور میری ماں کی توہین کی ہے۔ اس لڑکی کو حاصل کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے لیکن اگر وہ نہ بھی ملے تو میں چاہتی ہوں کہ وہ کسی دوسرے کے بھی قابل نہ رہے۔ وہ برباد ہو جائے، ہر گزرنے والا دن اس کو بربادی سے مزید قریب تر کرتا چلا جائے۔ اس کی ماں اس کے گھر والے اس کے لیے روئیں تڑپیں اور اس کی حالت دیکھ دیکھ کر جیتے جی مر جائیں۔" ساشا کے لہجہ میں خونخوار درندے جیسا طیش اور غراہٹ تھی۔ اس کا چہرہ اس وقت اندرونی خلفشار کی وجہ سے بے پناہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں بھی بدلہ کی طلب چمک رہی تھی۔

اس کے انداز کو جگن بابا نے ستائش بھری نگاہوں سے دیکھا تھا۔ اور ہنکارا بھرا تھا۔ پر سوچ انداز میں وہ [illegible] سر جھکائے بیٹھا رہا تھا۔ پھر ایک دم خاموشی میں اس کی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ننھی سی آواز سنائی دی تھی۔

"وہ لڑکی جو حسن کی بیوی بن گئی ہے وہ بہت کام کی ہے۔ اس سے ہم بڑے بڑے، کام لے سکتے ہیں۔ ایک دروازہ کھلا رکھنا بہت ضروری ہے۔ تو کسی طریقے سے اس لڑکی کو اپنا ہم نوا بنا لے۔ اور اس کو کہہ کر در شہوار کا کوئی من کا کپڑا لا دے۔ یاد رہے صرف اسی کا پہنا ہوا کپڑا لانا ہے۔" جگنن بابا کی بات پر ساشا کے چہرے پر چمک سی بڑھ گئی تھی۔

"یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے میں یہ کام کرلوں گی۔" ساشا نے دبے دبے جوش کے تحت کہا تھا۔

"تو ٹھیک ہے اگلے منگل وار کو تو آجانا۔ پھر آگے کیا کرنا ہے کیسا کرنا ہے یہ سب، ہم پر چھوڑ دے۔ تیری چنتائیں دور ہوجائیں گی۔ صرف ہمارا کام آگے کا ہوگا۔" جگنن بابا نے یہ کہہ کر آنکھیں موند لی تھیں۔ جیسے اب مزید پوچھ کہنے سننے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔

ساشا بھی ایک سمجھدار عورت تھی۔ معاملہ فہم بھی تھی اسی لیے خاموشی سے تیز تیز قدموں سے واپسی کی راہ پر ہولی تھی۔

❖❖❖❖

حسن حجلہ عروسی میں پہنچا تو شزاء سر جھکائے بیٹھی تھی۔ مدھری مسکان نے اس کے لبوں کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ پھوہ اس لیے مطمئن تھا اسے شاید مطلوبہ شے مل گئی تھی۔ حسن نے گہری سانس لی تھی۔

"یہ جڑاؤ کنگن آپ کے لیے ہیں جو امی جان نے بہت چاہت سے منتخب کیے۔ تھے۔ اور یہ انگوٹھی آپ کے لیے میری نے بطور خاص آپ کے لیے منتخب کی تھی۔" وہ اپنے تئیں بہت ہی اطمینان سے بولا تھا کہ جیسے اس کے ان الفاظ سے شزاء کو خوشی ملے گی۔ مگر شزاء کا تو جیسے دل بجھا سا گیا تھا۔

منہ دکھائی کا تحفہ بھی دیا تو کسی اور ہی کی پسند کے مطابق یعنی اس شخص کی اپنی کوئی سوچ یا پسند ہی نہیں تھی۔ اس کی بھنویں تن سی گئی تھیں۔ وہ اکلوتی تھی۔ اور پھر نازنین بیگم نے اسے اپنے ہاتھوں کا چھالا بنا کر رکھا تھا۔ اسی لیے وہ کچھ نک چڑھی سی بھی تھی۔ دولت کے انبار نے بھی اس کے دماغ میں خناس سی بھر دی تھی۔

"کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ سب آپ نے اپنی پسند سے لیا ہوتا۔" اس نے شکوہ کر ہی ڈالا تھا۔

"میرے لیے اپنی بہن اور ماں کی خواہش بے حد معتبر ہے اور اگر تمہیں یہ پسند نہیں آیا تو کوئی بات نہیں۔ بعد میں میرے ساتھ جا کر من پسند تحفہ لے لینا۔" حسن نے بات کو رفع دفع کرنا چاہا تھا۔ اس کی بات سن کر شزاء بھی وقتی طور پر خاموشی اختیار کرگئی تھی۔

لیکن اس کا انداز بجھا بجھا سا ہی تھا۔

"دیکھو شزاء میں نے ہمیشہ ہر بات میں اپنی ماں کو ہی فوقیت دی ہے۔ کیا تم اپنی ماں کو ترجیح نہیں دیتی؟" حسن کا سوال دوٹوک سا تھا۔

"بالکل میری مام میرے لیے سب سے خاص ہیں۔ مگر میں اب ایک شادی شدہ لڑکی ہوں۔ کبھی بھی اپنی مام کو آپ پر ترجیح نہیں دوں گی۔ یوں بھی رشتے اس وقت نبھتے اور اچھے لگتے ہیں جب ان کو اس کے اصل مقام پر رکھا جائے۔ کسی اور کو کسی کا حق غصب کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔" وہ تیز تیز لہجہ میں بولتی چلی گئی تھی۔ حسن نے تاسف سے اسے دیکھا تھا۔ وہ ایک دن کی دلہن تھی اور اس نے آتے ساتھ ہی اپنے خیالات کا پرچار کرنا شروع کردیا تھا۔

بہر حال دونوں جانب عجیب سی تناؤ کی کیفیت آچکی تھی۔ دونوں فریقین ہی مصالحت کی راہ اختیار کرنے پر آمادہ دکھائی نہ دے رہے تھے۔ حسن بے زار سا اٹھ کر باہر کمرے سے نکل گیا تھا۔ اور باہر ٹیرس پر آکر گہرے سانس لینے لگا تھا۔ جیسے اپنے اندر کا غصہ اور ابال کم کرنا چاہ رہا ہو۔ تبھی بلال صاحب کا وہاں سے گزر ہوا تھا۔ وہ بری طرح سے چونک گئے تھے۔ حسن کا اس طرح مضطرب سا کھڑے ہونا ان کو بری طرح سے کھٹکنے لگا تھا۔ سو وہ چپ چاپ وہاں سے واپس نہیں لوٹ سکتے تھے۔

"کیا بات ہے برخوردار؟ کیا دوستی بناؤ گے ہمارے ساتھ۔ چپ چاپ بتا دو معاملہ کیا ہے۔ دیکھو میں بہت اچھے طریقے سے معاملہ حل کرواسکتا ہوں کہ شادی شدہ زندگی کا برسوں کا تجربہ ہے میرے پاس میری اس بند مٹھی میں۔" بلال صاحب نے بالکل خاموشی سے حسن کے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔
بلال صاحب نے باقاعدہ مٹھی بند کر کے اس کے سامنے لہرائی تھی۔ وہ اس قدر تناؤ میں بھی زیر لب مسکرادیا تھا۔

"ایسا کچھ خاص نہیں اسے برا لگا کہ منہ دکھائی میں جو تحفہ لیا ہے وہ امی اور دری کی پسند کا ہے۔ اس میں میری اپنی پسند کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ کیا یہ بہت بری بات ہے؟ جس کا ایشو بنالیا جائے۔" وہ خفگی سے الجھے الجھے لہجے میں بولتا چلا گیا تھا۔

"حسن بیٹے۔ بہ ظاہر معمولی سی دکھائی دینے والی بات دوسرے فریق کے لیے زود و رنج کا سبب بھی ہوا کرتی ہے۔ تمہیں اس قدر صاف گوئی کی کیا ضرورت تھی؟ چپ چاپ منہ دکھائی تھما دیتے۔ کسی بھی لڑکی کو اپنے مجازی خدا سے لیے گئے تحفے پر صرف اس کی پسند کی مہر ہی درکار ہوا کرتی ہے۔ تم اب عقل مند ہو گئے تو ہر قدم پھونک کر رکھو گے۔ ورنہ تو زندگی عذاب بن جائے گی۔ یوں ذرا ذرا سی بات کو لے کر منہ پھلا لینا کہاں کی دانش مندی ہے۔ اگر وہ خفا ہو رہی تھی تو تم منا لیتے۔ یوں بھی زندگی کی یہ گاڑی اب دونوں کی محبت سے ہی نبھے گی۔ اس طرح بات بات پر روٹھنا منانا بہت مشکل ہو جائے گا۔ ابھی جاؤ۔ جا کر معافی مانگ لو۔ وہ مان جائے گی۔ مجھے امید ہے کہ اب تک اسے بھی اپنے لفظوں کا احساس ہو گیا ہوگا اگر مناسب سمجھو تو مسکرا کر جاؤ اس بار۔" بلال صاحب نے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ حسن نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ یوں بھی اس کا ساری رات یہاں ٹیرس پر کھڑے ہونے کا کوئی بھی ارادہ نہ تھا۔

شزاء بے آواز آنسوؤں سے رو رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے حسن کو بھی تاسف نے آگھیرا تھا۔ اس ایک رات کے لیے اس کے کیا کیا ارمان تھے اور کیا ہو گیا تھا۔ وقت مٹھی میں ریت کی مانند پھسل رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ سارے حسین پل غارت ہو جاتے۔ اس نے شزاء کی پلکوں پر آئے آنسو اپنی محبت بھری پوروں سے چن لیے تھے۔ اور زندگی نے ایک نئے سفر کا آغاز کر دیا تھا۔ بیوی ذرا سا مان ہی تو چاہتی ہے۔ وہ مل جائے تو اپنا آپ وار دیتی ہے۔

❖❖❖❖

شزاء بہت جلد ہی گھر کے تمام افراد خانہ کی عادات و اطوار کا بطور مشاہدہ کر کے ہر ایک کی عادت بخوبی جان گئی تھی۔ حسن کا بار بار اپنی والدہ اور بہن کو بے حد اہمیت دینا اسے بے حد کھلتا تھا۔ وہ شادی کے اولین دنوں میں دعوتوں میں مصروف رہی تھی۔ کچھ دعوتیں اس کے اپنے میکے کی جانب سے دی گئی تھیں۔ اور کچھ سسرالی دعوتیں تھیں۔ اسے حسن کا جاتے وقت نہ صرف خود والدہ صاحبہ سے اجازت طلب کرنا بلکہ اس کو بطور خاص نصیحت کرنا کہ وہ امی سے مل کر اور خدا حافظ کر کے جائے، اسے بے حد گراں گزرنے لگا تھا۔ گھر کے اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی تھا کہ دس بجے تک ہر فرد گھر میں ہو۔ خواہ وہ بلال صاحب ہوں یا خود حسن ہو۔

ایک شام جب وہ حسن کے ساتھ اسی طرح کسی جگہ جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اور اسے مجبوراً ساس کو سلام اور حاضری دینی پڑ رہی تھی۔ جو اس کے لیے محض گلے کا طوق ہی تھی۔ اس وقت آصفہ بیگم نے اس کے نک سک سے تیار سجے سنورے روپ کو بولتی نگاہوں سے دیکھتے کسی شش و پنج کا شکار لہجہ میں کہا تھا۔

"سنو حسن بہو کو جلدی گھر لے آنا۔ اس طرح یہ جس انداز میں اوپر سے نیچے تک سونے میں لدی ہے۔ جانتے ہو کہ آج کل حالات کیسے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی اونچ نیچ ہو۔ اس لیے فوراً نکل آنا کھانے کے بعد۔"

آج شزاء کے میکے میں تھی۔ اس لیے آصفہ بیگم کا کہنا آج شزاء کو عام دنوں میں کہنے کی نسبت زیادہ ناگوار گزر رہا تھا۔

"آنٹی آپ کا دل وسیع ہوتا تو یہ کہہ دیتیں کہ آج رات تم لوگ وہیں سو جانا لیکن ہمیشہ کی طرح یہی کہا کہ جلدی آجانا میں اس جلدی جلدی کی رٹ سے عاجز آچکی ہوں۔ ہم کیا ننھے بچے ہیں۔"

شزاء کا انداز سراسر تضحیک آمیز تھا۔ اتنے دنوں کا صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا۔ آصفہ بیگم نے قدرے حیرت اور جھینپ سے عقب میں کھڑے حسن کو دیکھا تھا جو خود بھی اس افتاد ناگہانی پر حواس باختہ دکھائی دے رہا تھا۔

"یہ تم کس انداز اور کس لہجہ میں امی سے بات کر رہی ہو۔ ابھی اسی وقت معافی مانگو۔" حسن نے سخت لہجہ میں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

سرزنش کی تھی۔ شزاء بھل بھل رونے والی ہوگئی تھی۔

"ارے تم کیوں بچی کو ڈانٹ رہے ہو۔ وہ اتنے دل سے تیار ہوئی ہے۔ بیٹا دیکھو شزاء وہ سب درست ہے مگر میں نے کبھی بھی حسن کو سسرال میں رکنے سے منع نہیں کیا ہے۔ اس کی اپنی عادت ہے برسوں سے اسے اپنے بستر پر ہی آرام دہ نیند ملتی ہے۔ دوسری بات اس نے آفس بھی تو جانا ہوتا ہے ناں۔ اس لیے میں نے کبھی اسے وہاں رکنے پر مجبور ہی نہیں کیا۔ جلدی کی رٹ نہیں لگا رہی بلکہ آج کل کے حالات۔"

آصفہ بیگم وضاحتیں دے رہی تھیں جب شزاء نے ان کی بات بیچ میں ہی اچک لی تھی۔

"حالات...... حالات تو یہاں کے بھی ٹھیک نہیں لگ رہے ہیں مجھے۔ اور میں کیوں معافی مانگوں میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے۔ جو بات بات پر مجھے ہی جھکنا پڑتا ہے۔ میں جاتی ہی نہیں۔ نہ جاؤں گی اور نہ ہی جلدی کی گردان سننے کی ضرورت ہوگی۔" شزاء نے پاؤں پٹختے روتے منہ بسورتے واپس اپنے کمرے میں قدم رکھ دیئے تھے۔ اس کے جاتے ہی حسن نے ایک شرمندہ سی نگاہ ماں کے چہرے پر ڈالی تھی۔ جہاں گہرا تاسف چھایا تھا۔

"حسن یہ بہت بری بات ہے۔ اس کے گھر والے کھانے پر تم دونوں کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ تمہیں کیا ضرورت تھی اسے ٹوکنے کی۔ بعد میں بھی یہ بات ہوسکتی تھی۔ اب جاؤ جا کر اسے منا کر لاؤ۔ میں نہیں چاہتی کہ بات طول پکڑ جائے۔ جب مرضی جاؤ جب مرضی آؤ۔ آج کے بعد میں نہیں بولوں گی کچھ بھی۔" آخری جملہ ادا کرتے ہوئے آصفہ بیگم کے لہجہ میں شکستگی گھل آئی تھی۔

"اف مام اب آپ بھی اس کی طرح بچوں کی طرح بی ہیو کر رہی ہیں۔" حسن نے پریشانی سے کہا تھا۔

"نہیں بیٹا جب بچے جوان ہوجاتے ہیں تو پھر والدین کو اپنے لفظوں کا چناؤ کرتے وقت بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ہر وقت کی نصیحت شاید آج کل کی اولاد اور نوجوان نسل کو گراں گزرتی ہے۔ بیٹا اگر وہ ناسمجھ ہے تو تم ہی کچھ نرمی برتو۔ اس کو پیار محبت سے سمجھاؤ۔ جس راستے سے تم لوگوں کا گزر ہونا ہے وہ ایک ویران علاقہ ہے آئے دن کی وارداتوں کی خبر ٹی وی پر گردش کرتی رہتی ہے۔ ماں ہونا تو دل پریشان ہوجاتا ہے۔ اب احتیاط کروں گی آئندہ۔"

آصفہ بیگم کا لہجہ بکھرا ہوا تھا۔ حسن کو ملال نے گھیر سا لیا تھا۔ اس کی بیوی کو ہزار مرتبہ کا سمجھایا ہوا بھی پلے نہیں پڑا تھا کہ وہ اس کی ماں سے بدسلوکی نہ کرے۔

بہر حال آصفہ بیگم نے جیسے تیسے اس سارے معاملے کو رفع دفع کر کے بہو اور بیٹے کو رخصت کروایا تھا۔ وہ بالکل بھی روایتی ساس نہ تھیں اور نہ ہی روایتی ساس بننے کی ان کو حسرت تھی۔ وہ تو صرف اپنے بیٹے اور بہو کی دائمی خوشیوں کی تمنائی تھیں۔

شزاء نے اس دن کے بعد سے جیسے ہر ہر بات کو شدت سے محسوس کرنے اور اس کو سر پر سوار کرلینے کی ٹھان لی تھی۔ دعوتوں کا سلسلہ ختم ہوگیا تھا۔ مگر عملاً ابھی تک اس کا گھر گھرہستی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ وہ من موجی تھا۔ چاہتی تو کمرے میں سوئی پڑی رہتی۔ اور موڈ ہوتا تو باہر نکل آتی۔ اس کے مزاج کے تحت ہی اب آصفہ بیگم نے اسے بالکل ہی روکنا ٹوکنا چھوڑ دیا تھا۔ اس دن بھی اس کو سوتا ہوا دیکھ کر وہ کلس کر رہ گئی تھیں۔ بلال اور حسن کب کے آفس کے لیے روانہ ہوچکے تھے۔ دری بھی کالج جاچکی تھی پیچھے صرف وہ اور شزاء تھے۔ دوپہر کا وقت آن پہنچا تھا۔ مگر شزاء اپنے کمرے سے ہی نہ نکلی تھی۔

شزاء گہری نیند میں تھی جب مسلسل بجنے والی فون کال سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس نے کسل مندی سے فون اٹھایا تھا۔ اور عروش کالنگ دیکھ کر وہ ایک دم سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

"ہیلو عروش۔" اس نے لہجہ حتی الامکان ہموار رکھنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس کے لہجہ میں بھاری پن عیاں تھا۔

"تو بی بنو ابھی تک محو استراحت ہیں۔" عروش نے ہنستے ہوئے پوچھا تھا۔

"ظاہر ہے یار تم جانتی ہو کہ میں نیند کے معاملے میں کتنی پوزیٹو ہوں۔ میری نیند پوری نہ ہو تو میرا سر درد کرتا رہتا ہے۔ کل ایک مووی دیکھتے ہوئے وقت خاصا ہوگیا تھا۔ دیر سے سوئی تو دیر سے ہی جاگنا ہوا۔"

"اچھا سنو میری طرف آجاؤ۔ یا کہو تو میں آجاتی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ہوں۔ بہت دن ہوئے تم سے بات چیت نہیں ہوئی تمہاری تو شکل دیکھنے کو ترس گئی ہوں۔ اور تمہاری مام بتا رہی تھیں کہ شزاء ادھر بھی نہیں آئی بالکل بھی شادی کے بعد۔ کیا بات ہے شادی شدہ زندگی میں خوب دل لگ گیا ہے کیا؟"

"خدا کا نام لو۔ کیسا دل لگنا۔ بس شادی شدہ زندگی کے تقاضے نبھا رہی ہوں۔ آج تو کسل مندی سی ہو رہی ہے۔ تم ہی آجاؤ نا۔" شزاء نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"میں؟ سوچ لو۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہاری ساس کو پسند نہیں آئے گی میری آمد؟" عروش نے ہچکچاتے ہوئے کہا تھا۔

"ارے کیوں بھلا۔ کسی کی کیا جرأت کہ میری دوست کی آمد پر منہ پھلائے تم آجاؤ۔ کب تک آؤ گی۔ ایسا کرنا دو گھنٹے تک آنا۔ سو کر اٹھ کر فوراً تو مجھ سے کچھ کیا ہی نہیں جاتا۔ فریش ہونے میں ہی گھنٹہ لگ جائے گا۔"

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی تھی۔ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا تھا۔ جو ایک بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ آج تو بہت ہی سوئی تھی وہ پھر جلدی سے فون بند کر کے فریش ہونے کے لیے چل دی تھی۔ عروش کے آنے سے پہلے اسے فریش ہو کر بہت اچھا سا تیار بھی تو ہونا تھا۔ پھر ساس کو بھی اپنی دوست کی آمد کی وجہ بتانی تھی۔ اس لیے وہ سیدھا واش روم میں گھس گئی تھی۔

❖❖❖❖

عروش نے فون بند کرتے ہوئے اپنے قریب بیٹھی ہوئی ساشا سے سوالیہ انداز میں پوچھا تھا کہ کیا اس نے بات طریقے سے کی ہے۔

"شاباش بالکل ٹھیک ہو گیا۔ اب جس کام کے لیے جارہی ہو وہ کر کے ہی لوٹنا اور ہاں جب تک وہ لوگ خود نہیں بتاتے تم چپ ہی رہنا۔ اس ملاقات پر نہیں اس کے بعد میں سوچ رہی ہوں شزاء کو گھر بلا کر ساری بات بتا دیتے ہیں۔ ہماری رشتہ داری سے متعلق بھی۔ کیونکہ کل کلاں بھی یہ بات کھل ہی جائے گی کہ آصفہ میری سوتیلی بہن ہے۔" ساشا نے پرسوچ انداز میں کہا تھا۔

"مام لیکن......" عروش ہچکچاہٹ کا شکار تھی۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم جیسا کہتی ہو ویسے ہی تو کرتی ہوں میں۔ ارسل کے گھر جانا ہے ناں پرسوں۔ تم سوچ لو اگر تم ارسل کے ساتھ شاندار طریقے سے زندگی بسر کرنے کی خواہش مند ہو تو پھر تم کو اپنے بھائی کی خواہش کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔" ساشا نے اس کی بات سرے سے کاٹ دی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ چلی جاتی ہوں۔" عروش نے بے زاری سے کہا تھا۔

عروش چاہتی تھی کہ اب ساشا اس کے اور ارسل کے رشتے کے حوالے سے کچھ پیش رفت کرے۔ اور ساشا نے اسے واشگاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اسے پہلے اپنے بھائی کے لیے ایک چھوٹا سا کام کرنا ہوگا۔ اسے کام کچھ عجیب سا تو لگ رہا تھا کہ اسے آصفہ آنٹی کے گھر جا کر دری کا لباس لانا تھا۔ بہت ہی مشکل کام تھا۔ مگر اس سے زیادہ اس نے جب ساشا سے باز پرس کی تو ساشا نے اسے بری طرح سے جھڑک دیا تھا کہ اپنے کام سے کام رکھے۔

عروش نے اس لیے بھی ماں کے سامنے سارے ہتھیار ڈال دیئے تھے کہ ساشا اسے ہر ماہ ایک معقول رقم جیب خرچ کے نام پر دیا کرتی تھی۔ ارسل کی طرف سے دباؤ آرہا تھا کہ اس کی والدہ گھر آنا چاہ رہی تھیں۔ ارسل کی ماں ان کا گھر بار دیکھنے کی خواہش مند تھیں۔ مگر اس سے پہلے ہی ساشا نے شرط رکھ دی تھی کہ پہلے وہ لوگ ارسل کے گھر جائیں گے اور اس کا گھرانہ دیکھیں گے۔ جبکہ یہ بڑا ہی عجیب سا تقاضا تھا جبکہ شادی پر سب سے میل ملاقات ہو ہی چکی تھی۔ مگر ارسل نے کسی نہ کسی طریقے سے روشنی بیگم کو منوا ہی لیا تھا۔ سو دو دن بعد ارسل کے گھر ساشا اور وقار صاحب نے جانا تھا۔ سہراب کو بھی ساتھ لے کر جانا تھا۔ اور اس سے قبل عروش چاہتی تھی کہ اس کی ماں کا موڈ بالکل ٹھیک رہے گا۔ کیونکہ ساشا کے موڈ کا کچھ بھی پتا نہ چلتا تھا۔ پل میں ماشہ پل میں تولہ۔

عروش جلدی سے تیار ہو کر نکل آئی تھی۔ سڑک پر گاڑی دوڑاتے اس کا ذہن بھی مسلسل گردش میں تھا۔ حتیٰ کہ کار شزاء کے گھر کے سامنے جا کر رک گئی تھی۔ اس نے دروازے پر دستک سے پہلے یہی مناسب سمجھا تھا کہ وہ شزاء کو کال کر کے پوچھ لے۔ اس نے فون ملایا تو دوسری

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

بیل پر ہی عروش نے دیکھا کال پک کر لی گئی تھی۔

"آ گئی تم۔ آ جاؤ میں انتظار ہی کر رہی ہوں۔"

شزاء نے تیز تیز لہجہ میں کہا تو اس نے خود کو قدرے پرسکون محسوس کیا تھا۔ اور اپنے اعصاب ایک لمبی سانس کھینچ کر ڈھیلے کر دیئے تھے۔

شزاء نے اس کا والہانہ استقبال کیا تھا۔ عروش سے گلے مل کر محبت سے اس کا ہاتھ تھامے سیدھا وہ اسے لے کر آصفہ بیگم کے پاس لے گئی تھی۔ ابھی کالج سے دری نہیں لوٹی تھی۔ بلال صاحب اور حسن بھی آفس میں ہی تھے۔ گھر میں صرف آصفہ بیگم تھیں۔ شزاء نے انہیں بتا دیا تھا کہ اس کی ایک سہیلی آنے والی ہے۔ انہوں نے کسی بھی قسم کا اعتراض نہیں کیا تھا۔ بلکہ کہا تھا کہ وہ اپنی سہیلی سے ملنے سے پہلے کچھ کھا پی لے۔

مگر اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ وہ اپنی دوست کی آمد پر ہی لنچ کرے گی ایک بار۔ اس کی دوست کی آمد لگ بھگ تین بجے ہوئی تھی۔ اور آصفہ بیگم اس وقت لاؤنج میں بیٹھی ہوئی کسی سے فون پر بات کر رہی تھیں جب شزاء عروش کا ہاتھ تھامے، سیدھا ان کے پاس چلی آئی تھی۔

"ان سے ملیے یہ میری ساس ہیں۔ ویسے مل تو تم چکی ہو گی شادی میں۔ آنٹی یہ میری عزیز از جان دوست ہے عروش۔" شزاء نے مسکراتے ہوئے تعارف کروایا تو آصفہ بیگم کے ہاتھوں سے فون چھوٹتے چھوٹتے رہ گیا تھا۔

"یہ یہاں کیسے؟" الفاظ ان کے لبوں سے پھسل کر رہ گئے تھے۔

"جی؟" وہ متعجب سی ہو کر بولی تھی۔ بھنویں تن سی گئی تھیں۔ آصفہ بیگم اپنے ان الفاظ کو منہ میں ہی دبا کر رہ گئی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کی بہو مزاج کی کس قدر گرم ہے۔ اور اس کی دوست کی آمد پر ان کا ذرا سا بھی ناگوار انداز برداشت نہیں کرے گی جبکہ دراصل وہ تو یہ دیکھ کر ہی دنگ رہ گئی تھیں کہ عروش کی ہمت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ یہاں تک آ گئی تھی۔

"جی عروش سے پوچھو کہ میرے ان سوالات کا کیا مطلب ہے؟ کیا عروش نے تمہیں نہیں بتایا کہ یہ میری کون ہے؟"

آصفہ بیگم نے یہی مناسب خیال کیا تھا کہ شزاء کو اب سب کچھ سچ بتا دیا جائے۔ کل کلاں شزاء کو عروش کے توسط سے نجانے کیسا ادھورا سچ سننے کو ملے۔ اس کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ شزاء کو سب بتا دیتیں۔

"عروش آنٹی کیا کہہ رہی ہیں؟" شزاء اب کے براہ راست عروش کی جانب مڑ گئی تھی۔

"یہ میری خالہ ہیں۔" عروش نے تھکن زدہ لہجہ میں کہا تو شزاء کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

"مگر تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟" شزاء کا لہجہ تیز تھا اور تیکھا بھی۔

"کیا بتاتی کہ یہ خالہ ہو کر بھی میری یہاں آمد پر قدغن لگا چکی تھیں دوسری بات یہ سب بڑوں کی باتیں ہیں ان کے مسئلے مسائل ہیں۔ میں ان کی وجہ سے اپنی دوست کو تو نہیں چھوڑ سکتی ہوں۔" عروش نے منہ بسورتے ہوئے روتی صورت بنا لی تھی۔ شزاء اب کچھ کچھ معاملہ سمجھ گئی تھی۔ اور وہ آصفہ بیگم کی جانب مڑی تھی۔

"آنٹی بتایا تو اب آپ نے بھی نہیں تھا کہ شزاء آپ کی نام کی بہو ہے۔ آپ نے دل سے مجھے اپنایا ہی نہیں۔ نہ حسن نے مجھے کچھ بتایا۔ اگر میرا بھی اس گھر میں اتنا ہی اختیار ہوتا جتنا سب کا ہے تو مجھے بھی اس رشتے کے حوالے سے بتایا جاتا۔ جبکہ پوچھنے پر بھی صرف ایک لے دے کہ ریحانہ پھوپھو کا بتایا گیا کہ یہی سگا رشتہ ہے۔"

وہ اب بات کا رخ ہی دوسری جانب کر چکی تھی۔ آصفہ بیگم کو عروش کے سامنے اپنی بہو کا اس طرح جرح کرنا ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ سو ایک دم بولی تھیں۔

"تم لوگ کمرے میں جاؤ باتیں کرو۔ انجوائے کرو۔ یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔"

وہ معاملہ فہم تھیں اور بات کو غلط رنگ دیتے ہوئے شزاء کو دیکھ کر انہوں نے فی الوقت اس بات کو نہیں ختم کر دینا مناسب سمجھا تھا۔

"ہاں چلو ناں شزاء میں بھی بس گھنٹہ دو گھنٹہ کے لیے آئی ہوں کار بھی خود ڈرائیو کی ہے۔ شام سے پہلے میں نے واپس جانا ہے۔" عروش بھی اب اصل کام جلدی کرنا چاہتی تھی جس مقصد کے لیے اس کی ماں نے اسے یہاں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

بھیجا تھا۔ وہ ہی ادھورا رہ جاتا تو کیا فائدہ تھا یہاں تک آنے کا۔

''آنٹی یہ میں آپ کے لیے لائی ہوں۔'' عروش نے پھولوں کا گلدستہ آصفہ بیگم کو تھمایا، کچھ بھی تھا۔ عروش تھی تو ان کی اپنی ہی۔ اس لیے ان کا دل ایک دم ہی اس کی جانب کھینچ سا گیا تھا۔

''ساشا کو معلوم ہے کہ تم کہاں ہو؟'' اب کہ آصفہ نے براہ راست عروش کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

''جی مام کو معلوم ہے۔'' عروش نے ہولے سے کہا تھا۔

''حیرت ہے پھر بھی اس نے تم کو روکا نہیں۔'' آصفہ نے حیرت سے کہا تھا۔

''کیونکہ شزاء میری دوست ہے۔ اور میں نے اس سے دوستی ترک نہیں کی ہے۔'' عروش روانی سے بولتی چلی گئی تھی۔

''توبہ توبہ تمہاری ساس تو اتنے سوالات پوچھتی ہیں کہ حد ہے۔'' عروش نے کمرے میں آتے ساتھ ہی صوفہ پر ڈھے سی گئی تھی۔

''ہاں بس دیکھ لو۔ ہر بات کی وضاحت دینی پڑتی ہے۔'' شزاء بے زاری سے بولی تھی۔

''مگر تم نے کیوں نہیں بتایا تھا؟'' اچانک شزاء اس سے پوچھ بیٹھی تھی۔

''بس یار بڑوں کی باتیں ہیں۔ دفع کرو۔ یہ بتاؤ زندگی کیسی چل رہی ہے بھائی کیسے ہیں؟'' وہ اب موضوع بدل گئی تھی۔ پھر ہلکی پھلکی باتیں ہونے لگی تھی۔

''اچھا سارا گھر نہیں دکھاؤ گی مجھے۔'' اچانک ہی عروش نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے کیوں نہیں آؤ۔'' شزاء اس کا ہاتھ تھامے اس کو ایک ایک کمرہ دکھائی رہی۔ اور پھر دری کے کمرے کے سامنے آکر وہ رک گئی تھی۔

''کیا یہ لاکڈ ہے؟'' عروش نے پوچھا تھا۔

''ارے نہیں لیکن دری کالج میں ہے۔ اس لیے اس کے پیچھے کمرے میں جانا شاید مناسب نہ لگے۔'' شزاء ہچکچاہٹ سے بولی تھی۔

''اس میں کیا ہے ذرا سا گھوم کر باہر آجائیں گے۔'' عروش نے کہا تو شزاء بھی مان گئی تھی۔

عروش نے تیزی سے ہینڈل گھما کر اندر قدم رکھ دیئے تھے۔ اندر کا یخ بستہ ماحول خوابناکی لیے ہوئے تھا۔ دری ایک نفاست پسند لڑکی تھی۔ اس کا کمرہ بھی اس کی نفاست کا ہی منہ بولتا ثبوت تھا۔ اس نے گھوم کر سارے کمرے کا طائرانہ جائزہ لیا تھا۔ اچانک ہی عروش نے وارڈروب کھول لی تھی۔ شزاء چونک سی گئی تھی۔

''یہ کیا کر رہی ہو عروش؟'' شزاء کے لہجہ میں پہلی مرتبہ گھبراہٹ سی آگئی تھی۔ آصفہ بیگم اس طرح ان دونوں کو اس طرح کمرے میں دندناتا ہوا دیکھ لیتی تو سخت برا مان جاتی۔ وہ دری کے معاملے میں بہت حساس تھیں۔ یہ تو وہ بخوبی جانتی تھی۔

''ارے یار صرف دیکھ ہی رہی ہوں کھا تو نہیں رہی۔ واہ کیا چوائس ہے دری آپی کی۔'' وہ مزے سے ایک ایک لباس کو چھو چھو کر دیکھنے لگی تھی۔

''یہ سوٹ ہی پہنا تھا ناں تمہارے ولیمے پر۔'' اچانک ہی عروش نے ایک ہرے رنگ کے سوٹ پر انگلی دھر کر پوچھا تھا۔

''ہونہہ یہی پہنا تھا۔'' شزاء نے اثبات میں جواب دیا تھا۔

''اچھا تم رکو میں ذرا آنٹی کو دیکھ لوں ادھر ہی نہ آجائیں۔'' شزاء دروازے تک گئی تھی اور عروش اس طرح کے موقع کی تاک میں کھڑی تھی۔ اس نے جلدی سے وہ لباس ہینگر سے اتار کر اپنے جمبو سائز ہینڈ بیگ میں رکھ لیا تھا۔ اور تیزی سے وارڈروب بند کر دی تھی۔ اس کے ہاتھ برف سے ہو رہے تھے۔ مزید یہاں رکنا دانش مندی کے خلاف تھا۔ سو جلدی سے باہر نکل آئی تھی۔ سامنے سے شزاء آرہی تھی۔

''چلو شکر ہے کہ تم نکل آئی آنٹی ادھر ہی آرہی ہیں ساتھ میں دری بھی ہے۔'' شزاء نے سکون کی سانس لی تھی۔ اسے عروش کو کسی بھی بات کے لیے منع کرنا اس لیے بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ یہ نہ سوچے کہ اس کی سسرال میں اس کا سکہ ہی نہیں چلتا۔ ورنہ وہ تو خود بھی دری کے کمرے میں آج پہلی مرتبہ گئی تھی۔

جب سے اس کی شادی ہوئی تھی وہ اس کے کمرے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

میں نہیں گئی تھی۔ ہاں لاؤنج میں یا پھر اس طرح ڈائننگ ٹیبل پر ہی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ اگرچہ اسے معلوم تھا کہ کس کا کون سا اور کہاں کمرہ ہے۔

اس کا دل بے حد خوش تھا۔ اس نے جیسا کرنے کی ٹھانی تھی ویسا ہی کر گزری تھی۔ اور اس نے سیدھا اپنے گھر میں آ کر ہی دم لیا تھا۔ حالانکہ وہ کار میں ڈرائیو کر کے آ رہی تھی مگر اس کا سانس نجانے کیوں کچھ تیز چل رہا تھا۔ شاید شدت جذبات کی وجہ سے ساشا لاؤنج میں ہی اس کی آمد کی منتظر تھی۔ اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکی تھی۔

”کیا ہوا کر دیا ناں کام؟“ ساشا کے لہجے میں اضطراب گھلا تھا۔

”اوہ مام سانس تو لینے دیں۔ بتاتی ہوں سب۔ پانی پلوائیں۔ سخت پیاس لگی ہے۔“ واقعی اس وقت عروش کے گلے میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ پانی پی کر اس نے ہینڈ بیگ سے مطلوبہ لباس نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔ اور ساشا کی نگاہیں چمک اٹھی تھیں۔

”لیکن مام آپ اس لباس کا کریں گی کیا؟ مجھے تو یہ بات سمجھ ہی نہیں آ رہی ہے؟“ وہ حیران سی پوچھ رہی تھی۔

”تم اپنے کام سے کام رکھو۔“ ساشا نے بے رخی سے کہا تھا اور لمبی اطمینان بھری سانس لی تھی۔

❖❖❖❖

رات کی سیاہی کوڑیالے ناگ کی طرح پھن مارے بیٹھی تھی۔ گھپ اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ درشہوار اس اندھیرے میں قبر کی گہرائی میں جیسے گم سی ہو رہی تھی۔ چہار سو گھپ تاریکی تھی۔ اس تاریکی سے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس نے اس اندھیرے سے راہ فرار حاصل کرنے کے لیے ایک جانب دوڑ لگا دی تھی تیز رفتاری سے بھاگتے ہوئے اس کا نظام تنفس بے حد تیز ہو چکا تھا۔ مگر گھپ اندھیرے اس کو اپنے اطراف محسوس ہوتے رہے تھے۔ جیسے اب روشنی کی کوئی لکیر بھی اس کا مقدر نہ رہی ہو۔ وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگی تھی۔ وہ باقاعدہ ہچکولے لے کر رو رہی تھی۔ اس کا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔ تبھی اسے آہٹ سنائی دی تھی۔ اس نے دیکھا ایک پتلی سی لکیر کسی نور کی مانند کسی سمت سے نمودار ہوئی تھی اور پھر اس لکیر نے تاریکی کا سینہ چیر کر اس منظر کو واضح کر دیا تھا۔ جس میں موجود درشہوار اطراف سے ہراساں بیٹھی تھی۔ وہ ایک بیابان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اطراف میں پتھروں کی بہتات تھی۔ اور وہ خود بھی ایک بڑے پتھر پر بیٹھی اپنی قسمت پر ماتم کناں تھی۔

اس نے دیکھا دائیں جانب سے ایک سفید لبادے میں ملبوس ایک باریش بزرگ ہولے ہولے اس کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ چند قدم کے فاصلے پر وہ آ کر ٹھہر سے جاتے ہیں۔ تب وہ بری طرح سے چونک جاتی ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ جس پتھر پر بیٹھی رو رہی ہے اس کے اطراف میں گول دائرے کی صورت میں چونے سے اس کے ارد گرد حد بندی سی مقرر کی ہوئی تھی۔ نہ وہ اس حد بندی سے باہر جا سکتی تھی اور نہ ہی کوئی اور اس حد بندی میں داخل ہو پا رہا تھا۔ وہ مایوسی سے اس بزرگ کو دیکھتی ہوئی بلک رہی ہے۔ جب اچانک دو کالے سیاہ ناگ بائیں جانب سے تیزی سے فاصلہ عبور کرتے اس کی جانب بڑھنے لگتے ہیں۔ اور پھر وہ اس حد بندی میں بھی گھس آتے ہیں اور آ کر درشہوار کو اس کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ وہ دونوں درشہوار کو اپنے اندر پرت در پرت لپیٹ رہے ہیں۔ ڈری کا سانس ان کی تیز لپیٹ کی وجہ سے بند ہونے لگتا ہے۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگتی ہے۔ حتیٰ کہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ تادم مرگ ہے۔ اسی وقت دلخراش چیخوں سے اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

رات کے ایک بجے کا وقت تھا اور وہ حیران پریشان اپنے بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کا وجود پسینے میں شرابور تھا۔ اور اس کے وجود میں جیسے جان ہی نہ رہی تھی۔ اس کی چیخوں کی گونج سے سب اہل خانہ جاگ چکے تھے۔ سب گھبراہٹ سے اس کے کمرے کی طرف لپکے تھے۔ اسی احساس کے ساتھ کہ نجانے اس پر کیا بیت گئی ہے۔ سب سے آگے آصفہ بیگم تھیں۔ انہوں نے کمرے میں قدم رکھتے ہی لائٹ آن کی تھی۔ کمرے میں عجیب سا حبس تھا۔ جیسے صدیوں سے بند پڑا رہا ہو۔

ایک عجیب سا احساس انہیں دامن گیر ہوا تھا۔ کھانسی کا شدید دورہ سا پڑا تھا انہیں۔ انہوں نے تیزی سے کمرے کی بند کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ پردے جو برابر

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

تھے۔ ہٹا دیئے تھے۔ اس کے بعد وہ چت لیٹی دری کے پاس آ گئی تھیں۔ جس کا چہرہ سفید لٹھے کی مانند ہو رہا تھا۔ جیسے کسی غیر مرئی نقطے پر اس کی سوچ آ کر ٹھہر سی گئی تھی۔

''ماں صدقے کیا ہوا ہے دری۔'' انہوں نے قریب آ کر دری کو پکارا تھا۔ اور اس کے بال سہلائے تھے۔

پہلی مرتبہ دری کو احساس ہوا تھا کہ یہ ایک نہایت بھیانک خواب تھا۔ جس کے زیر اثر ابھی بھی اس میں ہلنے جلنے کی جیسے سکت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ تحیر زدہ سی کمرے کو دیکھ رہی تھی۔

''امی جان۔'' وہ بلک کر ماں سے لپٹ گئی تھی۔

''میری جان کیا ہوا ہے؟'' آصفہ بیگم بولیں۔ ان کے عقب میں بلال صاحب بھی آن پہنچے تھے۔ جو تشویش زدہ اپنی بیٹی کو پریشانی میں مبتلا دیکھ رہے تھے۔

''امی وہ خواب میں۔ کہاں ہوں؟'' دری کے لفظ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔ ذہن میں مختلف خیالات کی آماجگاہ تھی اور اسی طرح اس کی ذہنی کیفیت بھی تھی۔

''بیٹا جی لگتا ہے کہ تم نے کوئی بہت ہی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ پریشان نہ ہو۔ میں ابھی آیت کریمہ کا دم کیے دیتا ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' بلال صاحب نے اس کو ڈھارس دی تھی۔ مگر کمرے میں پھیلی عجیب سی بساند نے ان کو بھی بری طرح سے چونکا دیا تھا۔ اور آصفہ بیگم کی تو آنکھیں برس رہی تھیں۔

بیٹی کو ذرا سا بھی پریشان دیکھنا ان کے لیے بے حد تفکر کا سبب تھا۔ اور اس وقت دری کا سہما ہوا انداز ان کو دکھی کر رہا تھا۔ وہ ماں کی آغوش میں منہ چھپائے ہوئے اس وقت بھی لرز رہی تھی۔ جیسے اسے کسی شے سے شدید خوف محسوس ہو رہا ہو۔ پھر بلال صاحب نے اس کے سر پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ کر ورد شروع کر دیا تھا۔ بہت عرصے قبل پیر صاحب نے انہیں وہ ورد بتایا تھا کہ اس کی باقاعدگی سے اہل خانہ ہر قسم کی آزمائش و مصائب سے محفوظ رہیں گے۔ پچھلے دنوں شادی کی گہما گہمی میں ان کا دھیان ذکر و اذکار سے قدرے کم ہو گیا تھا۔ صرف فرض نمازوں کی ادائیگی کے بعد وہ پڑھ کر ہی نہیں پا رہے تھے۔

مگر اسی وقت دری کی جو کیفیت تھی وہ ان کے لیے بے حد پریشان کن تھی۔ بلال صاحب کے ورد کے بعد دری کی حالت قدرے سنبھل گئی تھی۔ مگر ہراس اس کی آنکھوں میں جیسے رقم ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کو خواب بالکل سچ لگ رہا تھا۔ یوں جیسے ابھی بھی وہ اس بیابان میں بیٹھی ہوئی تنہائی کے روگ میں جی رہی ہو۔

❖❖❖❖

جگن بابا اس وقت ایک روئی کی بنی ہوئی گڑیا سامنے رکھے ہوئے اسے استہزائیہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے سامنے بیٹھی ہوئی ساشا بے حد مودب ہو کر جگن بابا کو دیکھ رہی تھی۔

''دیکھے گی تماشا؟'' جگن بابا کی آنکھوں میں شیطانی چمک عود کر آئی تھی۔

رات کے اس ویرانے میں قبرستان کے پیچھے وہ دونوں گھپ تاریکی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اس ٹھٹھرتی رات میں بھی جگن بابا مختصر سے لباس میں ملبوس ہونے کے بعد بھی سردی محسوس نہ ہوتی تھی۔ اس نے اپنے اردگرد ایک مخصوص حصار قائم کر رکھا تھا۔ یہ حصار اس کے گرد ہمیشہ ہی قائم رہتا تھا۔ بے حد تپسیا اور عبادت کے بعد یہ اس کو ملا تھا۔ اس حصار کے اندر نہ کوئی آ سکتا تھا۔ اور جو ایسی کوشش کرتا تھا اپنی ہی جان گنوا بیٹھتا تھا۔ جگن کے حصار کے اندر کا موسم بالکل نارمل سا تھا۔ اس قدر ٹھٹھرتے موسم کا اس پر کوئی بھی اثر نہ تھا۔ جبکہ گرم شال اوڑھے اور گرم سوئیٹر میں ملبوس ہونے کے باوجود ساشا کے اس وقت دانت کانپ رہے تھے۔ سخت ٹھنڈ تھی۔ اور رات کے وقت سردی کی لہر میں مزید اضافہ ہو جایا کرتا تھا۔

اس وقت ساشا جگن کے بلاوے کے بعد ہی آئی تھی۔ اس نے پہلے ہی لباس جگن کو پہنچا دیا تھا۔ اور اس وقت جگن نے اسے فوری طور پر واپس چلے جانے کا حکم دے دیا تھا۔ اس دن جس وقت وہ لباس لائی تھی اور دری کا لباس وہ جگن کو دے کر بے حد پرجوش سی تھی کہ اس کی اس کاوش کے بعد فوراً ہی کوئی معجزہ سا ہو جائے گا ایسا کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ بلکہ جگن نے اسے کہا تھا کہ ابھی وہ یہاں سے واپس پلٹ جائے اور مخصوص دن میں آئے۔ اکیلی ہی رات کے وقت یہاں پہنچ جائے۔ اس نے وہ سارے دن انگلیوں پر گن گن کر گزارے تھے۔ اتنے سارے دن

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

گزارنا اس کے لیے بے حد اذیت ناک سا تھا۔ اور اب اتنے دنوں کے بعد وہ پہلی مرتبہ دل میں دوبارہ وہی جوش وخروش محسوس کر رہی تھی۔ جو اس نے لباس یہاں پہنچاتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ جگن بابا نے اس کے قدموں کی آہٹ پر سرسری سی اک نگاہ سے اسے دیکھا تھا۔ اور ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا تھا۔ اس وقت تاریکی میں صرف وہی ایک الاؤ جو ہمیشہ ہی جگن کے سامنے روشن رہا کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس الاؤ میں نجانے کیا کچھ جل بجھ رہا تھا۔ اور اس الاؤ کی روشنی میں ہی اسے جگن بابا کو ڈھونڈنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔

بابا کے کہنے پر وہ مؤدب ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ جگن نے اپنے کرتے سے ایک گڑیا نکالی تھی۔ وہ گڑیا بالکل ہی بے جان سی عام سی روئی کی بنی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اس کو دیکھ کر ساشا کو لگا جیسے اس نے پہلے بھی اس چہرے کو کہیں دیکھا ہوا ہے۔ جوں جوں اس نے بغور اس چہرے پر غور کرنا شروع کیا اس کے ذہن کی گتھی سلجھنے کی بجائے مزید الجھتی جا رہی تھی۔ پھر یہ گتھی اس ایک جھٹکے سے کھل گئی تھی۔ جب اس کے ذہن میں ایک دم سے چھناکہ سا ہوا تھا۔ یہ چہرہ تو دری کا چہرہ تھا۔ اس کے نقوش اور اس گڑیا کے نقوش میں بے پناہ مماثلت تھی۔ وہ گہری سوچ میں غلطاں تھی جب جگن بابا نے اپنی آواز سے اسے بری طرح سے چونکا دیا تھا۔

"بول بالک دیکھے گی تماشا۔" جگن کے ہونٹوں پر گہری پراسرار مکروہ مسکراہٹ تھی۔

ساشا کے حلق سے بے ساختہ ہاں نکلا تھا۔ اور جگن نے آس پاس فرش پر پڑی ہوئی سوئیوں کو دیکھ کر اس کی توجہ ان سوئیوں کی جانب مبذول کی تھی۔ اور پھر ایک سوئی اٹھا کر اس سوئی کے نوکدار کنارے سے اس گڑیا کے سر پر ضرب دے دے کر اسے، درد دے رہے تھے۔ پھر جگن نے اس الاؤ میں دوسری ہاتھ کی مٹھی سے کچھ پھینکا تھا۔ الاؤ میں تڑ تڑ سے کچھ جلنے کی بو آئی تھی۔ اچانک وہ الاؤ کسی ٹی وی اسکرین کی مانند روشن ہو گیا تھا۔ اس میں منظر بے حد واضح تھا۔

یہ ایک کمرے کا منظر تھا۔ اس کمرے میں بیڈ پر دری گہری نیند میں گم تھی۔ مگر اس کے چہرے پر بے پناہ تکلیف کے آثار آرام سے دیکھے جا سکتے تھے۔ جیسے جیسے جگن اس گڑیا کے سر پر اس نوک دار سوئی سے وار کرتا تھا۔ اسی طرح دری اپنے بستر پر تڑپنے لگتی تھی۔ اس کا جسم تڑپ رہا تھا۔ سر دائیں بائیں حرکت کر رہا تھا پھر اچانک دری کی دلخراش چیخ سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ دری نے اپنا سر تھام لیا تھا۔ اس کے سر میں جیسے ہتھوڑے سے ضرب لگائی جا رہی تھی۔ درد کی بے پناہ شدت لیے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ تڑپ رہی تھی۔ چیخ رہی تھی۔ اس کی چیخ و پکار سن کر ہی بلال صاحب اور آصفہ بیگم بھاگے بھاگے آئے تھے۔ آصفہ بیگم نے آتے ساتھ ہی دری کو اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

"کیا ہوا میری بچی؟" آصفہ بیگم کے چہرے پر دکھ کے گہرے سائے رقم تھے۔ جبکہ بلال صاحب بے حد تشویش زدہ سے اپنی بیٹی کو اس حالت میں تڑپتا دیکھ رہے تھے۔

"امی میرے سر میں شدید درد ہے۔" وہ رو رہی تھی۔ آنسو اس کے گالوں کو مسلسل بھگو رہے تھے۔

"لاؤ میں سر دبا دیتی ہوں۔" آصفہ بیگم نے اس کا سر تھامنا چاہا تھا جب دری نے بے ساختہ انداز میں ان کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"امی میں یہ درد برداشت نہیں کر پا رہی۔ یہ کوئی عام درد نہیں ہے۔ آپ سمجھ کیوں نہیں رہی ہیں۔" دری نے بے بسی سے کہا تھا۔

تب آصفہ بیگم نے بے بسی سے مڑ کر اپنے مجازی خدا بلال صاحب کو دیکھا تھا۔

"ایسا کرتے ہیں اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں۔ میں کار نکالتا ہوں۔ تم اسے لے کر باہر نکلو جلدی کرو۔" بلال صاحب نے کہا تو آصفہ بیگم نے فوراً ٹوک دیا تھا۔

"آپ ہمدانی صاحب کو کیوں نہیں بلا لیتے۔ ڈاکٹر گھر آ کر دیکھ لے۔ اس کی حالت ایسی نہیں ہے کہ یہ سفر بھی کر سکے۔" آصفہ بیگم نے بھیگے ہوئے لہجہ میں کہا تھا۔ اور بلال صاحب نے فوری طور پر ڈاکٹر کو کال ملا دی تھی۔ آصفہ بیگم رونے لگ گئی تھیں۔

"آہ میری بچی۔ نجانے کس کی نظر لگ گئی ہے میری

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

بچی کو۔" وہ بے حد دکھی دکھائی دے رہی تھیں۔
"بجائے بچی کو حوصلہ دو۔ تم خود رونے بیٹھ گئی ہو۔" بلال صاحب نے بے حد ناگواری سے آصفہ بیگم کو ٹوکا تھا۔
تب آصفہ بیگم نے بامشکل اپنے آنسوؤں کو اپنے اندر ہی روکا تھا۔ اولاد بھی والدین کے لیے بھی کبھار آزمائش بن جاتی ہے۔ اولاد کے سکھ تو والدین کے لیے راحت و آسودگی کا سبب بنتے ہیں۔ مگر اولاد کے دکھ والدین کو اندر تک توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ دری کی یہ حالت ان کے لیے بے حد پریشانی کا سبب بن رہی تھی۔ وہ اتنے سالوں تک بھی کسی ایسی بیماری کا شکار نہیں رہی تھی۔ اب راتوں کو وہ ڈر کر جاگ جاتی تھی۔ اور پھر سہمی ہوئی ماں سے لپٹ جاتی تھی۔
مگر آج اس نے ایک نئے درد سے آگاہ کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کے سر میں ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔ سر میں جیسے ہتھوڑے سے ضربیں لگائی جا رہے ہوں۔ ایک ماں کے لیے اپنی اولاد کو اس قدر تکلیف میں دیکھنا بے حد اذیت کا سبب بن جاتا ہے۔ تدرے توقف سے ڈاکٹر آ گیا تھا۔ اور اس نے آتے ساتھ ہی دری کا چیک اپ شروع کر دیا تھا۔ جوں جوں وہ دری کو دیکھ رہا تھا اس کا ذہن الجھتا چلا جا رہا تھا۔ پھر اس نے ایک سکون بخش انجکشن تیار کر کے دری کو لگا دیا تھا۔
بلال صاحب اس کارروائی میں بالکل چپ رہے تھے۔ انجکشن کے بعد بھی دری کی حالت نہیں سنبھلی تھی۔ اور اس نے اسی طرح اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ اور کراہ رہی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں کے کنارے میں جیسے جم سے گئے تھے۔ آصفہ بیگم اس کو دیکھ کر دل میں درد کی لہریں محسوس کر رہی تھیں۔ بلال صاحب ڈاکٹر کو لے کر باہر کی جانب چل رہے تھے۔
"یہ سب کیا ہے ڈاکٹر صاحب؟" بلال صاحب کا لہجہ بے حد آزردہ سا تھا۔
"دیکھیں بلال صاحب میں نے سکون بخش انجکشن تو لگا دیا ہے۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ وہ کسی شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہیں۔ اور یہ اس کا نتیجہ ہے۔ انہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ یہ کچھ میڈیسن ہیں یہ انہیں صبح و شام کھلائیں۔ اگر افاقہ نہ ہو تو پھر مجھے دوبارہ بلا لیجئے گا۔" ڈاکٹر نے ایک نسخہ بلال صاحب کو لکھ کر تھما دیا تھا۔
"لیکن اس کی حالت میں تو بالکل بھی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ وہ تو اسی طرح سے مچھلی کی طرح تڑپ رہی ہے۔" وہ تفکر زدہ سا بولے تھے۔
"پریشان نہ ہوں۔ پندرہ منٹ تک وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔" ڈاکٹر نے اپنے تئیں تشفی دی تھی۔ بلال صاحب سر ہلا کر رہ گئے تھے۔
ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ واپس کمرے میں آ گئے تھے۔ جہاں دری اب قدرے بہتر حالت میں تھی۔ چپ چاپ سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ آصفہ بیگم اس کا سر ہولے ہولے سہلا رہی تھیں۔
پھر الاؤ میں یہ منظر دھندلا سا گیا تھا۔ اور اس کے بعد گم ہو گیا تھا۔ جبکہ ساشا یہ سب منظر دیکھ کر جگن بابا کے لیے دل میں مزید عقیدت محسوس کرنے لگی تھی۔ اسے اس کی ماں نے بتایا تھا کہ وہ بہت ہی پہنچے ہوئے بابا ہیں۔ مگر ان کے یہ کرامت والے عمل اس نے آج پہلی مرتبہ دیکھے تھے۔
"یہ سب؟" ساشا کو سوال کرنے کے لیے الفاظ بھی نہ مل رہے تھے۔
"یہ سب چھوڑ دے بالک۔ یہ پوچھ کہ اب تجھے کیا کرنا ہے۔ اور یہ بتا کہ تو خوش ہے؟" جگن نے زیر لب مسکرا کر پوچھا تھا۔
"جی بابا میں بے حد خوش ہوں۔ اور میرے دل میں آپ کا احترام مزید بڑھ گیا ہے۔" ساشا نے سر جھکا کر کہا تھا۔ جگن مسکرا دیا تھا۔
"ارے اتنے میں ہی خوش ہو گئی۔ بالکے ابھی تو اس کے برے دن شروع ہوئے ہیں۔ اس کی زندگی موت میں بدل جائے گی۔ اس گھر پر خوشیوں کے دن رخصت ہو گئے ہیں اور اس گھر پر موت کے سائے اپنے تعاقب میں پر پھیلائے بیٹھے ہیں۔"
جگن نے پر اعتماد انداز میں کہا تھا۔
"یہ لے۔ اسے سنبھال کر رکھ لے۔ آگے کا کام تو سنبھال۔ سوئیاں جہاں جہاں چبھیں گی۔ اس کی حالت اس طرح بگڑتی جائے گی۔ مگر یاد رکھ اس گڑیا میں دل کے

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

پاس نصب یہ تار نہ نکلنے پائے۔ جیسے ہی یہ نکل گئی۔ سارا عمل بے کار ہو جائے گا۔‘‘

ساشا نے دیکھا کہ گڑیا کے دل کے پاس واقعی ایک سنہری سی تار تھی۔ جو اس کے دل میں گڑی ہوئی تھی۔ اور اس تار کا رنگ سنہرا سا تھا۔ ساشا نے بے حد عقیدت سے اس گڑیا اور ان سوئیوں کو جگن سے لے لیا تھا۔ اور اپنے ساتھ لائے ہوئے بیگ میں حفاظت سے رکھ لیا تھا۔

’’بابا، آپ کو اس کے بدلے۔‘‘ وہ سوچ رہی تھی کہ کن لفظوں میں پوچھے کہ اب وہ کیا نذرانہ دے۔

’’نہیں نہیں دھن دولت ہمارے کسی کام نہیں ہے۔ وہ تو ہمارے قدموں میں رہتی ہے۔ تو صرف ہمارا ایک کام کر دے۔ کسی اور دکھ درد بھرے شخص کو ہمارا پتہ دے دے۔ بس یہی کر، اور اب جا۔ میرا جاپ کا سمے ہو رہا ہے۔‘‘

ساشا اثبات میں سر ہلاتی وہاں سے رخصت ہو گئی تھی۔ تیز تیز قدموں کے ساتھ اس کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو رہی تھی۔ اب وہ بتائے گی اس دری کی ماں کو جو اپنے تئیں انکار کر چکی تھی۔

❖❖❖

ساشا اور وقار صاحب اس وقت روشنی بیگم کے گھر کے وسیع و عریض ڈرائنگ میں براجمان تھے۔ روشنی بیگم اور ان کا بیٹا ارسل اس وقت گھر میں ہی تھے۔ اور ان کا والہانہ استقبال کر رہے تھے۔ دراصل روشنی بیگم کے خاوند بیرون ملک مقیم تھے اور انہوں نے بہت سارا سرمایہ یہاں ہی پر ہی بزنس کی غرض سے ارسل کو سونپ دیا تھا۔ اور ارسل نے اس سے باقاعدہ طور پر اپنے بزنس کا آغاز بھی کر لیا تھا۔ اس کے بزنس نے تیزی سے ترقی کی تھی۔ اور اس کے کاروبار میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے کئی برانچز اب پاکستان کے دوسرے شہروں میں بھی کھول لی تھیں۔ اس کے والد صاحب کا پاکستان بھی چکر لگتا رہتا تھا۔ بہت عرصے سے اب روشنی بیگم بضد تھیں کہ وہ اپنا سب کچھ وائینڈ اپ کر کے پاکستان میں ہی مستقل طور پر شفٹ کر جائیں اس لیے وہ فی الحال ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔ مگر عنقریب ان کا مستقل طور پر پاکستان میں ہی سیٹ ہو جانے کا ارادہ تھا۔ بچوں کی شادیوں کے سلسلے میں سارے اختیارات دیئے تھے یہی وجہ تھی کہ خاصی دیکھ بھال کے بعد روشنی بیگم نے اپنے اکلوتے بیٹے کی مشاورت کے بعد شزاء کی شادی حسن سے کر دی تھی۔

راحت صاحب پاکستان آئے تھے ایک ماہ کی چھٹی ختم ہوتے ہی واپس لوٹ گئے تھے۔ انہیں بطور داماد حسن بے حد پسند آیا تھا۔ اور اب انہوں نے اکلوتے بیٹے ارسل کی زندگی کا فیصلہ بھی روشنی بیگم کو ہی سونپ دیا تھا۔ مگر اس سے قبل ہی خود ارسل نے اپنی پسندیدگی ظاہر کر دی تھی۔ اور پھر شادی کے موقع پر ہی راحت صاحب نے عروش اور اس کے والدین کو دیکھ لیا تھا۔ انہیں عروش کچھ مغرور سی لگی تھی۔ مگر انہوں نے اپنے بچوں پر کبھی بھی اپنی مرضی مسلط نہ کی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے بچوں کو ان کی مرضی اور رائے کے مطابق جینے کا اختیار دیا جائے۔ شاید بہت عرصہ بیرون ملک مقیم رہنے کی وجہ سے ان کی سوچ میں بھی یہ پختگی تھی۔

’’بہن مجھے تو آپ کا گھر اور آپ خود بہت اچھی لگی ہیں۔ اور ارسل بیٹا کو تو ہم پہلے ہی پسند کر چکے ہیں۔ آپ جانتی ہیں لڑکی کی ماں ہونا بھی ایک بہت بڑی ذمہ داری ہوا کرتا ہے۔‘‘ ساشا نے مسکراتے ہوئے کہا تو ارسل مسکرا کر سر کھجا کر رہ گیا تھا۔

’’جی میں سمجھتی ہوں۔ میں بھی بیٹی کی ماں ہوں اور یہ آپ کا حق ہے کہ اپنی پوری تسلی و تشفی کے بعد ہی اس رشتے کے لئے حامی بھریں۔‘‘ روشنی بیگم نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

’’تو میری طرف سے تو اب ہاں ہی سمجھیں آپ بھی ہمارے گھر آئیں گھر بار دیکھ لیں۔ عروش کو تو آپ دیکھ ہی چکی ہیں۔ اور پھر ہمارے گھر آپ کی آمد مزید رشتے میں پیش رفت لائے گی۔‘‘ ساشا نے وقار صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ گویا پوچھ رہی ہوں کہ کیا وقار صاحب کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

’’جی بالکل بھابی آپ تشریف لائیں۔ ہمیں بہت اچھا لگے گا۔‘‘ وقار صاحب نے بھی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

روشنی بیگم کو اچانک ہی مہمان نوازی کا خیال آ گیا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

تھا۔ انہوں نے پرتکلف چائے کا اہتمام کیا تھا۔ اور اس دوران باتوں ہی باتوں میں رشتہ بھی طے قرار پا گیا تھا۔

"آپ نے بہت تکلف سے کام لیا ہے۔" ساشا نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"جی تکلف کیسا اور یہ تو میرے بیٹے کی سسرال ہے۔ اور میں آؤں گی تو سوچتی ہوں کہ شگن بھی ساتھ لے آؤں۔ اس کے بعد کوئی مناسب سا دن دیکھ کر منگنی کی رسم کر لیتے ہیں۔"

روشنی بیگم کو علم تھا کہ اس کا بیٹا کس قدر باؤلا ہوا پھرتا تھا۔ اس لیے وہ خود بھی اپنے بیٹے کو آباد اور خوش دیکھنے کی تمنائی تھیں۔

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ آپ پہلے گھر تو آئیں۔" ساشا نے خوشدلی سے کہا تھا۔

"ارے کیوں نہیں؟" وہ مسکرا رہی تھیں۔

"اچھا بہن مجھے لگتا ہے کہ اب ایک بات بھی سچ سچ بتا دینی چاہیے۔ یہی مناسب وقت ہے بعد میں جب رشتے ناطے طے ہو جاتے ہیں ور دوسرے لوگوں کی زبانی کلامی باتیں معلوم ہوتی ہیں تو دل میں بدگمانیاں جنم لینے لگتی ہیں۔" ساشا نے کہا۔

وقار صاحب نے ایک سرسری نگاہ بیگم پر ڈالی تھی۔ اور چائے کا سپ بھرنے لگے تھے۔ جبکہ ساشا کی اس تمہید سے روشنی بیگم بری طرح سے چونک گئی تھیں۔ ان کے چہرے پر پریشانی سی آ گئی تھی۔

"آصفہ آپا میری بہن ہیں۔ شاید یہ بات خود آصفہ آپا کو بھی آپ کو بتانا چاہیے تھی مگر نہوں نے تو شاید مجھے کبھی بہن ہی نہیں سمجھا اور نہ ہی بہن کا مان دیا ہے۔ اس لیے سب سے متعارف کرواتیں۔ میں مہندی میں شریک ہوئی تھی۔ مگر آپ نہیں آئی تھیں۔ بہرحال ہم آئے تھے۔ اس دن بھی کچھ بدمزگی سی ہوئی تھی۔" ساشا نے ایک سانس میں بولتے ہوئے ساری صورتحال روشنی بیگم پر آشکار کی تھی۔

"یہ بات تو مجھے معلوم ہی نہیں ہے۔ آپ تو بارات میں بھی شامل تھیں۔ مگر وہاں بھی میں نے آصفہ بیگم کے منہ سے ایسا کچھ نہیں سنا۔ بہت افسوس کی بات ہے یہ بات تو انہیں بتانا ہی چاہیے تھا۔" روشنی بیگم کو واقعی دھکا سا لگا تھا اور ان کے ذہن میں مختلف خیالات یکے بعد دیگرے دستک دے رہے تھے۔ مگر وہ لبوں پر قفل لگائے مزید ساشا کی طرف سے وضاحت کی منتظر تھیں۔

"بات یہ ہے کہ میں آصفہ آپا کی سوتیلی بہن ہوں۔ میری والدہ کے لیے آپا کے دل میں سخت نفرت تھی۔ سو وہ نفرت انہوں نے میرے لیے ہی پال رکھی ہے۔ میں تو ان کا ادب واحترام کرتی چلی آئی ہوں۔ بہرحال یہ بات انہوں نے نہیں بتائی تو کیا ہوا میں نے تو رشتے سے قبل ہی یہ بات آپ کو بتا دی ہے۔" ساشا نے بڑے سبھاؤ سے اپنا مدعا بیان کیا تھا۔

"میں تو آپ کی اعلیٰ ظرفی کی قائل ہو گئی ہوں۔ آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ اگر انہوں نے نہیں ملنا تو آپ بھی اپنے گھر بار پر توجہ دیں۔ یوں بھی شادی کے بعد تو سب کچھ مجازی خدا ہی ہوا کرتا ہے۔" روشنی بیگم نے اپنے تئیں دلاسہ دیا تھا۔

"سچ کہہ رہی ہیں دل کو کیا ہلکان کرنا۔ دراصل میرے بیٹے کا دل تھا کہ دری اس کی شریک سفر بنے۔ اس کے لیے میں نے طریقے سے پیار سے رشتہ طلب کیا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ بہرحال انکار یا اقرار ان کا حق ہے۔ مگر انکار کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے میری اتنی تذلیل کی سب کے سامنے کہ اب میں کیا کہوں؟" ساشا نے لفظوں کو توڑ مروڑ کر اپنی ہی راہ ہموار کرنے میں استعمال کیا تھا۔ اور روشنی بیگم نے بھی ان کی ساری باتوں کو اسی تناظر میں دیکھا تھا۔

"بہرحال ہم ان باتوں کو نہیں دیکھتے ان ساری باتوں میں اس بچی عروش کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ ہم آئیں گے۔ اور ہماری طرف سے بھی ہاں ہی ہے۔ یہ لیں منہ میٹھا کریں۔"

اسی وقت روشنی بیگم نے مٹھائی کی پلیٹ آگے بڑھائی تھی۔ وقار نے ستائشی نگاہوں سے اپنی شریک سفر کو دیکھا تھا جس نے کمال مہارت سے ساری صورتحال کو سنبھال لیا تھا۔ کہ بات بگڑی ہی نہیں تھی بلکہ ان کے حق میں ہوگئی تھی۔

❖❖❖❖

"کیا بات ہے کتنے دنوں سے تم کالج نہیں آ رہی ہو

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کیا ہو گیا ہے۔ آنٹی بتا رہی تھیں کہ تمہاری طبیعت خراب رہنے لگی ہے۔ کیا ہو گیا ہے میری عزیز سہیلی کو۔"

ہما بطور خاص بابا سے اجازت طلب کر کے فریدوں بخت کے ساتھ اپنی دوست دری کی عیادت کے لیے آئی تھی۔ اور واقعی ہما کی آمد سے دری کھل سی گئی تھی۔ وہ اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ فریدوں بھی اس وقت بلال صاحب سے کسی موضوع پر بات کر رہا تھا۔ مگر کن انکھیوں سے گاہے بہ گاہے وہ دری کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے حد فکر مندی سی جھلکی ہوئی تھی۔ دری بے حد مضمحل سی ہو گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اس کی بے خوابی پر دلالت کر رہے تھے۔ وہ چاہ کر بھی یہ معلوم نہ کر سکتا تھا کہ آخر اس کی پریشانی کی اصل وجہ کیا ہے۔ وہ کیوں اس قدر مضمحل اور آزردہ سی دکھائی دے رہی ہے۔ اس کو لگ رہا تھا کہ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں دبوچ لیا تھا۔ فریدوں نے اپنے اندر بے پناہ اضطراب ہلکورے لیتا محسوس کیا تھا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ میں دری کو لے کر پیر صاحب کے آستانے پر حاضری دوں۔ مگر یہ دری مانتی ہی نہیں ہے۔ جیسے ہی پیر صاحب کے آستانے پر اسے لے جانے کی بات شروع کرتا ہوں یہ رونے لگ جاتی ہے۔ میں وہیں اس کی مزید طبیعت خرابی کے خوف سے خاموش ہو جاتا ہوں۔ تم ہو سکے تو اپنے بابا تک میرا سلام اور پیغام پہنچا دینا بیٹا۔" بلال صاحب نے بے حد سعادت مندی سے اپنے پیر صاحب کا ذکر کیا تھا۔ فریدوں نے ایک لمحہ کے لیے کچھ سوچا تھا اور اس نے اسی وقت فیصلہ بھی کر لیا تھا۔

"ایک گلاس پانی درکار ہے صاف برتن ہو۔" فریدوں کی بات سن کر وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور اسی وقت الگ سے ایک گلاس میں از خود پانی بھر لائے تھے۔ ان کی اس حرکت کو دری دیکھنے سے قاصر رہ گئی تھی اس وقت دری کی ساری توجہ اپنی دوست ہما کی جانب مبذول تھی۔ اتنے دنوں میں پہلی مرتبہ دری مسکرا کر بات کر رہی تھی۔ ورنہ اتنے دنوں میں وہ اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس وقت ہما کے آنے سے اس کے چہرے کی زردی جیسے شادابی میں ڈھل رہی تھی۔

فریدوں بخت نے اس گلاس کو فوراً بلال صاحب سے لے کر تھام لیا تھا۔ اور اس کے بعد فریدوں بخت نے ورد مبارک شروع کر دیا تھا۔ اس دوران بلال صاحب بالکل خاموش بیٹھے رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ جس عظیم ہستی کا بیٹا ہے اس کراماتی ماحول میں اسی گھرانے کا پروردہ لڑکا تھا۔

فریدوں بخت نے کلام الٰہی پڑھ کر پانی پر دم کیا تھا۔ اور بجائے اس کے کہ بلال صاحب کو کہتے کہ وہ یہ گلاس دری کو دیں۔ وہ از خود اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور بلال صاحب نے لمحہ بھر کے لیے اس بات کو چونک کر دیکھا ضرور تھا۔ مگر وہ جانتے تھے کہ اس میں ہی مصلحت ہو گی۔ وہ براہ راست گلاس تھامے دری تک پہنچا تھا۔

"دری صاحبہ یہ پانی پی لیں۔ اللہ پاک شفا دے گا۔"

درشہوار جو باتوں میں منہمک تھی اس طرح سے اچانک فریدوں کے سامنے آنے سے چونک گئی تھی۔ مگر اس نے نرمی سے گلاس تھامنا چاہا تھا۔ مگر ہاتھ بڑھتے بڑھتے رک سا گیا تھا۔

"مجھے پیاس نہیں ہے۔"

نجانے یہ ساتھ بیٹھی ہما کا وہم تھا یا کیا کہ دری کے چہرے کا رنگ یک لخت بدل سا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر تذبذب کی کیفیت سی آ گئی تھی۔

"ادھر دیکھو دری میری طرف میری آنکھوں میں۔"

فریدوں بخت نے آج تک کبھی بھی دری سے نگاہ تک نہ ملائی تھی اور آج اسے براہ راست اپنی آنکھوں میں دیکھنے کا کہہ رہا تھا۔ دری نے سٹپٹا کر اس کی نگاہوں میں دیکھا تھا۔ وہاں صرف تحکم تھا۔ ایک ایسا انداز جو اس نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ فریدوں بخت کے انداز میں ایک بے پناہ سنجیدگی کا عنصر غالب تھا۔

اس نے اس کی نگاہوں میں جھانکا اور بالکل کسی معمول کی طرح سے گلاس تھام کر پی لیا تھا۔ قدرے فاصلے پر بیٹھے ہوئے بلال صاحب نے اس منظر کو دیکھا تھا اور اپنے دل میں بے پناہ تسلی جاگزیں محسوس کی تھی۔ اس کے اندر تک تقویت سی آ گئی تھی۔ پانی پیتے ہی جیسے دری کو اپنا آپ ایک دم سے ہلکا پھلکا سا محسوس ہونے لگا تھا۔ اس نے گلاس واپس ٹیبل پر رکھا تھا۔ اور چونک کر

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

فریدوں بخت کی طرف دیکھا تھا۔

"بابا جانی۔ پانی پیتے ہی مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے سر سے منوں بوجھ سرک گیا ہو۔ میرا وجود جیسے کسی شکنجے میں تھا۔ مگر اب اس سے رہائی ملنے والی ہو۔" دری کے الفاظ پر سب نے ہی حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا پھر بلال صاحب نے اٹھ کر فریدوں کو اپنے گلے سے لگالیا تھا۔

"میرا بچہ جیتا رہ شیر بیٹا۔ یہ سب پیر صاحب کی ہی کرامات ہیں۔ اور ان کی برکات ہیں۔" وہ بے حد عقیدت مندانہ لہجہ میں گویا ہوئے تھے۔

"ارے مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ بزرگ ہیں۔ میرے لیے بابا جیسے ہیں۔ دری کو البتہ بابا صاحب کے پاس ضرور لائیں۔ یہ بے حد ضروری ہو گیا ہے۔ اگر دری پانی پینے کے بعد بھی اپنے اندر کسی قسم کا تغیر محسوس نہ کرتی تو میں یہی سمجھتا کہ یہ محض وہم ہے۔ مگر اب لگتا ہے کہ جیسے......"

فریدوں بات کرتے کرتے ٹھہر سا گیا تھا جیسے سوچ رہا ہو کہ اپنے شبہ کو لفظوں کی زبان دے یا خاموشی ہی اختیار کرے۔

"بات مکمل کرو ناں بیٹا رک کیوں گئے؟" بلال صاحب نے پوچھا تھا۔

"ابھی مناسب وقت نہیں آیا۔ کاش میری سوچ میرا اندازہ بھی غلط ہی ثابت ہو۔ بہرحال آپ اطمینان رکھیں سب بہتر ہو جائے گا۔" وہ اطمینان دلا رہا تھا۔ تبھی باہر کار رکنے اور ہارن کی تیز آواز سے سب ہی باہر کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

"لگتا ہے ریحانہ بیگم آگئی ہیں۔" خانساماں نے کہا اور باہر جا کر واپس اندر آ کر مطلع کیا تھا۔

"جی صاحب ریحانہ بیگم صاحبہ آئی ہیں۔ ساتھ میں گل افشاں بی بی اور زریاب صاحب بھی ہیں۔"

"اچھا، انہیں ادھر ہی لے آؤ۔"

تھوڑی دیر میں ہنستی مسکراتی گل افشاں اور ریحانہ بیگم داخل ہوئی تھیں۔ آصفہ بیگم جو کچن میں مصروف عمل تھیں۔ ان کی آمد پر ادھر ہی آگئی تھیں۔

"ماشاء اللہ کیسی رونق لگ گئی ہے۔" آصفہ بیگم مسکرائیں تھیں۔

"ہاں تو اور کیا کرتے تم لوگ تو بھول کر بھی میرے گھر کا رخ نہیں کرتے ہو۔ ہم نے سوچا ہم ہی دھاوا بول دیتے ہیں پھر زریاب بھی ترس رہا تھا کہ امی وہ لوگ تو بات نہیں کر رہے لگتا ہے بھول گئے منگنی ہے پرسوں لیکن آپ ہی اب آجائیں۔ ان کو یاد دہانی کروائیں۔"

ریحانہ بیگم نے ہنستے ہوئے کہا تھا اور آصفہ بیگم نے اس بات پر کچھ فکرمندی سے بلال صاحب کی طرف دیکھا تھا۔ اور بلال صاحب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں آصفہ بیگم کو تسلی دی تھی کہ جیسے کہہ رہے ہوں کہ وہ سب سنبھال لیں گے۔ زریاب اپنے ذکر پر شرما سا گیا تھا۔ اور گہری نگاہوں سے دری کو دیکھ رہا تھا۔ جو وہیں بیٹھی تھی۔

زریاب کی آمد پر دری کے پاس بیٹھی ہوئی ہما نے اپنا چہرہ مکمل طور پر ڈھک لیا تھا۔ اس کا وجود پہلے بھی عبایا سے ڈھانکا ہوا تھا۔ یہ اس گھرانے کی ہی حیا اور پاسداری کا عالم تھا۔

"السلام وعلیکم۔" دری نے آگے بڑھ کر ریحانہ بیگم سے گلے مل کر سلام کیا تھا۔ مگر ریحانہ بیگم نے تو حیرت سے دری کو دیکھا تھا۔ اتنے سے دنوں میں وہ مرجھا کر رہ گئی تھی۔

"ارے تم نے کیا حالت بنالی ہے انہیں کیا ہوا کیا بیمار رہی ہو؟" ریحانہ بیگم نے اس کے تروتازہ گلاب چہرے کو اس قدر مرجھایا ہوا دیکھ کر اچنبھے سے پوچھا تھا۔

"جی اب تو آپ کو معلوم ہو گیا نا بہن اور اس وجہ سے ہم نے پہلے بھی اس معاملے کو طول دیا تھا۔ اور اب بھی ہم اس معاملے میں مزید تاخیر چاہتے ہیں۔ وجہ صرف اتنی سی ہے کہ دری ابھی مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہے۔ نہ ہی وہ پڑھائی لکھائی پر توجہ دے رہی ہے۔" بلال صاحب سے قبل ہی آصفہ بیگم نے مناسب موقع دیکھ کر بات کر لی تھی۔ ریحانہ بیگم نے گہری سانس لی تھی۔

"دیکھو آصفہ بھابی ایک تو یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ ایک منگنی کی رسم کرنے میں مسئلہ ہی کیا ہے۔ پہلے تم نے یہ جواز تراشا کہ تمہارے بہو اور بیٹا اس شہر میں نہیں مری گئے ہیں سیر و تفریح کے لیے ان کی آمد پر بھی منگنی ہو گی۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اس کے بعد ان کی دعوتوں کی نذر ہو گئی منگنی اور اب ہم نے جب کہا کہ اس جمعہ کو منگنی ہر حال میں ہو گی تو یہ نیا ڈھونگ رچا لیا بیماری کا۔ آخر بات کیا ہے کھل کر بتا ہی دو آج۔"
ریحانہ بیگم نے سخت لہجہ میں کہا تھا۔

"اچھا انکل اب ہم چلتے ہیں شام ہو رہی ہے۔ اور بابا کو پسند نہیں ہے کہ ہم شام کے بعد گھر لوٹیں۔"

فریدوں بخت معاملہ فہم تھا۔ اور صورتحال کی سنجیدگی دیکھ کر ہی وہاں سے فوری طور پر چلا جانا چاہتا تھا۔

"نہیں ابھی بیٹھو ابھی مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" بلال صاحب نے نجانے کیوں فریدوں بخت کو ٹھہرا لیا تھا۔ اور وہ اب اتنا نافرمان اور گستاخ تو تھا نہیں کہ حد ادب بھلا کر پھر بھی واپسی کے لیے بضد رہتا۔

ریحانہ بیگم کو یوں فریدوں بخت کا ابھی وہیں روکنا بے حد گراں گزرا تھا۔ وہ واقعی ان دونوں کی موجودگی میں کھل کر بات کرنے میں کسی قدر ہچکچا رہی تھی۔

"بات یہ ہے کہ منگنی تو دو دن بعد ہی ہو گی۔ اب اس موضوع کو ختم سمجھو ریحانہ۔ ہم نے اتنے دن منگنی التواء میں رکھی اس کی وجہ بھی تیاری تھی۔ اب جبکہ بچی بیمار ہے۔ تم اسے ڈھونگ کا نام کیسے دے سکتی ہو بھلا؟" بلال صاحب کو بھی اپنی بہن کے لفظوں سے رنج پہنچا تھا۔ وہ بھی اس وقت جب انہیں اپنی ہی بہن سے ڈھارس کی امید تھی۔

"اب منہ سے کچھ نکل ہی جاتا ہے گلے شکوے بھی تو اپنوں سے ہی بنتے ہیں اب ہو کیا ہے؟ یہ تو بتائیں؟" وہ اب ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ اور بلال صاحب کا اکھڑا ہوا انداز ان کو بہت کچھ باور کرا گیا تھا۔ اور اسی لیے انہوں نے بھی اپنے رویے میں لچک پیدا کر لی تھی۔

"میں نے کہا ناں کہ اب وہ بات ختم کر دی ہے۔"
بلال صاحب نے نجانے کیوں اتنا سخت لہجہ اختیار کیا تھا کہ کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی تھی۔

"ارے سب کیسے بیٹھے ہیں۔ امی ہم جو کپڑے اور زیورات لائے ہیں دری کے لیے وہ تو دکھائیں ناں ممانی کو۔" اسی وقت گل افشاں نے کہا تھا۔ وہ سمجھدار لڑکی تھی۔
اور پھر ماحول ایک دم ہی بدل سا گیا تھا۔ آصفہ بیگم نے بھی سب کو چائے اور لوازمات پیش کیے تھے۔ اور ماحول ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ بلال صاحب پھر فریدوں کو لے کر باہر چل دیئے تھے۔

"میری گزارش ہے کہ پیر صاحب ایک مرتبہ استخارہ کریں میں چاہتا ہوں کہ مجھے معلوم ہو کہ یہ سب کیا ہے۔ اچانک ہی دری کو خوفناک خوابیں آنا۔ اس کے کمرے سے عجیب سی بساند محسوس ہونا۔ دنوں میں دری کا چہرہ اتنا اجاڑ سا ہو گیا ہے اور یہی نہیں بلکہ آج کس طرح دری نے کہا کہ وہ۔" وہ کچھ کہتے کہتے چپ سے ہو گئے تھے۔ ابھی ان کے الفاظ ان کے منہ میں تھے کہ کمرے سے دری کی دلخراش چیخیں سنائی دی تھیں۔ وہ دونوں بھاگے بھاگے اندر کی جانب لپکے تھے۔

دری اپنے دل کو تھامے مسلسل کراہ رہی تھی۔ چیخ چلا رہی تھی فریدوں دری کو اس حالت میں دیکھ کر خود بھی پریشان سا ہو گیا تھا۔

زریاب اور ریحانہ کے تو ہاتھوں کے طوطے ہی اڑ گئے تھے۔ اس صورتحال میں انہیں سب سے عجیب جو لگ رہا تھا وہ دری کا صوفے پر اچھل اچھل کر نیچے ہونا تھا۔ وہ ایک سانس میں صوفے پر اچانک اوپر کو اٹھی تھی اور دوسری طرف نیچے کو گری تھی۔ جیسے اس کے ساتھ کوئی اٹھا پٹخ کر رہا ہو۔ پھر اچانک ہی وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اور فریدوں بخت نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی تھام کر اس کی نبض چیک کی تھی۔ اور اس نے گہری سانس لی تھی۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے ابھی ہوش آ جائے گا۔" فریدوں بخت نے کچھ پڑھ کر دری پر پھونکا تھا۔

کچھ دیر میں واقعی دری کو ہوش آ گیا تھا۔ اور وہ حیران ہو کر اطراف میں دیکھ رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ جیسے اسے ابھی کچھ دیر پہلے والی اپنی ہی کیفیت کا سرے سے علم ہی نہیں ہو۔ اگرچہ شہزاء اپنی ہی ذات تک محدود رہا کرتی تھی۔ مگر اس قدر شور و غل سن کر وہ بھی اپنے کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آ گئی تھی۔ اور اس نے بھی دری کو یوں چیختے چلاتے اور بے ہوش ہو کر گرتے اور پھر اٹھتے دیکھا تھا۔ وہ حیران رہ گئی تھی کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے۔

آصفہ بیگم مسلسل رو رہی تھیں۔ اور انہوں نے دری کو اپنے کلیجے سے لگا لیا تھا۔ جبکہ پاس بیٹھی ہما ان کو تسلی دے رہی تھی۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"آنٹی پریشان نہ ہوں۔ دیکھیں اب دری بالکل ٹھیک ہے آپ کے اس طرح مسلسل رونے سے وہ پریشان ہو رہی ہے۔" ہما نے کہا تو آصفہ بیگم نے بھی محسوس کیا کہ پورے کمرے میں محض ان کے ہی رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ آصفہ بیگم نے بھی اپنے آنسو پونچھ لیے تھے۔

کسی کو سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے۔

ریحانہ بیگم نے سب سے پہلے جلدی جلدی کی رٹ لگا کر واپسی کی راہ لی تھی۔ اس کے پیچھے ہی فریدوں بخت بھی نکل گیا تھا ہما کے ساتھ اور شہزا بھی اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

❁❁❁❁

عروش نے دیکھا کہ امی نے اپنے ہینڈ بیگ میں روئی کی بنی ہوئی ایک گڑیا رکھی ہوئی ہے۔ وہ جو اس وقت پیسوں کی اشد ضرورت محسوس کرتے ہوئے سیدھا ادھر آئی تھی۔ سوچا تھا کہ کچھ شاپنگ کر لے گی۔ شاپنگ اس کی کمزوری تھی۔ مگر اس میں موجود اس گڑیا کو دیکھ کر وہ بے حد حیران سی تھی۔ اس نے یونہی گڑیا کو الٹ پلٹ کر دیکھا تھا۔ سرسری سا انداز۔ اس کے اندر دل کی جانب لگی سنہری سی تار کو اس نے یونہی کھینچا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس گڑیا نے حرکت کی ہو۔ وہ گھبرا سی گئی تھی اور وہ گڑیا اس کے ہاتھ سے گر گئی تھی۔ یہ وہی لمحات تھے جب دری صوفے پر بیٹھی تھی اور اچھل کر گری تھی۔ اس نے دوبارہ سے ڈرتے ہوئے اس گڑیا کو زمین سے اٹھایا تھا۔ اسے اپنی رقم لینی تھی۔ گڑیا کے نیچے ہی ہزاروں روپے کے نوٹ پڑے تھے۔ اس نے اندازاً ہزار کے پانچ نوٹ گن کر لیے تھے۔ اور پھر واپسی گڑیا کو رکھنے کے ارادے سے زمین سے اٹھایا تھا۔ اس کی نظر بس گڑیا کے دل کے قریب بنی اس سنہری سی تار پر رک سی گئی تھی۔ جو آدھی سے زیادہ باہر کو نکل چکی تھی۔ اس نے اس تار کو کھینچا تھا۔ تار باہر نکل آئی تھی۔ وہ سپرنگ جیسی سنہری تار تھی۔ اس نے وہ تار اور گڑیا بالکل خاموشی سے جلدی سے بیگ میں واپس رکھ دی تھی۔ اور تیزی سے بیگ کی زپ بند کر دی تھی۔

اسے اپنے روپوں سے مطلب تھا۔ سو تیزی سے رقم لے کر باہر نکل آئی تھی۔ اور اس نے دیکھا کہ ساشا اس وقت کچن میں خانساماں کو رات کے کھانے کے لیے ہدایات دے رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر پلٹی تھی۔

"کیا بات ہے یہاں کیوں کھڑی ہوا یسے؟"

عروش کو اس گڑیا کا ذکر کرنا تھا۔ مگر اس طرح اس کی پیسوں کی چوری بھی پکڑی جاتی اس لیے چپ ہی رہی تھی۔

"میں کچھ دیر کے لیے پارلر جانا چاہتی ہوں۔" عروش نے لگی لپٹی رکھے بنا کہا تھا۔

"اچھا مگر کیسے۔ کل تک تو تمہارے پاس پیسے ہی نہیں تھے۔ اب اچانک کہاں سے مل گئے پیسے؟"

"جی وہ میں نے لے لیے ہیں کسی سے اب جاؤں میں۔ آدھا گھنٹہ تک لوٹ آؤں گی۔ یہاں قریب ہی جا رہی ہوں۔" وہ ملتجی لہجہ اپنائے تھی۔

"اچھا جاؤ مگر جلدی لوٹ آنا وقار کو پسند نہیں ہے کہ کھانے کے وقت کوئی بھی گھر سے باہر ہو۔"

وہ جانتی تھی کہ عروش کا آدھا گھنٹہ دو گھنٹے پر محیط ہوا کرتا ہے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ساشا نے خانساماں کو ہدایات دی تھیں۔ اس وقت وہ گھر میں اکیلی تھی۔ اور ایسے تمام اوقات کو وہ گنواتی نہیں تھی۔ جب جب اسے موقع ملتا تھا وہ ان سوئیوں سے اس گڑیا کو اذیت دیتی تھی۔ یہی سوچ کر اس نے اپنے کمرے کا سیدھا رخ کیا تھا۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔ اور پھر اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے گڑیا نکالی تھی۔ مگر وہ یہ دیکھ کر ہی دم بخود رہ گئی تھی کہ گڑیا کی دل کے پاس بڑی سنہری سی تار نکلی پڑی تھی۔ اور گڑیا کے چہرے پر ثبت ایک انوکھی مسکان اس کے سکون کا پتا دیتی تھی۔ مگر اس کی مسکان اس وقت ساشا کو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کا مذاق اڑا رہی ہو۔

"یہ سب یہ سب کیسے ہوا؟" ساشا نے بے حد غصے سے گڑیا کو ایک جانب پھینک دیا تھا اور اپنا ہی سر تھام لیا تھا۔ پھر اس کی نظر اپنے ہینڈ بیگ میں بکھرے ہوئے ہزار کے نوٹوں پر پڑی تھی۔ وہ سارے روپے ہی ایک طریقے سے رکھتی تھی۔ اکٹھے اور یوں بکھرے ہوئے نوٹ بتا رہے تھے کہ یہ عروش کی کارستانی ہے۔ اور اس نے روپے

لینے کے ساتھ ساتھ اس گڑیا سے بھی چھیڑ خانی کی تھی۔

''اف سارا کیا کرایا پر پانی پھیر دیا۔'' گہرا رنج ساشا کے چہرے پر چھا سا گیا تھا۔

پھر وہ گڑیا اس نے واپس ہینڈ بیگ میں ڈال دی تھی اور اسے بے حد غصے سے عروش کی واپسی کا انتظار تھا۔ اور پورے دو گھنٹے بعد عروش لہلہاتی ہوئی مہکتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے آتے ساتھ ہی پوچھا تھا۔

''مام میں کیسی لگ رہی ہوں۔ لگ رہی ہوں بے پناہ خوبصورت؟'' ساشا کے کاریڈار میں مسلسل حرکت کرتے ہوئے قدم تھم سے گئے تھے۔ اور اس نے رک کر ایک کٹی نگاہ عروش پر ڈالی تھی اور ایک زوردار تھپڑ اس کے داہنے گال پر رسید کیا تھا۔ وہ لہرا کر رہ گئی تھی۔

''تم نے رقم میرے بیگ سے لی تھی کیا؟'' ساشا کا انداز ہی ایسا تھا کہ وہ جھوٹ یا غلط بیانی کی ہمت نہ کر سکی۔

''مام چند ہزار کے لیے آپ نے میرے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ صرف چند ہزار روپے کے لیے۔''

عروش ایک خود سر لڑکی تھی۔ جیسے بچپن سے اب تک ہر خواہش پوری کیے جانے کی عادت تھی۔ ناں سننا تو اس کو گوارا ہی نہ تھا۔ اور اب ساشا نے اسے مارا تھا۔ زندگی میں شاید پہلی اور آخری مرتبہ اور اس نے ساشا کو اکثر اسی طرح غصہ میں دیکھا ضرور تھا۔ مگر اس غصے کا اصل منبع وہ ہرگز نہ ہوا کرتی تھی۔

''چند ہزار کے لیے نہیں مارا میں نے تمہیں یہ تھپڑ تم نے میرا اتنا بڑا نقصان کیا ہے۔ کیا ضرورت تھی تمہیں اس گڑیا کو چھونے کی۔''

''آپ نے مجھے اس معمولی سی کپڑے کی بنی گڑیا کے لیے مارا ہے مام مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔'' وہ حیران رہ گئی تھی اس کا بایاں ہاتھ ابھی بھی اپنے چہرے پر ہی تھا۔

''یہی بات تو تمہاری عقل میں نہیں سما رہی ہے کہ وہ گڑیا کوئی عام سی گڑیا نہیں تھی جسے تم نے چھوا اور بنا بنایا سارا کھیل برباد کر دیا۔ اس کے لیے میں نے جگن بابا سے خاص طور پر درخواست کی تھی۔'' ساشا نے بے حد دکھی لہجہ میں کہا تھا۔ اور پچھتاوا سا اس کے لہجہ میں تھا۔ اسی وقت پہلی مرتبہ عروش چونکی تھی۔

''اوہ تو اس گڑیا کا تعلق کہیں دری سے تو نہیں ہے۔''

naeyufaq.com
تازہ شمارہ شائع ہوگیا
آج ہی قریبی بک اسٹال سے طلب
ماہنامہ آنچل کراچی
ملک کی مشہور معروف قلمکاروں کے سلسلے وار ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل
ایک ہی رسالے میں
جو آپ کی آسودگی کا باعث ہو سکتا ہے اور وہ
صرف آنچل۔ آج ہی اپنی کاپی بک کرالیں
تیری زلف کے سر ہونے
اکائی
عشق دی ماری میں جھلی
Info@naeyufaq.com
008264242

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اسی لیے مجھے اس گڑیا کا چہرہ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔ مگر مام وہ تو.....'' لفظ اس کے منہ سے ادا ہی نہیں ہو پا رہے تھے۔

''ہاں تم ٹھیک سمجھی ہو۔ مگر تم نے اس سنہری زنجیر کو نکال دیا۔ وہی زنجیر اس کے قید ہونے کی دلیل تھی۔ بہرحال میں ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میں آج ہی جگن بابا کے پاس دوبارہ سے حاضری دوں گی۔'' ساشا نے پرعزم لہجہ میں کہا تھا۔

''مگر مام دری جہاں مرضی جائے۔ ہمیں اس سے کیا؟ آپ نے اتنی سی بات کو انا کا مسئلہ کیوں بنالیا ہے۔ جب ہمارا ان لوگوں سے اب کوئی واسطہ ہی نہیں رہا ہے تو پھر ہمیں کیا ضرورت ہے ان کے لیے باباؤں کے آگے حاضریاں دینے کی۔''

عروش اپنی ماں کے برعکس کچھ الگ سوچ کی حامل لڑکی تھی۔ اسے ان جادو منتر وغیرہ پر نہ تو زیادہ بھروسہ تھا دوسرا وہ من موجی سی تھی۔ اپنی ذات میں کھل کر جینا چاہتی تھی۔ بہت دیر تک کسی کے لیے کینہ نہ رکھ سکتی تھی۔ شاید اس کی رگوں میں وقار کا خون تھا۔ جو بالکل اسی طرح محض اپنی ہی ذات کا بندہ تھا۔

''تم ناسمجھ ہو اپنی ہی ذات کے اونچے مینار کے اس پار دیکھنے سے قاصر ہو۔ جاؤ۔ آئندہ پوچھے بنا میرے بیگ کو یا میری کسی بھی چیز کو چھونا مت۔ ورنہ ایسا نہ ہو کہ ان سارے معاملات کا اثر الٹا پڑ جائے۔ سمجھ رہی ہو ناں۔'' ساشا کے لہجہ میں دبا دبا غصہ اور دھمکی تھی۔

عروش محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی تھی۔ ورنہ عروش کو اپنی ہی ماں کے ارادے بے حد برے لگ رہے تھے۔ اور یہ سب اس کے اپنے بھائی کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ جس نے اب تک ماں کو پریشان کرنا نہ چھوڑا تھا۔ ہر دوسرے دن ماں کے سر پر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اور اس کے لبوں پر صرف دری کا نام ہوا کرتا تھا۔ اور اس کا اصرار بھی۔

رات کے کھانے کے بعد اس نے سب کے سونے کا بے حد بے صبری سے انتظار کیا تھا۔ اسے جلدی تھی کہ کسی طرح سے وہ جگن تک پہنچ جائے۔ اور پھر اس کے لیے کوئی لائحہ عمل دوبارہ طے کیا جائے۔ جب رات ڈھلنے لگی تھی وہ سر پر چادر اوڑھے گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔

اس کا برسوں کا وفادار ڈرائیور اس کا ہمراز تھا۔ اسے اسی خاص کام کے لیے رکھا گیا تھا۔ بھروسے کا آدمی تھا۔ جس نے آج تک ان باتوں کی اور ساشا کی حرکتوں کی خبر اس کے مجازی خدا وقار کو بھی نہیں ہونے دی تھی۔ وہ ایک بے زبان اور وفا شعار ملازم تھا۔

اس وقت بھی اس کو پہلے ہی ساشا کا پیغام مل چکا تھا۔ اور وہ گھر کے احاطے میں نہیں بلکہ گھر سے قدرے فاصلے پر اپنی ہی کار میں بیٹھا ہوا اس وقت بھی مالکن کی آمد کا منتظر تھا۔ جیسے ہی اسے ساشا آتی ہوئی دکھائی دی تھی وہ چوکنا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ ساشا اطراف میں دائیں بائیں محتاط نگاہوں سے دیکھتی ہوئی سیدھی کار تک پہنچی تھی اور پھر اس نے دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ساتھ ہی تحکم بھری آواز میں کہا تھا۔

''جلدی چلو۔'' ساشا کے کہتے ہی کار حرکت میں آ گئی تھی۔ کار اپنے مخصوص راستوں پر رواں دواں تھی۔ کوئی آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد منزل سامنے تھی۔ قبرستان سامنے دکھائی دے رہا تھا۔

''سنو میں جب تک آ نہیں جاتی تم یہیں میرا انتظار کرنا کہیں پیچھے پلانے نہ نکل کھڑے ہونا۔'' ساشا نے حکمیہ انداز میں کہا تھا۔

''جی بیگم صاحبہ میں تو برسوں سے اس ڈیوٹی کو نبھا رہا ہوں کیا کبھی کوئی کوتاہی ہوئی۔'' وہ تابعداری سے بولا تھا۔

''زبان بند رکھو۔ جتنا کہا ہے اتنا ہی کرنا۔'' ساشا یہ کہہ کر کرخت لہجہ میں باہر نکل کھڑی ہوئی تھی۔

ساشا کا رخ سیدھا جگن بابا کی طرف تھا۔ اسے یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی تھی کہ جگن بابا اپنی مخصوص جگہ پر نہیں تھے۔ اتنے برسوں میں ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کا منہ لٹک گیا تھا۔ مایوسی سے اس کے اندر بھی گھپ اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ وہ اس تاریکی میں بھی چاروں اطراف میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے اس ایک چکری کے نجانے دسویں چکر لگا لیے تھے۔ وہ تھک کر ہانپنے لگی تھی۔ اور مایوسی سے واپسی کے لیے جانے کا ارادہ ہی کرنے لگی تھی۔ جب اس خاموشی میں بھی جگن بابا کی خوفناک لرزا دینے والی آواز سنائی دی تھی۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"بال لا اس لڑکی کے اور آ جانا ٹھیک تین دن بعد۔ اب جا۔ فوراً چلی جا۔ ہمارا جاپ خراب نہ کر۔"

جگن بابا کی آواز سن کر وہ سرتاپا لرز اٹھی تھی۔ اس نے اطراف میں دوبارہ ہراساں ہو کر دیکھا تھا۔ مگر اسے بابا کسی طرف نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

"باؤلی سمے برباد نہ کر۔ جا ہم تجھے دکھائی نہیں دیں گے۔ مگر تو ہمیں من کی آنکھ سے دکھائی دے رہی ہے۔ اس سمے ہم اس قبرستان کی کسی قبر میں ہیں۔ جا۔ چلی جا۔" جگن بابا کی آواز اس کے کان کے بالکل پاس ہی سنائی دے رہی تھی۔ جیسے وہ اس کے بالکل پاس ہی کھڑے ہوں۔

ساشا کا وجود اس ٹھنڈ میں بھی پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ بات تو اس تک پہنچ ہی گئی تھی۔ اسے اب دری کے بال حاصل کرنا تھے۔ وہ یہ کام پہلے بھی ایک مرتبہ کسی سے کروا چکی تھی۔ اس لئے اسے اس طریقہ کار کا بخوبی علم تھا۔ اس نے اپنے ایک خاص بھروسے کے آدمی سے یہ کام کرالیا تھا۔ اس لیے اسے اندازہ تھا کہ اب کیا کرنا ہے۔ لیکن اس پراسرار تاریکی سے اس وقت اسے بے پناہ خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس لیے وہ الٹے قدموں بے حد خاموشی سے وہاں سے واپسی کے لیے چل دی تھی۔

ڈرائیور مستعد انداز میں کھڑا ہوا اس کا ہی منتظر تھا۔ جیسے ہی ساشا کو تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس ڈرائیور نے لپک کر اپنی سیٹ سنبھال لی تھی۔ ساشا بھی عقبی نشست پر آ کر براجمان ہو گئی تھی۔ تو کار واپسی کے لیے مڑ گئی تھی۔ کار واپسی کے راستوں پر رواں دواں تھی۔ اور اس کا ذہن مسلسل گردش کر رہا تھا۔ یہ کوئی اتنا آسان کام نہیں تھا۔ جتنا معلوم ہو رہا تھا۔ اب نجانے کیا ہونا تھا۔

❖❖❖❖❖

گھر کو قمقموں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ آرائشی انداز میں ہر اطراف پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ عروش کو باقاعدہ طور پر اب ارسل کے نام کی انگوٹھی پہنا دی گئی تھی۔ شزاء بھی حسن کے ساتھ یہاں مدعو تھی۔ بلایا تو حسن کے اہل خانہ کو بھی تھا۔ مگر وہ سب باتیں جو ماضی میں تلخی گھول گئی تھیں۔ وہ ابھی بھی رستے ہوئے تازہ خون کی مانند دل کی زمین کو تر کر رہی تھیں۔ اس لیے کسی نے بھی حسن کو تو جانے سے منع نہیں کیا تھا کہ اب یہ رشتہ ایک مجبوری سا تھا۔ جسے بہرکیف نبھانا ہی تھا۔ بلکہ اگلے دن ہونے والی دری کی منگنی کے لیے بھی حسن نے وہاں سب کو ہی مدعو کیا تھا۔ حسن کی دعوت کو ساشا نے اپنے لیے ایک بے حد تضحیک شمار کیا تھا۔

"دیکھتے ہیں میرا آنا تو بہت مشکل ہے۔ لیکن میں عروش کو ضرور اس دعوت میں بھیجوں گی۔ کیونکہ اب عروش کا بھی تم لوگوں سے ایک رشتہ سا بن گیا ہے۔" ساشا نے پرسوچ انداز میں کہا تھا۔

حسن یہاں آ تو گیا تھا مگر یہاں بھی سب سے ایک خاص فاصلے کے ساتھ موجود تھا۔ اس کا دل ابھی بھی ساشا کی باتوں کو بھلا نہ پایا تھا۔ مگر بعض رشتے انسان کو مارے باندھے نبھانے میں پڑتے ہیں۔ حسن نے واشگاف لفظوں میں انکار کر دیا تھا۔ مگر اس کے بعد تو شزاء نے پورے گھر میں خوب واویلا کیا تھا۔

"میں کیوں نہ جاؤں میرے بھائی کی منگنی ہے۔ میرے اکلوتے بھائی کی منگنی یہ ہوتی ہے سسرال جہاں خاوند کے ساتھ ساتھ بہو پر بھی پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔ ارے باتیں تو آپ لوگوں نے چھپائی ہیں ہمیں تو علم ہی نہ تھا کہ وہ لوگ آپ کے اتنے قریبی عزیز دار ہیں اور دلوں میں کدورتیں ہیں۔ یہ سب تو ہم سے چھپایا گیا تھا۔"

"شزاء بیٹی ہم نے یہ بات چھپائی تو نہیں تھی۔ ہمیں کون سا علم تھا کہ تم لوگ عروش کو اپنی بھابی بنانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ ہم نے جب ایک رشتے کو ہی بھلا دیا تو پھر تم کو متعارف کروانا کوئی ایسی ضروری بات نہیں تھی۔ متعارف تو تب کرواتے جب ہم خود میل جول رکھنا پسند کرتے۔" آصفہ بیگم نے معاملہ فہمی سے کہا تھا۔ اس کی بات اگرچہ آصفہ بیگم کو بے حد ناگوار خاطر گزری تھی۔

"اب ان باتوں کو جانے دیں۔ اب ان گزری باتوں کا کیا فائدہ۔ اب یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ شزاء بیٹی نے جانا ہے منگنی کی تقریب میں اور اکیلے نہیں جانا اس کے ساتھ حسن بھی جائے گا۔" اچانک ہی بالکل خاموش بیٹھے ہوئے بلال صاحب نے کہا تھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"مگر بابا جان میں وہاں کیسے جاسکتا ہوں؟" حسن نے بے حد تحیر زدہ ہوکر پوچھا تھا۔

"کیوں؟ کیوں نہیں جاسکتے تم۔" اب سوال بھی بلال صاحب نے دوبدو پوچھا تھا۔

"رنجشوں کو ہم تک ہی محدود رہنے دو۔ اس میں شزاء بیٹی کی ذات کو ملوث نہ کرو۔ نہ ہی میں یہ پسند کروں گا کہ تم اس کو تن تنہا بھیج دو۔ اس طرح اس کی معاشرے میں کیا وقعت رہ جائے گی۔ وہ کس کس کے سوالوں کے جواب دے گی کہ میاں اس کے ساتھ نہیں ہے۔ اس لیے یہ میرا حکم ہے کہ تم ان کے ساتھ ہی جاؤ۔" بلال صاحب کی بات پر شزاء جو بہت بھڑک رہی تھی۔ بول رہی تھی۔ اس وقت بالکل ہی چپ ہوگئی تھی۔ کیونکہ اس وقت وہ اس کے ہی خیالات کی ہمنوائی میں بول رہے تھے۔

"ہاں تمہارے بابا بالکل درست کہہ رہے ہیں۔ یہ ہی بہتر ہے۔" آصفہ بیگم ایک روایتی مشرقی خاتون تھیں۔ انہوں آج تک کبھی بھی اپنی سوچ کو الگ نہیں رکھا تھا۔ جو ان کے خاوند کی سوچ ہوا کرتی تھی۔ وہ اس پر ہی عمل پیرا ہوا کرتی تھیں۔ حسن کو ماننا ہی پڑا تھا۔ اور اب یہاں آکر وہ بالکل چپ چاپ تھا البتہ اپنے باپ کی کی نصیحت کے مطابق دری کی منگنی پر سب کو مدعو کرنا نہ بھولا تھا۔

کھانا کھول دیا گیا تھا۔ سب کھانے کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ اس کا یہاں کھانا کھانے کا بھی بالکل بھی ارادہ نہ تھا۔ مگر شزاء اس پر مسلسل کڑی نگاہ رکھے ہوئے بیٹھی تھی۔

"چلیں اب یہاں کیوں کونے میں بیٹھے ہیں۔ ایسا ہی کرنا تھا تو آتے ہی نہیں۔ اب آگئے ہیں تو میرا اور اپنا تماشہ تو نہ لگوائیں۔" وہ منہ بنا کر مسلسل بولتی چلی گئی تھی۔

اس کی مسلسل چلتی زبان سے اکثر حسن خائف ہوجاتا تھا۔ اس نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ وہاں تو اس نے کبھی بھی بابا اور اماں کے درمیان منہ زوری نہیں دیکھی تھی۔ جو بابا نے منہ سے نکال دیا اماں نے حرف بہ حرف اس کو مان لیا۔ کوئی اعتراض کوئی حرف زنی نہ کرتی تھیں۔

خدا خدا کرکے کھانا کھایا گیا اور واپسی کے لمحات آہی گئے۔ اور حسن کی جیسے تن مردہ میں جان سی پڑ گئی تھی۔ اسے اس ماحول سے وحشت سی ہورہی تھی۔ پھر اس نے گھر آکر ہی دم لیا تھا۔

وہ سیدھا بابا جان کے کمرے میں آیا تھا جبکہ شزاء منہ پھلا کے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

"کہو برخوردار سب ٹھیک رہا ناں۔" بلال صاحب نے پوچھا تھا۔

"جی بابا سب ٹھیک ہوگیا ہے۔ کل شام کی تیاری بھی کرنی ہے۔ میں اس لیے فوراً ہی شزاء کو لے کر نکل آیا تھا۔ دوسری بات ساشا آنٹی کہہ رہی تھیں کہ وہ کل عروش کو یہاں بھیجیں گی۔ مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ مگر کہہ رہی تھیں کہ اب عروش کا اس گھرانے سے بھی ایک الگ رشتہ بن گیا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ میل جول رہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ شاید وہ رات ادھر ہی رک جائے۔ یہ بات مجھے بالکل بھی ہضم نہیں ہوتی بابا۔" وہ کچھ پرسوچ لہجہ میں بولا تھا۔

"بیٹا یہ بہت اچھی بات ہے۔ ہر بات کو منفی انداز میں نہیں لینا چاہیئے۔ ہوسکتا ہے کہ ساشا چاہتی ہو کہ اس کا بیٹا ارسل بن گیا ہے اور اس حوالے سے وہ عروش کو یہاں بھیجنا چاہتی ہو۔ یہ تو ایک مثبت پہلو ہے۔ آصفہ بیگم اگر واقعی عروش آجائے تو دیکھنا اس کا خیال رکھنا اسے ارسل کی بیوی کی حیثیت سے عزت و احترام دینا۔" بلال صاحب کی بات سے سب نے ہی اتفاق رائے کیا تھا۔

❖❖❖❖

دری کی حالت بہت ہی اچھی ہوچکی تھی۔ اس کا ہنسنا بولنا پہلے جیسا ہوگیا تھا۔ گل افشاں صبح ہی آگئی تھی۔ اس کا کہنا تھا۔

"میں تو ہر حال میں حق دوستی نبھاؤں گی۔ شام کو بے شک بھیا امی تیار ہوکر آجائیں۔ میں تو اپنی دوست کی محبت میں آگئی ہوں۔" گل افشاں کی بات پر سب ہی ہنس دیئے تھے۔

"بہت اچھا کیا بیٹا ہم کو تمہارا آنا بہت اچھا لگا ہے۔ یوں بھی اتنے سارے کام اور میں اکیلی جان۔ اب اچھا تو نہیں لگتا ناں کہ دری کو کہوں۔" آصفہ بیگم نے اس پر وارے صدقے جاتے ہوئے کہا تھا۔

"کیوں بھئی یہ بھائی شزاء کس مرض کی دوا ہیں ان کو بھی تو کہیں ناں یہ تو گھر کی ہی تقریب ہے۔ اس میں ان

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

کا تو ضرور کام ہونا چاہیے۔'' گل افشاں بھی دور کی کوڑی لائی تھی۔ آصفہ بیگم نے گہری سانس لی تھی۔

''ان باتوں کو چھوڑو تم وقت پر اس کو پارلر لے جانا میں چاہتی ہوں کہ اس کو اچھا سا تیار کیا جائے۔'' ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں جب ملازم نے عروش کی آمد کی اطلاع دی تھی۔

آصفہ بیگم نے حیرت سے دری کو دیکھا تھا۔ مگر انہیں بلال صاحب کی بات بخوبی یاد تھی۔ اس لیے انہوں نے ملازم سے کہا تھا کہ اسے یہاں ہی لے آئے۔ قدرے توقف سے عروش ہنستی مسکراتی وہاں آ گئی تھی۔

''السلام علیکم خالہ جان۔'' عروش اس طرح مسکرا رہی تھی جیسے اس کو یہاں آ کر دلی خوشی مل رہی ہو۔ ''اتنی جلدی آ گئی۔ ابھی تو تقریب میں بہت وقت ہے ناں۔'' گل افشاں کہاں چوکنے والی تھی۔

''ہونہہ بس امی نے کہا جا کر سب کاموں میں ہاتھ بٹا دینا۔'' وہ مسکرا کر بولی تھی۔ سب ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر رہ گئے تھے۔ اس کا انداز تو ایسا تھا جیسے دونوں گھرانوں میں نجانے کتنا دوستانہ چل رہا ہے۔

''ہم مہمانوں سے کام نہیں کرواتے۔'' گل افشاں نے دو بدو بات کا جواب دیا۔ تو عروش بالکل چپ کر گئی تھی۔ یقیناً اسے گل افشاں کا انداز بھایا تھا۔ جو اس کے چہرے سے ہی صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

''ارے ارے یونہی باتیں ہی کرتی رہو گی یا کام بھی کرو گی۔ ایسا کرو تم گل افشاں کے ساتھ ہی دری کو پارلر لے جانا۔'' آصفہ بیگم نے اس کے چہرے پر سخت تاثرات دیکھ کر ہی بات کو رفع دفع کرنا چاہا تھا۔

''ڈیٹس گریٹ مجھے خود بھی پارلر سے ہی تیار ہونا اچھا لگتا ہے۔ مل کر چلتے ہیں۔'' عروش ہنس دی تھی۔

''چھوڑو آپ تو پہلے ہی اتنا اچھا خاصا تیار لگ رہی ہیں۔''

گل افشاں کی زبان کو بریک نہ لگ سکتے تھے۔ دری نے اس وقت گل افشاں کو ٹہنی ماری تھی۔

''پارلر میں ہر وقت ہی سجی سنوری رہتی ہوں پھولوں کی طرح مہکتی ہوئی۔'' عروش بھرپور ہنسی ہنس دی تھی۔

''لیکن میں اپنے لباس کو بھی ساتھ لائی ہوں میں ادھر بھی تیار ہونے کے ارادہ سے آئی ہوں۔ فنکشن تو روایتی سا ہی ہوتا ہے اصل مزہ تو ان تیاریوں میں ملتا ہے۔ چہل پہل اچھی لگتی ہے۔'' عروش نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ سب ہی چپ کر گئے تھے۔ پھر گل افشاں کو عروش کو ساتھ لے جانا بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مگر وہ آصفہ بیگم کے سامنے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔

''اچھا میں ذرا شہزاء سے مل کر آتی ہوں۔'' وہ الگ ہو گئی تھی اور سیدھا شہزاء کے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔

''آنٹی آپ کو کیا ضرورت تھی بھلا اس کو ہمارے پیچھے لگانے کی۔ نخرے تو دیکھیں محترمہ کے۔'' گل افشاں نے ناک بھوں چڑھائی تھی۔

''جانے دو بیٹا وہ بھی بچی ہے خوش ہو جائے گی۔ پھر ابھی تو اتنا وقت پڑا ہے تم دونوں آرام سے باتیں کرو۔ میں ذرا باقی کام دیکھ لوں۔ مگر یاد سے عروش کو بھی اپنے ساتھ لے جانا۔ ورنہ اب بہت بات بن جائے گی۔ میں نہیں چاہتی کہ اس خوشی کے موقع پر کوئی بھی بدمزگی ہو۔'' آصفہ بیگم نے ناصحانہ انداز میں کہا تھا۔ اور ان کی بات پر گل افشاں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ پھر آصفہ بیگم کے جاتے ہی وہ بولنے لگ گئی تھی۔

''بھلا کیا ضرورت ہے اس کو اتنا سر پر چڑھانے کی۔ اور ان کی والدہ صاحبہ تو ہمارے تایا ابو کو رسوا کرتی رہی۔'' گل افشاں کے دل میں بھی ان باتوں کی گہری گانٹھ ابھی بھی بندھی ہوئی تھی۔

''چھوڑو تم ان باتوں کو۔ امی نے یہ سب صرف بابا جان کے کہنے پر ہی تو کیا ہے۔ اگر بابا کو اعتراض نہیں تو تم کیوں خفا ہو رہی ہو۔ اور پھر یہ بھی ٹھیک ہے اس طرح ہم نئی نسل تو کم از کم نفرتوں کو محبتوں میں بدل ہی سکتے ہیں۔'' دری نے کہا تھا۔ پھر باتوں کا رخ تبدیل ہو گیا تھا۔

درحقیقت اہل خانہ عروش کی آمد کے اصل پس منظر سے قطعی طور پر ناواقف تھے۔ جن نے ساشا کو تین دن بعد یہاں آنے کا عندیہ دیا تھا۔ اور اس وقت میں اسے ہر کام کرنا تھا۔ اس لیے ساشا نے عروش کو اعتماد میں لے لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ عروش ایک چالاک لڑکی ہے۔ اس کی آمد و رفت بھی ہے۔ اس نے اگر ذرا سا ہوشیاری سے یہ کام کر دیا تو ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ ساشا

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ازخود تو جا نہیں سکتی تھی۔ پھر یہی نہیں اسے معلوم تھا کہ وہ یہ کام کسی اور سے کروا بھی نہیں سکتی تھی۔ عروش گڑیا کے اصل راز سے بھی واقف ہو چکی تھی۔ اس لیے اسے ہی ساشا نے کہا تھا کہ بال کسی طرح لے آئے۔

یہ ایک بہت مشکل کام تھا۔ مگر اب جیسے سارے رستے ازخود ہی کھل گئے تھے۔ کیونکہ آصفہ بیگم نے اسے خود ہی کہہ دیا تھا کہ عروش اور دری اور گل افشاں اکٹھے پارلر چلی جائیں۔ عروش بہ ظاہر تو بہت ہنس بول رہی تھی۔ مگر اس کے اندر بہت ہی اضطراب تھا۔ اس کو اندر ہی اندر پریشانی کھائے جا رہی تھی۔ اس مرتبہ اس کی ماں نے سارا کام اس کے سر پر لا دیا تھا۔ اس نے اپنے تئیں سمجھانے کی ازحد کوشش کی تھی کہ یہ ساری دشمنی بھلا دیں۔ مگر اس کی امی ساشا کا صرف یہی کہنا تھا کہ وہ یہ سب اس کے بھائی اپنے اکلوتے بیٹے کی خوشی کی خاطر کر رہی ہے۔ یہ تو اسے بھی دکھائی دے رہا تھا کہ سہراب مرجھا کر رہ گیا تھا۔ اور ہر وقت کمرہ بند کیے افسردہ نغمے سنتا رہتا تھا۔ اس کا مزاج بے حد اکھڑا اکھڑا سا ہونے لگا تھا۔ اور وہ بے حد سرد مزاج سا ہونے لگا تھا۔ اس کے مزاج میں بے حد تناؤ سا آ گیا تھا۔ اور وہ ہر وقت ساشا کو یہی کہتا پھرتا تھا کہ اسے ہر قیمت پر دری چاہیے۔ اگرچہ سہراب کا بھی ایک خاص پس منظر تھا۔ اسے ہر شے کی طلب میں جلدی جلدی کی رٹ لگنے کی پرانی عادت تھی۔

فلاں کھلونا چاہیے۔ دلا دیا۔ فلاں کالج میں ہر صورت ایڈمیشن چاہیے۔ دلا دیا گیا۔ اس طرح ہر مرتبہ وہ رو دھو کر اپنی منوا ہی لیا کرتا تھا۔ مگر یہ کوئی گڈے گڑیا کا کھیل ہرگز نہ تھا۔ اس لیے ساشا چاہ کر بھی کچھ نہ کر پا رہی تھی۔ اس نے بہ ظاہر عروش کے ذہن میں یہی بات ڈالی تھی کہ جگن ان بالوں پر کچھ ایسا جنتر منتر پڑھ ڈالے گا کہ دری ازخود شادی کے لیے سہراب کا ہی نام لے گی۔ لیکن درپردہ اب اسے دری کی ذات سے کوئی بھی دلچسپی نہیں تھی۔ نہ ہی وہ اسے اپنے گھرانے کی بہو بنانے کا کوئی ارمان رکھتی تھی۔ اس کے دل میں محض ایک غصہ تھا۔ کینہ تھا۔ عناد تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اپنی ذلت کا اپنی ماں کے دیئے گئے اسباق کی روشنی میں اپنی ہی بہن کی بیٹی کو تباہ و برباد کر کے اس سے انتقام لے۔ اس لیے اس نے عروش کو مجبور کیا تھا کہ وہ جا کر کسی طریقے سے بال لے آئے۔

اور اب وہ اپنی ماں کی سکھائی گئی پٹی کے مطابق ہی یہاں آئی تھی۔ اس کا بہ ظاہر ہنسنا بولنا اس کی منصوبہ بندی کا ہی ایک حصہ تھا۔ پھر اس نے ایک مخصوص طریقے سے بال حاصل کرنے کی ترکیب نکال ہی لی تھی۔

پارلر پہنچتے ساتھ ہی دری کا فیشل اور میک اپ شروع ہو گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ گل افشاں کو جب لیڈی اونر نے کہا کہ وہ جا کر اندر لباس تبدیل کر آئے۔ اس وقت عروش نے اس کے جاتے ہی پارلر میں میک اپ کرنے والی لڑکی کو ایک طرف لے جا کر کہا تھا۔

"سنیں ان کے بال بے حد روکھے سے ہو رہے ہیں۔ ان کی ٹرمنگ بھی کر دیں۔ اور کچھ روکھے سے بالوں کی بھی کٹنگ ہو جائے گی۔" وہ جلدی سے بول رہی تھی۔ اس کا دل اچھل پتھل کر رہا تھا۔ اور اسے یہ خدشہ بھی تھا کہ گل افشاں جلدی پلٹ آئے تو اس سے ضرور باز پرس کرے گی۔ مگر اس لڑکی نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"جی پھر پہلے تو کٹنگ ہی کرانی ہو گی کیونکہ میک اپ کے بعد تو ممکن نہیں۔ اچھا کیا پہلے بتا دیا۔" وہ لڑکی ہنس مکھ سی تھی۔ اس نے تیزی سے پہلے دری کے بالوں کا سرسری سا جائزہ لیا تھا۔ اور اس کے بعد کٹنگ شروع کر دی تھی۔ دری کو معلوم تھا کہ گل افشاں نے اچھی ہدایات ہی دی ہوں گی۔

جیسے ہی بالوں کی ایک لٹ نیچے گری اسے عروش نے اپنے پاؤں تلے داب لیا تھا۔ اور بے حد آہستگی سے اس کو گھسیٹتی ہوئی ایک جانب کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اور پھر اس نے اطراف میں دیکھا تھا۔

گل افشاں ابھی تک نہیں لوٹی تھی۔ لڑکی کا سارا دھیان اس وقت دری کی جانب تھا۔ جبکہ دری بھی آنکھیں بند کیے نجانے کون سے جہان میں تھی۔ اس نے بالکل خاموشی سے ان بالوں کو اٹھا کر اپنے پرس میں رکھ دیا تھا۔ اور اس کے بعد اس کا دل بالکل پرسکون سا ہو گیا تھا۔ اس نے ایک اہم معرکہ مار ہی لیا تھا۔

گل افشاں کے آنے تک لڑکی اس کے بالوں کی خوبصورت سیٹنگ کر چکی تھی۔ جواب دہی کے خوف میں اس نے جلدی سے اپنا لباس تبدیل کرنے کا ارادہ باندھ لیا تھا۔ اور لباس لے کر واش روم میں گھس گئی تھی۔ مگر اس

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کا خوف صرف خوف ہی تھا۔ کیونکہ اس سے بعد میں بھی کسی نے کوئی باز پرس نہیں کی تھی۔ اس نے اپنے پرس کو ایک لمحہ کے لیے بھی خود سے الگ نہیں کیا تھا۔ یوں جیسے اس میں قیمتی خزانہ پوشیدہ ہو۔ منگنی کی تقریب گھر کے ہی لان میں کی گئی تھی۔ لان میں بے حد خوبصورتی سے مہمانوں کی تواضع اوران کی ہر ضرورت کا انتظام کیا گیا تھا۔ مصنوعی پھولوں سے گھر کو سجایا گیا تھا۔ اور صرف قریبی لوگوں کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔ منگنی کی تقریب کے لیے باقاعدہ ایک جانب زریاب اور دری کو ایک دوسرے کے پہلو میں بٹھایا گیا تھا۔ فوٹو سیشن شروع کیا گیا تھا۔

دری بے حد خاموش سی تھی جبکہ زریاب خوب ہنس بول رہا تھا۔ چہک رہا تھا۔

”تم اچھی رہی ہو لڑکی۔ لڑکے کی بہن ہو کر بھی تم یہاں سجی سنوری بیٹھی ہو۔“ ریحانہ بیگم نے گل افشاں کی خوب خبر لی تھی۔ سب ہی ہنسنے لگے تھے۔

”تو کیا کروں۔ بعد میں بھی تو پارٹی بدلنی ہی پڑے گی تو میں نے سوچا کہ پہلے ہی پارٹی بدل لوں۔“ گل افشاں نے معصوم صورت بنا کر کہا تھا۔

”وہ کیسے بدلنی پڑے گی پارٹی بھلا ہم بھی تو سنیں ذرا۔“ ریحانہ بیگم نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

”جی جی بالکل صاف ظاہر ہے کہ بھیا تو شادی کے بعد اپنی بیگم کے ہی گن گائیں گے۔ بیگم بھی اگر اس قدر حسین، جاذب نظر، سلیقہ مند ہو تو دل تو خود بخود اس کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور ہو ہی جاتا ہے۔“ گل افشاں نے باقاعدہ دری کی بلائیں لیتے ہوئے کہا تھا۔ پارلر کی اگرچہ درشہوار کو کوئی خاص ضرورت ہی نہ تھی۔ مگر پارلر جا کر تیار ہونے کے بعد اس کے رنگ روپ میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ اس کی شخصیت میں مزید نکھار پیدا ہو گیا تھا۔ وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اس کا حسن دو آتشہ ہو گیا تھا۔

عروش یہاں ارسل کو دیکھ کر کھل اٹھی تھی۔ آصفہ بیگم نے باقاعدہ شنزاء کے اہل خانہ کو بھی اس موقع پر مدعو کیا تھا۔ اس لیے تو عروش نے اپنی تیاری پر خاص توجہ دی تھی۔ اس کے دو دو مقاصد تھے، جو پورے ہو رہے تھے۔ ایک تو وہ بہ ظاہر ساشا کے لیے ہی آئی تھی۔ مگر اب دل بھی بار بار ارسل کو دیکھنے اور اس سے ملاقات کے لیے مچلنے لگ تھا۔ تقریب ہنسی خوشی اپنے انجام کو پہنچی تھی۔ اور سب لوگ ہی اپنی اپنی سواریوں میں جس طرح آئے تھے اسی طر کاروں میں واپسی کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔

عروش کچھ پریشان سی تھی۔ کیونکہ پروگرام کے مطابق وہ ساشا کے ساتھ یہ طے کر کے آئی تھی کہ اگر شام میں مو نہ ملا جس کی عین امید بھی تھی۔ تو وہ رات کو کسی طریقے سے دری کے کمرے میں ٹھہر جائے گی اور موقع دیکھتے ہی اس کے بالوں کا ایک حصہ کاٹ لے گی۔ مگر اس پر تقدیر مہربان ہو گئی تھی۔ اس کا کام آسان ہو گیا تھا۔ اور وہ اس سے پہلے ہی فارغ ہو گئی تھی۔ وہ چاہتی تو کال پر سہراب کو بلا سکتی تھی مگر اس نے خود ہی کال نہ ملائی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ و ارسل کے ساتھ واپس لوٹے۔ اس کا ارسل سے ڈھیروں باتیں کرنے اپنے حسن کا قصیدہ سننے کا دل کر رہا تھا۔ کیونکہ یہاں سب لوگوں کے درمیان صرف ارسل سے آنکھوں ہی آنکھوں میں تبادلہ محبت ہوا تھا۔ عملاً کوئی بھی اظہار محبت نہ ہو سکا تھا۔ اب وہ چاہتی تھی کہ ارسل اسے چھوڑ کر آئے۔ اس پر ارسل کی مسلسل وارفتہ نگاہیں پڑ رہی تھیں۔ وہ مسلسل اس کی نگاہوں کے حصار میں ہی تھی۔ وہ بھی کچھ نخوت سے کھڑی تھی مگر دل میں پھول کھل رہے تھے۔

”کیا بات ہے عروش کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو؟“ شنزاء کو اپنی دوست اور ہونے والی بھابی کی پریشان صورت دیکھ کر احساس ہو ہی گیا تھا۔

”ہاں دیکھو نا کال ہی نہیں مل رہی ہے سہراب کی۔ اور گھر بھی جانا ہے۔ اب اتنی رات کو کیسے جاؤں گی میں؟“ وہ کچھ الجھن زدہ لہجہ میں بولتی اطراف میں سب کو واپسی کے لیے جاتا دیکھ کر بولی تھی۔

”لو اس میں بھلا ایسا کیا مسئلہ ہے۔ ارسل بھائی جاتے ہوئے تمہیں ڈراپ کر دیتے ہیں۔ یوں بھی ارسل اکیلا ہی آیا ہے۔ مام کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ اس لیے وہ نہیں آسکی۔ تم ارسل کے ساتھ چلی جاؤ۔“ شنزاء نے مسئلے کا حل اس کے دل کی آرزو کے عین مطابق ہی نکالا تھا۔ دل تو چاہا تھا کہ اپنی سہیلی کی اس وقت بلائیں لے ڈالے۔

عروش ہنستے مسکراتے گھر میں داخل ہوئی تو ساشا کو اپنا منتظر پایا تھا۔ عروش نے مسکراتے ہوئے کاغذ میں لپٹے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ہوئے بال سیدھا ساشا کے ہاتھ پر رکھ دیئے تھے۔اس کو دیکھ کر ساشا کھل اٹھی تھی۔

❖❖❖❖

بلال ہاؤس میں پرسکون سا ماحول تھا۔سب ہی بے حد اطمینان اور خوشی محسوس کر رہے تھے۔اتنے دنوں سے جو شدید تناؤ کی کیفیت تھی۔اس سے رہائی نصیب ہوگئی تھی۔دری کا اتنے دنوں سے بے آرام رہنا گھر والوں کے لیے شدید تشویش اور فکر مندی کا سبب بن رہا تھا۔سب ہی دری کی ذات کو لے کر اس کے لیے ہراساں تھے۔لیکن دری کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔منگنی کی تقریب بھی بخیریت انجام پذیر ہوگئی تھی۔

دری بھی بے حد خوش تھی۔وہ اپنے کمرے میں آ کر سارے زیورات اتارنے لگی تھی۔آصفہ بیگم نے کمرے میں جھانکا تھا۔

''ماشاء اللہ میری بیٹی تو آج شہزادی لگ رہی تھی۔''

آصفہ بیگم نے اس کا ماتھا قریب آ کر چوما تھا۔اپنی تعریف پر دری بری طرح شرما سی گئی تھی۔''بیٹیاں کچھ جلدی بڑی ہو جاتی ہیں۔ابھی کل کی ہی بات تھی جب تم اس آنگن میں کھیلا کرتی تھیں۔اور اب نئے آنگن کو اپنی خوشبو سے مہکانے چلی جاؤ گی۔'' آصفہ بیگم کا لہجہ بے حد اداس اور دلگیر سا تھا۔

''امی اگر آپ اس طرح سے اداس ہوں گی تو پھر میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔اور نہ ہی شادی کروں گی۔'' وہ بھی نروٹھے پن سے بولی تھی۔

''ارے ایسے کیسے شادی نہیں کرو گی اپنے گھر آباد رہو شاد رہو۔ویسے تمہیں زریاب پسند ہے ناں۔'' آصفہ بیگم نے اس سے قریب ہو کر ماں اور سہیلی بن کر پوچھا تھا۔

''پتہ نہیں میں نے کبھی بھی زریاب کو لے کر کوئی خواب نہیں سجایا ہے۔میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ جو بھی میرا جیون ساتھی ہو۔میری ہی نہیں میرے اہل خانہ کی بھی عزت کرے۔کبھی کسی بھی مقام پر مجھے اور میرے اہل خانہ کو کبھی نہ کرے۔'' دری نے بے حد ٹھہرے ہوئے لہجہ میں اپنے دل کی بات بیان کی تھی۔

آصفہ بیگم نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تھا۔

''اچھا رات بہت ہو رہی ہے اب تم سو جاؤ۔'' آصفہ بیگم نے اس کے ماتھے کا الوداعی بوسہ لیا تھا۔اور دری کو اپنی دعاؤں کے حصار میں رخصت ہوگئی تھیں۔

❖❖❖❖

رات کی گھمبیر خاموشی میں جگن اپنی لال انگارہ آنکھوں میں پنپتے ہوئے اشتعال کو جوالا مکھی بنائے اس وقت گہرے جاپ میں مستغرق تھا۔اس کے ہاتھوں میں اس وقت دری کے بال تھے۔اور اس کے سامنے الاؤ میں کھوپڑیاں جلنے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔اس کے عین سامنے بیٹھی ہوئی ساشا کے چہرے پر امید و بیم چھائی تھی۔

اس نے ایک موقع تو گنوا دیا تھا۔جس کا پچھتاوا بھی اسے بے حد زیادہ تھا۔مگر اب وہ ہر صورت میں یہ دوسرا موقع گنوانا نہیں چاہتی تھی۔وہ پورے تین دن بعد جگن کے سامنے حاضر ہوئی تھی۔اس کو امید تو نہ تھی کہ جگن اسے دکھائی دے گا۔یہاں آ کر اسے بے حد خوشی ہوئی تھی کہ جگن اس کے عین سامنے ہی بیٹھا ہوا تھا۔اسے دیکھ کر اس نے نجانے کیا پھونک کر الاؤ میں پڑھا تھا کہ آگ مزید بھڑک اٹھی تھی بھڑکتی ساشا کے دل کی حرکت بھی تیز تر ہو جاتی تھی۔مگر وہ اپنے ارادے کی اٹل تھی۔دل میں بھڑکتی ہوئی نفرت کو ایک جگہ ٹھکانے لگانے کا ارادہ رکھتی تھی۔اس وقت بھی وہ بے حد اطمینان سے بیٹھی تھی۔نہ تو اسے اس پرآشوب رات کا کوئی خوف تھا۔نہ ہی اندھیرے میں سرسراتی ہوئی ایک مخصوص آواز سے اسے خوف محسوس ہوا تھا۔اور نہ ہی اسے اس وقت جگن کی لال انگارہ آنکھوں سے ہی ڈر محسوس ہو رہا تھا۔

جگن نے پندرہ بیس منٹ تک کی جنتر منتر کا ورد جاری رکھا تھا۔اس کے بعد ایک لکڑی لے کر اس نے ایک گرہ کے بعد دوسری گرہ بالوں کی گانٹھ کی صورت میں باندھ دی تھی۔سات گرہیں کرنے کے بعد وہ رک گیا تھا۔اس کے چہرے پر پھیلی شیطانی چمک میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔اس کے بعد اس نے وہ لکڑی ساشا کے سامنے کر دی تھی۔

''اب اگر کسی بھی قسم کی غلطی کی تو پھر اس کے بعد میں بھی تیری کوئی سہاتیا نہیں کر پاؤں گا۔تیری ایک بھول سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دے گی۔یہ لکڑی تجھے اس چھوکری کے ہی گھر میں نرم مٹی میں دبا دینی ہوگی۔یہ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کام کوئی بھی کر سکتا ہے مگر اس کا عمل میں آتے ہی اس کے اثرات نمودار ہونا شروع ہو جائیں گے۔

یاد رہے کہ اس کام کے بعد تجھے میرے پاس آنے کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔ تیرے من کی ساری منو کامنائیں ایک ایک کر کے پوری ہوتی چلی جائیں گی۔ صرف اس لکڑی کو اس کے گھر میں دفن کرنے کی دیری ہے۔ اس کے بعد تیری ہر ادھوری خواہش پوری ہو جائے گی۔ اب تو جا۔" جگن نے کہا اور سیدھا ہاتھ کھڑا کر دیا تھا۔ ساشا جو چاہتی تھی اس کی وہ خواہش تو پوری ہو ہی گئی تھی۔ اس کے بعد کچھ بھی مشکل نہ تھا۔

اس نے اس کام کے لیے گھر کی کسی ملازمہ کی خدمات لینے کا سوچا تھا۔ کچھ رقم کی لالچ اچھے اچھوں کا ایمان ڈگمگا دیتا ہے۔ یوں بھی اسے معلوم تھا کہ یہ کام اسے کیسے پایہ تکمیل دینا ہوگا۔ وہ سرخوشی سے واپسی کے لیے روانہ ہوگئی تھی۔ اس کو اب اپنی منزل بے حد قریب محسوس ہونے لگی تھی۔ آصفہ کے آنسوؤں میں ہی اس کی جیت مضمر تھی۔ وہ اسے رلانا چاہتی تھی۔ جھکانا اور توڑنا چاہتی تھی۔

☆☆☆☆☆

دری فجر کی اذان کی آواز کے ساتھ جاگی تھی۔ اس نے نیند سے مدہوش نگاہوں کو کھولا تھا۔ اس کو اپنا سر بے حد بھاری بھاری سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے کافی دیر سیدھا بیٹھے اذان کے لفظوں اور اس کی بازگشت کو سنا تھا۔ وہ ان الفاظ کو ایک برسوں تک دہرانے کی عادی تھی۔ نماز کی پکار کے لیے ہونے والے اس بلاوے کا جواب دیتی تھی۔ اور آج اس کے لب ساکت تھے۔ درحقیقت اس پر جادو اثر کر گیا تھا۔ اس کے بالوں کو کس طریقے سے رقم دے دلا کر اس کے لان میں ہی ایک جانب دفنا دیا گیا تھا۔ یہ کام کچھ مشکل ضرور تھا۔ مگر پیسہ ہر شے کے حصول کا ذریعہ بن جایا کرتا ہے۔ اس کے بعد سے اس کا سر بوجھل سا رہنے لگا تھا۔ نہ کچھ کھانے کا جی چاہتا تھا اور نہ پینے کا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس کا دل کسی نے اپنی مٹھی میں لے رکھا ہو۔ اس کے دل پر کسی نے اپنا پاؤں رکھ دیا ہو۔ اس کے دل کی گردش تو شاید جاری تھی۔ مگر اس کی رفتار بے حد سست اور مدھم سی تھی وہ رک رک کر چل رہا تھا۔ چیخ چنگھاڑ رہا تھا۔ اپنی آزادی کے لیے فریاد کناں تھا۔ اور اب کئی دنوں سے اس کا عبادت میں بھی جی نہ لگ تھا۔ اس کا جی تو اب رہا ہی نہیں تھا۔

وہ کسل مندی سے واش روم کے لیے اٹھی تھی۔ اور اس سے فراغت کے بعد اس نے وضو نہیں کیا تھا۔ نماز کا اراد نہیں باندھا تھا۔ روایات میں اور اچھی اقدار میں ایک یہ بات بھی شامل تھی کہ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد باقاعد تلاوت کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اور یہ برسوں کا معمول تھا۔ اس کے بعد جس کا جو جی چاہتا کرتا۔ اگر مزید آرام کی نیت ہوتی تو سو جاتا۔ کام کرنے ہوتے تو جاگتا رہتا۔ یہ اس کی اپنی صوابدید پر ہوتا تھا۔ مگر اس کو کوئی دوسرے کسی کام کے لیے نہ تو کوئی مجبور کرتا تھا اور نہ ہی پابند۔

آصفہ بیگم کی عادت تھی یونہی گزرتے ہوئے اس کے کمرے میں جھانکا کرتی تھیں۔ وہ ماں تھیں۔ بیٹی ذات کی بہت ساری ذمہ داریاں ہوا کرتی ہیں۔ جب بچی جوان ہونے لگتی ہے تو ماں کو اس کی دوست بن کر اس کے تمام دکھ سکھ کو اپنا بنانا پڑتا ہے۔ اسی طرح ہی معاملہ بھی تھا۔ وہ اس کی ہم راز اور ہم عمر نہ سہی مگر اس کی غم خوار اور ہم درد تو تھیں۔

اس کے کمرے میں جھانکا تو وہ آرام سے سیدھی واش روم سے نکلی اور جا کر اپنے بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔ وہ کمرے کی جھری اوٹ سے اس منظر کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔ واپس پلٹنے کو اب دل آمادہ نہ ہو رہا تھا۔ خود نماز پڑھتی اس سے اس معاملے میں باز پرس ہی نہ کرتیں۔ یہ ایمان کا تقاضا تھا کہ وہ اس سے ضرور باز پرس کرتیں۔ اسی لیے وہ کمرے میں داخل ہوگئی تھیں۔

"کیا بات ہے در شہوار بیٹی نصیب دشمناں طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔" آصفہ بیگم کے لہجہ میں فطری ماں کی مامتا کی فکر میں گھلا ہوا خالص لہجہ تھا۔

"جی میں ٹھیک ہوں بس سر کچھ بوجھل سا محسوس ہو رہا ہے۔" دری نے اٹھ کر اپنے سر کو اپنے ہاتھوں سے سہلایا تھا۔

"اچھا مگر تم تو سو کر جاگی ہو۔ شاید بہت سونے سے بھی سر بھاری ہو جاتا ہے۔ بیٹا صبح سویرے دن کا آغاز رب کے نام سے ہونا چاہیے۔ رحمٰن کے نام کی برکات سے دن بھر کے سارے کام خود بخود اچھے ہو جاتے ہیں۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

تم جاگو اور وضو کر کے نماز پڑھو۔ دیکھنا تمہارا ذہن بالکل ہلکا پھلکا ہو جائے گا۔''

''وضو؟'' دری نے الجھے الجھے لہجہ میں کہا تھا۔

''ہاں بیٹا وضو کر کے ہی تو نماز پڑھتے ہیں کیا کبھی وضو کے بنا بھی نماز ہوتی ہے۔'' اب کے آصفہ بیگم کے چہرے پر تشویش کے گہرے شائے چھا گئے تھے۔

''مگر مجھے یاد نہیں آ رہا ہے، وضو کا طریقہ۔'' دری نے بے بسی سے کہا تھا۔

آصفہ بیگم کے لیے یہ بات کسی بھی جھٹکے سے کم نہ تھی۔ مگر اس کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کی بجائے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے بولی تھیں۔

''میں سمجھ گئی آگے پیچھے بھول گئی ہو گی طریقہ۔ میں سمجھاتی ہوں۔ یہ دیکھو آؤ میرے ساتھ جیسا میں کروں تم بھی کرتی جانا۔'' آصفہ بیگم کو اس کی آنکھیں ایک دم سے اجنبی سی محسوس ہونے لگی تھیں۔

''جا بڑھیا اپنا کام کر، مجھے سونے دے۔ مجھے نہیں پڑھنی نماز۔ جا بھاگ۔'' اچانک ہی دری نے باقاعدہ آصفہ کو زوردار دھکا دیتے ہوئے کہا تھا۔ اس کے علاوہ دری کی آواز میں گرج تھی۔ غصہ تھا۔

آصفہ بیگم دری کے اس طرح کے بدلے ہوئے انداز کو دیکھ کر ہی تھر تھر کانپنا شروع ہو گئی تھی۔ دری نے ماں سے بے ادبی نہیں کی تھی۔ مذاق میں بھی ماں کا جی نہ دکھایا تھا۔ کہاں تو دری اس وقت بپھری ہوئی شیرنی کی مانند انہیں دھکے دے رہی تھی۔

''دری کیا ہو گیا ہے؟'' آصفہ بیگم کی آواز جیسے گہری کھائی سے برآمد ہوئی تھی۔ دراصل یہ بے یقینی کی ہی گہری کھائی تھی۔ جہاں سے ان کا اندر کا دکھ بول رہا تھا۔ اور سوال کر رہا تھا۔

اس کے بعد تو جیسے دری کا غصہ دوگنا ہو چکا تھا۔ اس نے آصفہ بیگم کے بازو کو بری طرح سے دبوچا تھا۔ اور کھینچ کر دروازے سے باہر کر کے دروازہ دھڑام سے اندر کی جانب بند کر دیا تھا۔ باہر آصفہ بیگم حق دق کھڑی اس نئی افتاد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دکھ، حیرت، بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں وہ نجانے کتنی ہی دیر پتھر کا بت بنی وہاں کھڑی رہی تھیں۔ پھر وہ سرپٹ بلال صاحب کے پاس دوڑی چلی گئی تھیں۔ بلال صاحب تلاوت میں مشغول تھے۔ اپنی زوجہ کو اس قدر ہراساں اور ہانپتے روتے دیکھ کر بری طرح سے چونک گئے تھے۔

''کیا ہوا نیک بخت کیوں صبح سویرے رونا ڈال رہی ہو۔'' بلال صاحب نے ایک ناگوار نگاہ ان کے الجھے بالوں پر ڈالی تھی۔ ان کا دوپٹہ بھی شاید دری کے کمرہ میں ہی رہ گیا تھا۔

''رونا تو اب ہمارے مقدر میں لکھا جا چکا ہے بلال صاحب'' وہ کرسی پر ڈھے سی گئی تھیں۔

''کچھ پتہ بھی تو چلے کہ ماجرا کیا ہے کونسی قیامت آ گئی ہے؟'' بلال صاحب نے اس مرتبہ تلاوت بند کر کے ان کی جانب رخ کیا تھا۔ ایک تو دوران تلاوت ان کا ٹوکنا ہی بے حد معیوب لگا تھا۔ اور اس کے بعد ان کا مسلسل بدشگونی جیسے الفاظ منہ سے نکالنا ان کو بے حد ناگوار خاطر گزر رہا تھا۔

''قیامت اور کیا ہو گی میری اپنی جوان اولاد نے مجھے کمرے سے دھکے دے کر باہر کا رخ دکھا دیا ہے۔ اس قدر زور سے دھکے دیئے ہیں۔ میرے بازو کو دبوچا ہے۔ آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ میرے لیے۔ آہ میرے لیے۔'' وہ رو رہی تھیں۔

''حسن بیٹے کی اتنی جرأت کہ آپ کو کمرے سے دھکے دے کر نکال دے۔'' بلال صاحب کے انداز میں تذبذب کی سی کیفیت تھی۔

''بلال صاحب میں حسن کی بات نہیں کر رہی ہوں دری نے مجھے نکالا ہے۔ وہ بھی بے حد بے ادبی سے۔ بڑھیا پکار کر۔'' آصفہ بیگم کا رونا کم ہی ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ مگر یہ رونا ان کا صرف اپنی اولاد کے لیے تھا۔ اس وقت ان کو اپنی عزت ذلت کا نہیں اپنی اولاد کی حالت دیکھ کر دکھ اور گہرا ملال ہو رہا تھا۔

آصفہ کی بات پر بلال صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک رنگ جا رہا تھا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)